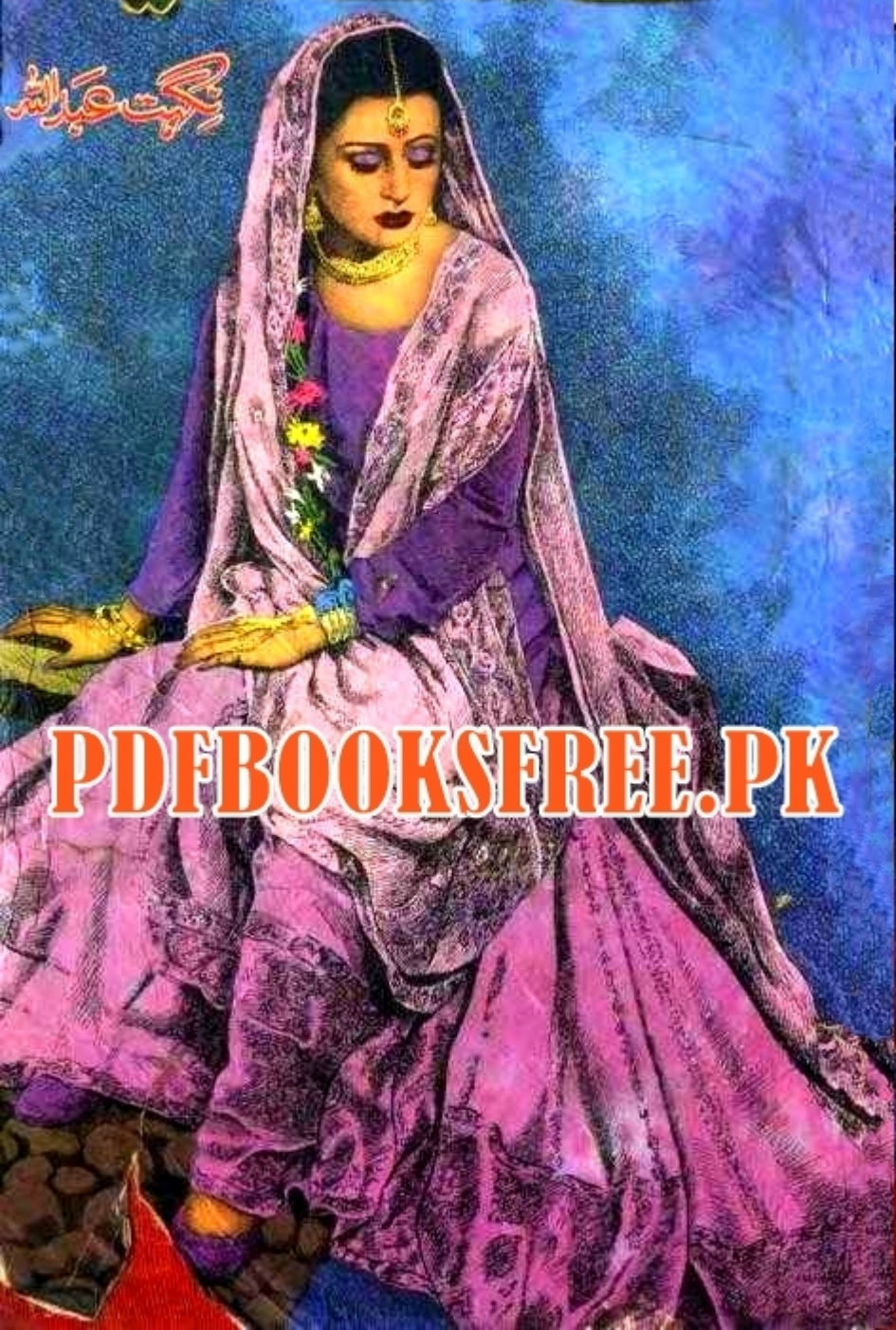


# مجھے روٹھنے نہ دینا

حکایت عبداللہ



PDFBOOKSFREE.PK

## مٹھے روٹھے دنیا

گرمیوں کی رات تھی قدرے ٹھنڈی اور پرسکون سی۔

دن بھر کی گرمی اور عیس کے بعد شام میں ہوانے کچھ آنکھیلیاں شروع کی تھیں۔ موتیا اور رات کی رانی کو چھو کر جب آگن کا رخ کرتی تو پوری فضا مٹکی ہوئی سی لگتی تھی۔ ربیعہ نے سر شام ہی کلثوم اور ہما کے ساتھ مل کر آگن میں چھڑ کاؤ کر دیا تھا۔ چھڑ لائن سے چار پائیاں بچھا کر ان پر کھیں بچھا دیے تھے۔ روزانہ کی طرح یہ کام کرتے ہوئے ان تینوں بہنوں نے آپس میں چھڑ بچھاؤ میں کی تھی۔ اور نہ ہی چھڑ کاؤ کرتے ہوئے ایک دوسرے پر پانی پھینکتا تھا۔ ایک دوسرے سے نظریں چراتے بس خاموشی سے ہر کام ہو گیا۔

اور تو اور اماں بھی خاموش تھیں۔ نہ کوئی حرایت، نہ سرزنش۔ برآمدے میں رکھے تخت پر بیٹھیں، جلنے کا سوجھ میں مگم تھیں۔ ان کی آنکھیں ایک ہی نکتے پر مرکوز۔ اور چہرے پر فکرات کی کیڑوں کا جال تھا۔ کسی کسی وقت ایک طویل سانس آہ کی صورت میں ان کے ہونٹوں سے خارج ہوتا تو چار پائیوں پر کھیں بچھاتے اس کے ہاتھ وہیں رک جاتے اور وہ دُرویدہ نظروں سے اماں کی طرف دیکھنے لگتی۔

چھوٹی آپا گرمی کے باوجود کمرے میں بند تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو اماں انہیں آواز پر آواز دینے جاتیں لیکن اس وقت تو جیسے وہ انہیں پکارتے ہوئے بھی ڈر رہی تھیں۔ گوکہ اماں قصور وار نہیں تھیں اور قصور وار تو کوئی بھی نہیں تھا۔ پھر بھی جب کبھی ایسی کوئی بات ہوتی، چھوٹی آپا کا موڈ مچھتا اور ہر ایک اپنے آپ کو ان کا مجرم تصور کرنے لگتا تھا۔

”کاش۔۔ میرے اختیار میں ہوتا تو میں اس گھر کے اور خاص کر چھوٹی آپا کے دلہندہ سمیٹ لیتی؟“ دن میں کتنی بار اس نے اس انداز سے سوچا تھا۔ اب بھی کچھ آسمان پر دُور تک نظریں دوڑاتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں دہرایا۔ پھر اس کی نظریں ستاروں کے جھرمٹ پر جم گئیں۔ جو ایک دوسرے کے بے حد قریب ہو کر جلنے کیسا مرغوشیاں کر رہے تھے۔ کچھ شریر سا انداز تھا۔ جلتے بجھتے جیسے آنکھوں سے ایک دوسرے کو اشارے کر رہے ہوں۔ روزانہ ستاروں کے جھرمٹ کو دیکھتے ہوئے اس کے ہونٹ آپ ہی آپ مسکراتے لگتے تھے اور ان کے درمیان جب وہ چاند کا تصور کرتی تو ایک چہرہ نمودار ہو کر کتنے سہانے خواب اس کی ہلکول پر اُتار آتا۔ پھر رقیہ تمام رات وہ ان خوابوں کی سرزمین پر اس کا ہاتھ تھامے بہت دُور تک نکل جاتی تھی۔ اور خواب تو وہ اب بھی سماں چاہتی تھی۔ ہر طرف سے بے نیاز ہو کر کچھ دیر کو حقیقی زندگی کی ٹھکان بچھا کر چاہتی تھی، کچھ سہانے خواب ہی سماں۔ لیکن دل اتنا بوجھل ہو رہا تھا کہ کوئی اچھی بات سوچی ہی نہ گئی۔ ستاروں کے جھرمٹ سے سفر کرتی ہوئی اس کی نظریں اپنے آگن کا طواف کرنے لگیں۔

کچن کے دروازے کے پاس پیڑٹل فین رکھا تھا اور اس کے سامنے سب سے پہلے ابامیاں کی چار پائی تھی

اُن سے کچھ فاصلے پر کلتھوم اور ہما۔ پھر وہ خود تھی۔ امان کی چار پائی سرمانے کی طرف تھی۔ اور چھوٹی آپا پر آمدے میں تخت پر سوار ہی تھیں۔ پچھلے سال جب بڑی آپا کی شادی نہیں ہوئی تھی تو امان کے پیروں کے پاس ان کی چار پائی بچھا کر رکھی تھی۔ اس نے بڑی باری سب کو دیکھا۔ ابھی تو رات کا پہلا پھر تھا اور سب سو رہے تھے۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ پھر بھی کوٹ بدل کر زبردستی انھیں بند کر لیں۔

آبامیاں یعنی اکرام علی ایک سرکاری ملازم تھے۔ نہایت شریف، ایماندار اور خدا کی رضا میں راضی رہنے والے۔ کبھی کوئی شکوہ ان کی زبان سے نہ نکلتے تھے۔ ہمیشہ شکر کا کلمہ پڑھتے نظر آتے۔

تھیں تو آپا بھی تقریباً ان ہی کی طرح لیکن کہیں کہیں مقدر سے شاکہ نظر آتی تھیں۔ قدرت نے ان کی چوٹی میں یکے بعد دیگرے پانچ بیٹیاں ڈال دیں تو بیٹے کی آرزو میں شکوہ تو ان کے لب پر آنا ہی تھا۔ اب تک صرت سے کہتیں۔

”کیا تھا جو اللہ میاں ایک بیٹا دے دیتا۔ بڑھاپے کا سہارا تو ہو جاتا۔ بیٹیاں تو ان کے چڑیاں ہوتی ہیں۔

اپنے اپنے نصیب کا داد نہ لیں گی اور اڑ جائیں گی۔“

اور دوسرا شکوہ انہیں اپنی غریبی سے تھا۔ لیکن یہ شکوہ ان کے لب پر شاد و نادر ہی آتا تھا۔ بظاہر وہ مطمئن ہی نظر آتی تھیں۔ آبامیاں کی بچی بڑھی معمولی سی تنخواہ اور گھر میں پانچ بیٹیاں جو کڑی کی بیل کی طرح دن بدن بڑھتی چلی جا رہی تھیں اور اسی صاب سے منگائی جی۔ اس کو توڑ منگائی کے بعد جس میں طرح آمان گھر کا خرچ چلاتی تھیں، یہ ان کا ہی کمال تھا اور اس بات کے آبامیاں بھی معترف تھے۔ کیونکہ وہ تو تنخواہ امان کے ہاتھ پر رکھ کر بڑی الذمہ بوجھتے تھے لیکن انہیں احساس ضرورت تھا کہ اس معمولی سی رقم میں پورا مہینہ چلانا کس قدر مشکل کام ہے اور پھر بڑیاں بھی سب پڑھنے والی تھیں۔

ان ان عورتوں میں سے نہیں تھیں جو ہر وقت تنخواہ کی کمی اور منگائی کی زیادتی کا رونا رو کر گھر کا سکون برباد کرتی ہیں۔ انہوں نے اولاد کے سلسلے کبھی ایسا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ ان کی شخصیت میں بڑی باری تھی اور خود اسی اس حد تک کہ چھینے کے آخری دنوں میں چٹنی روٹی پر لڑا کر لیتیں لیکن کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا یا۔ نہ کبھی حالات سے تنگ آ کر آبامیاں کو ان کی کم مائیگی کا طعنہ دیا۔

ان تمام باتوں کے ساتھ شاید ان کے اندر کہیں خوشحال اور آسودہ زندگی کی خواہش ضرور تھی جس کا اظہار انہوں نے یوں تو کبھی نہیں کیا لیکن جب بڑی آپا کے لیے پیام آنے شروع ہوئے تو ان کی دلی خواہش اس طرح اساتے آئی کہ وہ ہر آنے والے پیغام کو بڑی سہولت سے رد کرتی گئیں۔

”نیک نیت۔ آخر تم چاہتی کیا ہو؟“ ایک دن آبامیاں نے پوچھ ہی لیا۔

”میں تو بس اتنا چاہتی ہو۔ اکرام علی کی میری بیٹی اچھے کھلتے پیتے گھر میں بیاہی جائے۔“ امان کی صاف گولی پرا آبامیاں کتنی ہی دیر تک سر جھکائے بیٹھ رہے۔

”دیکھو ناں اکرام علی۔“ امان کہنے لگیں۔ ”ہم نے تو جو بڑی بھلی گذارنی تھی، گذار لی، اب کم از کم بیٹیوں کے لیے تو اچھا سوچیں۔ اس گھر میں ہم نے اپنی بچیوں کو دیا ہی کیا ہے سوائے تعلیم کے۔ نہ اچھا پہنا یا، نہ اچھا کھلایا تو کیا ان کی خواہش نہ ہوگی اچھا پہننے اور اچھا کھانے کی؟“

”ان کے نصیب میں اگر اچھا پہننا اور اچھا کھانا کھا ہو گا ضرور ملے گا، تم کیوں فکر کرتی ہو؟“ آبا انہیں رسا سے سمجھاتے ہوئے بولے۔

”مجھے فکر کرنی ہے۔“ امان اپنی بات پر زور دے کر بولیں: ”میں اپنی بیٹی کو کسی لوگ سے بیاہ کر اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتی کہ اس کے نصیب میں ہو گا تو وہ لوگ نہایت ہی جلتے گا یا کسی بیل کا مالک۔ نہیں اکرام علی، اپنی ساری زندگی تو کبھی سارا کبھی پاؤں دھانسنے کے چکر میں گزرتی گئی۔ اب بیٹیوں کے ساتھ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔“ قدرت سے توقع کے بعد کہنے لگیں۔

”تم یہی کہو گے کہ کہیں بیٹیوں کی عمر نہ نکلی جائیں۔ تو بے شک نکل جائیں۔ یہاں دال روٹی کھا کر چین کی نیند تو سوتی ہیں۔ اگر دوسرے گھر میں بھی یہی حالت رہے تو چین کی نیند بھی نہیں ملے گی۔ ابھی اکیلی جان ہیں، کوئی

کوئی ترزد نہیں۔ اگلے گھر میں ایسے حالات ہوتے تو سو کھینچے ہوتے۔ اپنی کم اور گھر کی فکر زیادہ۔ اور ب بچے ہوتے تو ان کے لیے جان مارتے ہوتے ضرور سوچیں گی کہ ہمیں ساری زندگی میں ملا ہی کیا۔ ماں باپ نے گھر بھی بڑی کوتاہی سے رہا اور یہاں بھی کچھ نہ ملا۔“

”تمہاری بات ٹھیک ہے۔“ آبامیاں کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد بولے تھے: ”لیکن میں سمجھتا ہوں اب ملک بڑی کے لیے جتنے پیغام آتے ہیں، وہ سب موزوں اور مناسب تھے۔ جاوید، خالدہ، قاسم۔ کیا بڑی کتنی ہی سب میں؟ پڑھے لکھے، نیک اور سب سے بڑی بات کہ شریف خاندانوں سے تھے۔“

”میں مانتی ہوں، یہ سب خوبیاں تھیں ان میں لیکن جو خیر میں چاہتی ہوں، وہ کسی میں نہیں تھی۔“ امان ہاتھ اٹھا کر فیصلہ کن پوچھ میں کہتیں۔

”گو پیسے کو تم خوبی مانتی ہو۔“ آبامیاں ہنستے ہوئے بولے تھے۔

”ہاں۔“ امان نے بالکل بڑا نہیں منایا۔ تم خواہ مذاق اڑاؤ یا کچھ بھی کہو، میرے نزدیک یہ بڑی خوبی ہے اور سن لو، میں جی وہیں بیاہوں گی جس میں یہ خوبی ہوگی۔“

”نیک نیت۔“ اس گھر کی کرا دھرتا تم ہو۔“ آبامیاں نے ہتھار ڈال دیے۔ ”سیاہ و سفید کی مالک ہو جو مناسب سمجھو کرو لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ صرف اس ایک خوبی کو دیکھتے ہوئے بقیہ باتوں کو نظر انداز مت کر دینا۔“

”قدرت کرو اکرام ملی، دیکھ بھال کر ہی کروں گی۔“ امان نے خود مطمئن ہو کر آبامیاں کو بھی اطمینان دلایا تھا۔ ”میری بیٹیاں ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ایک ہیں۔ پڑھی لکھی ہونے کے ساتھ ساتھ گھرواری کا سلیقہ بھی ہے۔

”اور پھر خدا کی ذات سے ناامید بھی نہیں ہوں۔ اب جبکہ اس گھر میں پتھر آنے ہی گئے ہیں تو مجھے یقین ہے کبھی کوئی ایسا پتھر بھی ضرور ملے گا جو ہر لحاظ سے میری بیٹی کے لیے موزوں ہوگا۔“

بڑی آپا پہلو بٹھی کی اولاد تھیں۔ خاصی خوش شکل۔ درمیانے قد کے ساتھ جسم سڈول تھا۔ مزاج میں ٹھہراؤ بلکہ بہت حد تک نرم خن بھی جاسکتی تھیں۔ بس ایک دھیمی مسکناں جو ہر دم ان کے ہونٹوں پر رہتی۔ پچھلے سال انہوں نے بی۔ اے کیا تھا۔ اس کے بعد گھرواری میں مصروف تھیں۔ گو کہ ان کے لیے پیغام تو اسی وقت آنا شروع ہوئے تھے جب وہ بی۔ اے میں پڑھ رہی تھیں۔

لیکن۔

کیونکہ کوئی امان کے معیار پر پورا نہیں اُترتا تھا اس لیے پہلے ان کی پڑھائی کا بہانہ کر کے مالتی رہیں پھر جب یہ عذر بھی نہیں رہا تو سہولت سے منہ کرتی رہیں مگر یہ سلسلہ زیادہ دیر تک جاری نہیں رہا یعنی امان کو بہت زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ گزشتہ سال بوا (جو رشتے کروانے کا کام کرتی تھیں) عاصم بیگ کا پیغام لائیں،

جو ہر لحاظ سے امان کے معیار کے مطابق تھا۔

عاصم بیگ ایک بینک میں منیجر تھے۔ کنبہ بھی زیادہ بڑا نہیں تھا۔ بس ایک ماں اور ایک چھوٹا بھائی۔ گھر بھی ذاتی تھا۔ اور زندگی کی مزید سہولتیں بھی حاصل تھیں۔ امان کی سوچ بہت اونچی نہیں تھی۔ بس بیٹی خوشحال ہو اور معمولی معمولی چیزوں کو ترسنا نہ پڑے۔ اس لحاظ سے عاصم بیگ نہایت مناسب تھے۔

انہوں نے آبامیاں سے مشورہ کیا اور کچھ جھان بین کے بعد ہائی بھری یہاں قسمت نے امان کا ساتھ دیا یا پھر بڑی آپا ہی قسمت کی دھن نکلیں کہ عاصم بیگ کی والدہ انہیں دیکھتے ہی آن پر اسی لٹو ہوئیں کہ تین کپڑوں میں انہیں مہار کر لے جانے پر تیار تھیں لیکن اب ایسا بھی نہیں تھا کہ امان انہیں تین کپڑوں میں رخصت کر دیتیں۔ ساری زندگی جو جمع کیا تھا، اس میں سے بڑی آپا کا حصہ نکال کر اپنی حیثیت کے مطابق انہیں رخصت کیا۔

ان کے مستقبل کی طرف سے تو امان نے پہلے ہی اپنا اطمینان کر لیا تھا پھر جب کچھ دنوں میں انہوں نے بڑی آپا کا رنگ روپ دیکھا جو ان کی آسودگی کا قاضی تھا۔ تو انہیں اطمینان ہو گیا۔

پھر چھوٹی آپا تھیں۔ شکل و صورت ان کی بھی اچھی تھی۔ اور رنگت باقی تمام بہنوئی سے صاف۔ اس پر لکھے سیاہ بالوں کی لمبی سی چوٹی ان کی کمر پر ناگ کی طرح بھرا کر تھی۔ قد بھی اونچا تھا۔ لیکن ایک خامی جس نے ان کی خوبصورت شخصیت کو داغدار کر دیا تھا۔ وہ ان کی ایک ٹانگ کا نقص تھا۔ بچپن میں شرک پار کرتے ہوئے کہیں

میں نے اس پر اس قدر غصہ کیا کہ میں نے اس کو مار مار کر ہلاک کر دیا۔

یہاں تک تو سب ٹھیک تھا۔ لیکن جس روز چھوٹی آپا کو دیکھنے کچھ خواتین آمیں اور انہوں نے محض ہی کے پیر کے نقص کی وجہ سے انہیں روکیا، اس روز سے چھوٹی آپا کا مزاج بدل گیا۔ وہ جو ہر ایک کا مذاق ابل تک بڑے ضبط سے بہتی آتی تھیں، اس مقام پر شاید ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اور چھوٹا ایک بار بھیں، بار بار ہوا بار بار اپنے ٹھکرائے جانے کی پچاس دل میں ایسی جھنجھکی کہ وہ ہنستی نسنکرائی چھوٹی آپا جانے کہاں جاسوئی تھیں کہ پھر ضبط پڑے نہ ملیں۔ گو کہ آسمان ایسے مرقعوں پر اس قسم کے مجلے بولا کرتی تھیں۔

اور جھوٹے آپا ناوان نہیں تھیں۔ جانتی تھیں یہ سب دل بھلاوے کی باتیں ہیں اور اماں جیسے بچن میں انہیں ایسی باتوں سے بھلا لیا کرتی تھیں۔ سمجھتی تھیں اب بھی وہ بہل جائیں گی اور بھلنا تو دودھ کی بات جھوٹ آپا تو تھتے سے اُٹھ جاتیں۔ زندگی میں کبھی اماں کے سامنے زبان نہیں کھولی تھی لیکن اب تو ایسی ایسی باتیں سنا جاتیں کہ اماں حیران پریشان پورا منہ کھولے ان کی طرف دیکھ جاتیں۔

ہوا اپنی جگہ جو رسی بنی نظریں چراگئیں۔ ادا ماں خواہ مخواہ گزریے دنوں کو یاد کرتے ہوئے چھوٹی آپا کے ساتھ ہونے والے حادثے کو دہرائے گی تھیں۔

اور تیسرے نمبر پر وہ تھی یعنی ربیعہ اکرام علی۔ گوگرہ شکل و صورت اور عادات و اطوار میں باقی بہنوں کے بہت زیادہ مختلف نہیں تھی۔ بس کہیں کہیں قصور اذوق نظر آتا تھا۔ اور سب فرق لے باقیوں میں ممتاز بھی لڑتا تھا۔ سر و قد اور سرخی شامل گندی رنگت میں ایک خاص کشش تھی۔ چہرے پر برقی تھی اور آنکھوں میں نمیندگی اور شیدائے اس کے علاوہ بھی کوئی اور بات مزہ و تھی جیسے پہلی غیر ارادی نظر کے بعد ارادی۔ نظر کا تقدار ٹھہراتی تھی کیونکہ سب بہنیں سال و دو سال کے فرق سے تعلیمی میدان میں تھیں۔ بڑی آبا پی اے کر کے

اس کی ایک ایک تھک سہی عادت یہ تھی کہ وہ اکثر بیٹھے بٹھائے کھو جاتا کرتی تھی کہیں تلی دیکھی تب کہیں بھول کھلات، کہیں کوئی بچہ۔ غرض جو چیز اسے اچھی لگتی یا مانتا کرتی تھی اسے دیکھتے ہی وہ کھو جاتی تھی۔ نظریں اس چیز پر مرکوز کیے لپٹا نہیں دہن ساتھ دیتا تھا کہ نہیں) وہ میرے اپنے آپ میں نہیں رہتی تھی۔ کچھ تنہائی پسند بھی تھی اور تنہائیوں میں سوچنا اچھا لگتا تھا۔ اور گزشتہ سال تک تو اس کی سوچیں گھر کے افراد تک ہی محدود تھیں۔ نرم دلی کے باعث گھر کے مسائل کو سمجھتی اور ان پر روشنی بھی تھی۔ خاص طور پر جیوئی آپا کے بے لگ روینے نے اسے بہت دکھ پہنچایا تھا۔ وہ جیوئی آپا کو قصور وار نہیں سمجھتی تھی، جو لوگ ذمہ دار تھے، اسے ان پر انوس ہو جاتا تھا اور گزشتہ سال تک اس کی سوچیں بس اس حد تک محدود تھیں۔

اپنے بارے میں سوچتے ہوئے وہ دُور نے لگتی تھی کہ اگر جو کبھی کسی نے اس کی آنکھوں میں اس چہرے کا عکس پایا تو کیا ہوگا؟ وہ ایک چہرہ جو بیرونی نظر میں اسے اچھا لگا تھا۔ اور اپنی عادت کے مطابق اسے دیکھتے ہی وہ کھو سی تھی یوں کہ گرد پیش کا ہوش ہی نہ رہتا تھا۔

ثناقب حسن اس کی دوست انیلا کا بھائی تھا۔ انیلا اسی سال کسی دوسرے شہر سے مائیکریٹ ہو کر اس کے کالج میں آئی تھی اور شاید راستوں سے نا آشنا کی بنا پر ثناقب حسن اسے کالج سے لینے آیا تھا۔ وہ اس وقت کلن گریٹ سے نکلتی رہی تھی کہ بلا ارادہ اس کی نظر ثناقب حسن کی طرف اٹھ گئی تھی اور پھر اسے اپنے طرف کی خبر نہ تھی۔

پھر اکثر ایسا ہونے لگا۔ شروع شروع میں دونوں دوہری دور سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر مسکرائشوں کا تبادلہ ہوا۔ اور اس کے بعد فاصلہ مستحکم ہو گیا۔ اور اب تو وہ ہر ایک جان دو قاب تھے۔

کبھی کوئی آشنا چہرہ ہاجانک سامنے نہ آجائے؟  
کبھی جو بات اب تک راز ہے ہم عام اگر اسے مسوا نہ کر دے،

وہ جو بڑی تھی، ایک دم بہاؤ میں آگئی۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اور یہ سبق یقیناً اس نے سکھایا تھا جو مرد تھا اور جسے رسوا ہونے کا کوئی خدشہ بھی نہیں تھا۔



اس کے بعد چوتھے نمبر پر کوشش تھی اور اس کے بعد تھا۔ یہ دونوں کیونکہ ابھی نوکریں کی خدمت میں تھیں اس لیے خاصی لا آسانی، ٹٹ کھٹ اور شرارت تھیں۔ اس گھر کی خاموش فضاؤں میں اگر کوئی بھی نچتی تو کوشش اور ہنس کی وجہ سے۔ ہر بات سے بے نیاز دونوں کا زیادہ وقت باتیں کرنے اور سب کو ہنسلے میں گزرتا تھا کبھی کبھی اتنا ٹوٹتی بھی تھیں کہ اتنا زیادہ نہ ہنسا کر دیکھیں آیا میاں ان کی طرف داری کرتے ہوئے اماں کو منہ کرتے۔

نیک بخت مت منع کیا کرو انہیں۔ ان ہی کے دم سے تو اس گھر میں زندگی کے آثار نظر آتے ہیں۔

دو پہر کا وقت تھا۔ گرمی اپنے عروج پر تھی۔ شام کا وقت تھا۔ روزانہ کی طرح مایوس اور نامراد گھر میں داخل ہوا تو فوری طور پر کسی کا سامنا کرنے کے بجائے چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پنکھا نل اسپڈ سے کھول کر اس نے پہلے پیروں کو جوتوں کی قید سے آزاد کیا پھر قمیص کے بٹنی کھولتا ہوا پلنگ پر سیدھا لیٹ گیا۔ پورا دن جو پینے سے جھگکا ہوا تھا، اس پر پینے کی ہوالے سی کام کرنے لگی۔ آنکھیں بند نہیں تو کچھ دیر کو واقعی اپنی اوقات بھول گیا یوں لگا جیسے کسی عالیشان شنگ کے ریج بستہ بیدروم میں بخواب ہو۔ وہ توجہ پسینہ خشک ہوا اور پینے کی ہوا معمول کے مطابق کچھ گرم سی محسوس ہونے لگی تب اس نے ہڑ ہڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ پہلے اپنے اطراف نظر بن دوڑائیں پھر طویل سانس لیتے ہوئے گمبہ ادب کیا اور نیم دراز ہوتے ہوئے سوچنے لگا۔

پچانہیں یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔ اب تو اماں اور آبا کے سامنے جاتے ہوئے بھی شرم آنے لگی ہے کتنی آس سے۔ دیکھتے ہیں وہ دونوں جیسے ابھی میں انہیں نوکری مل جائے کی نوید دوں گا؟ چھ مہینے پہلے اس نے اپنی تعلیم مکمل کی تھی اور اس کے فوراً بعد سے ہی وہ چاب کی ٹنگ و دو میں لگ گیا تھا لیکن ابھی تک کہیں بات نہیں بنی تھی۔ گھر کا سب سے بڑا لڑکا ہونے کے ناتے ساری ذمہ داریاں اس پر تھیں۔ اور سب اسی سے اس لگائے بیٹھے تھے اور کوئی ایک فرد تو تھا نہیں۔ آبا جو ریشٹر ہو چکے تھے اماں تین بہنیں اور ایک بھائی۔ جب سے آبا ریشٹر ہوئے تھے، گھر کے حالات کافی خراب ہو چکے تھے۔ آمدنی کے نام پر صرف ان کی پنشن تھی اور اتنی رقم میں گھر کی گاڑی چلنا سی طرح بھی ممکن نہیں تھی۔ اماں نے فوراً ہی مشین منہجالی لی، بڑی دونوں بہنیں پڑھائی چھوڑ کر گھر بیٹھ رہیں۔ البتہ انہیں لڑکھنے کا شوق تھا اور وہ کسی طرح اس سے دستبردار نہ ہوئی۔ پھر عاقبت تھا جوا بھی میٹرک میں پڑھتا تھا۔ ایک طرح سے مسائل کا ہارگزار اور سائل کچھ بھی نہیں تھے۔ پھر بہنیں بھی شادی کی عمر کو پہنچ چکی تھیں۔ اور یہ سب اسی کو کرنا تھا۔

یہ سارے مسائل دیکھتے ہوئے وہ چاہتا تھا کوئی اچھی جانب ملے جو اس کے سارے مسائل کو حل کر دے۔ نہ تو رفتہ رفتہ ضرور حل کرے اور اسی نوکری جس کی مولیٰ تو وہاں پورا مہینہ چلنا بھی مشکل نظر آتا اگر ملتی بھی تھی تو اس نے قبول نہیں کی۔ اور پھر جب سے ربیعہ اس کی زندگی میں آئی تھی، تب سے وہ اپنے بارے میں مجبور سوچنے لگا تھا لیکن یہ خیال ضرور تھا کہ بہنوں کے فرض سے سبکدوش ہونے کے بعد ہی وہ اپنے لیے کچھ کر سکے گا۔ اور ان فراغ نفس سے عہدہ برا ہونے میں پچانہیں گناہ وقت گئے۔ سالی دو سال یا اس سے بھی زیادہ۔ اور کیا اتنا عرصہ ربیعہ اس کا انتظار کر سکے گی؟

یہ خیال آج اچانک ہی اسے آیا تھا۔ اس وقت جب وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر گھر لوٹ رہا تھا اور اب پھر وہ اسی پہنچ پر سوچنے لگا۔

ربیعہ اس کی محبت تھی۔ اور وہ اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اسے پانے کے لیے ضرور تھا کہ وہ جلد سے جلد نہ صرف اپنے پیروں پر کھڑا ہو بلکہ بہنوں کی ذمہ داریوں سے بھی فارغ ہو جائے اور یہاں رو کر تو یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا کہ اتنی کم مدت میں وہ یہ سب کر لے۔

کیوں نہیں کہیں باہر نکلے کی کوشش کروں۔ مڈل ایسٹ یا کہیں اور۔ اس نے سوچا اور اس سوچ کے ساتھ ہی ٹوٹی اس پھر سے بندھنے لگی تھی۔

باہر جا کر تو جیسے لوگوں کے ہاتھوں میں اللہ دین کا چرخ آجاتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چھوٹے گھروں کی جگہ بڑے تعمیر ہو جاتے ہیں۔ قصبہ میں بھی ایک سال میں اسے سارے مسائل سے نکل کر ربیعہ کے لیے ایک بڑا سا گھر بن گیا اور ایک سال کوئی اتنا زیادہ تو نہیں ہوتا، بلکہ جھپٹے میں گزر جاتا ہے۔ میں ربیعہ سے کہوں گا۔

بھائی۔ وہ جہانے کیا کچھ سوچے جا رہا تھا کہ انیلا نے دروازے میں جھانک کر اسے پکارا۔ وہ چمنکا اور مسوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

اماں کھانے کے لیے بلا رہی ہیں۔ انیلا نے کہا تو وہ طویل سانس لیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس کے ساتھ ہی سے کمرے تک آیا۔ دسترخوان پر سب لوگ بیٹھ چکے تھے۔ وہ بھی خاموشی سے بیٹھ گیا۔

تمہارے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ اماں سائن کا ڈونگا اس کے آگے رکھتی ہوئی بولیں۔ میں اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ وہ دھیرے سے بولا۔ کچھ کام بناؤ، اماں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ کام پڑنا تو سیدھا اپنے کمرے میں کیوں چلا جاتا۔ پہلے تمہیں اطلاع نہ دیتا۔ اس کا جواب آبانے دیا تو ان پر امانتے ہوئے بولیں۔

ضروری تو نہیں ہے۔ پہلے مجھے اطلاع کرتا۔ آخر تھکا ہوا آیا تھا۔ کچھ دیر آرام کرنے لیٹ گیا ہو گا۔ اس کریں اماں۔ اس نے ٹوک دیا۔ آبا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اگر کام بننا تو میں تھکا ہوا ہونے کے باوجود پہلے آپ کو اطلاع دیتا۔

چلیں بھائی۔ پہلے کھانا کھاؤں۔ شکلیہ نے اس کی پلیٹ میں روٹی رکھی۔ پھر اماں اور آبا کو مخاطب کر کے اپنے گھر کے کم از کم کھانا تو آرام سے کھانے دیں، یہ ساری باتیں آپ بعد میں بھی کر سکتی ہیں۔

شکلیہ کے ٹوکے کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کھانا خاموشی سے کھا گیا۔ اس کے بعد آبا چھوٹے کمرے میں چلے گئے شکلیہ اور نیلہ برتن سینٹھیں لگیں۔ انیلا نے فرش صاف کر کے سونے کے لیے نیچے دری بچھا دی اور وہ ماں کے ساتھ ان کی چار بائی پر آ بیٹھا۔

گو کہ کھانے کے بعد اس پر بھی تسستی سواڑ ہو گئی تھی۔ اور دل چاہ رہا تھا، چپ چاپ جا کر سو جائے لیکن بعض اس خیال سے اماں کے پاس بیٹھ گیا کہ انہیں اپنے ارادے سے آگاہ کر سکے یہاں نوکری کی تلاش میں اسے مارے پھرنے سے بہتر ہے کہ وہ کہیں باہر نکل جائے اور جتنی بھاگ دوڑ وہ یہاں نوکری حاصل کرنے کے لیے کر رہا ہے اتنی بھاگ دوڑ اور کوشش باہر جانے کے لیے کرے، اس میں ان سب کا فائدہ ہے۔ ابھی وہ بات کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ شکلیہ اور نیلہ بھی فارغ ہو کر ان کے پاس آ بیٹھیں۔ اور جس راز سے وہ بیٹھیں، اس سے وہ سمجھ گیا کہ وہ کوئی بات کرنا چاہتی ہیں، اس لیے وہ اپنی بات روک کر ان دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔

بھائی۔ ایک دن آپ اپنے کسی دوست کا ذکر کر رہے تھے۔ شکلیہ اسے متوجہ پا کر کہنے لگی۔ وہی اس کے بارے میں آپ جبار ہے تھے کہ اس کی اپنی کوشش کی فرم ہے۔ پچانہیں کیا نام لے رہے تھے اس کا۔ شہر ذرا احمد۔ اس نے کہا۔

ہاں وہی۔ تو میں یہ کہنا چاہا رہی ہوں کہ آپ ان کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے؟ ہو سکتا ہے ان کے پاس کوئی جگہ خالی ہو اور اگر نہیں بھی ہوگی تو وہ آپ کے لیے۔ باقی بات اس نے خود ہی مکمل نہ کی کہ بھائی خود ہی سمجھ جائے گا۔

ہاں۔ اس نے گہری سانس کے دوران ہاں کہتے ہوئے شکلیہ کی بات کاٹ دی پھر اماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

اماں۔ میں اب کچھ اور سوچ رہا ہوں۔ کیا؟ کیا سوچ رہے ہو؟ وہ اماں پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ میں سوچ رہا ہوں۔ یہاں مارے مارے پھرنے سے بہتر ہے کہیں باہر نکلنے کی کوشش کروں۔

پھر بچانے کے انداز میں کہنے لگا۔

”دیکھیں ناں اماں۔ یہاں نوکری کرنے سے کیا ملے گا؟ بارہ پندرہ سو روپے یا پھر زیادہ ہالہ ہوگا۔ آمدنی کا کچھ ذریعہ تو ہوجائے گا ناں۔“

”اماں۔ ہمیں اب صرف دو وقت روٹی کی فکر نہیں کرنی۔ اس کے علاوہ بھی بہت سارے مسائل، شکیلیہ، غیلہ پڑھائی سے فارغ ہو کر گھر بیٹھی ہیں۔ کل کو انیلا بھی فارغ ہو چلائی تھی تو کیا ہمیں ان کی شاہ کرنی۔ اور پھر گھر کی حالت آپ دیکھ رہی ہیں۔ اس گھر میں کوئی اچھا رشتہ تو آنے سے رہا جبکہ میں گھر ٹھیک ٹھاک کر کے بہنوں کو اچھی جگہ بیاہوں اور یہ اسی صورت ممکن ہے اماں کہ میں باہر جا کر کروں۔ آپ نہیں جانتیں وہاں کی محنت مزدوری سے جتنا پیسہ ملتا ہے، اتنا تو یہاں کی انٹری سے بھی اس نے اچانک جس مسئلے کو چھڑوایا تھا، اس سے اماں بھی سوچ میں پڑ گئیں۔“

”دیکھیں ناں اماں۔ یہی دو چار سال ہیں۔ وہ اگر میں نے یہاں گمنام دیے تو ہمارا کوئی ایک مسئلہ نہیں ہوگا۔ شکیلیہ کی عمر دو چار سال بچا آپ کی سوچ میں کتنی ہوگی؟“

”کہتے تو تم ٹھیک ہو۔ اماں پر سوچ انداز میں سر ہلاتی ہوئی بولیں۔ لیکن بیٹا، باہر نکلنے کے کچھ روپیہ چاہیے ہوگا۔“

”چاہیے تو ضرور لیکن اسے آپ مسئلہ نہ بنائیں۔ کہیں سے بھی قرض لے لیتے ہیں، کچھ آپ کچھ ہم اماں میں دو چھپنے میں ٹوٹا دوں گا۔“

”اماں کے خاموش رہنے پر کہنے لگا۔ پھر آپ اجازت دے رہی ہیں۔ میں کوشش کروں؟ کیا کوشش کروں؟“

”کسی بھی ایسی سے رابطہ کروں گا۔ وہ پندرہ بیس ہزار نے کچھ باہر بھیج دیں گے۔“ قد وقت کے بدلنے لگا۔ یہاں سے وہ جس کام کے لیے بھیجیں گے، چلا جاؤں گا۔ وہاں جا کر میرے طور پر کوشش کر کے مزید اچھا کام تلاش کروں گا۔“

”بھائی۔ ٹھیک کہہ رہے ہیں اماں،“ بنیلے نے اس کی تائید کی۔

”جیسے تم مناسب سمجھو بیٹا۔ مگر اصل مسئلہ تو پندرہ بیس ہزار کا ہے۔ اماں شش و پنج کی کیا تھیں۔“

”یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے اماں۔ آپ جس سے بھی میرے باہر جانے کا کہہ کر قرض لیں گی، وہ اڑ کرے گا۔ آپ بڑے ماموں سے کہیں یا چچا جان سے اور جو بھی پیشی ہوگی، وہ میں اپنے دوستوں۔ کروں گا۔ واپسی کی بالکل فکر نہ کریں میں دو چھپنے میں سب کی رقم ٹوٹا دوں گا۔“

”میں تمہارے آبا سے بات کروں گی۔“

”صرف بات نہیں اماں، انہیں قائل بھی کرنا ہے اور یہ کام صرف آپ کر سکتی ہیں۔“ اماں نے اصرار کیا۔

”بس تو طے ہو گیا کہ مجھے باہر جانا ہے۔“ اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے کمرے کی طرف ہوئے وہ اپنے اندر ایک نیا عزم ایک نیا حوصلہ پیدا کر چکا تھا۔

وہ خواتین جو چھوٹی آبا کو دیکھ کر ناک جھون چڑھاتی ہوئی تھیں۔ وہ پھر آگئیں۔ اماں کو حیرت لیکن غار نہیں ہونے دی۔ اسی طرح عزت سے بٹھایا اور بیٹھتے ہی ایک خاتون کہنے لگیں۔

”ہمیں روٹی تو اسی دن پسند آگئی تھی۔ بس ذرا ہم آپس میں مشورہ کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے۔“

انہیں انہیں کیا۔

اماں نے قہقہے سے ان کی باتیں سنیں اور پھر روٹے کی بابت معلوم کیا جب انہوں نے یہ بتایا کہ روٹے

ٹیوٹ کبھی میں اسٹور کیپر ہے تو اماں نے ان ہی کا جواب ٹوٹا دیا۔

”میں اپنے میاں سے مشورہ کرنے کے بعد ہی کوئی جواب دے سکوں گی۔“

”نہیں شمشے کی کیا ضرورت ہے۔ کل گھر آ کر روٹے کو دیکھ لیں اور بات کچی کر لیں۔“

”نہیں بی بی، یہ عمر بھر کا معاملہ ہے۔ اس طرح ہتھیلی پر سرسوں جمانے سے بات نہیں بنے گی میں اطمینان

لے اپنے میاں سے مشورہ کروں پھر کوئی جواب دے سکوں گی۔“ اماں نے سہولت سے انہیں سمجھا دیا۔

جب وہ خواتین دوبارہ آنے کا کہہ کر چلی گئیں۔ تو اماں مسلسل منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی رہی تھیں۔

وہ سب بیٹیں حیران تھیں کہ یہ اماں کو کیا ہو گیا ہے حالانکہ انہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ کتنی فکر مند رہتی

یا چھوٹی آبا کی طرف سے ادراپ جب ان کا مسئلہ حل ہو رہا ہے تو بیکارے خوش ہونے کے منہ پھلائے پھر

یا ہیں۔

کٹھن اور کچہر دیر تک تو اماں کا موڈ دیکھتے ہوئے خاموش رہیں لیکن زیادہ دیر تک ان سے برداشت

نہ ہو۔ چھوٹی آبا کو شرف نظروں سے دیکھتے ہوئے پہلے دبی دبی مسکراہٹ ہونٹوں پر چلی پھر بے ساختہ ہنسی

یہ دوران دونوں نے کاٹنا شروع کر دیا۔

سے بتورانی ڈھنپ بنے گی!

گورے ہاتھوں میں مہندی رچے گی

”ارے۔“ ربیعہ نے ان دونوں کو روکنا چاہا۔ لیکن جب چھوٹی آبا پر نظر پڑی تو اس نے اپنا ارادہ ملتوی

دیا کیونکہ چھوٹی آبا بظاہر ان دونوں کو گھور رہی تھیں لیکن ان کے چہرے پر بکھرے آن گنت رنگ اس بات

نے عکاس تھے کہ انہیں یہ سب اچھا لگ رہا ہے۔ اس نے چھوٹی آبا کے چہرے پر پھیلی قوس و قزح کو دلچسپی سے

دیکھا۔ پھر علوت کے مطابق جاتے کہاں کھو گئی۔ نظریں ان کے چہرے پر جمی تھیں۔ اور ذہن کہیں اور بھٹک

نا تھا۔

اسی وقت اماں کمرے میں داخل ہوئیں۔ کچہر دیر تک خاموشی سے ایک ایک کے چہرے کو دیکھتی رہیں۔

پھر قدرے اونچی آواز میں ڈانٹتے ہوئے بولیں۔

”یہ کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ بند کر دینا سب۔“

”اماں، خوشی کا موقع ہے۔“ کٹھن نے کہا تو اماں کو مزید غصہ آ گیا۔

”خوشی کا موقع۔؟ کیسی خوشی؟ کہاں کی خوشی؟ کیا بول رہے اس گھر میں؟ کیا تمہارے باوا کی کوئی لاٹری نکل

نا ہے۔“

”اماں۔ یہ سب تو چھوٹی آبا کے لیے۔“ اس نے ڈانٹے ڈرتے اماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا چاہا لیکن

ان کی گھورتی نظروں کے سامنے اس کی زبان بند ہو گئی۔

”مچلا اٹھو تم سب یہاں سے۔ رات کے کھانے کی فکر ہے کہ نہیں؟“ اماں نے سب کو اٹھایا۔ ربیعہ

سائیں چڑھا دو اور تم آگوندہ کر روٹی پکاؤ۔“ وہ خاموشی سے اٹھی اور چھوٹی دونوں کو اپنے ساتھ آنے کا

بارہ کیا تو وہ دونوں بڑا سامنے بناتی ہوئی اس کے پیچھے چل پڑیں۔

رات میں وہ حسب عادت ستاروں کے چھوٹ میں اس مانوس چہرے کی شوخیان دیکھتے ہوئے

اپنی کی سرزمین پر بٹھنے لگی تھی۔ جب اماں کی آواز نے اسے حقیقت کی دنیا میں آکھینچا۔ وہ آبامیاں کی

پائی کے پاس کھڑی انہیں مخاطب کر کے کہہ رہی تھیں۔

”سو گئے کیا اکرام علی؟“

”اؤں۔ نہیں تو۔“

آپامیاں نے آنکھوں سے بازو ہٹایا۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گئے اور اماں ان کے پاس بیٹھتی ہوئی یوں بیٹوں کی

ٹ دیکھنے لگیں جیسے اندازہ کر رہی ہوں کہ سب سو گئی ہیں یا نہیں۔ اس نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔

اماں اچھا اطمینان کر لینے کے بعد آبامیاں سے کہنے لگیں۔

”صبح جب چھوٹی آپا کو معلوم ہوگا کہ اماں نے ان کے لیے آیا ہوں پیغام زکوہ دیا ہے تو چاہئیں ان کے احساسات کیا ہوں گے؟“

”جو کہ اماں غلط نہیں سوچ رہیں۔ ہر ماں کی طرح ان کی بھی یہی خواہش ہے کہ بٹیاں خوشحال گھروں میں جائیں لیکن اس خواہش کو جس طرح انہوں نے اپنے آپ پر طاری کر لیا ہے، وہ یقیناً ٹھیک نہیں ہے۔ اتنی مشکل سے تو کسی نے چھوٹی آپا کے لیے ہامی بھری ہے اور اماں اسے بھی اپنی خواہش کی تذکرہ ہی ہیں کم از کم چھوٹی آپا سے تو پوچھ لیں کہ وہ کیا چاہتی ہیں۔ ہو سکتا ہے چھوٹی آپا ہر قسم کے حالات میں گزارا کرنے کا حوصلہ رکھتی ہو۔ اور چھوٹی آپا ہی کیا ایسا حوصلہ تو ہر لڑکی ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا ہوتی ہے۔“

اس کے ساتھ ہی وہ اپنے بارے میں سوچنے لگی اور اپنے لیے سوچتے ہوئے شاقب حسن کا خیال آیا تو اچانک دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ان دھڑکنوں میں کوئی خوشگوار سا احساس نہیں جاگتا تھا بلکہ ایک انجانا خوف اور خوف میں دھڑکا کہ شاقب حسن بھی تو حالات کا شکار اور بے شمار مسائل میں بھرا ہوا شخص ہے۔ وہ اماں کے معیار پر کیونکر اترے گا۔

”میرے خدا! اس نے بے تحاشا دھڑکنے دل پر دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ میں تو شاقب حسن کے بغیر زندگی کا تصور ہی نہیں رستی۔ اور جو اماں نے لے زکوہ دیا تو میں کیا کروں گی؟ بہت دیر تک وہ اسی انداز سے سوچتی رہی اور آخر میں اس طرح اپنے آپ کو بہلایا۔

”وہ چاہ کی کوشش کرتا رہا ہے اور جب تک چھوٹی آپا کی شادی ہو تب تک ہوسکتا ہے وہ کسی قابل ہو چکا ہو۔“

صبح وہ اپنے معمول کے مطابق اٹھی۔ نماز سے فارغ ہو کر اماں کے ساتھ مل کر ناشتا بنایا پھر ناشتا کرنے کے بعد کالج چلی گئی۔ رات کی سوچوں نے اسے خاصا پرزورہ کر دیا تھا۔ پڑھائی میں بالکل دل نہیں لگا اور پھر آج ایلا بھی نہیں آئی تھی، جس سے وہ کچھ مایوس ہو گئی تھی۔

اس نے سوچا تھا ایلا کو لینے کے بہانے شاقب حسن آئے گا تو وہ اسے حالات بتاتے ہوئے اپنے خدشات کا اظہار بھی کر دے گی اور اب شاقب کے آنے کی امید بھی کم تھی۔ اس نے بہت دے دی ہے پیر پڑھائے اور آخری پیر پڑھ تو چھوڑ ہی دیا۔ کچھ دیر یونہی لائبریری میں بیٹھی اس کے بعد گھر جانے کا ارادہ کر کے اٹھ گئی۔

کالج گیٹ سے نکلی تو سلسلے ہی شاقب حسن گھر نظر آیا جسے دیکھتے ہی اس کی آنکھیں چلنے لگی تھیں۔

”میرا خیال تھا آج تم نہیں آؤ گے۔“ وہ اس کے قریب پہنچتے ہی کہنے لگی۔

”کیوں؟“ وہ مسکرایا۔

”ایلا جو نہیں آئی۔“

”میں قیوت لڑکی۔ ایلا کا تو صرف بہانہ ہوتا ہے ورنہ۔“ وہ شوق سے بولا۔

”اچھا چلو۔“ وہ اس کی شوق نظروں کی تاب نہ لا کر بولی اور اس سے پہلے ہی قدم آگے بڑھا دیے۔

”سنو۔“ وہ اس کے ساتھ قدم ملائے ہوئے بولا۔ ”میرے ساتھ چلو۔“

چل تو رہی ہوں۔“

”نہیں۔“ میرا مطلب ہے کسی ایسی جگہ جہاں کچھ دیر بیٹھ کر ہم اطمینان سے باتیں کر سکیں۔“ وہ ایک دم قدم روک کر اس کی طرف دیکھنے لگی تو وہ غوراً بولا۔

”میں سمجھتا ہوں یہ مناسب بات نہیں ہے لیکن مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“ اور کچھ ضروری باتیں تو لے بھی کرنی تھیں۔ پھر بھی وہ سوچ میں پڑ گئی۔

چلو اگر تمہارا دل آمادہ نہیں ہوتا تو نہ سہی۔“ وہ اسے سوچ میں دیکھ کر مصالحتہ انداز میں بولا۔

”نہیں نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔“ اس نے کہا اور پھر وہ مخصوص ماحول کی پروردہ لڑکی دل میں کچھ دیر کچھ خوف لیے کچھ جھجکتی ہوئی اس کے ساتھ چل پڑی۔

”آج پھر وہ عورتیں آئی تھیں۔ اپنا صوفیہ کے لیے۔“

”کیا کبہ رہی تھیں؟“ ابامیاں کے لہجے میں بے صبری تھی۔

”کہہ رہی تھیں ہمیں لڑکی پسند ہے۔ اب آپ لڑکے کو دیکھ کر بات پکڑ لیں۔“

”چلو۔ اللہ کا شکر ہے۔ اب تم۔“

”لیکن اکرام علی۔“ ابامیاں کی بات پوری ہونے سے پہلے اماں بول اٹھیں۔ ”ہمیں لڑکا دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”تو کیا بغیر دیکھے ہی؟“

”نہیں۔ بلکہ میں یہاں صوفیہ کی شادی نہیں کروں گی؟“

”کیوں؟“

”لڑکا کسی پرائیویٹ کمپنی میں اسٹوڈ کیئر ہے۔ نہ ذاتی گھر اور نہ ہی آمدنی کا کوئی اور ذریعہ ہے جو کے افراد بھی ماشاء اللہ اچھے خاصے ہیں۔ ایسے حالات میں تو میری بیٹی۔“

”نیک بخت۔“ ابامیاں نے ٹوک دیا۔ اللہ پر بھروسہ رکھو، حالات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔ یہ ہے تمہاری بیٹی بھاگوانی ہو جو اس گھر میں جاتے ہی۔“

”نہیں اکرام علی۔ بیٹیوں کے نصیب کھول کر نہیں دیکھے ہم نے اور اگر مجھے اپنی بیٹی کے بھاگوان ہوں۔“

”کچھ یقین ہو، تب بھی میں یہ ریسک نہیں لے سکتی اور جہاں تک اللہ پر بھروسہ کرنے کی بات ہے تو پھر بھروسہ ہے جب ہی تو میں نے امید کا دامن تھام رکھا ہے کہ جس طرح بڑی کی شادی اچھے گھر میں اسی طرح باقیوں کی بھی ہو جائے گی۔ لیکن اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں اس بھروسے پر آنکھیں بند کر کے کنویر چھانگ لگا دوں کہ اللہ جیلے گا تو یہ مجھے نہیں ہوگا کیونکہ یہ بھروسہ نہیں حماقت ہے۔ اللہ کہے گا،“

”تمہیں قتل نہیں دی تھی۔“

”تم غلط نہیں کہہ رہی لیکن صوفیہ کے پیر کا نقص نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اگر کوئی اس کے دامن پھیلارہا ہے تو انکا رمت کرو۔“ ابامی زور دے کر بولے کہ شاید اماں نرم ہو جائیں۔

”کیسی باتیں کر رہے ہو اکرام علی؟“ ایک معمولی سا نقص ہی تو ہے، کون سا خدا خواستہ میری بیٹی لولی لنگا کر دے تو قیوت کے بعد کہنے لگیں۔

”اس میں اگر عیب ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو ایراء غیر اس کا ہاتھ مانگے میں اسے ہی تو میں اس کے لیے بھی اسی طرح سوچتی اور چاہتی ہوں جو بڑی کے لیے چاہا۔ اور ذرا ایمانداری سے بتاؤ کہ بڑی کو اسودہ حال دیکھ کر کیا تمہیں خوشی نہیں ہوتی؟“

”کیوں نہیں، اسے دیکھ کر تو آنکھوں میں اور سینے میں ٹھنڈک آتا رہے۔“

”بس تو باتیں کی طرف سے بھی میں اپنی آنکھیں ٹھنڈی رکھنا چاہتی ہوں۔“ اماں کے فیصلہ کن انداز ابامیاں خاموش ہو رہے۔

”میں کبھی ہی بوا کو بلوا کر انہیں منہ کروا بھیجوں گی اور ہاں سے بھی صاف صاف کہہ دوں گی کہ رشتے لانے تو اچھے گھروں کے لائے ورنہ اپنے گھر بیٹھی رہے۔ ایسے گھر میں بیٹی بیل پنے سے بہتر ہے میں بیٹی کو اپنے بھٹائے رکھوں، آگے کی سو پریشانیوں سے یہ ایک پریشانی قیمت ہے۔ پھر اٹھتے ہوئے بولیں۔“ ایسی کو نہیں نکلی جا رہی ہیں لڑکیوں کی، اللہ کوئی نہ کوئی سبب پیدا کر ہی دے گا۔“

”ہاں۔“ اللہ بڑا کار ساز ہے۔ ابامیاں دوبارہ لہٹتے ہوئے بولے تو اماں اپنی چارپائی کی طرف چلی گئی۔

”نے اماں کو اپنی چارپائی پر بیٹھتے اور پھر لیٹتے محسوس کیا۔ پھر طویل سانس لیتے ہوئے کلوں کے درکھول دے۔“

”کھلے آسمان پر ستارے اسی جگہ جگمگا رہے تھے اور عین نظروں کے سامنے وہی ستاروں کا بھرپور اس میں سے جھانکتا وہی مانوس چہرہ لیکن اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگا۔ اسے چھوٹی آپا کے چہرے پر پڑے“

”توس وقرن کے رنگ یاد کرنے لگے اور اس نے سوچا۔“

قرب ہی ایک پارک تھا۔ اور اس وقت وہاں زیادہ لوگ بھی نہیں تھے۔ وہ اسے لے کر اسی میں داخل ہو گیا۔ اور کمرے رکھی بیچ پر بیٹھ کر دیر تک دونوں ہی اپنی اپنی جگہ خاموش رہے تھے۔  
 "تمہیں کوئی ضروری بات کہنی تھی؟" آخر اس نے خود ہی پہل کی کیونکہ وہ زیادہ دیر تک یہاں رگنا نہیں چاہتی تھی۔ چاہتی تھی جلد وہ اپنی اپنی بات کہہ کر وہاں سے اٹھ جائیں۔  
 "ہاں۔" وہ اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے یہاں جاب تلاش کرنے کا سلسلہ ترک کر دیا ہے۔"

"کیوں؟"  
 "اس لیے کہ اب میں باہر جانے کی سوچ رہا ہوں بلکہ آج سے میں نے کوشش بھی شروع کر دی ہے۔"  
 "تو کیا تم چلے جاؤ گے؟" اس کے سادگی سے پوچھنے پر وہ ہنس پڑا۔  
 "میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں ربیعہ۔" وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔  
 "دیکھنا، اگر میں یہاں رہا تو اپنی ذمہ داریوں سے نکلنے کے لیے مجھے ایک طویل مدت درکار ہوگی۔ اور اتنی طویل مدت تم میرا انتظار کرنے کا اقرار کر بھی تو تو میرا خیال ہے تمہارے والدین بھی تمہارے اقرار کا بھرم رہتے نہیں دیں گے۔ اس کے خاموشی سے سر جھکانے پر کہنے لگا۔

"اسی لیے میں نے باہر جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ سال یا زیادہ سے زیادہ دو سال لگیں گے۔ میں بہنوں کی دوا سے فارغ ہو جاؤں گا اور دو سال کا عرصہ بہت زیادہ نہیں ہوتا۔ اتنی مدت تو تم میرا انتظار کر سکتی ہو ناں؟"  
 "میں تو ایک عرصہ انتظار کر سکتی ہوں،" وہ اسی طرح سر جھکاٹے ہوئے بولی۔

"لیکن ابھی تم نے خود کہا تھاں۔ کہ میرے والدین انتظار نہیں کریں گے۔ اور یہ حقیقت ہے ثاقب حسن کہ اماں جھوٹی آپا کی شادی کرتے ہی میری فکر میں لگ جائیں گی۔ اور تمہارے گھر کا ماحول میں بولنے کی اجازت نہیں دیتا۔ آبا میاں نے تمام اختیارات اماں کو سونپ رکھے ہیں اور اماں جو مناسب سمجھتی ہیں، کرتی ہیں۔ بڑی آپا کی شادی ہوئی، اماں نے اشارے کئے میں بھی ان کی مرضی معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اسی طرح جھوٹی آپا کے ساتھ کر رہی ہیں۔ اور میں ان سے الگ تو نہیں ہوں۔ یقیناً میرے ہاں سے میں بھی وہ خود ہی فیصلہ کر لیتی گی۔"  
 "اس کا مطلب ہے اس سے پہلے کہ کوئی اور تمہارا اہلکار بن کر سلسلے آجائے، میں ابھی اپنا اماں کو تمہارے گھر بھیج دوں۔"

"نہیں۔" وہ فوراً بولی پڑی۔  
 "کیوں؟" وہ متعجب ہوا۔ اور وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔ کیسے اس سے کہے اور تپا نہیں اپنی بات سمجھا بھی سکے گی یا نہیں۔

"بتاؤ ناں ربیعہ، کیا بات ہے؟" وہ اسے سوچتے دیکھ کر پوچھنے لگا۔  
 "منو ثاقب حسن، کوئی غلط رائے قائم مت کرنا۔ اصل میں اماں اپنی بیٹیوں کی شادیاں ان گھروں میں کرنا چاہتی ہیں جو خوشحال ہوں اور جن میں بہت زیادہ مسائل نہ ہوں۔ ابھی کل ہی اماں نے جھوٹی آپا کے لیے آیا ہوا پرول محض اس لیے ریجیکٹ کر دیا ہے کہ روڈ کا اسٹور کیئر تھا۔ اور اس کے کاندھوں پر گھر پر ذمہ داریوں کا بار بھی تھا۔"  
 "تم کیا کہنا چاہتی ہو؟" وہ شش و پنج کی سی کیفیت میں بولا۔

"میری کہ ایسے حالات میں جب کہ ابھی تم اپنے پیروں پر بھی کھڑے نہیں ہوئے، اپنے گھر والوں کو بھیج دو گے تو اماں نہیں مانیں گی۔ اور ایک بار اگر انکار ہو گیا تو دوبارہ گنجائش نہیں رہے گی۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟"  
 وہ ذرا سا مروچا کر کے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔"  
 "ہاں کی صورت اس کے سینے میں دبی سانس ہونٹوں کی قیدت آزاد ہوئی پھر فوراً ہی وہ ہونٹ بھیج گیا تھا۔



**ثاقب حسن** کی آنکھوں میں سوچ کی پرچمائیاں اُتر آئی تھیں اور پیشانی پر پکیروں کا ہلکا جال بنتا چلا جا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔

"میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ کوئی غلط رائے مت قائم کرنا۔ اصل میں اماں صرف ماں بن کر سوچتی ہیں اور شاید اپنی پوری زندگی کو نظر رکھتے ہوئے ہی انہوں نے بیٹیوں کے لیے اس انداز سے سوچا شروع کیا ہے۔ شاید تم یقین نہ کرو۔ وہ تو یہاں تک کہتی ہیں کہ اگر کسی بیٹی کو خوشحال گھر نہ ملا تو وہ اسے ساری زندگی اپنے پاس بٹھائے رکھیں گی۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

"اماں ہی کیا، میں سمجھتی ہوں ہر ماں اپنی بیٹیوں کے لیے ایسی خواہش رکھتی ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ زیادہ تر ماں، بیٹیوں کی بڑھتی ہوئی عمر سے گھبرا کر اپنی خواہش کا گلا گھونٹ دیتی ہیں اور جیسا بھی بڑھنے لگے اسے بیٹی کا نصیب سمجھ کر قبول کر لیتی ہیں لیکن اماں ذرا مختلف ہیں، میرا خیال ہے، وہ کبھی بھی اپنی خواہش کا گلا نہیں گھونٹیں گی۔"

"اس کی ساری بات سن کر بھی وہ خاموش بیٹھا رہا تو وہ اُلجھ گئی۔  
 "تم کچھ کہو گے نہیں؟" وہ اس کی مضبوط کلائی پر اپنا ہاتھ رکھ کر ہلاتے ہوئے بولی تو وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکے سے مسکرایا پھر اس کا ہاتھ تھام لیا۔  
 "کیا کہوں؟"

"میری اتنی ساری باتوں کے جواب میں کچھ بھی۔"  
 "ربیعہ۔" وہ اس کے ہاتھ پر دیاؤ ڈال کر بولا۔ "تم میری محبت ہو۔ زندگی کی طویل شاہراہ پر میں تمہارے بنا چلنے کا قصور بھی نہیں کر سکتا۔ تم نے اچھا کیا جو اپنی اماں کے خیالات سے مجھے آگاہ کر دیا۔ اب میں اپنے کوششیں مزید تیز کر دوں گا۔ اور انشاء اللہ بہت جلد کسی مقام تک پہنچ کر ان کے سامنے آؤں گا۔ تم میرا انتظار کرو گی ناں؟"  
 "آس نے خاموشی سے سر جھکا لیا تو کہنے لگا۔

"بہر حال تم اپنے دل کو اندیشوں کی آماجگاہ مت بناؤ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی تو تمہاری جھوٹی آپا کی شادی ہوئی ہے۔ امید ہے اس وقت تک میں کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔ بس تم میری طرف سے دل میں کوئی بات مت لانا۔ میں تمہارا ہوں اور تمہارا ہوں گا۔ اور تم بھی ربیعہ، اپنے آپ کو میری امانت سمجھو۔ تمہیں پانے کے لیے اگر مجھے جان سے بھی گزرنی پڑا تو گزر جاؤں گا۔"

"پلیز۔" اس کی آنکھیں جھلکانے لگیں۔ "ایسی باتیں مت کرو۔"  
 "دیکھو روئے کی کوشش مت کرنا۔ جن آنکھوں میں محبتوں کے دیپ چلتے ہوں، ان میں پانی نہیں راتنا چاہیے ورنہ۔" وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی پلکیں جھپک جھپک کر سارا پانی اپنے اندر اتار گئی۔

"گد۔" محبتوں کے دیپ کبھی بجھنے مت دینا۔" وہ ہلکے سے مسکراتی پھر اٹھتے ہوئے بولی۔  
 "اب چلو۔ کافی دیر ہو چکی ہے۔"  
 "چلو۔" وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ پھر اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ "سنو۔ اب میں روزانہ تم سے ملنے نہیں آسکوں گا۔"

"کیوں؟" وہ گھبرا کر بولی۔  
 "میں وقت بڑی جھجک دوڑ کروں گا تو کام بنے گا ناں، البتہ جس دن فارغ ہوں گا، آ جاؤں گا۔ تم میری کامیابی کے لیے دعا کرنا۔" اس نے سر ہلایا۔ اور اپنے روٹ کی بس دیکھ کر جلدی سے اسے خدا حافظ کہتی ہوئی بس میں سوار ہوئی۔

گھر میں داخل ہوئی تو غیر معمولی خاموشی کا احساس ہوا۔ تپتے آگن اور برآمدے میں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ اس نے آگن تیز قدموں سے پار کیا پھر برآمدے میں ترک کر اس غیر معمولی خاموشی کا سبب جاننے کی کوشش



کرنے لگی۔

فطری طور پر پہلے اپنے بارے میں خیال آیا کہ کہیں وہ معمول سے بہت زیادہ لیٹ تو نہیں ہو گئی یا پھر کسی نے اسے ثاقب حسن کے ساتھ دیکھ تو نہیں لیا۔ اس خیال کے ساتھ ہی دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور چہرہ جو پہلے ہی دھوپ کی شدت سے تپ رہا تھا۔ اب اس میں سے گرم گرم جھپٹ نکلتی محسوس ہونے لگی۔ اس نے تھیلیوں سے چہرہ تھپتھپایا اور بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی کمرے کے دروازے تک آئی۔ دھوپ بیچ آنے کی وجہ سے پہلی نظر میں اسے کمرے کے اندر صاف نظر نہیں آیا اب تھنڈل کا احساس ضرور ہوا، جو وہ فوراً کمرے کے اندر داخل ہو گئی۔ کندھے سے بیگ اتار کر یہ بھی چارپائی پر ڈال دیا اور پھر چادر اتارتے ہوئے خود بھی بیٹھ گئی۔

”آج بہت دیر کر دی؟“ اماں نے یونہی پوچھ لیا تھا لیکن اس کے دل میں چور تھا، اس لیے گڑ بڑا گئی۔

”بشکل لہجے پر قاپا پاتے ہوئے بولی۔“  
”ہاں۔ کچھ ٹونس بنانے تھے۔ اس کے لیے لائبریری میں بیٹھ گئی۔ پھر بس بھی دیر سے ملی۔“  
”اچھا۔ منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھا لو۔“ اماں نے مطمئن سی ہو کر کہا۔

”آپ لوگوں نے کھالیا؟“  
”ہم نے تو کھالیا لیکن تمہاری چھوٹی آپا نے نہیں کھالیا۔“  
”کہاں ہیں چھوٹی آپا؟“ وہ ادھر ادھر دیکھتی ہوئی پوچھنے لگی۔  
”اسٹور میں بند ہے۔“ اماں نے کہا تو وہ ایک دم چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔  
”خیریت اماں؟“ چھوٹی آپا اسٹور میں کیوں بند ہیں؟“

”دماغ خراب ہے اس کا۔ سمجھتی ہے میں اس کی دشمن ہوں۔“ پھر فوراً اس موضوع سے ہٹتے ہوئے بولیں۔ ”چلو جاؤ تم جا کر کھاؤ۔ اس سے بھی پوچھ لینا، کھائے تو ٹھیک ورنہ اس کے حال پر چھوڑ دو۔“  
وہ پوچھنا چاہتی تھی چھوٹی آپا کا موڈ کس بات پر خراب ہوا ہے اور یہ کہ وہ اماں کو اپنا دشمن کیوں سمجھ رہی ہیں لیکن اماں نے جس طرح اس بات کو رد میں ختم کر دیا تھا، اس سے وہ سمجھ گئی کہ اس سلسلے میں کچھ پوچھنا اماں کو سخت ناگوار گزرتے گا۔ اس لیے خاموشی سے اپنے شوہر اتارنے لگی پھر بیروں میں چل ڈال کر کمرے سے نکل آئی۔ منہ ہاتھ دھو کر کھانا نکالنے سے پہلے اس نے اسٹور کا دروازہ کھٹکھٹایا دوسری طرف بالکل خاموشی رہی۔ بار بار کھٹکھٹانے کے بعد وہ پکارنے لگی۔

”چھوٹی آپا۔ دروازہ کھولیں۔“  
”کیوں؟“ چھوٹی آپا کا ضدی لہجہ کاٹ دار تھا۔  
”کھولیں ناں۔“ اس نے منت کی۔

”نہیں کھولتی، دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ وہ چھوٹی آپا کے غصے کو جانتی تھی پھر بھی وہاں سے نہیں ہٹی۔  
”ٹھیک ہے، مت کھولیں۔ میں بھی یہیں بیٹھ جاتی ہوں۔“ وہ وہیں دروازے کے سامنے بیٹھ گئی۔  
اور قدرے اونچی آواز میں بڑبڑاتے لگتی تاکہ وہ بھی سن لیں۔

”ایک تو پہلے ہی اتنی دھوپ میں سے آرہی ہوں۔ آؤ پر سے یہاں گرمی میں مگر نا پڑ رہا ہے۔ بھوک بھی اتنی لگ رہی ہے، لیکن میں کھانا نہیں کھاؤں گی جب تک چھوٹی آپا نہیں کھائیں گی۔“ اسٹور کے اندر پہنچا ہٹ سی محسوس ہونے لگی تو اس نے فوراً گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔ پھر دروازہ کھٹکے کی آواز آئی ساتھ ہی چھوٹی آپا کی جھنجھلاہٹ۔

”تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟“ اس نے جواب نہیں دیا۔  
”اتھو یہاں سے اندر جاؤ۔“  
”میں نہیں جاؤں گی۔ وہ منہ مچلا کر بولی۔  
”کیوں؟“

”اماں کا موڈ ٹھیک نہیں ہے شاید۔“ خواہ مخواہ ڈانٹ رہی ہیں۔“

”تمہیں کس بات پر ڈانٹا ہے؟“ وہ انجان بن کر سادگی سے پوچھنے لگی۔  
”نہیں خیر۔ مجھے تو انہوں نے کچھ نہیں کہا۔“ چھوٹی آپا نظریں پجراتی ہوئی بولیں۔  
”پھر آپ اسٹور میں کیوں بند تھیں؟“ وہ جان کر پوچھنے لگی۔

”ایسے ہی۔ اچھا تم اٹھو، جا کر کھانا کھاؤ۔“  
”اکیلے مجھ سے نہیں کھا یا جاتا۔ ذرا سی دیر کیا ہوئی کسی نے انتظار ہی نہیں کیا؟“  
”میں نے نہیں کھا یا ابھی تک۔“ چھوٹی آپا نے کہا تو وہ خوشی کا اظہار کرتی ہوئی بولی۔  
”ہج۔ آپ میرا انتظار کر رہی تھیں؟“

”ہاں۔“ چھوٹی آپا کا شگفتہ لہجہ اس کے دل میں ترازو ہو گیا۔ اٹھتے ہوئے بولی۔  
”آپ اندر چلیں، میں کھانے کے کراتی ہوں۔“ اس کے ساتھ ہی وہ کچن کی طرف چلی گئی۔ کھانے کے کمرے میں آئی تو چھوٹی آپا وہاں موجود نہیں تھیں۔ اماں نے جھوٹے کمرے کی طرف اشارہ کیا تو وہ خاموشی سے ادھر چلی گئی۔ چھوٹی آپا دیری پر چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ اس نے ٹرے ان کے سامنے رکھی اور خود بھی بیٹھ گئی۔

”یہ دال روٹی ٹرے میں سجا کر لانے کی کیا ضرورت تھی، ایسے ہی اٹھا لائیں۔“ چھوٹی آپا نے کہا تو اسے بے ساختہ ہنسی آئی۔ جسے ہونٹوں کے اندر روکتی ہوئی بولی۔  
”ایسے کیسے اٹھا لاتی؟“

”روٹی کے اوپر دال رکھتیں اور لا کر میرے ہاتھ میں تھما دیتیں۔“  
”چھوٹی آپا کیسی بات کر رہی ہیں؟“ وہ افسوس سے بولی۔  
”غلط تو نہیں کہہ رہی۔ جو حالات، ہمارے ہیں کہ سفید پوشی کا بھرم بھی نہیں رکھا جاتا تو ایسے حالات کا شکار لوگ تو اسی طرح کھاتے ہیں۔“

”میں مانتی ہوں ہمارے حالات بہت اچھے نہیں ہیں لیکن۔“  
”لیکن کو چھوڑو ریجر۔“ چھوٹی آپا اس کی بات کاٹ کر فوراً بول پڑیں۔ ”جب شکستہ حالات کو تسلیم کر رہی ہو تو لیکن کہہ کر حقائق سے نظریں پچرانے کی کوشش مت کرو اماں کی طرح۔“  
”اماں کی طرح۔؟“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”ہاں۔“ چھوٹی آپا کے لہجے میں طنز اور تنبی ایک ساتھ سمٹ آئی۔  
”اس صدیوں پرانے چھوٹے سے کھنڈر نما گھر میں اماں کی ساری زندگی چٹنی پیستے اور دال گھوٹے گزرتی۔ اس کے باوجود انہوں نے اس حقیقت کو کبھی تسلیم نہیں کیا کہ ہم متوسط طبقے کے بہت عام سے لوگ ہیں۔ اس لیے تو ہمارے لیے ملوں کے خواب دیکھتی ہیں۔ انہیں بتاؤ ریجر کہ دال روٹی یا چٹنی ٹرے میں سجا کر کھانے سے ہم بڑے آدمی نہیں کہلائیں گے۔ ہماری حیثیت بڑھ نہیں جائے گی۔“

”چھوٹی آپا ٹرے میں رکھ کر کھانا حیثیت کو ظاہر نہیں کرتا۔ کھانے کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔ اس سے پڑھے لکھے اور اُن پڑھ کی تیز ہوتی ہے۔ اگر ہم تھیلی پر روٹی رکھ کر کھانا شروع کر دیں تو کوئی کہے گا کہ ہم نے اسکوئی کا کچ کا منہ بھی دیکھا ہے اور جہاں تک حالات کی بات ہے تو میں سمجھتی ہوں اتنے بڑے بھی نہیں ہیں، اللہ کا شکر ہے ہم بہت سوں سے اچھے ہیں۔“

”ہونہر۔ اچھے۔“ چھوٹی آپا خاموش متفکر نظر آرہی تھیں۔  
”کیوں؟ کیا کبھی آپ نے اماں کو کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتے دیکھا ہے؟ کبھی تعلیم رک ہماری؟ جب اور جس وقت فیس یا کتابوں کے لیے ہمیں پیسوں کی ضرورت پڑی، اماں نے بغیر سوال جواب کیے ہماری تھیلی پر رکھ دیے اور بڑی آپا کی شادی پر بھی کسی سے لینے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ سب کچھ اماں اور اتانے

ہی کیا ناں؟ پھر آپ کیوں اپنے آپ کو اتنا کم تر سمجھ رہی ہیں اور چھوٹی آپا سفید پوشی کا مجرم تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔ اماں نے اگر ایسا کیا تو کیا بڑا کیا اور آپ کیا سمجھتی ہیں کہ یہ مجرم رکھنا بہت آسان ہے نہ نہیں بلکہ تن من سب مارنا پڑتا ہے۔

قدر سے توقف کے بعد کہنے لگی۔ آپ نے تو یہ کہہ کر مذاق اڑا لیا کہ اماں کی ساری زندگی چٹنی پیستے یا وال گھومتے گزر گئی۔ لیکن ذرا اماں سے تو پوچھیں کہ یہ کام کرتے ہوئے انہیں کن مراحل سے گزرنا پڑا۔

”کیوں چٹنی پیستنا بہت مشکل کام ہے کیا؟“ وہ افسردگی سے مسکرائی۔

”نہیں چٹنی پیستنا مشکل نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ جو بندے کی خواہشات پستی ہیں، وہ یقیناً تکلیف کا باعث ہیں اور اماں کیونکہ بار بار یہ تکلیف سہہ چکی ہیں اس لیے وہ نہیں چاہتیں کہ ہم اس تکلیف کو محسوس بھی کریں یہ وہ بہت خوبصورتی سے اصل موضوع کی طرف اٹھتی۔

”آپ یہ خیال دل سے نکال دیں کہ اماں میری با آپ کی دشمن ہیں۔ یہ تو ان کی محبت ہے کہ وہ ہمیں ان حالات سے نکالنا چاہتی ہیں۔ وہ نہیں چاہتیں کہ جو تکلیفیں انہوں نے اٹھائیں، وہ ہم بھی اٹھائیں اور ایسا تو ہم ماں سوچتی ہے۔ آپ ان کی محبت پر شبہ مت کریں چھوٹی آپا۔ ماں کی محبت بے لوث و بے غرض ہوتی ہے۔ ذرا سوچیں تو ہمارے لیے بہتر اور خوشحال زندگی کی خواہش میں ان کی کیا غرض ہو سکتی ہے۔ صرف اتنی کہ وہ ہمیں خوش اور مطمئن دیکھ کر خود بھی مطمئن ہونا چاہتی ہیں ورنہ ان کے ہاتھ کیا اٹے گا؟ بڑے گھر کی خواہش ہے تو ہمارے لیے، اچھا پہننے اور اچھا کھانے کی آرزو بھی ہمارے لیے ہے۔ وہ یہ سب کچھ اپنے لیے تو نہیں چاہ رہی۔“

پھر وہ اماں کی بات جو وہ آتا مایاں سے پوچھ رہی تھیں وہ چھوٹی آپا سے پوچھنے لگی۔

”ایمانداری سے بتائیں، بڑی آپا کو دیکھ کر آپ کو خوشی نہیں ہوتی؟ کس طرح بھٹاٹ سے رہتی ہیں اور کس شان سے آتی ہیں۔ ان کے چہرے پر شرمیلی یوں چمکتی ہے کہ پھوٹتے ہوئے ڈرگتا ہے کہ کہیں خون باہر نہ چھلکنے لگے۔ ہونٹ ہیں کہ ہر دم مسکراتے پر آمادہ۔ یہ ساری خوشیاں یہ صحت کی دولت انہیں آسودہ اور خوشحال گھر سے ہی دی ہے ناں؟ انہیں چادر چھوٹی ہونے کی پریشانی نہیں ہے نہ سڑھٹا نہیں گئی تو یہ کچھ عجیبی گے اور پیر دھانپنے سے سزاوارتاں ہیں بھی ان ہی کی طرح دیکھنا چاہتی ہیں؟“

”میں تمہاری باتوں کو جھٹلاؤں گی نہیں ربیعہ لیکن میرے لیے اس انداز سے سوچنا اور ایسی خواہش رکھنا سراسر حماقت ہے۔“ چھوٹی آپا آخری نوالہ منہ میں ڈال کر دوماں سے ہاتھ صاف کرتی ہوئی بولیں۔

”کیوں؟“

”اس لیے کہ میں تم لوگوں کی طرح مکمل نہیں ہوں۔ میرے پیر میں نقص ہے۔ میں چلتے ہوئے لنگڑاتی ہوں اور اس دور میں بڑے گھروں میں رہنے والا کوئی ایسا جی دار پیدا نہیں ہوا جو مجھے جیسی لنگڑی کو خوشی سے بیاہ لے جائے۔“

”چھوٹی آپا۔“ وہ چھوٹی آپا کا درد اپنے دل میں محسوس کرتے ہوئے بولی۔ آپ لنگڑی نہیں ہیں۔ اپنے پیروں پر چلتی ہیں۔ بس ذرا سا۔“

”مجھے بلاؤ دوست ربیعہ، میں اچھی طرح جانتی ہوں، کہنے والے مجھے لنگڑی کہتے ہیں۔“

”کہنے والے اندھے ہیں۔“ ربیعہ تیزی سے بولی۔

”بہر حال تم اماں کو سمجھاؤ میرے لیے اونچے خواب نہ دیکھیں۔ آج بوا کو بلا کر انہوں نے پرویز کے گھر والوں کو انکار کھلوا کر سخت غلطی کی ہے۔“

گوکہ وہ خود بھی سوچ رہی تھی کہ اماں کو بنا سوچے اتنی جلدی انکار نہیں کھلوانا چاہیے تھا پھر بھی چھوٹی آپا کے سامنے اماں کی طرف لڑکی کرنے لگی تھی تاکہ اماں کی طرف سے ان کا دل صاف ہو جائے۔

”اماں نے جو کیا اچھا کیا۔ ان کی نظر میں ہم سب ایک جیسی ہیں اور وہ سب کے لیے ایک طرح سے ہی سوچیں گی۔ سمجھیں آپ۔“ وہ ٹرے اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ ”میں برتن رکھ کر آ رہی ہوں، پھر دونوں یہیں سوئیں

گے۔“ چھوٹی آپا خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔

شام میں بڑی آپا اور دولہا بھائی آگئے تو گھر کی خاموش فضا میں خوشگوار سی جھلک بچ گئی۔ بڑی آپا نے بہت زیادہ آنا جانا نہیں رکھا تھا۔ اسی شہر میں رہتے ہوئے بیٹے ہیں ایک آدھ بار آجائیں، وہ بھی کچھ دیر کے لیے۔ بہنیں شکایت کرتیں اور خفا ہوتیں کہ اگر رہنا نہیں ہے تو کم از کم صبح سے تو آیا کریں۔ دن بھر ہمارے ساتھ رہیں۔ اور اماں نے کتنے پر اصرار کر کے وہ جاتیں لیکن بڑی آپا مسکراتے ہوئے سہولت سے سمجھاتیں اتنی (آن کی ساس) اکیلی ہوتی ہیں۔ میں اگر یہاں رک گئی تو انہیں کام کاج میں خاصی پریشانی ہوگی۔ آخر آپ کے جانے سے پہلے بھی تو وہ اکیلی ہوتی تھیں۔ کتنی کم کو بہت شوق تھا کسی دن بڑی آپا رات میں رکیں۔ اس لیے وہ انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتی۔

”اس وقت وہ مجبور تھیں اور اب جبکہ وہ میری عادی ہو چکی ہیں تو مجھے اس طرح انہیں چھوڑ کر یہاں نہیں بیٹھے رہنا چاہیے۔“

چھوٹی آپا کا خیال تھا بڑی آپا ان کے سامنے محض عذر تراشتی ہیں۔

”مجھے تو گھٹنا ہے دولہا بھائی یا ان کی ساس نے انہیں یہاں رہنے اور زیادہ آنے جانے پر پابندی لگا رکھی ہے۔“

لیکن چھوٹی آپا کا خیال صحیح نہیں تھا۔ ان کی سسرال کی طرف سے ان پر کوئی پابندی نہیں تھی اصل میں بڑی آپا اپنے سیکے کا مجرم رکھنا چاہتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں اگر ایک دن بھی یہاں رک گئیں تو اماں کو صرف ایک وقت کے کھانے کے لیے کتنا اہتمام کرنا پڑے گا اور اس سے گھر کے بجٹ پر جو اثر پڑے گا، اس کا احساس بڑی آپا کو اچھی طرح تھا۔ اس لیے وہ سب کی غفلتیں مسکرا کر سہہ جاتی تھیں۔ اور دوبارہ جلد آنے کا وعدہ کرتی لیکن کبھی ان کا وعدہ اٹھانہیں ہوا تھا۔

ان دنوں بڑی آپا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ نئے مہمان کی آمد تھی اور اس وقت وہ عاصم کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جا رہی تھیں۔ اماں سے انہیں بلکہ عاصم بیگ کو بھی کوئی بات کرنی تھی، اس لیے کچھ دیر کے لیے ادھر رک گئے تھے۔

”اماں۔ سہیل، عاصم کے بہت اچھے دوستوں میں سے ہیں۔“ جس وقت وہ چائے لے کر آئی، بڑی آپا اماں سے کہہ رہی تھیں۔ ”میں کوئی بار عاصم کے ساتھ ان کے گھر جا چکی ہوں۔ ماشاء اللہ گھر اب بھی اچھا ہے۔ سہیل کی والدہ نے مجھ سے کہا تھا کہ کوئی لڑکی میری نظر میں ہوتو۔ اور عاصم کا کہنا ہے کہ صوفیہ مناسب رہ گئی۔“

اماں نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ ٹرے میں رکھی سموسوں کی پلیٹ اٹھا کر عاصم بھائی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔

”لو بیٹا۔ یہ کھاؤ۔“ عاصم بھائی نے پلیٹ ان کے ہاتھ سے لے کر بڑی آپا کی طرف بڑھادی۔

”اماں۔ ہم اس وقت اس سلسلے میں آپ کے پاس آئے ہیں۔ بڑی آپا کہنے لگیں۔ ”ہم ڈاکٹر کے پاس سے ہو کر سیدھا سہیل کے ہاں جاؤں گے۔ میں اس کی والدہ کو یہاں کا پتا بتا دوں گی اور ہو سکتا ہے کہ کسی وقت وہ آجائیں۔“

”کیا کرتا ہے سہیل؟“ اماں نے نظارہ سرسری انداز سے پوچھا۔

”اس کا پتا زس ہے گارمنٹ کا۔ اور ابھی حال ہی میں اس نے ایک چھوٹی سی فیکٹری بھی لگائی ہے۔“

عاصم بھائی سہیل کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگے۔ بہت مختصر لڑکا ہے۔ امید ہے آگے بہت ترقی کرے گا۔ گھر میں ماں باپ کے علاوہ وہ نہیں ہیں۔ بہنیں منگنی شدہ ہیں اور ویسے بھی بہنوں کی ذمہ داری اس پر نہیں ہے۔ اس کے والد خود زس میں ہیں۔“

اور اماں کو کیا چاہیے تھا، اندر ہی اندر بے حراطمینان محسوس کیا لیکن بیٹی داماد پر یوں ظاہر کیا جیسے سوچ میں پڑ گئی ہوں۔

”اچھا تو اب ہم چلتے ہیں۔ ابھی ڈاکٹر کے پاس بھی جانا ہے۔“ ماحم بھائی اٹھتے ہوئے بولے ”آپ کو اس لیے بتا دیا کہ آپ ان کی آمد سے بے خبر نہ رہیں۔“

”اچھا کیا بیٹا جو چلے آئے۔ میں تمہارے آباؤاُمیوں سے بھی ذکر کروں گی۔“ پھر وہ سب بہنیں انہیں چھوڑنے باہر نکل آئیں۔ اس کے بعد معمول کے کاموں میں لگ گئیں۔

اگلے دن سہیل کی والدہ اور ساتھ میں ان کی بہنیں بھی آئیں۔ اس وقت چھوٹی آیا بڑے کمرے میں بیٹھی تھیں اور اتفاق سے وہ تینوں بھی سیدھی وہیں چلی آئیں اور اب جبکہ وہ اس کمرے میں داخل ہو رہی تھیں تو اتناں کو انہیں وہیں بٹھانا پڑا۔

”یہ صوفیہ ہے۔“ سہیل کی والدہ بیٹھے ہی چھوٹی آیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھنے لگیں۔ اتناں نے اثبات میں سر ہلایا پھر چھوٹی آیا کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔

اور ساری گڑبڑ یہیں ہو جاتی تھی۔ جب چھوٹی آیا قدرے ٹھنڈا کر چلتی ہوئی سلٹنے سے گزر جاتیں اور دیکھنے والے جوان کی صورت دیکھ کر یقیناً یہ سوچتے کہ یہی ہے وہ گوہر نایاب جس کی ہمیں تلاش تھی۔ وہ ایک دم مایوس ہو جاتے تھے۔ سہیل کی والدہ اور بہنوں کی بھی یہی کیفیت ہوتی۔ پہلے ان کے چہرے چمکنے لگتے تھے پھر ایک دم بجھ گئے اور وہ رشتے کی بات کرنے کے بجائے اتناں سے چھوٹی آیا کے ساتھ ہونے والے حادثے کی تفصیلات معلوم کر کے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوتیں۔

”کچھ دیر بیٹھیں، چائے آ کر ہی ہے۔“ اتناں نے کہا تو وہ کسی مصروفیت کا بہانہ کر کے کمرے سے نکل آئیں اور اتفاق تھا کہ اس وقت ربیعہ روپے کے پتے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی کچن سے نکلی۔ یہ چھوٹا سا آنگن جو موتیا اور دلت کی رانی کی بھیجی تھیں خوشبو سے مہکتا تھا۔ وہاں شام آ کر رہی تھی۔ اور سلونی شاموں کا شبنم چلائے وہ بڑی ربیعہ اکرام علی اچانک سلٹنے آ کر بیٹھے ہوئے چہروں پر روشنی بکھر گئی تھی۔

”یہ بڑی کون ہے؟“ سہیل کی والدہ پلٹ کر اتناں سے پوچھنے لگیں۔  
”میری بیٹی ہے تیرے نمبر کی۔“ اتناں نادان نہیں تھیں۔ جان گئیں کہ وہ اتنے اشتیاق سے ربیعہ کے بارے میں کیوں پوچھ رہی ہیں؟ لیکن انہیں یہ بھی گوارا نہ تھا کہ چھوٹی آیا کو نظر انداز کر کے ربیعہ کی بات کی جائے۔ اس لیے کچھ ناگوار سے ربیعہ کا تعارف کرایا۔

”ذرا اسے پاس بلا لیں۔“ خاتون نے اصرار کیا تو اتناں نے اسے آواز دے ڈالی اور اسے کیونکہ صورتحال کا اندازہ نہیں تھا، اس لیے تیز قدموں سے چلتی ہوئی ان کی طرف آئی۔

”ماشاء اللہ بہت پیاری بچی ہے۔“ خاتون نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا پھر اتناں سے کہنے لگیں ”مجھے خوشی ہے کہ ہمیں اس گھر سے مایوس نہیں جانا پڑا۔ ہمیں اپنے سہیل کے لیے آپ کی یہ بیٹی پسند آئی ہے۔ اور ہم کل پھر آئیں گے۔“

اسے ایک دم دھچکا سا لگا۔ حیران ہو کر اتناں کی طرف دیکھا پھر فوراً اندر کی راہ لی۔

سہیل کی والدہ اور بہنوں کا دل تو یہ چاہ رہا تھا اسی وقت دوبارہ بچے کر اتناں سے تفصیلی بات کریں لیکن کیونکہ پہلے ضروری کام کا بہانہ کر کے اٹھ چکی تھیں، اس لیے اب محض اپنی بات رکھنے کی خاطر کل فرصت سے آنے کا کہہ کر چلی گئیں۔ اتناں نے انہیں جلتے ہوئے دیکھا پھر کچھ سوچتے ہوئے ان کا سفر نفی میں ہوتا چلا گیا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو اپنی آنکھوں میں پانی کو جمع ہونے سے نہیں روک سکی تھی۔ ذہن الگ ماؤف ہو گیا تھا۔ کچھ سوچنے کی کوشش بھی کی تو کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔

بس ایک خیال ”اتناں نے اگر ہامی پھر تو کیا ہوگا؟“ اسے بڑی طرح پریشان کر رہا تھا۔ دل کو دھڑکا تو پہلے ہی لگا رہتا تھا، اب تو بے شمار دشمنوں اور اندیشوں نے جیسے حملہ کر دیا تھا۔ اتناں کے سامنے زبان کھولنے کی جرات تو وہ اپنے اندر کبھی بھی پیدا نہیں کر سکتی تھی اور پھر اتناں نے نون سا اس کی مرضی معلوم کر لی تھی۔ وہ یوں سرعام رو بھی نہیں سکتی تھی۔ جبکہ آنکھوں میں جمع پانی پھلنے کو بے تاب تھا۔

وہ بہت خاموشی سے اسٹور میں چلی آئی اور اپنا بکس کھول کر اس میں کچھ تلاش کرنے کے بہانے پورا کر

اندر دے کر سارے آنسو بہا ڈالے لیکن دل کا بوجھ پھر بھی کم نہیں ہوا۔  
”آئی کہاں چلی گئی ہیں؟“ کلثوم اسے آواز دے رہی تھی۔ اس نے جلدی سے دوپٹے سے اپنی آنکھیں اوپرا کر چہرہ صاف کیا پھر باہر نکل آئی۔ ڈرتا تھا کہیں اتناں سے سامنا نہ ہو جائے، اس لیے سیدھا کچن کا رخ کیا کلثوم وہیں موجود تھی۔ اسے دیکھتے ہی کہنے لگی۔

”کہاں تھیں آپ؟“  
”اسٹور میں۔“ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی ”تمہیں کوئی کام ہے؟“  
”نہیں۔ میں یہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ آپ جو یہ چاول صاف کر رہی تھیں، انہیں ابھی بھگونے لے یا۔“  
”تم ہٹو، میں کروں گی۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔  
”میں آپ کی مدد کر رہی ہوں۔“

کلثوم کی یہ غلطوں پر شکش کو اس نے رد کر دیا اور پھر اسے کچن سے نکال کر ہی دم لیا۔ اصل میں وہ اس وقت بالکل تنہا رہنا چاہ رہی تھی اور کمرے۔ برآمدے یا آنگن میں ایسا ممکن نہیں تھا، وہ جہاں بھی بیٹھتی، کوئی نہ کوئی ضرور اس کے پاس آ بیٹھتا۔ اس لیے کانا پکانے کے بہانے کچن میں پناہ ڈھونڈی۔ ابھی وہ کھانا میں تھی، اس لیے صرف منہ میں ہی ذہن میں گھر کر رہی تھیں۔

”اگر ایسا نہ ہوا۔ اور اگر ایسا ہو گیا تب۔“؟ بس اسی قسم کی باتیں تھیں جو دل کو دھلائے دے رہی تھیں۔ کھانا تیار ہو گیا، اس کے بعد بھی وہ کچن سے نہیں نکلی۔ وہیں بیٹھ کر پیشانی گھٹنوں پر رکھ لی تو ایک دم ہی ناقد حسن کا خیال آیا۔ ساتھ ہی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔ اس مختصر عرصے میں وہ اسے بہت عزیز ہو گیا تھا۔ اتنا کہ اس سے دوری کا خیال ہی جان پر بجائے دے رہا تھا۔

”تمہاری قسم ناقد حسن، تمہارے بنائیں جی نہیں پاؤں گی۔“ اس نے دل ہی دل میں کہا، پھر سوچنے لگی کہ کل ہی اس سے ملنے کی کوشش کرے گی۔ اور ناقد حسن کا خیال کیا آیا کہ ذہن آپ ہی آپ بیدار ہو گیا۔ دل کو ڈھارس بندھی، کچھ حوصلہ بھی ہوا اور وہ آنے والے خطرے سے غصے کا سوچنے لگی۔

”اگلے دن کالج سے لوٹی تو گھر میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کچھ دوری ہوئی سی دے پاؤں چلتی کمرے میں آئی تو چھوٹی آیا کو اتناں کے مقابل کھڑے دیکھا، وہ کہہ رہی تھیں۔  
”میرے لیے آیا ہوا پرویز کا پرویز آپ نے ریجٹ کر دیا، میں خاموش رہی اور اب سہیل کا کھانا جو آپ کی خواہش کے عین مطابق خاص خوشحال ہے، وہ اگر میرے بجائے ربیعہ کا ہاتھ مانگ رہے ہیں تو آپ نے کیوں انکار کیا؟“

”تمہاری وجہ سے؟“ چھوٹی آیا کے چلا کر بولنے کے باوجود اتناں نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔  
”کیوں؟ کیوں؟ میری وجہ سے کیوں؟“

”ربیعہ تم سے چھوٹی ہے اور جب تک تمہاری شادی نہیں ہو جاتی، میں اس کی نہیں کر سکتی۔“  
”اس طرح تو اتناں۔ میرے ساتھ ساتھ باقی لڑکیاں بھی اس دلچیز پر بیٹھیں رہیں گی؟“

”کیسی باتیں کر رہی ہو؟“ اتناں نے تنبیہ انداز اختیار کیا۔  
”میں غلط نہیں کہہ رہی۔ آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میرے اس عیب کی بدولت کوئی اچھا رشتہ میرے لیے

آئی نہیں سکتا۔ پھر آپ میری وجہ سے دوسری بیٹیوں کو نیوں بٹھائے رکھنا چاہتی ہیں۔“  
”صوفیہ۔“ اتناں نے ٹوکا۔ ”یہ تمہارے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں۔“

”ہاں۔ میرے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں لیکن آپ کی حقائق سے چشم پوشی نہ مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ آج آپ نے سہیل کے گھر والوں کو مایوس کر دیا کچھ نہیں کیا۔ میں نہ سہی، ربیعہ ہی۔ اور پھر ربیعہ پر ہی بس نہیں ہے اس کے بعد دو اور بھی موجود ہیں، آپ خود سوچیں اگر آپ مجھ میں ہی انکی رہیں تو باقیوں کا کیا ہوگا؟“

”صوفیہ۔ میں نے کبھی تم لوگوں کو ایسی باتیں کرنے کی اجازت نہیں دی۔“ اتناں سخت سے بولیں۔  
”مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے ایسی باتیں کرنے کا۔“ چھوٹی آیا کسی طرح بھی اپنی آواز پر کنٹرول نہیں کر پا

رہی تھیں۔ لیکن آپ سن لیں اماں۔ اب میرے لیے کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بار بار لوگوں کے سامنے تماشائیں بن سکتی ہوں۔

”بیٹا۔“ اماں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ چھوٹی آپا پیر پختی ہوئی ساتھ ولے کرے میں چلی گئیں۔ اور پھر دروازہ بھی بند کر لیا۔ اور وہ جو اس ساری گفتگو کے دوران اسی طرح کھڑی تھی، بہت آہستہ قدموں سے آگے بڑھی، کندھے سے بگ آئنا رکھ کر ٹیبل پر رکھا اور چارپائی پر بیٹھنے ہوئے اماں کی طرف دیکھنے لگی۔ ان کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ انہیں چھوٹی آپا کی بکیزری نے رنج پہنچایا ہے۔ اس کا دل چاہا وہ ان کی دجوتی کی خاطر کچھ کہے لیکن اس سے پہلے ہی اماں کہنے لگیں۔

”وہ چھوٹی دونوں وہیں باورچی خانے میں بیٹھ کر کھانا کھا رہی ہیں۔ تم بھی وہیں چلی جاؤ۔ یا پھر یہاں لا کر کھا لو۔“

”آپ نے کھالیا؟“

”نہیں۔ اور مجھے بھوک بھی نہیں ہے۔“ اس کے ساتھ ہی اماں نے تکیہ سیدھا کیا اور لیٹ گئیں۔ وہ سمجھ گئی کہ اب وہ اس سے کوئی بات نہیں کریں گی۔ اس لیے چپ چاپ وہاں سے اٹھ آئی۔

کلثوم اور ہما کھانے سے فارغ ہو چکی تھیں۔ اور اب بیٹھی سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی ہمانے پیر صحنی اس کی طرف کھسکا دی جس پر بیٹھتے ہی وہ اس سارے ہنگامے کا پس منظر پوچھنے لگی، ”نوکلثوم تم مختصر یوں بتایا کہ ہسل کی والدہ اور بہنیں آپ کے لیے آئی تھیں۔ اماں سے بہت اصرار کیا لیکن اماں کسی طرح ہیں مافیں۔ صاف انکار کر دیا اور ان کے جانے کے بعد چھوٹی آپا اماں سے آجھنے لگیں۔ یہ سب تو وہ خود بھی جان چکی تھی اس لیے کوئی تبصرہ کیے بغیر اپنے لیے پلٹ میں سالن نکلے گئی۔

”چھوٹی آپا ٹھیک کہتی ہیں، اماں کو انکار نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ کلثوم اپنی رائے دینے لگی۔ اتنے اچھے رشتے بار بار نہیں آتے۔“

”مجھے تو ان خواتین پر ترس آ رہا ہے، اتنی مایوس ہو کر گئی ہیں؟“ ہما تاتف سے بولی۔

”اچھا چلو، اب تم دونوں اندر جاؤ۔“ اس نے ٹوک دیا۔ ”وڑتہ اماں پتا نہیں کیا سمجھیں؟“

”کیا سمجھیں گی؟“

”یہی کہ ہم ضرور ان کے خلاف محاذ بنارہے ہیں۔“ اس نے کہا تو وہ دونوں سر ہلاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں پھر جب وہ تنہا رہ گئی تو اس سارے واقعے کو نئے سرے سے سوچنے لگی۔ ایک طرح سے اُسے اطمینان ہی ہوا کہ خود آپ ہی آپ ٹل گیا ہے۔ کل سے وہ بہت پریشان تھی اور اپنی پریشانی سے ثابت حسن کو بھی آگاہ نہیں کر سکی تھی۔ لیکن وہ چاہتی تھی جلد اس سے مل کر ساری صورتحال اس پر واضح کر دے کہ آج تو اماں نے انکار کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے آئندہ وہ چھوٹی آپا کے یا سب کے مجبور کرنے پر اپنی بات پر قائم نہ رہ سکیں اور چھوٹی آپا سے پہلے اس کی شادی کے بارے میں سوچنے لگیں۔

”میں کل ہی انیلا سے کہوں گی کہ ثابت حسن سے کہے جتنی جلد ہو سکے مجھ سے ملے۔“ اُس نے سوچا اور کھانے کے برتن رکھ کر اندر چلی آئی۔

پھر وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا، شام میں بڑی آپا آئیں۔ انہوں نے بھی اماں سے وہی باتیں کیں جو چھوٹی آپا نے کہی تھیں، فرق صرف اتنا تھا کہ چھوٹی آپا چلا کر بات کر رہی تھیں اور بڑی آپا نے آرام سے اماں کو سمجھانے کی کوشش کی اور پھر ابا میاں بھی بڑی آپا کے ساتھ مل گئے تھے۔ یوں اماں نے ہتھیار ڈال دیے۔

انسان خواہ کتنی ہی تباہی کر مالے، اپنے زور بازو پر بھروسہ کرتے ہوئے کتنی ہی کوششیں کر ڈالے، ہوتا وہی ہے جو اوپر ولے نے اس کے مقدر میں لکھا ہوتا ہے۔ اور اس نے ہر کام کے ہونے کا ایک مقرر کر رکھا ہے۔ ثابت حسن کی قسمت میں بھی جلنے لکھا تھا کہ اتنی کوششوں اور جدوجہد کے بعد بھی اس کا کام نہیں بن رہا۔

تھا مختلف ایجنسیوں کے چکر لگاتے لگاتے وہ تھک گیا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اسے پہلے ہی مرحلے پر مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا بلکہ بہت حوصلہ افزا جواب ملے کچھ مراحل وہ طے بھی کر لیتا۔ لیکن پھر پتا نہیں کیا ہوتا کہ عین وقت پر اس کا معاملہ کٹائی میں پڑ جاتا۔ یقیناً سارا کھیل پیسے کا تھا کہ جس آسامی پر وہ باہر جانے والا ہوتا، کوئی دوسرا اس سے زیادہ پیسے ادا کر کے اس کا حق مار جاتا اور اس کا نام آئندہ کی لسٹ میں چلا جاتا۔ وہ تھکا ضرور تھا لیکن مایوس نہیں ہوا تھا۔ جب ہی تو نئے سرے سے امید کا دامن تھام کر صبح شام ایجنسی کے چکر لگانے لگتا تھا۔ اسی چکر میں وہ کئی دن سے رعبہ کے پاس بھی نہیں جاسکا تھا۔ ویسے بھی وہ چاہتا تھا کوئی خوشخبری ہی کے لیے اس کے پاس جائے۔

لیکن جب انیلا نے رعبہ کا پیغام دیا کہ ملنا چاہتی ہے تو وہ رُک نہیں سکا۔ اگلے دن ہی اس سے ملنے پہنچ گیا۔ اسی پارک کے مخصوص گوشے میں جب اس کے برابر بیٹھا تو بغور دیکھنے پر احساس ہوا کہ وہ کچھ پریشان کی چیز کیا بات ہے؟، ”ثاقب نے بے قراری سے پوچھا اور جواب میں اس کی پلکوں سے ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گود میں رکھی قابل پر چلنے لگے۔

”رعبہ۔“ وہ ایک دم پریشان ہو گیا۔ مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟ کیا میرے ذائے سے پریشان ہو گئی ہو؟۔ میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ میں۔“ اس کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اس نے ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا تھا اور باقاعدہ سسکیوں سے رونے لگی تھی۔ یہ صورتحال اسے مزید پریشان کر گئی۔ سمجھ میں نہیں آیا، کیسے اُسے چپ کرانے۔ کچھ دیر تک اس کے پلٹے وجود کو دیکھتا رہا پھر جب برداشت نہیں ہوا تو کہنے لگا۔

”رعبہ پلزز بس کرو، روک لو اپنے آنسو، مجھے بے حد دکھ ہو رہا ہے۔“ وہ ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں رگڑنے لگی، اُس نے جیب سے دو مال نکال کر اس کی طرف بٹھا دیا اور جب وہ چہرہ صاف کر کے اپنے آپ کو بولنے کے قابل بنا سکا تو پوچھنے لگی۔

”تمہاری کوششیں کہاں تک کامیاب ہوئیں؟“

”میری کوششیں ابھی تک جاری ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟۔ کام ہوتے ہوتے رہ جاتا ہے۔ شاید کچھ آزمائشیں ابھی باقی ہیں یا پھر میرے نصیب میں۔“ اُس کے اترتے چہرے پر نظر پڑی تو بات وہیں چھوڑ کر حوصلہ دیتے ہوئے کہنے لگا۔

”تم قلمت کرو۔ انشاء اللہ جلد ہی کوئی صورت نکل آئے گی۔“

”جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو کیونکہ میں حالات سے نہیں لڑ سکتی۔“ وہ سر جھکاتے ہوئے بولی۔ میرا اسی طرح ساری صورتحال کہ سنائی اور آخر میں جب یہ بتایا کہ اماں چھوٹی آپا کے بجائے اس کے لیے سوچنے لگی ہیں تو وہ بے چین ہو گیا۔

”رعبہ۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یقین کرو میں یہ ساری جدوجہد صرف تمہارے لیے کر رہا ہوں۔“

”میں جانتی ہوں لیکن۔“

”جانتی ہو تو حالات سے لڑنے کا حوصلہ بھی پیدا کرو۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر فوراً بول پڑا۔

”تم نہیں جانتے ثابت۔“ اماں نے شروع سے اپنے اور ہمارے درمیان ایک فاصلہ رکھا ہے ایک حد سے بڑھنے کی اجازت انہوں نے ہمیں بھی نہیں دی۔ انہوں نے تو کبھی کسی معمولی سی بات میں بھی ہماری رائے کو لینا ضروری نہیں سمجھی اور جو تم حالات سے لڑنے کی بات کرتے ہو تو یہ تو جب وجہ امان مجھ سے پوچھیں کہ تم کیا چاہتی ہو اور میں کسی بھی طرفان کی پروا کیے بغیر، سارے حوصلے مجتمع کر کے تمہارا نام لے دوں یہاں تو یہ سوال میرے سے اٹھا ہی نہیں جاسکتا۔ اماں اپنا فیصلہ سناتے ہیں اور ہم ماننے پر مجبور۔“

اگر ایسی بات تھی رعبہ تو۔ تو تم نے میری محبت کی پذیرائی کیوں کی؟۔ اپنے حالات جانتے ہوئے بھی مجھے؟۔

”بغیر ثابت حسن۔“ وہ چہرہ پڑی۔ ”اب خدا کے لیے یہ مت کہہ دینا کہ میں اپنی محبت کا گلا گھونٹ دوں اور یہیں سے اپنے قدم واپس موڑ لوں۔“



مہیوقوف ہوئی۔ میں تمہیں ایسا مشورہ دے سکتا ہوں جبکہ میں خود ایسے مقام پر اکٹھا ہوا ہوں جہاں سے واپسی کے راستے بے نشان ہو چکے ہیں۔ تم میری اولین محبت ہو رہی اور میں تمہارے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یقین کرو اگر تم نے مجبور ہو کر بھی راستہ بدلا تو میں زندہ نہیں رہ سکوں گا۔  
پھر میں کیا کروں؟ وہ بھیگی بھیگی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اور وہ اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں اترتا ہوا بولا۔  
تم تو بس اتنا کرو کہ اپنے سارے آنسو پونچھ ڈالو۔ وہ بے اختیار اپنی آنکھیں صاف کرنے لگی اور جب اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہا تھا۔  
مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا واسطہ اتنی بزدل لڑکی سے پڑ رہا ہے۔ بہر حال تم اندیشوں میں جان مت گھلاؤ۔ کہ تمہاری جان میری امانت ہے۔  
لیکن ثانی۔

اور ہوں۔ کوئی مایوسی کی بات نہیں ہوگی۔ اس نے ٹوک دیا۔ گو کہ اندر ہی اندر وہ خود بہت ڈر رہا ہوگا لیکن اس پر ظاہر کر کے اسے مزید پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنی کیفیت چھپا کر وہ اسے اندیشوں سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔

یہ یقین رکھو کہ تمہارا میرا سبکدوش آسمانوں پر رکھا ہے۔ ہمیں کوئی الگ نہیں کر سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ابھی میں کسی طرح بھی تمہارا ہاتھ مانگنے کے قابل نہیں ہو سکا ہوں۔ پھر بھی اس یقین کے ساتھ یہ ہاتھ تھام رہا ہوں کہ اسے کسی دوسرے ہاتھ میں بھی نہیں جانے دوں گا۔ اس کے خاموشی سے دیکھنے پر کہنے لگا۔ میں آج اتناں کو تمہارے گھر بھیجوں گا۔  
کیا؟ اس کے ہونٹ کھلنے کے کھلے رہ گئے۔

کوشش تو کر لینے دو۔ وہ رسان سے بولا۔ اگر اس طرح بات نہ بنی تو کوئی اور طریقہ سوچو گا تم بہر حال ہر فکر سے آزاد ہو جاؤ۔ تمہاری مجبوری جان لینے کے بعد حالات کا مقابلہ میں خود کروں گا۔ مجھیں تم۔

اس نے چپ چاپ سر جھکا دیا۔  
کیا سوچنے لگیں؟ وہ اس کے چہرے کے چھکے ہوئے سر کو دیکھتا ہوا بولا۔  
مجھے ڈر لگ رہا ہے۔

زمین۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ میرے اتنا سمجھانے پر بھی تم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اگر اس طرح ہمت ہارو گی تو میں کچھ بھی نہیں کر سکوں گا۔ کیا تمہیں میرا یقین نہیں ہے؟  
ہے تمہارا یقین۔

بس تو اسی یقین کا دامن تمہارے رکھو۔ اور اب ذرا سا مسکراؤ تاکہ میرے ساتھ ساتھ اطمینان پھیلے پھولوں کو بھی اپنی قسمت پر رشک آنے لگے۔  
کیا مطلب؟

بے چارے کب سے تمہیں آزرہ دیکھ کر مرجھائے جا رہے ہیں میری طرح۔ ذرا سا مسکرا دو گی تو کھنکھنیں گے۔

تمہاری طرح؟ وہ فوراً بولی اور بے ساختہ ہنس پڑی۔ پھر اس کی والہانہ نظروں سے گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔  
چلو کانی دیر ہو گئی۔

چلو۔ وہ اٹھ کر اس کے ہم قدم ہو گیا۔ پھر جب وہ اپنے روٹ کی بس میں سوار ہو گئی تب وہ اپنی بس کا انتظار کرنے لگا۔

اس کا خیال تھا شائبہ حسن اس کے اور خود اپنے حالات کو سمجھتے ہوئے اپنی والدہ کو اس کے ہاں نہیں بھیجے گا۔ اور وہ خود بھی چاہتی تھی کہ وہ جب تک کسی قابل نہ ہو جائے ایسا کوئی قدم نہ اٹھائے لیکن دوسری طرف یہ خوف بھی تھا کہ اماں اسے بھٹائے نہیں رکھیں گی۔ ایک طرح سے وہ دو متضاد کیفیات میں گھری ہوئی تھی شائبہ

والدہ کا انتظار بھی تھا اور یہ بھی چاہ رہی تھی کہ وہ نہ آئیں۔  
سچی سے آنے کے بعد کھانا کھاتے ہی وہ سوچا کہ کتنی ٹھیک اس روز اسے بالکل نیند نہیں آئی۔ پوری رات بوجھتے ہوئے اور اس دھڑکے میں گزر گئی کہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ ہر سہرہ چلتے ہی ایک ایک کر کے بے اٹھنے لگے اور وہ ابھی کچن میں آکر چائے بنانے کا سوچ رہی تھی کہ شائبہ کی والدہ آئیں۔ ان کے ساتھ ننلا تھی۔ اس نے وہیں کھڑے رہ کر انہیں ہمارے ساتھ اندر جاتے ہوئے دیکھا۔ پھر چوہا جلا کر چلنے کا پانے کھینے لگی۔

اس کا دل اچانک ہی بہت زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ کہیں کوئی فرشتہ گوارا احساس نہیں جاگتا تھا اور نہ امید کی کوئی جگہ سی کہیں ہی جگر لگائی تھی۔ بس ایک خوف جیسے جدا شیاں مقدر ہونے جا رہی ہوں۔

میرے خدا۔ بے تحاشا دھڑکنے والے دل کے ساتھ اس نے بے شمار دعائیں مانگ ڈالیں۔  
آپ۔ کلثوم اس کے پاس آکر کہنے لگی۔ آپ چائے بنا رہی ہیں؟  
ہاں۔ وہ ہاں کی صورت سینے میں دبی سانس ہونٹوں کی قید سے آزاد کرتی ہوئی سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

اندر کچھ مہمان آئے ہیں، ان کے لیے بھی بنالیں۔  
کون ہیں؟ وہ جان بوجھ کر انجان بنی۔  
بنال ہے کوئی رشتے وغیرہ کا چکر ہے۔ اور ہاں خاتون کے ساتھ جو ایک لڑکی ہے، وہ بتا رہی تھی آپ کے ساتھ پڑھتی ہے۔

اچھا۔ وہ رخ موڑ کر ٹرے میں کپ رکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ کیا نام ہے؟  
پتا نہیں۔ آپ چائے لے کر جائیں گی تو دیکھ لیں گے۔  
چائے میں لے جاؤں؟

ہاں۔ اماں نے تو یہی کہا ہے، آپ کے ہاتھ بھجوا دوں، کلثوم شرارت سے مسکرائی تو وہ اسے گھور کر رہ گئی۔ چھٹی پاٹ میں چائے دم کر کے ٹرے میں رکھی اور دوپٹہ کھول کر سلیٹ سے اوڑھنے لگی۔  
ذرا سا گھونٹ بھی نکال لیجیے۔ کلثوم نے چھیڑا۔

بکومت۔ وہ ٹرے اٹھا کر اندر چلی گئی۔ انیلا کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا۔ دقتا کہیں وہ شرارت سے دیکھے اور جواب میں اس کے ہونٹوں پر شگبیں مسکراہٹ چل کر کوئی راز عیاں نہ کر دے۔ بہت آہستہ آواز میں اس کی والدہ کو سلام کیا۔

جنتی رہو۔ انہوں نے دعا دی اور پھر اماں سے پوچھنے لگیں۔ یہ ہے آپ کی بیٹی ربیعہ؟  
جی ہاں۔

ماشاء اللہ۔ انیلا بہت تعریف کرتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ یہ ہے بھی تعریف کے قابل۔ میں بہت دنوں سے آنا چاہا رہی تھی لیکن کوئی نہ کوئی مصروفیت آڑے آتی رہی۔

ہاں۔ کام تو کبھی ختم نہیں ہوتے۔ اماں نے کہا اور اسے وہاں سے جلنے کا اشارہ کیا تو وہ چائے ان کے آگے رکھ کر وہاں سے چلی آئی۔ کچن میں آئی تو چھوٹی آپا سے سامنا ہو گیا۔ جانے کیوں وہ اپنے آپ کو مجرم محسوس کرنے لگی۔ اگر شائبہ حسن کا معاملہ نہ ہوتا تو اس وقت وہ چھوٹی آپا کے سامنے دبا دبا سا احتجاج ضرور کرتی لیکن اب نظریں چرات ہوئی ان کی طرف سے ذرا سا رخ موڑ کر اپنے لیے چائے بنانے لگی۔

مومن آیا ہے؟ چھوٹی آپا اس سے پوچھنے لگیں۔  
میری دوست ہے انیلا۔ اپنی والدہ کو لے کر آئی ہے۔

غیرت۔ میرا مطلب ہے یہ بیٹی یا کسی خاص مقصد سے؟ چھوٹی آپا نے بہت عام سے بچے میں پوچھا اس کے باوجود وہ فوری طور پر جواب نہ دے سکی۔

اس کا مطلب ہے کسی خاص مقصد سے آئی ہے؟ چھوٹی آپا اس کے خاموش رہنے پر کہنے لگیں۔ کیا کرتا

ہے اس کا بھائی؟

”چھوٹی آپا۔ پلیز میں یہ سب نہیں جانتی۔“

”ارے۔ تو کیا اس نے پہلے تمہاری رائے نہیں لی تھی؟“

”ہماری رائے کی اہمیت ہے؟“ وہ اٹھا انہی سے پوچھنے لگی۔

”اس گھر میں نہیں ہے اہمیت اور دوسرے اس بات کو کیا جانتیں جب تک ہم خود۔“ چھوٹی آپا کی بات ہونٹوں میں رہ گئی۔ کیونکہ انیلا وہیں آگئی تھی۔ اس نے آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے انیلا کو کچھ بھی کہنے سے باز رکھا پھر چھوٹی آپا سے اس کا تعارف کروانے لگی۔

”ہی انیلا ہے اور انیلا یہ میری چھوٹی آپا ہیں۔“

”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ انیلا نے کہا تو جواب میں چھوٹی آپا نے بھی یہی جملہ دہرا دیا۔

”تم یہاں کیوں چلی آئیں؟“ وہ انیلا سے پوچھنے لگی۔

”بڑوں کی باتوں میں مجھے اپنا وجود بہت عجیب سا لگ رہا تھا اس لیے اٹھ آئی۔“

”بیچہ! اسے دوسرے کمرے میں لے جاؤ۔“ چھوٹی آپا نے کہا تو وہ اسے لے کر چھوٹے کمرے میں آگئی۔

”کیا رہا؟“ تنہائی ملتے ہی وہ بے تابی سے پوچھنے لگی۔

”ابھی تو تمہاری اماں میرے بھائی کے بارے میں معلومات حاصل کر رہی ہیں۔“

”اماں کا موڈ کیسا ہے؟“

”بظاہر تو خوشگوار ہی نظر آ رہا ہے۔ ویسے تمہیں خدشہ کس بات کا ہے؟ میرا بھائی کسی سے کم تو نہیں ہے۔“

ایسا بانٹا سچا ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔“

اب وہ اس سے کیا کہتی کہ اماں کو باز لگا سچا نہیں پیسے والا چاہیے۔ بس طویل سانس لے کر رہ گئی۔

”ویسے بیچہ۔“ انیلا رازدارانہ سے کہنے لگی۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ آج اچانک ثابت بھائی کو کیا ہوا کہاں تو کہتے تھے بہنوں سے فارغ ہو کر اپنے بارے میں سوچوں گا اور اب ایک دم ہی اماں کے سر ہو گئے کہ آج ہی بیچہ کے گھر چلی جائیں۔ اماں نے کہا بھی پہلے تم کسی کام سے لگ جاؤ پھر۔ لیکن وہ مانے ہی نہیں۔“

”سنو۔“ اس نے بھی رازدارانہ انداز اختیار کیا۔ ”اماں سے کیا کہنا ہے کہ ثابت کیا کرتا ہے؟“

”یہی کہ عنقریب باہر جانے والے ہیں۔“

”اماں مطمئن ہو گئی تھیں؟“

”پتا نہیں کیونکہ انہوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ کیوں، کیا انہیں باہر جانے پر اعتراض ہو گا؟“ وہ ابھی کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ انیلا کی اماں اسے پکارنے لگیں۔

”میرا خیال ہے، اماں جانے کو تیار ہیں۔“ انیلا اٹھتی ہوئی بولی ڈکل کالچ میں تفصیل سے بات کر رہی تھی۔

”بیچہ۔“ اماں نے آواز دی تو وہ انیلا کو لے کر بڑے کمرے میں آگئی۔ جہاں اس کی اماں جانے کو تیار تھیں۔

”اس نے درزیدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا تو اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا سامھوس ہوا۔“

”ثابت کی والدہ کے چہرے پر مایوسی اور فساد کی اس نے صاف طور پر محسوس کر لی تھی اور جان گئی کہ اماں نے ان کی بات سنی ضرور ہے لیکن اس کا کوئی دیا ان کی جھولی میں نہیں ڈالا۔ جب ہی تو وہ اس قدر مایوس اور نالا

نظر کر رہی تھیں۔“

”اچھا بہن ہم چلتے ہیں۔“ ثابت کی والدہ نے اماں سے اجازت چاہی پھر ٹھہر کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”خوش رہو بیٹی، اللہ تمہارے نصیب اچھے کرے۔“

وہ انہیں دروازے تک چھوڑنے کی غرض سے انیلا کے ساتھ چلنے لگی تو اماں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کا تیرا وجود جیسے منجمد ہو گیا۔ اتنی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ پلٹ کر اماں کی طرف دیکھ سکے۔ بس خاموش

کھڑی انیلا اور اس کی اماں کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

”تم جانتی ہو ان کے بیٹے کو؟“ اسے اپنے عقب سے اماں کی آواز سنائی دی ان کے سر پر ہاتھ میں جانے

بتی کہ وہ اندر تک کانپ گئی۔

”نہیں تو۔“ اس نے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

”پھر یہ یہاں تک کیسے آئیں؟“

”وہ۔“ انیلا۔ ”اس کی سمجھ میں نہیں آیا، کیا کہے۔“

”انیلا نے ذکر تو کیا ہو گا تم سے؟“ اماں جلنے کیا معلوم کرنا چاہتی تھیں۔

”جی۔“ اس نے سر جھکا لیا۔

”پھر تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“

”میں کیا بتاؤں اماں؟“ وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی تو اماں اس کے کندھوں پر دباؤ ڈال کر وہیں بٹھاتے ہوئے کہنے لگیں۔

”رو مت۔“ آئندہ ہمارے سمجھتی ہو اپنی غلطی پر پردہ ڈال لو گی۔“

”میں نے کیا کیا ہے؟“

”دیکھ کیا ہے جب ہی تو یہ بڑی اپنی ماں کو لے کر آئی ہے ورنہ تم سے پہلے بھی اس گھر کی دوڑکیاں کا بلوں

میں پڑھ چکی ہیں۔ ان کے لیے تو کوئی اس طرح نہیں آیا۔“

”تو اس میں میری کیا خطا ہے؟“ میں نے تو انیلا سے نہیں کہا تھا کہ میرے گھر آؤ۔“ وہ دوپٹے کے پلو

سے آنکھیں صاف کرتی ہوئی ہوئی تو اماں کتنی دیر تک ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہیں جیسے

اندازہ کر رہی ہوں کہ وہ سچ کہہ رہی ہے یا جھوٹ۔“

اور وہ اماں کے اس طرح دیکھنے سے مزید سہم گئی۔ پہلو بدلتے ہوئے راہ فرار ڈھونڈنے لگی۔

”جاؤ جا کر منہ ہاتھ دھو۔“ اماں نے خود ہی اس کی مشکل حل کر دی اور ایسا انداز اختیار کیا جیسے اس کی بات

کا یقین کر لیا ہو۔ وہ فوراً ان کے پاس سے اٹھ گئی۔ کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئی تو ابامیاں آ رہے

تھے۔ اس نے جلدی سے انہیں سلام کیا۔ اور آئینے سے گزر کر ہاتھ روم میں داخل ہو گئی۔ اتنے سے فاصلے

نے ہی اس کے وجود میں مساتھوں کی تھکن اتار دی تھی۔ اس وقت ذہن سچھ اور سوچنے کے قابل نہیں تھا۔

بس اماں کا خون تھا جس نے دل کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

منہ پر ہانی کے چھینٹے مارتے ہوئے آنکھوں نے بھی چاہا کہ اپنے اندر ٹھہرا سا راپانی بھاؤ الین لیکن اس نے

بیشکل تمام آنکھوں کے گرد حفاظتی بند باندھے اور دوپٹے ہی سے چہرہ صاف کرتی ہوئی ہاتھ روم سے نکلی تو

پن میں چلی گئی۔ چھوٹی آپا ابھی تک یہیں موجود تھیں۔ نیچے والا چوہا جال رہا تھا شاید ان کا وہیں بیٹھ کر روٹی

پکانے کا ارادہ تھا۔

”بہنیں چھوٹی آپا۔ روٹی میں پکا دیتی ہوں۔“ رونے سے اس کی آواز ساثر ہوئی تھی جب ہی چھوٹی آپا فوراً

سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ آنکھوں میں اترے گلابی ڈورے بھی چھٹی کھا رہے تھے۔ چھوٹی آپا فوری

طور پر کچھ نہیں بولیں، نہ ہی اپنی جگہ سے ہٹیں۔ بس خاموشی سے دوسری بیٹری اس کی طرف کھسکا دی۔ وہ بیٹھ

گئی تو چھوٹی آپا نے توجہ چلے پر رکھا اور شلیف پر سے اٹے کا برتن اتار کر اپنے قریب رکھ لیا۔

”میں پکا دیتی ہوں۔“ اس نے پھر کہا۔

”نہیں۔ میں پکلاؤں گی۔“ چھوٹی آپا نے اٹے کا پیڑا بنایا پھر بلی کر توے پر ڈالتے ہوئے بظاہر سرسری

انداز سے پوچھنے لگیں۔

”روٹی رہی ہو؟“

”ہاں۔“ اس نے ٹھوڑی گھنٹوں پر لگاتے ہوئے اعتراف کیا۔

”کیوں؟“ اس کی آنکھیں جھلملتا گئیں تو اس نے گھنٹوں ہی گھنٹوں رگڑ ڈالا پھر آہستہ آواز میں بولی۔

”چھوٹی آپا۔ اگر انیلا اپنے بھائی کا پرہیزوار لے کر آئی تھی تو اس میں میرا کیا قصور؟“

”کیا واقعی تمہارا قصور نہیں ہے؟“ چھوٹی آپا نے ایک دم اسے اپنی نظروں کی گرفت میں لے لیا تو وہ گڑبڑا کر

بولی۔

”کیا مطلب؟“

”کیا ثاقب حسن ہی انیلا کا بھائی ہے؟“

”کیا؟“ چوٹی آپا کے منہ سے ثاقب حسن کا نام سن کر کتنی دیر تک وہ حیرتوں کے سمندر میں غوطے کھاتی رہی۔

”پتاؤں؟“ چوٹی آپا کے پوچھنے پر وہ چونک گئی۔

”آپ کیسے جانتی ہیں ثاقب حسن کو؟“

”جانتی۔ تو نہیں بس نام سے واقف ہوں۔ اب تم پوچھو کیسے؟۔ تو وہ ایسے میری بہن کہ ایک دن چاروا خٹے ہوئے تمہاری انگلی چاولوں کی سطح پر بار بار ایک ہی انداز سے حرکت کر رہی تھی۔ میں نے غور کیا تو کافر حسن، لکھا نظر آیا اور پھر اس نام کی جگہ میں نے تمہاری آنکھوں میں بھی دیکھی تھی۔“ وہ عجیب کشش و پری میں رہ گئی۔ اقرار کرنا بھی مشکل لگ رہا تھا اور جھٹلا بھی نہیں سکتی تھی۔ بس سر جھکانے پر اکتفا کیا۔

”سنا ہے ایسے معاملے میں کسی ہمارے ضرورت ضرور محسوس ہوتی ہے پھر تم نے اتنی رازداری کیسے برت لی؟“

”میں ڈرتی تھی۔ وہ دھیرے سے بولی۔

”ہاں میرا بھی یہی خیال تھا کہ تم خوفزدہ ہو۔ خیر اب یہ بتاؤ، اماں نے انہیں کیا جواب دیا؟“

”چنانچہ یہ توضیح انیلا سے معلوم ہوگا۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔ مجھے ذرا بھی امید نہیں ہے! اماں اس رشتے پر ہامی بھریں گی؟“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ ثاقب حسن کوئی جاب نہیں کر رہا البتہ باہر جانے کی کوشش میں لگا ہوا ہے اور آپ تو باتا رہیں اماں۔“

”ہاں، میں اماں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔“ چوٹی آپا فوراً بول پڑیں۔

”لیکن تم ربیعہ، اس سلسلے میں خاموش مت رہو۔ اگر واقعی ثاقب حسن سے محبت کرتی ہو تو اماں سے بات کرو۔“

”میں۔“ وہ اپنی طرف اشارہ کیے چوٹی آپا کی طرف یوں دیکھنے لگی۔ جیسے انہوں نے کوئی انہونی بات کہہ دی تھی۔

”جو بک چوٹی آپا اطمینان سے بولیں۔

”ہاں تم۔ صاف صاف اماں سے کہہ دو کہ ثاقب حسن کے سوا کسی سے شادی نہیں کرو گی۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہیں چوٹی آپا آپ؟ اماں تو میرا گلا دیا دیں گی۔“

”تو کیا اس کے بغیر اطمینان سے رہ لو گی؟“

”اطمینان سے۔؟ میں تو پتا نہیں ہی بھی پاؤں گی کہ نہیں۔“ اس کی آنکھوں کی سطح پھر گہری ہونے لگی۔

”ربیعہ۔“ چوٹی آپا نے اس کے کھٹے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اتنی بڑی کام مظاہرہ کر کے اپنے لیے مشکلات منت خریدو۔ بس اپنے اندر تصور اس حوصلہ پیدا کر لو۔ ایک بار اماں سے کہہ دو۔“

”چوٹی آپا۔ میں سب کر سکتی ہوں لیکن اماں کے سامنے زبان نہیں کھول سکتی۔ مگر بھی نہیں۔ اور ابھی ان کے پوچھنے پر میں صاف انکار بھی کر چکی ہوں کہ میں انیلا کے کسی بھائی کو نہیں جانتی۔“ چوٹی آپا کا دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہیں پھر کہنے لگیں۔

”اچھا پہلے تم صبح انیلا سے معلوم کرو کہ اماں نے انہیں کیا جواب دیا ہے پھر میں کچھ کروں گی۔“

”چوٹی آپا پلیز۔ آپ اس سلسلے میں کچھ نہیں بولیں گی۔“

”کیوں؟“ وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ اماں آگئیں۔ باری باری دونوں کو دیکھا پھر کہنے لگیں۔

”یہ تم دونوں یہاں کیا کر رہی ہو؟“

”میں روٹی پکارتی تھی۔ ربیعہ یونہی میرے پاس آ بیٹھی۔“ چوٹی آپا۔ ان کے کھردرے لہجے کا ٹوٹ

بغیر اطمینان سے بولی۔

”اگر بیک گئی ہو تو دسترخوان بچھا دو۔ ان کے کہنے پر ربیعہ خاموشی سے اٹھ گئی۔

پھر کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر وہ حسب معمول اپنی کتابیں لے کر بیٹھ گئی۔ کلثوم اور ہما کا شاید کوئی ٹیٹل وغیرہ تھا۔ وہ اس کی تیاری میں لگی ہوئی تھیں۔ اس کا اسٹیڈی کرنے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا پھر بھی کتاب کھول کر بیٹھ گئی۔

نظارہ نظر میں صنعت پر جتنی تھیں لیکن ذہن جھٹک رہا تھا۔ کبھی ثاقب حسن کی باتیں۔

”تمہارا میرا سونگ آسمانوں پر لکھا ہے، ہمیں کوئی الگ نہیں کر سکتا۔“

”ذرا سا مسکرا دو کہ بھولوں کے ساتھ ساتھ میرے دل کی کلی بھی کھل اٹھے۔“

اس کے ہونٹوں پر ذرا سا ارتعاش پیدا ہوا تھا کہ اماں کی باتیں۔

”تم ان کے بیٹے کو جانتی ہو؟“

”کچھ کیا ہوگا جب ہی تو یہ لڑکی اپنی ماں کو لے کر یہاں تک آئی ہے۔ ورنہ تم سے پہلے بھی اس گھر کی دو

رو کیاں کاجوں میں پڑھ چکی ہیں۔“

”میرے خدا۔“ اس نے طویل سانس لیتے ہوئے کرسی کی پشت سے مڑکاتے ہوئے آنکھیں بند کر ثاقب حسن کی والدہ کا مایوس چہرہ تصور میں آ کر آیا۔ اس کا دل دکھ سے بھر گیا اور ہلکا ہلکا درد اٹھنے لگا۔ بند کپڑوں کے اندر پانی یوں چھلا کہ کناروں کو کھٹک گیا۔

وہ گرد و پیش سے بگناہ ہو چکی تھی۔ اور اندر کی آوازوں میں کھوکھراہٹیں محسوس ہی نہ کر سکتی تھی۔ وہ تو جب کندھے پر دباؤ محسوس ہوا تو گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اماں سر پر کھڑی تھیں۔ وہ فوراً سیدھی ہو بیٹھی۔

”جاؤ جا کر سو جاؤ۔“ اماں کا سر دہریہ مکیہ تھا۔ اس نے فوراً کتاب بند کر دی اور ان کے ساتھ ہی کھڑی ہو کر باہر آئی تو چوٹی آپا، اماں کے پاس بیٹھ جانے کس موضوع پر بات کر رہی تھیں۔ وہ چپ چاپ جا کر اپنی چار پائی پر لیٹ گئی۔

”ربیعہ۔ اتنی جلدی سو رہی ہو؟“ چوٹی آپا وہیں سے پکار کر پوچھنے لگی۔

”ہاں نیند آ رہی ہے۔“ اس نے کہا اور چادر سر تک اوڑھ لی۔ اس نے جھوٹ بولا تھا۔ نیند بالکل نہیں آ رہی تھی۔

چادر میں چھپی تو پھر وہی ساری باتیں جو اندر بیٹھ کر سو رہی تھی، ایک بار پھر ذہن پر دستک دینے لگیں۔ جنہیں سوچنے اور ان میں الجھنے الجھنے جانے کتنی رات بیت گئی۔

جب ہر طرف خاموشی کا احساس ہوا تو اس نے منہ پر سے چادر ہٹا کر دیکھا۔ سب اپنی اپنی جگہوں پر بے خبر سو رہے تھے۔ سب پر سے ہوتی ہوئی اس کی نظریں ستارے بھرے آسمان پر جھٹکنے لگیں۔ آج وہ ستاروں کا ٹھہرنا نہیں تھا جس کے درمیان چاند کا تصور کرتی تو ایک مانوس چہرہ روشن ہو جایا کرتا تھا۔ شوخ اور شیریں سا۔

”ثاقب حسن؟۔“ دل نے پکارا۔ تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں؟“

”تم تو بس اتنا رو کہ اپنے دل سے سارے خدشے، سارے اندیشے نکال باہر کرو۔“ اسے لگا جیسے وہ کہیں اس کا کھڑا کہہ رہا ہے۔

”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”میرا یقین کرو۔ میں تمہارا ہاتھ کسی اور ہاتھ میں نہیں جانے دوں گا۔“

اسے ثاقب حسن کا لہجہ تھا۔ پھر بھی دل اندیشوں کی قید سے آزاد نہیں ہوا۔ اسی طرح سوچتے اور تصور میں اس سے باتیں کرتے ہی وہ فینڈ کی آغوش میں چلی گئی۔

صبح وہ معمول کے مطابق اٹھی۔ نماز سے فارغ ہو کر اماں کے ساتھ مل کر ناشتا بنایا اور پھر اندر چلی گئی۔

کالچ یونیفارم پر استری کرتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ جاتے ہی انیلا سے پوچھے گی۔ اماں نے کیا جواب دیا تھا؟ اور یہ کہ دوبارہ وہ کب اس کے گھر آئے گی؟۔ استری کا مٹین بند کر کے پیش تو اماں دروازے سے داخل ہوتی نظر آئیں۔ وہ بے حد خاموش نظروں سے اُن کی طرف دیکھنے لگی۔

”تم آج سے کالچ نہیں جاؤ گی۔“ دہری رات والا لہجہ تھا اماں کا۔ ٹھہرا ہوا ہونے کے باوجود بے حد سرد اور چھتا

ہو اس۔ وہ احتجاج کے طور پر ایک لفظ تک نہ کہہ سکی۔ امان نے بس یہی ایک جملہ کہا اور واپس چلی گئیں اور وہ تو جیسے اپنے سارے احساسات سمیت منجمد ہو گئی تھی۔

ثاقب حسن گو کہ بہت زیادہ پرامید نہیں تھا پھر بھی اندر کہیں ہلکی سی امید کی کرن شاید قیمت مہربان ہو جائے، نے اسے سہارا دیا ہوا تھا لیکن جب امان اور انیلا، ربیعہ کے گھر سے مایوس لوٹیں اور بتایا کہ ربیعہ کی والدہ نے حلف منع کر دیا ہے تو وہ بے حد پریشان ہوا۔ اگر وہ سوچ کر جواب دینے کا کہیں تب تو شاید وہ اس کی ڈور تھلے رکھتا لیکن یہاں تو صاف منع کر کے آئندہ کے لیے گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔ یہ بات تو اسے ربیعہ نے بھی سمجھا دی تھی لیکن وہ کیا کرتا، حالات ایسے ہو گئے تھے کہ اسے فوری قدم اٹھانا پڑا۔

وہ رات جو ربیعہ پر بھاری تھی، اُس نے بھی اسی طرح گزار دی۔ اور صبح ناشتا کرتے ہی وہ نکل گیا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ اسی وقت ربیعہ سے ملے گا اور پھر دونوں بیچہ کر کوئی نیاراستہ سوچیں گے لیکن یہاں بھی اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ربیعہ کا بچہ نہیں آئی تھی۔ وہ بہت دیر تک اپنی مخصوص جگہ پر کھڑا اس کا انتظار کرتا رہا تھا اور پھر یہ انتظار جیسے اس کا مقدر ہو گیا۔ پورا ہفتہ گزر گیا۔ وہ صبح اور دوپہر کے وقت اس کے راستے پر نظریں جھکائے کھڑا رہتا اور وہ جیسے راستہ بھول گئی تھی۔

وہ اسے کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ اسے اپنے آپ سے بڑھ کر عزیز ہو گئی تھی اور اب اس سے دُوری کسی طرح بھی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔ پہلے ہی سوچا تھا کہ اس سے مل کر اسی میں حوصلہ پیدا کرے گا کہ وہ خود اپنے گھر والوں کو راضی کرے لیکن جب اس سے ملاقات ہی نہیں ہوئی تو وہ مایوسیوں میں گھرنے لگا۔

کئی بار سوچا انیلا کو اس کے گھر بھیجے لیکن یہاں امان رکاوٹ بن گئیں۔  
”ہم غریب ضرور ہیں لیکن ہماری عزت ہے۔ میں کسی طرح انیلا کو اس کے گھر نہیں جانے دوں گی۔“  
”امان۔ میری زندگی کا سوال ہے۔“ وہ عاجزی سے بولا تھا۔

”اور میری انا کا۔“ امان نے اُن کا مسئلہ بنا کر اس کی بات مانتے سے صاف انکار کر دیا۔  
”میں کیا کروں؟“ وہ باگیل ہونے لگا۔ اپنے آپ سے بے گانہ ہو گیا بھول گیا کہ ان دنوں وہ اپنے بہتر مستقبل کے لیے کیا کوششیں کر رہا تھا۔ ہر کام وہیں رہ گیا۔ بس ربیعہ کا خیال تھا۔ اس کے دیدار کی خواہش لیے روزانہ اسی راستے پر جا کھڑا ہوتا جہاں سے کبھی وہ اسے آتی ہوئی نظر آتی تھی۔ گھنٹوں گزر جاتے۔ وہ کتنی لمبائیوں پر ربیعہ کا گمان کر کے کہتا اور پھر مایوس لوٹتا تھا۔ اسے اس کا خیال بھی تھا کہ بتائیں اس پر کیا کر رہی ہوگی اور پھر اس کے گھر والوں نے یہی تو نہیں اس کا کالج چھڑا دیا ہوگا۔ یقیناً کوئی بات ہوگی۔

”کہیں اس کی شادی تو نہیں ہو رہی؟“ اس دن اس کے بارے میں سوچتے ہوئے اس خیال نے اسے بے چین کر دیا اور وہ اونچا پورا مرد امان کی گود میں سر رکھ کر بچوں کی طرح رو دیا۔  
”امان۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”پھر تم ہی بتاؤ۔ میں کیا کروں؟“ امان اس کے رونے سے پریشان ہو گئیں۔  
”آپ اس کے گھر جا کر بات کریں۔ ان سے کہیں بے شک ابھی شادی نہ کریں لیکن میرے کسی قابل ہونے کا انتظار تو کر لیں؟“

”بٹھا۔ ہم کسی کے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے۔“ امان اس کا سر سہلاتے ہوئے سمجھانے لگیں۔ ”تم نے تو جی کو روک لگا کر سدا کی کوششیں ترک کر دی ہیں۔ اب بھلا بتاؤ تو تم کسی قابل کس طرح ہو سکتے ہو۔ سارا وقت کمرے میں بند ہو کر تو تم کچھ نہیں کر سکتے۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔

”اچھے رشتے اتنی جلدی نہیں ملتے اور پھر جس طرح اس کی والدہ چاہتی ہیں اس کے لیے تو میرا خیال ہے انہی لمبا عرصہ انتظار کرنا پڑے گا تو بٹھا اس عرصے میں تم کیوں نہیں کسی قابل ہو جاتے۔ جب کچھ بن جاؤ گے تو میں تمہارا

ماطر پھر اس کے گھر چلی جاؤں گی؟

”لیکن امان۔ میرا کسی کام میں دل نہیں لگتا۔“

”اپنے آپ کو سنبھالو۔ اس طرح حوصلہ مار کر خود اپنا نقصان کرو گے۔“

”میں جانتا ہوں لیکن جب تک اس کے ملنے کا یقین نہ ہو، میں کچھ نہیں کر سکتا۔“

”اگر نصیب میں ہوگی تو ضرور ملے گی خواہ درمیان میں کتنی ہی رکاوٹیں کھڑی کیوں نہ ہو جائیں لیکن بیٹا کچھ کرو ضرور اس طرح دیتا تاکہ کمرٹ بیٹے جاؤ۔“ اس کے خاموش رہنے پر کہنے لگیں۔

”انہوں نے انکار صاف اس لیے کیا ہے کہ تم کچھ نہیں کر رہے۔ اور میں زیادہ اصرار بھی نہیں کر سکی۔ ہاں اگر تمہارے پاس کوئی معمولی سی نوکری بھی ہوتی، تب بھی میں انہیں قائل کرنے کی کوشش ضرور کرتی۔ خود ہی سوچو، اگر تمہاری بہنوں کے لیے کسی بے کار آدمی کا رشتہ آجائے تو کیا ہم منظور کر لیں گے؟ نہیں ناں تو ہمیں انہیں الزام دینے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔ انہیں یہی کرنا چاہیے تھا؟“

”امان۔ آپ بھی ایسے کہہ رہی ہیں۔“ وہ شامی لہجے میں بولا۔

”میں غلط نہیں کہہ رہی۔ جذبات سے نکل کر ذرا ہوش سے کام لو۔ یہ جو وقت تم میرا کر رہے ہو، ہاتھ سے مل گیا تو پھر نہیں آئے گا۔ ہمارا نہیں تو اسی لڑکی کا خیال کرو۔ وہ بہت زیادہ عرصہ تمہارے انتظار میں نہیں بیٹھی رہے گی۔“

امان غلط نہیں کہہ رہی تھیں۔ اس نے طویل سانس لیتے ہوئے پُر سوچ انداز میں سر ہلایا اور اُنچے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ بستر پر سیدھا لیٹا تو امان کی باتوں کو سوچنے لگا۔ دل اور ذہن نے ان کی باتوں کو جھٹلایا نہیں۔ پھر بھی وہ پہلے اس کے ملنے کا یقین چاہتا تھا۔

”ربیعہ۔ ربیعہ۔ میں تمہیں کہاں ڈھونڈوں؟“ وہ آنکھوں کو ہتھیلیوں سے ڈھانپتے ہوئے شکستگی سے بڑبڑایا۔  
”تمہاری قسم۔ جب تک یہ یقین نہ ہو کہ میری ساری جدوجہد اور محنت کے بعد تم انعام کی سورت ملو گی، میں کچھ نہیں کر سکتا۔ کم از کم تم ہی یہ یقین بخش دو۔ کہہ دو کہ تم میرا انتظار کرو گی۔“ اس کی آنکھوں کا پانی ہتھیلیوں کو نم کرنے لگا۔

”چ۔ چ۔“ ثاقب حسن، مرد ہو کر روتے ہوئے؟“ دل نے ٹوکا۔

”پھر میں کیا کروں؟“ بے بسی سے بڑبڑایا۔

”کوئی اور راستہ سوچو۔“

”اور راستہ؟“ اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔ اور ذہن آہستہ آہستہ بیدار ہونے لگا۔ پھر واقعی وہ ایک نیاراستہ تلاش کر رہا تھا۔ تیسرا راستہ جس کے اختتام پر ان دنوں کی منزل ایک ہو۔ کتنی دیر گزر گئی۔ وہ سوچتا رہا، بوجھتا رہا۔ بالآخر کسی نتیجے پر پہنچا تو قدرے مطمئن ہونے لگا تھا۔

کتنے بہت سارے دن گزر گئے تھے۔ اس کی حالت ثاقب حسن سے مختلف نہیں تھی۔ ویسی ہی بے چینی ویسا ہی اضطراب۔ اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کرے؟ سارا دن اپنے آپ کو کسی کام میں مصروف رکھتی تاکہ پریشان خیالات سے نجات ملے لیکن اس کا خیال کسی وقت جانا ہی نہیں تھا اور اس کے ساتھ مشکل یہ بھی کہ سب کے سامنے اپنے آپ کو نارمل بھی پوز کرنا تھا۔ یوں جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔

صرف چھوٹی آٹا یا اس کی کیفیت کو سمجھتی تھیں، لیکن وہ بھی کچھ کرنے سے قاصر تھیں۔ بس اندر ہی اندر کڑھتی یا پھر کسی وقت اُسے سمجھانے کی کوشش کرتیں۔ وہ ان کی ساری باتیں خاموشی سے سن لیتی اور جواب میں ایک لفظ بھی نہیں کہتی تھی۔

اُس روز امان بڑی آپا کے بلانے پر اُن کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ کپٹوم اور ہما بھی اسکول گئی ہوئی تھیں۔ گھر میں بس وہ اور چھوٹی آپا تھیں۔ چھوٹی آپا موقع دیکھتے ہی پھر اسے سمجھانے لگیں۔



”وکیجو تم جس آگ میں چپ چاپ سُلگ رہی ہو، اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟“  
وہ صب عادت خاموشی سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”اس طرح مت دیکھا کرو ربیعہ، مجھے وحشت ہونے لگتی ہے۔“ اس نے پلکیں جھٹکائیں تو چھوٹی آپا نے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔

”میرے خدا۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے ربیعہ؟ خدا کے لیے کچھ بولو،“  
”کیا بولوں؟“ وہ بے بس نظر آنے لگی۔

”کچھ بھی۔ اچھا ایسا کرو جو کچھ تمہارے دل میں ہے سب کہہ ڈالو۔“

”آپ جانتی تو ہیں۔“ اس کے ساتھ ہی وہ رونے لگی۔ چھوٹی آپا اس کے رونے سے پریشان تو ہوئیں لیکن چپ نہیں کرایا سو شاید اسی طرح دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ کافی دیر بعد جب وہ خود ہی چپ ہو گئی تو بولی۔

”میں نے کبھی سوچا یہی طرح دل کا بوجھ ہلکا ہوگا۔ میں آپ کو بتاؤں چھوٹی آپا، میں نے جان بوجھ کر اس راستے پر قدم نہیں رکھا تھا۔ شائبہ حسن پتا نہیں کیسے اچانک ہی میری نظروں کے سامنے آ گیا۔ اور آپ تو جانتی ہیں میری عادت کو کسی بھی اچھی چیز کو دیکھ کر اس پرستے نظریں پٹانا بھولی جاتی ہوں اور پھر شائبہ حسن تو یونانی دیوتاؤں کا سائن رکھتا ہے۔ میں کیسے اسے نظر انداز کر دیتی۔“

وہ بار بار میرے سامنے آنے لگا اور میری سمجھ میں نہیں آتا اسے مجھ میں کیا نظر آیا جو میری طرف لپکتا تھا۔ میں تو بہت عام سی لڑکی ہوں۔ کاش وہی مجھے نظر انداز کر دیتا تو آج میں ان حالوں کو نہ پہنچتی۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

”اب یہ جاننے کے بعد کہ اسے پانا تو دور کی بات میں اسے کبھی دیکھ بھی نہیں سکوں گی، میرا دل اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا۔ چھوٹی آپا، مجھے کسی بے قرار نہیں آتا۔ میں اس کے خیال سے جتنا دامن بچانے کی کوشش کرتی ہوں، وہ اتنا زیادہ مجھ پر حاوی ہوتا جاتا ہے۔ مجھے لگتا ہے میں کبھی بھی اسے جھٹلا نہیں پاؤں گی۔ اماں نے اچھا نہیں کیا اور وہ کیا سمجھتی ہیں اس چار دیواری میں مقید ہو کر میں اس کا خیال چھوڑ دوں گی۔ نہیں، اس کا خیال تو میری نس نس میں سما یا ہے۔ وہ میری ہر سانس میں مہلبا ہے۔“ اس کے آنسو پھر تواتر سے بہنے لگے۔

”لوگ کہتے ہیں کوئی کسی کے بغیر نہیں مرنے والا۔ شاید ٹھیک کہتے ہوں۔ وہ میرے بغیر زندہ ہوگا اور میں اس کے بغیر زندہ ہوں لیکن پھوٹی آپا۔ میں زندہ نہیں ہوں، زندہ لاش ہوں۔ میرے اندر ساری خواہشیں، ساری آرزوئیں مر گئی ہیں۔ میرے احساسات بھی میرے ساتھ نہیں دیتے۔ پھر جھٹلا میں کیسے زندہ ہوں؟ بتائیں، کیا میں آپ کو زندہ نظر آتی ہوں۔“

”ربیعہ۔“ چھوٹی آپا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبایا۔ ”تم بہت بزدل ہو۔ زندگی میں تو اس سے کہیں زیادہ کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور تم پہلے ہی قدم پر حوصلہ ہار گئیں۔“

”یہ تو اناں سے صاف صاف کہہ دو کہ شائبہ حسن نہیں تو کوئی بھی نہیں یا پھر اس کا خیال دل سے نکال دو اس طرح جو تم چپ چاپ اندر ہی اندر جل رہی ہو، یہ انتہائی بزدلی اور احمقانہ پن ہے۔“

”میں ایسا نہیں کر سکتی۔ نہ اماں کے سامنے ایسی کوئی بات کر سکتی ہوں اور نہ ہی اس کا خیال دل سے نکل سکتا ہے۔“

”تو پھر مجھے اماں سے بات کرنے دو، ان کے خیال میں میں بدتمیز اور بدکالظ تو ہو چکی ہوں، تمہاری خاطر ایک بار پھر یہ الزام سہل ہونے لگی۔“

”آپ آپ کیا بات کر رہی ہیں؟ وہ مایوسی سے بولی۔ اماں نے شائبہ حسن کے گھر والوں کو مایوس تو لوٹا ہی دیا ہے۔ اب وہ دوبارہ کیسے آئیں گے بھلا؟“

چھوٹی آپا سر ہلاتے ہوئے جانے کیا سوچنے لگیں۔ کافی دیر بعد انہوں نے اسے مخاطب کیا تو وہ چونک کر

دیکھنے لگی۔

”تم ایک کام کرو۔ کسی بھی طرح شائبہ حسن کو یہ پیغام بھیجو کہ وہ اپنی اماں کو دوبارہ بھیجے۔ آگے میں سنبھال لوں گی۔“

”میں کیسے اسے پیغام بھیج سکتی ہوں؟ آپ دیکھ رہی ہیں اماں نے میرا گھر سے نکلنا ہی بند کر دیا ہے۔“

”چھوٹی آپا کچھ بدتمیز اس کی طرف دیکھتی رہیں پھر کہنے لگیں۔“

”اچھا۔ یہ کام بھی میں ہی کرتی ہوں۔“

”آپ کیا کریں گی؟“ وہ حیران و پریشان ہو کر بولی۔

”تمہارے کالج جا کر انیلا سے ملوں گی۔“

”لیکن۔“

”لیکن ویکین چھوڑو۔ میں کل ہی اماں سے کوئی بھی بہانہ کر کے تمہارے کالج جاؤں گی۔“ پھر اس کا ہاتھ تھپکتی ہوئی بولیں۔ ”مجھ سے تمہاری یہ حالت نہیں دیکھی جاتی۔ اور پلینر تم بھی اپنے اندر ذرا سی ہمت پیدا کر لو ایسا نہ ہو تمہاری بزدلی میرے سارے کیسے کرانے پر پانی پھیر دے۔“

”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”خبردار۔“ چھوٹی آپا نے آنکھیں دکھائیں۔ ”بالکل بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے اور سنو بلا خوف و خطر ان خوابوں کو آواز دے ڈالو جو تم نے سنا ہے ہوں گے۔ اور میں ان کے شرمندہ تعبیر ہونے کے لیے دعاگو تو ہوں ہی کل کوشش بھی کر دوں گی؟“

”اس کی نظروں میں شائبہ حسن کا سراپا آسمان، دراز قامت، سرخی مائل سفید رنگت، براؤن بال اور بڑی بڑی براؤن آنکھیں۔ جن میں اس کے دل کی ہر بات واضح طور پر تحریر ہو جایا کرتی ہے۔ دل آداس ہو تو آنکھوں کے دپ نیچے پڑے۔ دل شونی و شرارت پر آمادہ ہو تو آنکھیں ہنسنی ہوئی ہلکتی تھیں۔ اس نے مٹیوں کے رنگ پہلی بارانی ہی آنکھوں میں تو دیکھے تھے۔“



”کوئی گھنٹہ پھر بعد چھوٹی آپا واپس آئیں۔ اُس وقت وہ کچن میں تھی۔ اُن کی آواز سن کر دل چاہا بھاگتی ہوئی اندر جائے اور اُن سے ساری تفصیل پوچھ ڈالے۔ لیکن اُن کا خیال کر کے وہ وہیں رُک رہی۔ کچھ دیر بعد چھوٹی آپا خود ہی پانی پینے کے بہانے آگئیں۔ انہیں دیکھتے ہی وہ محترم سوال بن گئی۔“

”انیلا بیماری کے باعث ایک ہفتے کی چھٹی پر ہے۔“ انہوں نے بلا تہید ایک ہی جملے میں ساری صورت حال واضح کر دی۔

”اب کیا ہوگا؟“ وہ پھر مایوس ہونے لگی۔

”ہوگا کیا۔ ایک ہفتے کی تو بات ہے۔ اُس کے بعد پھر چلی جاؤں گی۔“ چھوٹی آپا نے اطمینان سے جواب دیا تو وہ یس اُن کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

”اب خدا کے لیے تمہاری ساری ہوجا کر اندر ہی اندر جلتے مت لگنا۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ چھوٹی آپا نے ہلکے سے ڈانٹا تو وہ سر ہلانے لگی۔“

پھر یس دودن ہی وہ چھوٹی آپا کے اطمینان دلانے پر قدرے مطمئن رہی تھی کہ تیسرے دن ایک خاتون نے اگر اس کا یہ تھوڑا سا اطمینان بھی چھین لیا۔ ان کا علیہ اور چال ڈھال بتا رہی تھی کہ وہ کوئی معمولی عورت نہیں ہیں، اُن کا لباس سادہ مگر بیش قیمت تھا اور وہ آئی بھی لمبی سی محاذی پر تھیں۔ اُن انہیں دیکھ کر خاصی مرعوب ہوئیں اور پہلی بار انہیں اپنا گھر بہت معمولی لگا۔ بوکھلاہٹ میں ادھر ادھر بولیں دیکھنے لگیں۔ جیسے انہیں اُن کے لیے کوئی بھی جگہ مناسب نہ لگ رہی ہو۔

ان دونوں کو جلتے ہوئے دیکھ رہی تھیں پھر وہ ایک دم اماں کی طرف متوجہ ہوئیں تو اماں نے فوراً نظروں کا زاویہ بدل لیا۔  
”وہ جو بائیں طرف آپ کی بچی جا رہی ہے، اُس کا کیا نام ہے؟“ اماں نے پلٹ کر دیکھا پھر اہستہ آواز میں بولیں۔

”ربیعہ۔“  
”ماشاء اللہ بہت پیاری بچی ہے۔ اور یقیناً میرے شہرہ زکے ساتھ خوب سمجھ گئی۔“ اماں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تو کہنے لگیں۔ ”آپ کل ہی اکرام صاحب کے ساتھ ہمارے ہاں تشریف لائیں۔“  
پھر وہ اماں کو اپنے گھر کا پتا سمجھانے لگیں۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں چلنے لے کر آئیں تو تانبہ نے دونوں کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ اور چائے کے دوران یوں ہی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔  
ان کے جانے کے بعد کلثوم انگشت کی کتاب لے کر چھوٹی آپا کے پاس آ بیٹھی۔ وہ اُسے پڑھانے میں لگ گئیں۔ ربیعہ کو اماں نے رات کے کھانے کے لیے کہا تو وہ اُٹھ کر کچن میں آ گئی۔ اُس کا ذہن اچانک ہی مختلف خیالات کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ وہ اجنبی خاتون جو ابھی کچھ دیر پہلے آئی تھیں، انہیں دیکھ کر اتنا تو وہ سمجھ گئی تھی کہ کسی خاص مقصد سے آئی ہوں گی لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کس کے لیے آئی ہیں؟۔  
کیونکہ وہ اُس سے اور چھوٹی آپا سے ایک ہی بچے میں بات کر رہی تھیں۔  
”کاش چھوٹی آپا کی بات بن جائے۔“ وہ سوچنے لگی۔ ”دنیا میں اچھے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ دیکھنے میں تو خاصی مہربان نظر آئی تھیں۔ ہو سکتا ہے انہوں نے چھوٹی آپا کو پسند کر لیا ہو۔“ پھر وہ کتنی دیر تک چھوٹی آپا کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔

ابامیاں آئے تو اماں انہیں لے کر اندر چلی گئیں۔ وہ یقیناً انہیں اُن خاتون کی آمد کے بارے میں بتا رہی ہوں گی۔ لیکن پتا نہیں کیوں اتنی رازداری برت رہی تھیں۔ اُس کی طرح چھوٹی آپا بھی کچھ الجھن میں تھیں۔ لیکن اپنے بارے میں خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوئیں۔ انہیں ربیعہ کا خیال تھا اور وہ سوچ رہی تھیں اگر اماں نے یہاں ہائی بھری تو پھر ناقص سن والے معاملے کا کیا ہوگا؟ اسی لیے انہوں نے ربیعہ کے سامنے اُس خاتون کا ذکر نہیں چھیڑا کہ کہیں وہ ابھی سے اندیشوں میں نہ گھر جائے۔

اگلے دن اماں کی سرگرمیاں کچھ پُرانہ سی تھیں۔ ابامیاں کے آفس جانے کے بعد انہیں بیٹھے بیٹھے بڑی آپا یاد آئے لگیں۔ اور وہ اُسی وقت اُٹھ کر ان کی طرف چل دیں۔ وہاں سے واپس آئیں تو کچھ بوکھلائی ہوئی سی تھیں کبھی اپنا پاکس کھولتیں اور کبھی ابامیاں کا۔ پھر ابامیاں بھی معمول سے بہت پہلے آفس سے آگئے تھے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ اور اماں کہیں جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اتنے میں بڑی آپا اور عام بھائی بھی آگئے۔ پھر وہ چاروں مل کر پتا نہیں کہاں چلے گئے۔

اُن کی واپسی اس وقت تھی جب شام گہری ہو کر رات میں ڈھلنے لگی تھی۔ اماں آئی تو بے حد خوش تھیں۔ اُن کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ ابامیاں البتہ سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

”چھوٹی آپا۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ وہ سرگوشی میں پوچھنے لگی۔  
”پتا نہیں۔ میری تو اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“ چھوٹی آپا نے لاعلمی ظاہر کی۔ پھر کہنے لگیں۔ ”ایک دو دن صبر کرو۔“ اماں خود ہی اس راز سے پردہ اٹھا دیں گی۔

لیکن انہیں دو دن صبر نہیں کرنا پڑا۔ اگلے دن ہی اماں چھوٹی آپا کو اپنے پاس بٹھا کر کہنے لگیں۔  
”رات ہم نے ربیعہ کی بات طے کر دی ہے۔ پرسوں جو بیگم احمد حسن آئی تھیں، اُن کے بیٹے کے ساتھ“  
فوری طور پر چھوٹی آپا کچھ بول ہی نہ سکیں۔ بس حیرت سے اُن کے ہونٹ نیم وا ہو کر رہ گئے تھے۔  
جب کہ اماں تفصیلات بتاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”اُسی دن وہ ربیعہ کو پسند کر کے ہمیں اپنے گھر آنے کی دعوت دے گئی تھیں۔ رات ہم اُن ہی کی طرف

”یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔“ خاتون برآمدے میں رکھے تخت پوش پر غور ہی بیٹھ گئیں۔ اُن کا نرم لہجہ اس بات کا غماز تھا کہ وہ بہت دھیمے مزاج کی عورت ہیں۔

”آپ؟“ اماں اُن کی آمد کا مقصد جاننا چاہتی تھیں۔ بس اسی قدر کہہ سکیں۔

”آپ اطمینان سے بیٹھیں تو میں اپنے بارے میں بتاؤں۔“ خاتون نے کہا۔ ”تو اماں اُن کے سامنے بیٹھ گئیں۔“

”میں بیگم احمد حسن ہوں۔“ وہ کہنے لگیں۔ ”میرے شوہر کا تقریباً تین سال قبل انتقال ہوا تھا، اُس وقت شہرہ زکیم بی۔ اے کر کے لوٹا تھا۔“ لمحہ بھر کو رُک کر کہنے لگیں۔ ”شہرہ زکیم سب سے بڑا بیٹا ہے اور میں اسی کے لیے یہاں آئی ہوں۔“

”اُس گھر کا پتا آپ کو کس نے دیا؟“ اماں پوچھنے لگیں۔

”خاص طور سے آپ کے گھر کا پتا کسی نے نہیں دیا۔“ انہوں نے بُردباری سے جواب دیا۔ ”میں نے غالباً کسی گھر یا کسی تقریب میں آپ کی بچیوں کا ذکر سنا تھا کہ ماشاء اللہ بہت نیک اور سلیقہ شعار ہیں۔ مجھے اپنے بیٹے کے لیے لڑکی کی تلاش تھی، اس لیے میں نے اپنے طور پر خود آپ کا گھر تلاش کیا۔“ اماں کے خاموشی سے دیکھنے پر کہنے لگیں۔

”اکرام علی آپ کے شوہر کا ہی نام ہے ناں۔“

”جی ہاں۔“

”بس تو میں اکرام علی صاحب کا گھر پوچھتے ہوئے یہاں تک آئی ہوں۔“

”آپ چائے پئیں گی یا۔“ اماں طویل سانس لینے کے بعد پوچھنے لگیں۔

”چائے اس شرط پر پیوں گی کہ آپ مجھے مایوس نہیں لوٹائیں گی۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

”ہاں۔ یہ سب تو مقدری باتیں ہیں۔“ اماں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ اور پھر اندر چلی گئیں۔ ربیعہ اور چھوٹی آپا ایک ہی جگہ بیٹھی تھیں۔ وہ باری باری دونوں کو دیکھنے لگیں۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آیا، چائے کے لیے کس سے کہیں۔

”باہر جو خاتون اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آئی تھیں۔ وہ حیثیت میں اماں کی توقع سے کہیں بڑھ کر تھیں۔“

اماں نے اپنی بیٹیوں کے لیے خوشحال گھرانوں کی خواہش ضرور پال رکھی تھی لیکن اُن کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کسی امیر زادے کا رشتہ بھی آسکتا ہے۔ پہلے سہیل کے رشتے کو وہ صرف اس لیے رد کر چکی تھیں کہ انہوں نے چھوٹی آپا کے بجائے ربیعہ کو پسند کر لیا تھا۔ اور اب جبکہ سب نے انہیں یہ بات سمجھا دی تھی کہ صوفیہ یار بیچہ میں سے جس کی بھی بات بن جائے، اُسی کی شادی کر دیں تو ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، ان دونوں میں سے کسے اُن کے سامنے بھیجیں؟۔ گو کہ ماں ہونے کے ناتے اُن کی خواہش تھی کہ صوفیہ بڑی ہے، پہلے اس کی شادی ہو۔ لیکن یہ خدشہ کہ پھر کے نقص کی وجہ سے وہ رد کر دی جائے گی، انہیں مجبور کر رہا تھا کہ وہ ربیعہ کو اُن کے سامنے بھیجیں۔ دل پر پھر رکھ کر انہوں نے آواز ربیعہ کو ہی دی لیکن پھر کچھ سوچ کر دونوں کو ہی باہر آنے کے لیے کہا۔

”کیا بات ہے اماں؟“ چھوٹی آپا نے پوچھا۔ لیکن اماں کوئی جواب دیے بغیر وہیں سے پلٹ آئیں اور ابھی دوبارہ اُن خاتون کے سامنے تخت پوش پر بیٹھی ہی تھیں کہ ان کے پیچھے چھوٹی آپا اور ربیعہ آ گئیں۔ ان دونوں کو معلوم نہیں تھا کہ اماں کے ساتھ کوئی اور بھی موجود ہے، اس لیے اپنی دھن میں چلی آئیں لیکن جب اُن خاتون پر نظر پڑی تو دونوں ٹھٹھک کر رُک گئیں۔

”آؤ بیٹی۔ رُک کیوں گئیں؟“ خاتون نے شفقت سے کہا تو دونوں اماں کی طرف دیکھنے لگیں۔

”میرا خیال ہے، پہلے چائے بنا لو۔“ اماں نے کسی ایک کو مخاطب کر کے نہیں کہا تھا، اس لیے دونوں کچن کی طرف چلی گئیں۔ اور اماں دُزدیہ نظروں سے بیگم احمد حسن کے چہرے کے تاثرات دیکھنے لگیں جو

گئے تھے۔ ماشاء اللہ بہت بڑے لوگ ہیں۔ شہر و زامراں کے سب سے بڑے بیٹے ہیں اور اس نلے گھر کی زیادہ تر ذمہ داریاں ان ہی کے کندھوں پر ہیں۔ لیکن پیسے کی فراوانی نے ذمے داریوں کو بوجھ نہیں بنایا ہوا اور پھر گھر کے افراد بہت زیادہ نہیں ہیں۔ کل چار بہن بھائی ہیں۔ بڑی بہن شادی شدہ ہیں پھر شہر و زامراں ان کے بعد عمر و زامراں سے چھوٹی ایک بہن ہے۔ امان خالصہ اطمینان سے تفصیل بتا رہی تھیں۔

”یہ سب تو ٹھیک ہے اماں۔ لیکن آپ پہلے ربیعہ سے تو پوچھ لیں؟ چھوٹی آپا بمشکل بول پائیں۔“

”ربیعہ سے پوچھ لوں۔“ اماں نے ان کی طرف یوں دیکھا جیسے انہوں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔

”ہاں اماں۔ آپ کو اُس سے پوچھنا چاہیے۔“ چھوٹی آپا نے پوری قوت سے کہا۔

”کیوں؟ کیا میں اُس کی دشمن ہوں؟“ اندھے کنوں میں چمک دھنکی لے لے۔ امان کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔

”بڑی کی شادی کی، اُس سے پوچھا؟ تمہارے لیے سوچتے ہوئے کبھی تم سے پوچھا؟ پھر وہ کیا آسمان سے اُتری ہے جو پہلے اُس کی رائے لوں؟“

”اماں۔ آپ سمجھ نہیں رہیں۔“ چھوٹی آپا الجھ کر بولیں۔

”بس بی بی۔ مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش بھی مت کرو۔ میں نے تمہیں ساری بات اس لیے بتائی ہے کہ آج وہ گھر ربیعہ کو انگوٹھی پہنانے آرہے ہیں۔ تم ذرا چھوٹی دونوں کے ساتھ مل کر گھر ٹھیک ٹھاک کر لو؟“

”اُس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا یہی تھا کہ اماں پھر بول پڑیں۔“

”ابھی کچھ دیر میں تمہاری بڑی آپا بھی آنے والی ہوں گی۔ پھر اُن کے ساتھ مل کر شام کے کھانے یا ناشتے وغیرہ کا جو بھی انتظام کرنا ہو، کر لینا۔“ اُس کے ساتھ ہی اماں اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“

”میں تمہارے ماموں جی کی طرف جا رہی ہوں۔ انہیں بھی شام کی دعوت دے دوں اور وہ کہیں گے بالابہی بالابہ کر لیا۔“

”اور تیا باجی؟“

”انہیں ہم رات ہی کہتے ہوئے آئے تھے، وہ آجائیں گے۔“ اماں غلت میں کہتی ہوئی چلی گئیں اور چھوٹی آپا نے اس ساری صورت حال کو ابھی نئے سرے سے سوچنا شروع کیا ہی تھا کہ ربیعہ دبے پاؤں ان کے پاس آ کھڑی ہوئی اور قدرے دھیمی آواز میں پوچھنے لگی۔

”کیا ہوا چھوٹی آپا؟“ یہ اماں کہاں چلی گئی ہیں؟ وہ متبست سی ہو کر بولی۔

”ماموں جی کے گھر۔“ چھوٹی آپا طویل سانس لیتے ہوئے بولیں پھر اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا اور چپ چاپ اُس کی طرف دیکھ گئیں۔

”اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں؟“ وہ ابھی کہہ کر پوچھنے لگی۔

”ربیعہ۔ تمہاری قسمت تمہارا ساتھ نہیں دے رہی۔“

”کیا مطلب؟“ وہ بالکل نہیں سمجھی۔

”دیکھو میری بات عقل سے سننا اور پلیر رونامت۔“ چھوٹی آپا اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولیں۔ ”اُس دن جو خاتون آئی تھیں، اماں اور ابامیاں نے ان کے بیٹے کے ساتھ تمہاری بات طے کر دی؟“

”کیا۔“ اُسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

”ہاں ربیعہ۔ اور آج شام وہ باقاعدہ تمہیں اپنا پابند کرنے آرہے ہیں۔“

”نہیں چھوٹی آپا۔“ وہ رونے لگی۔

”رؤمت ربیعہ۔ رونے سے حالات بدل تو نہیں جائیں گے۔“

”لیکن آپ نے تو کہا تھا۔“ وہ رونے کے سبب اپنی بات پوری نہ کر سکی۔

”ہاں۔ میں نے کہا تھا کہ میں تمہاری خاطر اماں سے لڑوں گی۔ لیکن لڑنے کا وقت کہاں ہے۔ یہ ساری باتیں ایک دم ہی طے ہو گئیں۔ اگر درمیان میں کچھ دن ہوتے، تب میں بات کر سکتی تھی۔ اب اگر میں کوئی بات

کروں گی تو اماں سمجھیں گی، میں تمہاری راہ میں رکاوٹ بن رہی ہوں جب کہ میں نے خود انہیں اس بات پر راضی کیا تھا کہ وہ میری دہر سے دوسری بیٹیوں کو نہ بٹھائے رکھیں۔“

وہ اور شدت سے رونے لگی۔

”میری بہن، اب صحت کا تقاضا یہی ہے کہ اسے مقدر کا کھاسم سمجھ کر قبول کر لو۔“

”لیکن۔“ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ برآمدے سے آتی بڑی آپا کی آواز سن کر گھبرا کر چھوٹی آپا کی طرف دیکھنے لگی۔

”تم جلدی سے اسٹور میں چلی جاؤ۔“

”چھوٹی آپا نے کہا تو وہ فوراً اٹھ کر چلی آئی۔ اسٹور کا دروازہ اندر سے بند کرتے ہی وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔“

”کھودینے کے احساس نے اُسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ دل الگ مل چلی کراحتجاج کرنے لگا تھا۔ اُس کی کچھ میں نہیں آ رہا تھا، یہ سب اتنا اچانک کیسے ہو گیا؟ اور اُس کے ساتھ ہی کیوں ہوا؟ کتنے حسین خواب سجاٹے تھے اُس نے۔ کبھی سوتے میں اور کبھی جاگتی آنکھوں۔ وہ خواب سارے اس طرح ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، اُس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا اور اب جب کہ کتب حقیقت نے اُسے بیدار کر دیا تھا تو ٹوٹے خوابوں کی کرجیاں اس کی روح میں اُتری جا رہی تھیں۔ جن کی جھپٹ آنکھوں میں بھی اُتری ہوئی تھی۔“

”ناقیب حسن۔“ وہ بے آواز صدائیں دینے لگی۔ ”تم نے کہا تھا، جن آنکھوں میں محبتوں کے دیپ جلتے ہوں اُن میں پانی نہیں اُترنا چاہیے، ورنہ دیپ بجھ جاتے ہیں۔ یہ دیپ بجھنے سے پہلے کہیں سے آجاو۔ کہیں سے آجاؤ ناقیب حسن۔ کہیں سے آجاؤ۔“ وہ دوسری ہو کر وہیں فرس پڑ پڑ گئی اور کہیں سکین کی آواز باہر نہ جانے، منہ پر ہاتھ رکھ کر مگھشوں پر رکھ لیا۔

”ربیعہ۔“ دروازے کے قریب اُسے چھوٹی آپا کی آواز سنائی دی۔ پہلے اپنا وہم لگا لیکن جب غور کیا تو وہ دروازے پر ہلکی ہلکی دستک دے کر اُسے پکار رہی تھیں۔

”ربیعہ پلینر، اب باہر نکلو۔ بڑی آپا بھی تمہارا پوچھ رہی ہیں۔“ اُس نے جلدی سے آنکھیں اور چہرہ صاف کیا اور اٹھ کر دروازہ کھولی دیا۔ چھوٹی آپا اسے دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔ شدت گریہ سے آنکھیں ترخ ہونے کے ساتھ سونج بھی گئی تھیں۔

”کیا کیا حالت بتاتی ہے؟“

”اُس کی آنکھیں پھر پانیوں سے بھر گئیں۔“

”خدا کے لیے بس کرو۔“ چھوٹی آپا نے شوک دیا۔ چلو جا کر جلدی سے منہ ہاتھ دھو لو۔ اماں بھی بس آنے والی ہوں گی۔ اور سنو اسی طرح مت بڑی آپا کے سامنے چلی جانا۔“ وہ کچھ نہیں بولی، پلٹ کر آئے کی طرف کا دروازہ کھولا اور وہیں سے نکل کر ہاتھ روم میں چلی گئی۔

”کتی دیر تک آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتی رہی۔ پھر صابن سے منہ دھو کر باہر نکل آئی۔ کمرے میں آئی تو بڑی اور چھوٹی آپا بل کر شام کا پروگرام طے کر رہی تھیں۔ اس پر نظر ڈی تو بڑی آپا پلکے سے مسکرائیں۔ اور اُس نے کیونکہ چہرہ صاف نہیں کیا تھا، اس لیے بہانے سے تولیہ اٹھا کر منہ چھپالیا۔ بڑی آپا نے اس کی اس حرکت کو شرم پر معور کیا اور زور سے ہنس پڑیں۔“

”بہت لمبی ہو تو ربیعہ۔ شہر و زامراں کے پورے گھر والے بہت اچھے ہیں۔ میں پرچ بہت متاثر ہوں۔ بڑی آپا نے پہلے اُس سے کہا پھر چھوٹی آپا کو ان کے گھر کے لیے ایسے فرد کے بارے میں بتانے لگیں اُس نے موقع غنیمت جانا اور چپکے سے وہاں سے کھسک آئی۔ ویسے بھی اُسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔“

پھر شام تک کا وقت اُس نے اکیلے کمرے میں گزارا۔ کلثوم اور ہما گھر کو ٹھیک ٹھاک کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ بڑی آپا اور چھوٹی آپا کچن میں گھسی شام کے لیے پٹا نہیں کیا کچھ تیار کر رہی تھیں۔ ابامیاں بھی اسی

وقت آگئے تھے۔ اماں خود بھی بوکھلا رہی تھیں اور انہیں بھی بوکھلائے دے رہی تھیں۔ سب کیونکر یہ مصروف تھے، اس لیے کسی نے اُس کی روٹی روٹی آنکھوں پر غور نہیں کیا۔

وہ اکیلے کمرے میں بیٹھی بس اپنے آپ پر کڑھتی رہی تھی۔ اور اب تو ذہن بھی ڈھنگ سے کام نہیں کر رہا تھا۔ شاید وہ تھک گئی تھی یا پھر حالات سے شکست مان لی تھی۔ ایک بار چھوٹی آپا کمرے میں آئیں تو وہ گم سم سی بیٹھی تھی۔ انہیں اُسے دیکھ کر واقعی دکھ ہوا لیکن وہ کچھ کرنے سے قاصر تھیں اور اب تو نستی کے دو بول بھی نہ کہہ سکیں۔ بس اتنا کہا۔

ربیعہ لیٹ جاؤ۔ بلکہ ہو سکے تو سو جاؤ۔“ اُس نے خاموشی سے اُن کی بات مان لی۔ تکیہ سیدھا کر کے لیٹ لی اور چادر سر تک اوڑھ لی۔ رونے کی وجہ سے آنکھیں بو جھلی ہو رہی تھیں، ذرا سی جھپکیں تو بند ہوتی چلی گئیں۔ اور پھر نیند بھی مہربان ہو گئی۔

جانے کتنی دیر تک سو رہی تھی۔ خود سے اٹھی بھی نہیں۔ بڑی آپا نے اکراٹھا یا تھا۔ وہ کتنی دیر تک خاموش نظروں سے اُن کی طرف دیکھتی رہی۔

اتھ رہنا ہو۔ نہ باری نیریز میں بھی کچھ وقت لگے گا۔“ انہوں نے کہا تو وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ گھر میں چہل پہل کا احساس ہوا تو یاد آیا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ دل میں ہلکا ہلکا سادرد اٹھنے لگا۔ آنکھوں میں نمی اترنے لگی جسے چھپانے کی خاطر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

”تم باغچہ روم میں جاؤ۔ میں تمہارے کپڑے وہیں پہنچا دوں گی۔“ بڑی آپا نے کہا تو وہ اُن کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے نکل آئی۔ بڑے کمرے سے ماموں جی اور تانیا جی کی بیسیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ رُکے بغیر سیدھی چلی گئی۔ جب نہا کر آئی تب سب لڑکیوں نے اُسے گھیر لیا۔

اُسی وقت اماں اس کے کپڑے اور زیور کچھ دیر پہلے بیگم احمد حسن نے بھجوائے تھے، لے کر آگئیں۔ اور لڑکیوں کو بدایت کی کہ جلدی اسے تیار کرو۔ پھر وہ خاموش تماشائی بنی اپنی آرزوؤں کو فنا ہوتے دیکھتی رہی تھی۔

شام ابھی پوری طرح نہیں ڈھلی تھی کہ بیگم احمد حسن اپنے کچھ خاص عزیزوں کے ساتھ آگئیں۔ مردوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ اور خواتین بڑے کمرے میں آگئیں۔ کچھ دیر بعد بڑی آپا نے اُسے لے جا کر بیگم احمد حسن کے پہلو میں بیٹھا تو شہر و زامہ کی بہنیں لپک کر اُس کی طرف آگئیں۔ اور بڑے اشتیاق سے اسے دیکھنے لگیں۔ پھر اُسے ان کی سرگوشیاں سنائی دینے لگیں جو کہہ رہی تھیں۔

”اتنی۔ آپ کا انتخاب واقعی لاجواب ہے۔“ سب اُس کی تعریف کر رہے تھے اور اس کے قریب بیٹھی بیگم احمد حسن تو اُس پر نشان ہوئی جارہی تھیں۔ اگر شاقب حسن کا خیال درمیان میں نہ ہوتا تو وہ اپنی اتنی تعریف پر یقیناً تھوڑی مغرور ہوتی اور قسمت پر شکر کہہ دیتی۔ لیکن اب تو اُسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ نہ تعریفی جملے، نہ والہانہ انداز۔ اس کے برعکس وہ سوچ رہی تھی۔ کائنات اس میں اچھی لگنے والی کوئی بات ہی نہ ہوتی اور بیگم احمد حسن اول روز ہی اپنے دل کے ناک بھجوں چڑھاتی ہوئی چلی جاتیں، لیکن وہ کیا کرتی کہ نہ صرف دیکھنے میں اچھی لگتی تھی بلکہ دل میں بھی لگ کر جاتی تھی۔

پھر بیگم احمد حسن نے اماں کی اجازت لے کر خود ہی اُسے انگوٹھی پہنائی تھی۔ اُس کے بعد وہ بس کچھ دیر ہی وہاں بیٹھی تھی۔ بڑی آپا کسی کام سے وہاں آئیں تو وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ اور اُن ہی کے سہارے چلتی ہوئی چھوٹے کمرے میں آگئی۔

”میں تمہیں وہاں سے اُٹھانے تو نہیں آئی تھی۔“ بڑی آپا کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہنے لگیں۔ ”میں تھک گئی تھی۔“ اُس نے عذر تراشا۔

”اُسے اتنی سی دیر میں اور شادی کے دن کیا کرو گی جو گھنٹوں بیٹھا پڑے گا؟“ اُس نے جواب نہیں دیا۔ اُن

کی طرف سے مرن موڑ کر زیور اُتارنے لگی۔

”ابھی مت اُتارو۔“ بڑی آپا نے روکا۔ ”ہو سکتا ہے جانے سے پہلے تمہاری ساس نندیں تمہارے پاس آئیں۔“

”بس بڑی آپا۔ اب یہاں کسی کو مت آنے دیجیے گا۔“

”جی۔ اب تم اُن کی امانت ہو۔ ہم انہیں کیسے روک سکتے ہیں؟“ اُن کی بات پر اس کا ذہن بھٹک گیا۔ ”تم میری امانت ہو۔ اور میں تمہارا ہاتھ کسی اور ہاتھ میں نہیں جانے دوں گا۔“ کتنے مان سے کہا تھا اُس نے جب بت کمرے میں اُسے بہت زیادہ عزیز ہو گیا تھا۔ بڑی آپا اُسے خاموش دیکھ کر چلی گئیں اور وہ ان کو اُن کی بازگشت سننے کو تنہا رہ گئی۔ اُسے اپنا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ جس طرح کھڑی تھی، اُسی طرح وہیں بیٹھ گئی۔ سر سے اُنیل ڈھلک کر کندھے پر آکر کا تھا۔ اور جو زیور اُتار رہی تھی تو فقط ایک کان کی بالی ہاتھ میں تھی۔

کتنی دیر گزر گئی۔ وہ ایک ہی نکتے پر نظریں مرکوز کیے گم سم سی بیٹھی تھی۔ باہر سب لوگ کھانے سے فارغ ہو کر اب شاید جلنے کی تیاری کر رہے تھے اور جلنے سے پہلے اُس کی ساس اور نندیں اس کے پاس آگئیں۔ ”اچھا بھابی۔ ہم جارہے ہیں۔“ اُس کی چھوٹی نند نے شوخی سے اسے مخاطب کیا۔ تو وہ چونکی اور روپٹ لپک کر سر پر اوڑھ لیا۔

”چھنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ شہر و زامہ جی ہمارے ساتھ نہیں آئے۔“

”مت تنگ کرو۔“ اتنی نے بڑھ کر اُس کے سر پر ہاتھ رکھا پھر قدرے جھک کر اُس کی پیشانی چوم لی۔ ”اچھا بیٹی۔ اب چلتے ہیں۔“

”یہ بھی بتا دیجیے، بہت جلد انہیں لینے آئیں گے۔ اس کی نند نندا خاصی شوخ لگ رہی تھی۔“

”انشاء اللہ۔“ اتنی (اس کی ساس) نے کہا۔ اور دونوں بیٹیوں کو چلنے کا اشارہ کیا۔

”زیادہ دن نہیں ہیں۔ اگلے مہینے آج ہی کی تاریخ کو دوبارہ آئیں گے۔“ بڑا جاتے جاتے بھی بہتی گئی اور اُس کا ہاتھ بے اختیار اپنے سینے پر چلا گیا۔

”میرے خدا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی جلدی کیوں ہو رہا ہے؟“ اُس نے سوچا اور دل دکھ سے بھر گیا پھر وہ اُٹھ کر اسٹور میں چلی گئی۔ زیور اُتار کر کپڑے تبدیل کیے اور جب باہر نکلی تو اُس کی گزرتا سے دیکھ کر چیخ پڑیں۔

”یہ کیا کیا؟“ ہم نے تو ابھی ڈھنگ سے تمہیں دیکھا ہی نہیں تھا۔“ وہ کیا کہتی۔ خاموش ہی رہی۔

”عجیب لڑکی ہو، تمہاری جگہ میں ہوتی تو کوئی کہتا بھی تو چیخ نہ کرتی۔“ عاصمہ کی بات پر اتنے دکھ کے باوجود اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رنگ گئی۔

”تھینکس گاڈ۔ ہونٹوں نے کچھ حرکت تو کی ورنہ میں تو سمجھتی تھی، دونوں نے ایک دوسرے سے جدا نہ ہونے کی قسم کھا رکھی ہے۔“

”کیں دونوں نے؟“ وہ بے خیالی میں پوچھ گئی۔ اور سب لڑکیاں بے ساختہ ہنس پڑیں۔ پہلے تو وہ سمجھتی نہیں، پھر جب خود کیا تو اپنی غائب دماغی پر دل ہی دل میں نادم ہوئی اور اپنے آپ کو سرزنش بھی کی۔

”کم از کم سب کے سامنے تو مجھ رہنا ہی چاہیے۔“

”سب لڑکیاں اُس کے سسرال والوں کی تعریف کرتے ہوئے بار بار اُسے خوش نصیب کہہ رہی تھیں اور اُس نے گھٹنوں پر پیشانی ٹکاتے ہوئے سوچا۔ اگر یہ خوش نصیبی ہے تو پتا نہیں بدل نصیبی کیا ہوگی؟“

وہ وقت کو روکنا چاہتی تھی۔ چاہتی تھی دن طویل سے طویل تر ہو جائیں، لیکن لمحے مسلسل اُس کی گرفت سے پھسلنے جارہے تھے۔ اندر کہیں شدید خواہش کے ساتھ ہلکی سی آہیں کہ شاید کوئی معجزہ ہو جائے، کوئی ایسی



بات جسے بنیاد بنا کر شہر و زامہ کی اتنی کسی دن آکر کہہ دیں ہم سے غلطی ہوئی، مغل میں ٹاٹ کا پونہ کبھی ہم نہیں لگ سکتا۔ آخر دنیا میں ایسا ہوتا تو ہے کہ عین وقت پر بھی لوگ شادی سے انکار کر دیتے ہیں۔ پھر میرے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہو رہا جب کہ میرے ساتھ تو ایک کہانی بھی منسوب ہے۔ شاقب حسن کی کہانی۔ اب اُسے کون سمجھا تا کہ اکثر جو باتیں ہم چاہتے ہیں کہ ہو جائیں وہ نہیں ہوتیں اور جو ہم نہیں چاہتے وہ ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ نہ وقت کو روک سکی اور نہ دن طویل ہو سکے اور آخری معجزے کی اس بھی اُس وقت ٹوٹ گئی جب وہ شہر و زامہ کے سنگ چلتی ہوئی بابل کا آنگن پار کر آئی۔ اُس نے تو ابھی کتاب زندگی کے اس باب کو بند بھی نہیں کیا تھا جو شاقب حسن سے منسوب تھا اور نہ مشرقی لڑکی ہونے کے نلکے شہر و زامہ کے ساتھ ہمیشہ وفادار رہنے کا کوئی عہد کر کے اپنے آپ کو بھلا یا تھا۔ اور آخری وقت تک حقیقت سے نظریں چرائی رہی تھی۔

شاید وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ بھیا ناک خواب۔ اور جب آنکھ کھلے گی تو سب کچھ اُس کی خواہش کے مطابق ہو گا۔ لیکن کچھ بھی اُس کی خواہش کے مطابق نہیں ہو گا۔ سبھی سنواری جملہ عروسی میں جب وہ تنہا رہے گی تو احساس ہو گا کہ خواب تو وہ تھا جو اُس نے پہلے دیکھا تھا اور حقیقت یہ ہے۔ ایک زخم خوردہ سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر اُٹھ رہی۔ دل کی کچھ عجیب سی کیفیت تھی۔ اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ کر شاید ٹھہر سا گیا تھا۔ اور انکھیں تو گزشتہ کئی روز سے خشک ہو چکی تھیں۔ اس وقت ذہن بھی خالی تھا۔ نہ کوئی سوچ، نہ کوئی خیال۔ بس کچھ تھکن کا احساس ہو رہا تھا۔ نیکی کے سہارے کمر سیدھی کرنا ہی چاہتی تھی کہ دروازے سے باہر آہٹ سن کر سنبھل کر بیٹھ گئی۔ دروازہ کھٹنے اور پھر بند ہونے کی آواز کے ساتھ ہی سویا ہوا ذہن اور ٹھہرا ہوا دل بیدار ہونے لگا۔ پھر قدموں کی آواز کو کہ کارپٹ پر واضح نہیں ہو رہی تھی لیکن لمحہ لمحہ اپنی طرف بڑھی محسوس ہو رہی تھی۔

ربیع۔ آئے والے نے اُسے پکارا نہیں تھا بلکہ اُسی انداز سے اُس کا نام لیا جیسے اپنی یادداشت کا امتحان مطلوب ہو۔ پھر بھی اُس کے وجود میں ڈرامی حرکت پیدا ہوئی اور وہ ان کی اگلی کسی بات کا انتظار کرنے لگی۔

کہتے ہی لٹے یونہی چپ چاپ مرک گئے۔ پھر وہ کہنے لگے۔  
”اُن اولیں لمحوں میں غالباً رومانی کی بات ہوتی ہے اور دینے والا یقیناً اپنی رفیق سفر کے لیے ایسی چیز منتخب کرتا ہے جو اُس کے جذبات کی ترجمانی کر سکے۔ اور لینے والا بھی یہ توقع ضرور رکھتا ہو گا کہ کوئی ایسا چیز ہو جو اچانک ہی اُسے بے پناہ خوشیوں کا احساس بخش دے۔“  
وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گئے اور اس کے اندر تو ویسے بھی کوئی ہلچل نہیں مچی تھی اور اب تو یوں لگ رہا تھا جیسے نہ معلوم سنائے اس کے اندر گھر کرتے جا رہے ہوں۔

ربیع بیگم۔ میں اپنے جذبات کی ترجمانی کرنے والی چیز ضرور منتخب کرتا اگر جو۔ خیر چھوڑیں۔ انہوں نے اُس کے جھلے ہوئے سر کو دیکھا پھر حجب سے ایک لفافہ نکال کر اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگی۔  
”البتہ آپ کو بے پناہ خوشی سے بھگتا کر نے والا تحفہ ضرور ہے میرے پاس۔ یہ لیجیے۔“  
اُس نے فوراً ہاتھ نہیں بڑھایا۔ بس ڈرامی پلکیں اٹھا کر ان کے بڑھے ہوئے ہاتھ کی طرف دیکھنے لگی۔  
”لیجیے ربیع۔ یہ آپ کے لیے ہے۔“ اُس نے لفافہ لے کر چاہا کہ اُسے کنارے رکھ دے لیکن وہ نہ لگے۔

اگر آپ اسے اسی وقت دیکھ لیں تو زیادہ بہتر ہے۔ اپنی بات کہہ کر وہ رخ موڑ کر قدے فاصلے پر جا کھڑے ہوئے۔ اُس نے کچھ جھپکاتے ہوئے سر اوچا کیا اور نظروں کا زاویہ بدل کر اُن کی طرف دیکھا۔ وہ اُس کی طرف پشت کیے کھڑے تھے۔ وہ آنکھیں لگی۔

پتا نہیں۔ یہ سب کیلئے ہے۔ اُس نے سوچا اور یوں ہی الجھتے ہوئے لفافہ کھول کر اُس کے اندر سے نکال لیا۔ تہہ شدہ کاغذ کھولنے سے پہلے ایک باہر اُن کی طرف دیکھا وہ اسی طرح کھڑے سگریٹ اسی تھے۔ اگلے پل گہرا دھواں اُس کے آس پاس پھیلنے لگا۔ تب طویل سانس لیتے ہوئے وہ کاغذ کھولنے لگی۔ اُسے غافل کر کے کھٹا گیا تھا۔  
ربیع میری زندگی!

ہم دونوں کے درمیان کبھی خط و کتابت تو ہوئی نہیں تھی اس لیے یقیناً میری تحریر تمہارے لیے اگائی ہوگی۔ بھئی میں ہوں شاقب حسن۔

شاقب حسن۔ اُس کے ہونٹوں نے بے آواز جیش کی اور سارے احساسات ایک ساتھ پیدا ہو گئے۔ انکھوں پر شیشی نمٹ آئی دلی جو کچھ پہلے تک ٹھہرا ہوا تھا، اس نور سے دھڑکا کہ شبہ ہوا اُس کی آواز قد سے فاصلے پر رہے شہر و زامہ نے بھی سنی ہوگی جب ہی وہ فوراً اُن کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ پھر اُن کی پشت سے ٹکرا کر نظریں اتر کاغذ پر دوڑنے لگیں۔ آگے کھٹا تھا۔

تم خیر ان ہو رہی ہو۔ ہاں یہ حیرت کی بات تو ہے۔ بھہر میں نہیں ساری بات بتانا ہوں۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ تم میری امانت ہو اور میں تمہارا ہاتھ کس اور کے ہاتھ میں نہیں جانے دوں گا۔ تو اب بھی تم اپنے آپ کو میری امانت سمجھو۔ ہاں تم شہر و زامہ کے پاس میری امانت ہو رہے سمجھیں جو قوف لڑکی، میں سمجھتا ہوں۔

”میں نے آماں اور ایلا کو تمہارے گھر بھیجا تھا لیکن وہی ہوا جس کا تہیں ڈرتا تھا یعنی تمہاری آماں نے صاف انکار کر دیا۔ اس دن مجھے بے حد دکھ ہوا اور یہ خیال کہ اب میں نہیں کبھی نہیں پاسوں گا۔ مجھے زندگی سے دور لے جانے لگا۔ اور میں سارے حوصلے ہار کر صرف گھر کا ہوا بچھے لگا جیسے اب میری زندگی میں کوئی مقصد نہ رہ گیا ہو۔ مجھے کسی پل قرار نہیں تھا۔ تم سے ملنا چاہتا تھا لیکن جانے کیوں تم نے کالج چھوڑ دیا۔ کتنے دن تک تو میں بس تمہاری راہ دیکھتا رہا تھا۔ پھر ہر طرف سے مایوس ہو کر ایک دن میں اُن کے سامنے رو پڑا۔ کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے میرے اندر حوصلہ پیدا کرنا چاہا لیکن میں نے صاف کہہ دیا کہ جب تک تمہارے ملنے کی امید نہ ہوگی، میں کچھ نہیں کر سکتا گا اور یہ حقیقت ہے کہ تمہارے ملنے کی آس کے بغیر میں کچھ نہیں کر سکتا۔

آماں کا خیال تھا کہ مجھے دوبارہ بہتر مستقبل کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے اور میں نے سوچا ایسا نہ ہو۔ میں جدوجہد ہی کرتا رہوں اور اس عرصے میں تم کسی اور کی ہوجاؤ اور یہی میں نہیں چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا، جب میں کسی قابل ہو جاؤں خواہ اس میں کتنا ہی عرصہ کیوں نہ لگے جب واپس آؤں تو تم میری منتظر ہو اور ایسا کوئی عہد تم نے میرے ساتھ نہیں کیا تھا۔ میں تمہیں الزام نہیں دے رہا ربیع بلکہ میں تمہارا ممنون ہوں کہ تم نے مجھے اندھیرے میں نہیں رکھا تھا۔ بہر حال میں نے سوچا اگر تم اپنے والدین کے گھر رہیں تو کبھی بھی میرا انتظار نہیں کر سکو گی۔ اس لیے میں نے یہ راستہ اختیار کیا۔

تم میری بات سمجھ رہی ہونا؟ اگر نہیں تو میں تمہیں بتاؤں کہ شہر و زامہ میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ دوست کم حسن۔ ایک بار پہلے بھی یہ مجھ پر احسان کر چکے ہیں، خیر اُس کی تفصیل تو بعد میں کبھی بتاؤں گا۔ اس وقت ان کا احسان یہ ہے کہ انہوں نے میرے کہنے پر تمہیں اپنا ہا۔ تم اس وقت تک میری امانت کے طور پر ان کے گھر ہو گی جب تک کہ میں تمہاری والدہ کے معیار کے مطابق بڑا آدمی بن کر نہ لوٹ آؤں۔ گو کہ شہر و زامہ اس بات کے لیے آمادہ نہیں تھے لیکن میں نے بڑی مشکل سے انہیں آمادہ کیا۔ تب ان کے گھر کس قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔ تم اطمینان سے رہنا اور نہ صرف میرے حوالے سے خواب سمجھنا بلکہ اُس کے دل پہ بھی جلا رکھنا۔

تم اور بھی بہت کچھ جانتا چاہو گی تو اُس کے لیے صبح کا انتظار کرو۔ صبح میں تم سے ملنے آؤں گا۔ اس وقت اتنی۔ باتیں بتا دیجی یوں ضروری سمجھیں کہ کہیں تم شہر و زامہ کے رویے سے پریشان

نہ ہوا جاؤ۔ ویسے شہر و زکا اصرار بھی تھا کہ میں تمہیں اتنا ضرور بتا دوں کہ اس سے تمہارا نکاح ضرور ہوا ہے  
لیکن تم ان کی بیوی نہیں ہو۔ باقی باتیں سمجھ کر لیں گے۔

تمہارا شائبہ

خط پڑھنے کے بعد بھی وہ کتنی ویرانگ اسی طرح بیٹھی رہی تھی۔ گو کہ اس نے سمجھانے کی کوشش کی تھی؛  
بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔

شہر و زکا اصرار سے کھٹکارتے تو وہ چونک گئی۔ اسے خیال ہی نہیں رہا تھا کہ کمرے میں کوئی اور بھی موجود ہے  
اپنے آپ میں بڑا عجیب سا محسوس کرتے ہوئے خط تہہ کر کے دوبارہ لفافے میں ڈالا اور کچھ دُرتے دُرتے فراموشی  
گھما کر ان کی طرف دیکھا۔ اور سامنے بیٹھا شخص کوئی غماں سا شخص نہیں تھا۔ کوئی ایسی بات اس میں تھی جس نے اس  
احساسات پر برف کی تہیں جا دیں۔ اور وہ اپنی عادت کے مطابق ایک ٹک نہیں دیکھتے ہوئے کھوس گئی۔

جلنے اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوتا تھا؟ جب بھی کوئی مفروضہ نظر آئی، وہ کھوکھی۔ کبھی ایسے مقام پر  
آپ پر اختیار نہیں رہا تھا۔ ہزار کوشش کرتی کہ نظروں کا زاویہ بدلے یا پکیں بھیر کالے لیکن کبھی کامیابی نہیں ہوتی  
شہر و زکا اصرار کی طرف متوجہ نہیں تھے۔ کوئی میگزین ہاتھ میں لیے، اسی میں مگن تھے لیکن جب پیشانی پر بے نام  
تپش محسوس ہوتی تو فوراً سراوچا کر کے دیکھا اور اسے یوں کھوٹے کھوٹے انداز میں اپنی طرف دیکھتے ہوئے پار  
جانے کیا سمجھے۔ کھڑے ہوتے ہوئے اپنی صفائی پیش کرنے لگے۔

یقین کریں اس سانسے قفسے میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں تو سرے سے مان ہی نہیں رہا تھا لیکن شائبہ  
”ہاں ثابت۔“ وہ جیسے ہوش میں آ گئی۔ سر کو ہلکے سے جھٹکا دیا اور سیدھی ہو بیٹھی۔

”میں شاید مزید اس سلسلے میں کچھ نہ کہہ سکوں۔“ انہوں نے جیب سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبا  
اور شعلہ لگنے کے بعد اس کی طرف متوجہ ہوئے تو کہنے لگے۔

”آپ کے دائیں طرف ڈریسنگ روم ہے اور اُدھر باتھ روم۔ اس طرف میرا اسٹڈی روم ہے۔ میں اگر  
میں جا رہا ہوں۔ آپ ریلیکس ہو جائیں۔ پھر جاتے جاتے کہنے لگے۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو یا کوئی اور  
بات ہو تو میرا دروازہ ناک کر دیجیے گا۔“ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے اسٹڈی روم کی طرف بڑھ گئے۔

وہ بہت خاموشی سے انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اور جب انہوں نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ  
بند کر لیا تو اس نے طویل سانس لے کر اپنے تئیں ہونٹے اعصاب کو پُر سکون کیا۔ پھر فوراً مسہری سے اتر آئی  
ڈریسنگ روم میں جا کر پہلے زوراً اتارے پھر ڈریس چن کر کے ہلکی پھلکی ہو گئی۔

وہاں سے نکلی تو باتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھو یا۔ پھر جب کمرے میں آئی تو پہلے یہ اطمینان کیا کہ  
یہاں کوئی نہیں آئے گا پھر بیڈ پر لیٹ گئی۔ نیند نہیں آرہی تھی اور کچھ فریش بھی ہوئی تھی اس لیے اس ساری سوزنا  
کا نئے سرے سے جائزہ لینے کی خاطر پہلے شائبہ حسن کا خط نکال کر دوبارہ اطمینان سے پڑھنے لگی۔ اب کچھ کچھ  
باتیں اس کی سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ پھر بھی کچھ انجین ضرور چھوڑ گئیں جنہیں سنبھالتے سنبھالتے وہ تنگ گئی تو اپنے  
آپ کو اطمینان دلایا۔

”صبح شائبہ حسن آئے گا تو اس سے پوچھ لوں گی۔“

”کیا واقعی صبح آئے گا؟“

صبح وہ اپنے معمول کے مطابق اٹھی۔ حسب عادت پہلے نماز پڑھی۔ اس کے بعد سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے  
آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی کھڑکی کے پاس آکھڑی ہوئی۔ ذرا سا پردہ ہٹا کر دیکھا۔ سامنے وسیع لان تھا جس میں  
مختلف اقسام کے پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ کنارے لگی باڑھ میں رنگین پتے ابھی تک جگمگا رہے تھے۔  
لیکن صبح کے آجائے میں ان کی روشنی قدر سے ماند پڑ گئی تھی۔

موسم بدل رہا تھا۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خشکی تھی۔ لان سے گزر کر پھولوں کی مہک چڑائی ہوئی ہوا اس کے بدن  
سے نکلتی تو اسے جھرجھری سی آگئی۔ اس کے باوجود اس نے گہری سانس لے کر تازہ ہوا اپنے اندر اتاری۔ یہاں

ظہر بہت خوبصورت لگ رہا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ اس نے اتنا بڑا گھر خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ اس کی سوچوں  
رسائی صرف اس حد تک تھی جیسا کہ بڑی آبا کا گھر تھا اور جب سے ثابت حسن اس کی سوچوں پر قابض ہوا تھا  
ب سے تو وہ بس اس کی ہمارے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ اس کی سنگت میں چلتے ہوئے باقی ساری باتیں کہیں۔  
ن منظر میں چلی گئی تھیں۔ بس ایک چھٹنا سا گھر اور شائبہ حسن کا ساتھ۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ اور اب یہاں کھڑے  
پر دو رنگ نظریں دوڑاتے ہوئے اس نے سوچا۔

”زندگی کا ایک رخ یہ بھی ہے جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ پُر سکون ماحول۔ زندگی میں جو جد  
ہے لیکن یہ خوف نہیں کہ کل کیا ہوگا؟ آج اور آنے والی یقیناً ان کی دسترس میں ہے۔ نہ فائدہ، نہ کوئی نگرہ،  
بہی تو کوئی، بچلی نہیں۔ یہ بچلی، افزائش اور بھاگ دوڑ تو ہم جیسے لوگوں کے نصیب میں لکھی گئی ہے۔“

”درازا کھلنے کی آواز پر اس کی سوچیں منتشر ہو گئیں۔ پٹ کر دیکھا شہر و زکا اصرار اسٹڈی روم سے نکل رہے تھے۔  
”السلام علیکم۔“ اسے متوجہ دیکھ کر انہوں نے سلام کیا اور کے بغیر دروازہ کھول کر باہر نکل گئے تو وہ طویل  
انس لیتی ہوئی دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے شہر و زکا لان میں داخل ہوتے دیکھا تو وہاں

ہمٹ آئی۔ معطر اور قدر سے خنک ہوائے اس کے ہاتھوں اور چہرے کو سرد کر دیا تھا۔ وہ ہتھیلیوں کو  
پس میں گر کر پھر ان سے چہرہ تصفیہ پاتی ہوئی بیڈ پر بیٹھی تو اسی وقت اس کی بڑی نیند آ گئی۔ ایسے وقت  
ری شرم آپ ہی آپ عمو کر آتی ہے لیکن اسے کیونکہ کوئی نیا احساس نہیں لانا تھا اس لیے وہ اسی طرح بیٹھی بے خیالی  
ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”نئی زندگی کی نئی صبح مبارک ہو۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تو اسے ایک دم احساس ہوا کہ اس  
ج نہیں بیٹھنا چاہیے تھا۔ فوراً سر جھکاتے ہوئے آہستہ آواز میں بولی۔  
”شکریہ۔“

”یہ شہر و زکا ہاں چلے گئے؟“ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔  
”غائبانہ میں نکل گئے ہیں۔“

”زندگی میں کچھ ہو جائے۔“ یہ منہ اپنی روٹیں کبھی تبدیل نہیں کرے گا۔“ وہ شہر و زکا اصرار کے بارے میں کہتی ہوئی  
سنگ روم میں چلی گئیں۔ واپس آئیں تو اس کے کپڑے بیڈ پر رکھتے ہوئے کہنے لگیں۔  
”تم نہا کر یہ ڈریس پہن لو۔ میں ابھی اگر تمہیں تیار کر دوں گی۔ سنو، اگر یہ پسند نہ آئے تو اپنی مرضی سے کوئی  
مرا سوٹ نکال لینا۔“ وہ جاتے جاتے کہتی گئیں تو وہ بیڈ پر رکھے سوٹ کو دیکھنے لگی۔ شوکنگ پنگ کلر  
نلوار سوٹ جس کے بڑے سے دوپٹے پر سہر کا کام کا جال بنا تھا۔

”میری پسند ناپسند سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ وہ ہلکے سے بڑبڑائی اور وہی کپڑے اٹھا کر ہاتھ روم میں  
گئی۔ نہا کر نکلی تو وہ اس کی منتظر تھیں، اسے لے کر ڈریسنگ روم میں آ گئیں۔ ڈریسنگ ٹیبل کے بڑے  
کینے کے سامنے بٹھاتے ہوئے پہلے اس کے بالوں میں برش کیا۔ پھر ڈرائیو سے خشک کرنے لگیں۔  
وقت اس کی چھوٹی مندر نما دروازے میں سے جھانک کر پوچھنے لگی۔

”آپنی۔ میں بھی آجاؤں؟“

”آجاؤ۔ میں ابھی تمہیں بلانے ہی والی تھی۔“ پھر ڈرائیو اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولیں ڈم  
نیچے اس کے بال خشک کرو، میں میک اپ کر دیتی ہوں۔“

”بھائی۔ آپ کے بال بہت خوبصورت ہیں۔“ نڈا اس کے بالوں میں برش کرتے ہوئے بولی۔  
”ہاں گئے بھی ہیں اور لمبے بھی۔“ آپنی نے تائید کی۔ پھر کسی ماہر بیوٹیشن کی طرح اس کا میک اپ کرنے  
، اس کا سر سے فارغ ہو کر انہوں نے اس کے بال بنائے پھر دوپٹے سر پر جاتے ہوئے نڈا سے کہنے لگیں۔  
”ماتحتی سے معلوم کرو نشتے کے لیے دہن کو وہاں لے آؤں یا یہیں بھجوا دیں گی۔“

نڈا سر ہلاتی ہوئی چلی گئی۔ تو آپنی اسے کمرے میں لے آئیں۔ اس نے دیکھا شہر و زکا اصرار صوفے پر بیٹھا اخبار

دیکھ رہے تھے۔ اس کی آمد کا انہوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ جبکہ آپ نے اسے جان کر کے برابر بیٹھا دیا۔ خاص نروس ہوئی۔ وزیدہ نظروں سے اُن کی طرف دیکھا تو انہوں نے بڑی خوبصورتی سے ہاتھ میں کپڑا اُٹھ کر رول کر کے اُس کے اور اپنے درمیان رکھ دیا۔

”بیٹھیں آپ۔ آپ کٹری کیوں ہیں؟“ وہ بہن کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔  
 ”میں ناشتہ کرتا کروں۔“ آپی جانے لگیں تو اُسی وقت نڈرائی دھکیلتی ہوئی آگئی۔ آپی نے اس کے مدد سے ناشتہ کے تمام لوازمات ٹیبل پر رکھ دیے پھر نڈرا کو لے کر چلی گئیں۔ کچھ دیر تک دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہے۔ شاید دونوں ہی اس انتظار میں تھے کہ پہلے وہ شروع کرے۔  
 ”آپ کے لیے چائے بناؤں؟“ طویل خاموشی سے گھبرا کر بالآخر وہ بول پڑی۔

”نہیں آپ ناشتہ کریں۔ میں اپنا کام خود کروں گا۔“  
 اُن کا بوجہ بہت عام سا تھا پھر بھی اسے لگا جیسے وہ کچھ جتنا رہے ہوں۔ اپنے آپ میں بڑا عجیب سا محسوس ہوئی۔ مشکل ایک سلاش لے سکی۔ اُس کے بعد چائے صرف اپنے کپ میں ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ انہا نے اس کے اٹھنے کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اطمینان سے ناشتہ کرتے رہے پھر خود ہی اپنے لیے چائے بنا کر ابھی دو گھنٹہ ہی لیٹے تھے کہ اُن کا بھائی مہروز دروازے پر دستک دے کر چلا آیا۔ وہ بیڈ پر بیٹھی تھی خواہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ مہروز نے مسکراتے ہوئے اُسے آداب کہا پھر شہزاد احمد سے کہنے لگا۔

”آپ کے کوئی دوست آئے ہیں ناقتب حسن؟“  
 شہروز براہ راست اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ اور اس کا دل جز ناقتب حسن کا نام سنتے ہی زور زور سے دھکا لگا تھا۔ اُن کے اس طرح دیکھنے سے ٹھہرنے لگا۔  
 ”کیا کہوں اُن سے؟“ مہروز پوچھ رہا تھا۔  
 ”ہاں۔ وہ چونکے۔ اُسے ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ، میں آ رہا ہوں۔“ مہروز چلا گیا تو وہ اس سے پوچھنے لگے۔

”آپ اسی وقت ملیں گی اُس سے؟“  
 ”کیا اس وقت مجھے اُس سے ملنا چاہیے؟“ وہ اٹھا اُن ہی سے پوچھنے لگی۔  
 ”نہیں۔ اس وقت مناسب نہیں لگتا۔ میں اُس سے کہہ دیتا ہوں دو تین روز بعد۔“ وہ اٹھ کر چلے اور اُسے یہی صورت حال بڑی عجیب سی لگی۔ اپنی پوزیشن الگ خراب لگ رہی تھی۔  
 ”اس وقت ناقتب حسن کو نہیں آنا چاہیے تھا۔“ وہ سوچنے لگی۔  
 ”اُس نے تو مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے اور شہروز احمد دیکھنے میں تو اچھے خاصے میچور گتے ہیں۔ وہ

کی باتوں میں کیوں آگئے؟“  
 وہ ابھی اور کچھ کہہ کر آپی کے آنے سے اُس کی سوچیں منتشر ہو گئیں۔ اُن کے پیچھے ملازمہ بھی تھی! نے ملازمہ کو ناشتہ کے برتن لے جانے کے لیے کہا اور اس سے پوچھنے لگیں۔  
 ”تم نے ناشتہ ٹھیک طرح سے کیا ہے نا؟“

”جی۔“  
 ”شہزاد کہاں چلے گئے؟“  
 ”اُن کے کوئی دوست آئے ہیں۔“  
 ”ہاں مہروز بتا تو رہا تھا۔ خیر تم آرام سے بیٹھو۔ ابھی ٹراکیاں تمہارے کمرے میں آ رہی ہیں۔“ وہ خاموش بیڈ پر تلے کے سہارے بیٹھ گئی۔  
 پھر وہ پہر تک اُس کے کمرے میں غاص ہلا نکلا رہا۔ شہروز کی کزنز مسلسل وہیں ٹھہرا جاتے ہوئے تھے چھٹی چھاڑ، ہنسی مذاق۔ وہ غائب دعاغی سے سب کو دیکھتی رہی۔ دوپہر میں کھانے کے بعد آپی نے سونے کی تاکید کی اور سب کو لے کر چلی گئیں۔

شام میں ویسے کی تقریب کسی فائبروٹاشار ہوٹل میں تھی۔ اُس کے گھر سے بھی سب آئے ہوئے تھے۔ آف ایٹ بیش قیمت شرارہ سوٹ جس پر گولڈن کام کیا ہوا تھا۔ اُس پر بہت رخ رہا تھا۔

جب اُسے ہمانوں کے سامنے اسٹیج پر چھایا گیا تو کہتے ہی تعریفی جملے اس کی سماعت سے ٹکرائے تھے۔ بن وہ اس وقت خاصی پرشور تھی۔ دوستی و کیفیات میں گھری ہوئی تھی۔ اس لیے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ سمجھوتہ کر لیتی۔ گزشتہ ایک ماہ جتنے ٹڑھنے کے بعد وہ ہتھیار تو ڈال ہی چکی تھی اور اپنے آپ کو سمجھایا تھا کہ ناقتب حسن اُس کے نصیب میں نہیں ہے۔ لیکن اب اس طرح اُس کو اُس نے اسے ڈسٹرب دیا تھا اور اگر غیر جانبداری سے سوچیں تو ناقتب حسن کا یہ اقدام کسی طرح بھی مناسب نہ تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ وہ۔۔۔ بر جانبداری سے سوچ نہیں پا رہی تھی کبھی ناقتب حسن کے لیے دل چلتا اور کبھی اپنے آپ کو سرزنش کرنے کی مزید تہم یہ تھا کہ ابھی وہ اُس کی محبت کو مکمل طور پر دفن بھی نہیں کر پائی تھی۔ اس لیے زیادہ جھکاؤ اسی کی طرف تھا۔

ای بار بار کسی نہ کسی خاتون کو لے کر آتیں اور اُس سے تعارف کرواتیں کوئی شہروز کی پھوپھی، کوئی چچی، کوئی مانی۔ وہ میں ایک نظر اٹھا کر سر جھکا لیتی۔  
 ”زندگی پڑی ہے ان رشتے ناتوں کو سمجھنے کی۔“ اُس نے سوچا لیکن پھر فوراً ہی دوسرا خیال۔  
 ”مجھے کیا ضرورت ہے سب کو جلتے کی۔ میرا کون سا تال ہے ان سب سے؟“  
 پھر چھٹی آپا اُس کے پاس آ بیٹھیں۔ اس کا دوپٹہ ٹھیک کرنے کے بہانے، قدرے اس کی طرف جھک کر روشنی میں کہنے لگیں۔

”یہیں منہ منٹ پھلا کر بیٹھو۔ ویسے کی دہن ہو ایک شرمگین مسکراہٹ تمہارے ہونٹوں پر ہونی چاہیے۔“  
 ”کہاں سے لاؤں شرمگین مسکراہٹ۔“ وہ بے بسی سے بولی۔  
 ”شہزاد احمد کا قصور اور پھر اُن کی باتیں یاد کر لو۔ خوبصورت مسکراہٹ آپ ہی آپ ہونٹوں پر سج جائے گی۔“  
 وہ کوئی جواب دینا ہی چاہتی تھی کہ شہروز کا کوئی کزن انہیں لے کر گیا اور پھر اُن دونوں کی تصویریں بنانے لگا۔

”یارا تے اجنبی کیوں بنے کھڑے ہو؟“ بھائی کے کندھے پر ہاتھ رکھنا اُن کے لیے ناگوار تھا اور جانے شہروز اندر نے اپنے کزن کا خیال کیا یا قریب کھڑے وجود سے اٹھتی تھک نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا کہ اُفتیا کی کندھے پر ہاتھ رکھ گئے۔ لیکن جیسے ہی وہ تصویر بنا چکا، وہ کسی سے ملنے کا بہانہ کر کے اسٹیج سے نکلے گئے تھے۔

ویسے کی تقریب ختم ہوئی تو رواج کے مطابق اماں اسے اپنے ساتھ لے آئیں۔  
 گھر آتے ہی اُس نے سب سے پہلے اپنے آپ کو بھاری بوجھ سے آزاد کیا یعنی زیورات اتارے اور اس تبدیل کیا۔ اس کے بعد بہنوں کے پاس آ بیٹھی۔ بڑی آپا کو دیکر دیکر اُس سے پوچھنے لگیں۔  
 ”شہروز کیسے ہیں؟ تمہاری ساس اور زندیں؟“  
 ”بڑی آپا۔“ اُس نے ٹوکا۔ ”ایک ہی دن میں میں کسی کو کیسے جان سکتی ہوں جھلا؟“

”کچھ اندازہ تو ہوا ہوگا؟“  
 ”سب اچھے ہیں۔“ اُس نے جان پھرائی۔  
 پھر رات اور اگلا سارا دن اُس نے یہیں گزارا۔ شام میں اُس کے سسرال سے کافی لوگ اسے لینے آئے۔ اُسی وقت کلثوم اور جہان شہروز کا جوتا پھینکا کر ان سے اچھی خاصی رقم وصول کر لی۔ چھوٹی آپا البتہ الگ تھک سی تھیں۔ زیادہ ہمانوں کے سامنے آئی ہی نہیں تھیں۔ پھر کھانے کے بعد وہ سب کے ساتھ دوبارہ اُسی گھر میں آ گئی، جسے وہ اپنا گھر نہیں کہہ سکتی تھی۔

اتنی کو احساس تھا کہ شہر ہزار احمد گذشتہ کئی سالوں سے گھر کی ذمہ داریوں اور آفس کے کاموں میں مصروف تھا۔ اس لیے وہ چاہتی تھیں کہ اپنی منوں کے بہانے وہ کہیں گھومنے پھرنے چلے جائیں تاکہ وہ جو مسلسل کام سے تھکا تھا کچھ سلاہے، اسے کچھ آرام ملے اور وہ ریلیکس ہو جائیں۔ انہوں نے شہر ورسے کہ انہوں نے وہی کام کی زیادتی کا بہانہ کر کے ٹالنا چاہا۔

”اسی لیے تو میں چاہتی ہوں، کہیں گھر پھر آؤ۔ مسلسل کام سے تمہاری صحت متاثر ہو رہی ہے۔“ اتنی زور دیا۔

”میری صحت کو کیا ہوا؟ ٹھیک تو ہے۔“  
”کہاں ٹھیک ہے؟۔ ہر وقت تھکے تھکے سے نظر آتے ہو۔ اور پھر ریمو کی بھی خواہش ہوگی۔ تم اسے نہ لے جاؤ۔“

”لیکن اتنی۔ یہاں آفس کا کیا ہوگا؟“  
”مہر وز ہے ناں۔ اب تو ماشاء اللہ وہ سب سمجھنے لگا ہے۔ میرا خیال ہے وہ آفس کے معاملات کو کچھ سمجھتا تو ہے لیکن۔“ انہوں نے پھر کچھ کہنا چاہا۔

”بس میں تمہارا کوئی عذر نہیں سنوں گی۔ تم ربیع سے پوچھ لو۔ جہاں وہ کہے وہیں کا پروگرام سیٹ کر لو۔ اتنی سے مزید بحث کرنا فضول تھا۔ کیونکہ وہ حکم صادر کر چکی تھیں۔ اس لیے وہ خاموش ہو رہے۔ پھر اندر ہی اندر غصے جزبہ ہوئے۔ انہوں نے سوچا وہ ربیع سے کہیں گے، وہی اتنی سے کوئی بہانہ کر دے کیونکہ اتنی ان کا تو کوئی عذر ملنے کو تیار نہ تھیں۔

رات میں جب وہ کمرے میں آئے تو وہ صوفے پر بیٹھی اپنے ہی کسی خیال میں گم تھی۔ انہوں نے پلکے سے کھانسی کر اسے متوجہ کیا پھر کہنے لگے۔

”اگر آپ فوراً سونے کا ارادہ نہیں رکھتیں تو میں آپ سے کچھ بات کر لوں۔“ اس نے ذرا سارے اوجھا ان کی طرف دیکھا پھر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ بیٹھ تو گئے لیکن پھر سوجھ بوجھ میں نہیں آیا اس سے کیا کہیں؟ جیب سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں اور سگٹلنے کے بعد بھی خاموش رہے۔ یوں لگا جیسے وہ صرف سگریٹ پینے کے لیے یہاں بیٹھے ہوں۔ اور وہ منتظر تھی۔ کسی کسی وقت ان کی طرف دیکھ بھی لیتی تھی۔ لیکن پوچھنا نہیں کہ وہ کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا خیال تھا، وہ ثاقب حسن کے بارے میں کوئی بات کریں گے۔ لیکن جب وہ بولے تو اتنی کی خواہش کا بتانے لگے۔

”اتنی کا اصرار ہے کہ ہم کچھ دنوں کے لیے مری سوات وغیرہ چلے جائیں۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔ ”میں ایسا نہیں چاہتا اور میں نے اتنی کے سامنے بہت عذر تراشنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے میری کوئی بات نہیں سنی۔ اگر آپ کسی طرح۔“ اس نے خاموشی سے دیکھنے پر کڑا ہڑکائے۔ ”میرا مطلب آپ اتنی کے سامنے کوئی بہانہ کر سکیں تو۔“

”یہ ساری صورت حال میری اپنی سمجھ سے باہر ہے شہر و احمد۔“ وہ الجھ کر بولی۔  
”آپ کی آنکھیں کا ذمہ دار میں نہیں ہوں۔“ وہ قطعیت سے بولے۔

”آپ اپنے آپ کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے۔“  
”کیا مطلب؟۔ آپ مجھے الزام دے رہی ہیں؟“

”میرے الزام دینے یا نہ دینے سے کیا فرق پڑتا ہے شہر و احمد۔ آپ اپنے آپ سے پوچھیں کہ کچھ آپ نے کیا، وہ صحیح ہے؟“  
”میں مانتا ہوں کہ یہ صحیح نہیں ہے لیکن ثاقب حسن کے پاس غالباً اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا

”ہونہ۔“ اس کے حلق سے ایک ٹوٹی ہوئی سی آواز نکلی اور وہ سر کو نفی میں ہلانے لگی۔ وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر کہنے لگے۔

”میں نے سنا تھا محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے، اب دیکھ بھی لیا۔ اور آپ اتنی مایوس کیوں ہیں؟۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ ثاقب حسن نے یہ سب آپ کی محبت میں کیا۔ آپ کو پانے کی خاطر۔“  
”کیا یہی ایک راستہ رہ گیا تھا۔ کہ مجھے زبردستی آپ کے سر پر مسلط کر دے۔ وہ یہ کیوں بھول گیا کہ جس بندھن میں میں بندھی ہوں، اس کے کچھ تقاضے بھی ہوتے ہیں جو دنیا داری کے لیے تو بہر حال نبھانے ہی پڑیں گے۔“

”میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟۔ ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ آپ اس انداز سے مت سوچیں کہ ہم پر مسلط کی گئی ہیں۔ ثاقب حسن میرا دوست ہے اور اگر اس نے اپنی کوئی امانت میرے پاس رکھ چھوڑی ہے تو اس کی حفاظت میرا فرض ہے۔“

”میں کوئی بے جان شے نہیں ہوں شہر و احمد۔ جسے آپ لا کر میں بند کر دیں کہ ثاقب حسن آئے گا تو اسے واپس کر دیں گے۔ جتنی جاگتی انسان ہوں اور زندہ رہنے کے لیے ایک انسان کی کیا ضروریات ہوتی ہیں؟ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”ارے۔“ وہ سگریٹ ایش ٹرے میں سلے ہوئے بولے۔ ”تو آپ اس وجہ سے پریشان ہیں لیکن یہ کیوں بھول رہی ہیں کہ اتنے لوگوں کی موجودگی میں ایجاب و قبول کے مراحل سے گزرتے ہوئے میں نے آپ کے نان نفقے کی ذمہ داری بھی قبول کی ہے۔“ اس کے شاکی نظروں سے دیکھنے پر کہنے لگے ”بہر حال آپ کو زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا خیال ہے سب کچھ آپ کی خواہش کے مطابق ہوگا۔“

”میری خواہش کے مطابق؟۔“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔  
”ہاں۔“ کیا آپ کو ثاقب حسن کی ہر اہی کی خواہش نہیں تھی؟

”تھی۔ لیکن اس طرح نہیں۔“ وہ نظریں جھٹکاتے ہوئے بولی تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔  
”یہی بات میں نے ثاقب حسن کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ کوئی بھی رکی اپنی محبت کو پانے کے لیے یہ طریقہ اختیار نہیں کر سکتی۔ وہ اپنی محبت کو کہیں دفن تو کر سکتی ہے لیکن۔“ اس پر نظر پڑی تو انہوں نے اپنی بات وہیں روک لی۔ وہ پلکیں جھپکتے ہوئے آنکھوں میں اتنی ہی شاید اپنے اندر آواز دہرائی تھی۔  
”ربیع۔“ وہ کچھ دیر تک خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد بولے۔ ”میں تو یہی کہوں گا کہ اب جو ہو چکا ہے اس سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کریں؟ پھر اسٹڈی روم کی طرف جلتے ہوئے جیسے اچانک کوئی بات یاد آئی تو پلٹ کر کہنے لگے۔

”سنیں۔ کل آپ کو ثاقب حسن سے ملنا ہے۔“ اپنی بات کہہ کر وہ رُکے نہیں۔ فوراً دروازہ کھول کر اسٹڈی میں داخل ہو گئے۔ اور وہ کتنی دیر تک سن سی بیٹھی رہ گئی تھی۔

صبح وہ آفس جانے سے پہلے اس کے ساتھ دوبارہ کمرے میں آئے تو نہ لٹنے کے بعد وہیں سے چلے جایا کرتے تھے۔ اس نے انہیں دیکھ کر قدرے حیرت کا اظہار کیا تو وہ کہنے لگے۔

”میں نے اتنی سے کہہ دیا ہے کہ آج پانچ پر ہم کہیں انوائٹڈ ہیں۔ کیا رہے آپ تیار رہے گا۔ میں گاڑی بھیج دوں گا۔“

”کیا مطلب؟۔“ وہ واقعی نہیں سمجھی۔  
”ارے۔“ وہ حیران ہوئے۔ ”کیا آپ کو یاد نہیں رہا؟ رات میں نے کیا کہا تھا کہ آج آپ کو ثاقب حسن سے ملنا ہے۔“ اس کے نظریں خیرانے پر کہنے لگے۔ ”ثاقب آپ سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہے۔ ویسے بھی آج کل میں وہ باہر جانے والا ہے۔“

”اس نے کوئی جواب نہیں دیا، نہ کوئی تبصرہ کیا۔ انہیں وہیں چھوڑ کر ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس

اُٹی تو وہ موجود نہیں تھے۔

پھر گیارہ بجے تک کا وقت اُس نے بہت اضطرابی کیفیت میں گزارا۔ متضاد کیفیات میں تو وہ اول روز ہی گھر گئی تھی اور آج تو وہ اپنے آپ کو بالکل ہی بے بس محسوس کر رہی تھی۔ دلِ ثاقبِ حسن سے بننے پر اصرار کر رہا تھا اور دماغِ سرزنش ہو سکتا ہے وہ دل کو دماغ کے تابع کر لیتی لیکن حالات اُس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

گیارہ بجے اتنی خود اُس کے کمرے میں آکر کہنے لگیں۔

”بیٹا! تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔ شہرِ وزیر کمرے گئے تھے کہ تم دونوں کو کہیں جانا ہے۔“ اُس نے سوچا

مردود کا بہانہ کر کے منع کر دے لیکن اتنی بڑے اصرار سے کہہ رہی تھیں۔

”جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ڈرامیور کا ڈی لے کر آتا ہی ہو گا۔“ وہ سر ہلاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے

تیاری میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ ویسے بھی اُس نے کوئی خاص اہتمام نہیں کیا تھا۔ پلکے رنگ کا پلین سوٹ اور

میک اپ کے نام پر صرف لب اشک لگائی تھی۔ کمرے سے نکلی تو اتنی اُسے دیکھ کر حیران ہو گئیں۔

”بیٹا! اس طرح جاؤ گی؟“

”جی۔“ اس کا جی اشیات بھی تھا اور سوالیہ بھی۔

”بڑی بات ہے ابھی تو مٹی دہن ہو۔ جاؤ کوئی اچھا سا سوٹ پہن لو۔ اور تم نے کوئی زیور بھی نہیں پہنا؟“

”ٹھیک تو ہوں اتنی۔“

”ٹھیک نہیں ہو۔ اچھا اگر کپڑے نہیں بدلنا چاہ رہیں تو زیور ضرور پہن لو۔“

وہ چپ چاپ دوبارہ اندر چلی گئی۔ بھاری زیور کے بجائے اُس نے ہلکا سا سیٹ پہن لیا۔ پھر جب باہر

آئی تو ڈرامیور کا ڈی لے کر آچکا تھا۔ اُس نے اتنی کو اپنے جانے کا بتایا اور باہر نکل آئی۔

گاڑی کچھ جلنے پہلے اور کچھ ابانے راستوں پر دوڑتی ہوئی ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے سامنے رکی تو

وہ قند سے حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”صاحب اندر آپ کا انتظار کر رہے ہیں“ ڈرامیور نے اُسے متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

”کون صاحب؟“ بے خیالی میں اُس کے منہ سے نکل گیا۔

”جی۔ اپنے شہرِ وزیر صاحب۔“

”ہاں۔ اچھا۔“ وہ دلی ہی دل میں اپنے آپ کو ملامت کرتی ہوئی گاڑی بے اثر آئی۔ پھر اُس نے ڈرامیور

سے یہ تک نہیں پوچھا کہ وہ یہیں رکے گا یا واپس جانے کا۔ تیز قدموں سے چلتی ہوئی شیشے لے دروازے سے اندر

داخل ہو گئی تھی۔ اور اندر داخل ہوتے ہوئے وہ ایک دم نزوس ہو گئی۔ کچھ جھپکتے ہوئے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں

سب سے آخری ٹیبل پر شاقب حسن بیٹھا نظر آیا۔

اتنے دنوں بعد اُسے دیکھ رہی تھی۔ فوری طور پر ہر بات ذہن سے نکل گئی۔ بس وہی یاد رہا اور ابھی یہاں

آنے سے پہلے وہ جدول کو دماغ کے تابع کرنا چاہتی تھی۔ اب پورا وجود دل کے تابع ہو گیا تھا۔ قدموں کو بے اختیار

اُس کی طرف بڑھنے سے کسی طرح نہ روک سکی۔ بلکہ شاید اس نے دوبارہ سانس بھی اُس کے قریب جا کر ہی لیا تھا۔



”میلو مسز شہروز احمد۔“ ثاقب حسن کے ہونٹوں پر فحاشانہ مسکراہٹ تھی جبکہ اُس کی آنکھیں جھلملانے لگیں

اور اُس کے روکتے روکتے بھی وہ رو پڑی۔

”جو قوت۔ یہ کیا کر رہی ہو؟“ وہ پریشان ہوا اور دہی دہی آواز میں اُسے رونے سے منع کیا تو اُس نے

سارے آنسو رومال میں جذب کر لیے۔

”یہ بتاؤ۔ کھانے سے پہلے کیا لو گی؟“ وہ اُس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے پوچھنے لگا پھر اُس کا جواب

نئے بغیر وپٹر کو بلا کر کوئلہ ڈنگ لانے کے لیے کہا پھر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بہت سنجیدگی سے بات

کرنے لگا۔

”میں نے کہا تھا ناں کہ تمہارے حصول کے لیے میں کچھ بھی کر گزروں گا۔“

”لیکن مجھے تمہاری طرف پند نہیں آیا۔“ وہ فوراً بول پڑی۔

”پھر تم ہی بتاؤ، میں کیا کرتا؟“ فوری طور پر دولتمند بن نہیں سکتا تھا اور میری موجودہ پوزیشن تمہاری

والدہ کے لیے قابل قبول نہیں تھی۔ پھر ایک ہی راستہ میری سمجھ میں آیا۔ میں تم سے ملنا چاہتا تھا تا کہ دونوں

مل کر اس مسئلے کا کوئی حل سوچیں لیکن میں تمہاری راہ دیکھتا رہا اور تم پھر لوٹ کر اُس راستے پر نہیں آئیں،

جہاں میں گھنٹوں تمہارے انتظار میں کھڑا رہتا تھا۔“

”اناں کو جانے کیا شبہ ہوا اگر انہوں نے اسی دن میرا کالج چھڑا دیا جس دن تمہاری اماں اور اٹیل آئی تھیں۔“

”ہاں۔ میرا بھی یہی خیال تھا اور پھر اپنے طور پر میں نے جو سوچا اُس پر عمل بھی کر ڈالا۔ یقین کرو میں نے

بہت مشکل سے شہرِ وزیر احمد کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ تم سے نکاح کر لیں۔ وہ تو کسی طرح مان ہی نہیں لے

تھے۔ بلکہ پہلی بار تو میری بات سن کر وہ ہنسنے سے اکھڑ گئے تھے۔ انہیں میری ذہنی حالت پر شبہ ہوا تھا۔

پھر حال پورا ایک ہفتہ لگا انہیں اس بات پر راضی کرنے میں۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

”میں کیا کرتا رہا؟“ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ خیال کہ تم میری نہیں ہو سکتیں۔ مجھ سے میری

زندگی بچھین رہا تھا۔“

”اب بھی تو میں تمہاری نہیں ہوں۔“

”ہو نہیں۔ لیکن یہ اطمینان تو ہے کہ میری ہو جاؤ گی۔ اور یقین کرو جب تک مجھے یہ اطمینان نہیں مل

گیا تھا تب تک میں ہر بات سے بیگانہ تھا بلکہ دیوانہ ہو گیا تھا۔ بس یہی کسر رہ گئی تھی کہ لوگ ہاتھوں میں

سنگ اٹھا لیتے۔“ اپنی آخری بات پر شاید وہ محظوظ ہوا تھا کہ پلکے سے ہنس دیا جب کہ وہ اسی طرح سنجیدہ

تھی، پوچھنے لگی۔

”اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

”میں اسی ہفتے کسی بھی دن چلا جاؤں گا۔ میرا سب کام اوکے ہو گیا ہے، بس سیٹ اوکے کروانے کی

دیر ہے۔“

”پھر آؤ گے کب؟“

”بہت جلد۔ میرا مطلب ہے زیادہ سے زیادہ دو سال۔“

”دو سال؟“ وہ ہول کر ہوئی۔

”دو سال بلکہ جھپکتے ہیں گزر جائیں گے ربیعہ۔“

”تمہارے لیے۔“ اُس لیے کہ تم ہر فکر سے آزاد ہو کر جا رہے ہو۔ میرے بارے میں سوچا ہے کہ میری

پوزیشن کتنی آکھڑ ہے۔“

”کیا مطلب؟“ اُسے جیسے اُس کی بات سمجھ نہ آئی تھی۔

”ایک ایسے شخص کے ساتھ رہنا جس سے میرا کوئی ناما نہیں، آسان ہے کیا؟ اور پھر کیا سوچیں گے شہروز

احمد کہ میں اُن کے گھر میں رہ کر تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ اور اگر شہروز کے علاوہ کسی کو یہ بات معلوم ہو گئی تو؟“

”تم خواہوا اندیشوں میں مت گھرو ربیعہ۔“ وہ اُسے سمجھاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”یہ بات ہر تنہوں کے سوا

کسی کو نہیں معلوم۔ اور نہ ہو گی۔ میں تمہاری خاطر جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔“ قدرے توقف کے بعد

کہنے لگا۔

”میں نے شہروز احمد سے بات کر لی ہے۔ میری والیبی سے دو تین مہینے قبل وہ تمہیں طلاق دے دیں گے

پھر میں یہاں آتے ہی تم سے شادی کر لوں گا۔“ اُس کے خاموشی سے دیکھنے پر کہنے لگا۔ ”میرا خیال ہے،

اس وقت تمہاری اماں انکار نہیں کریں گی کیونکہ ایک تو میں ان کے معیار کے مطابق بن کر آؤں گا۔

دوسرے انہیں اپنی طلاق یافتہ بیٹی کے لیے رشتے کی تلاش ہو گی۔“

”میت اندھی ہوتی ہے، یہ تو سنا تھا لیکن کوئی محنت میں اس حد تک جاسکتا ہے، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔“ وہ انسرورگ سے مسکرائی۔ ”ثاقب حسن۔ میرے ماتھے پر طلاق کا لیلبل لگتے ہی جو افسانے بن گئے، ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”بیوقوف۔ یہ سب وقتی باتیں ہوتی ہیں۔ پھر بہت جلد لوگ بھول بھی جاتے ہیں اور جب ہم دونوں خوش و خرم زندگی گزاریں گے تو وہی لوگ جو باتیں بنائیں گے، پھر ہماری زندگی پر رشک کریں گے۔“

”شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔“

”شاید نہیں یقیناً۔“

”لیکن یہ تو بتاؤ۔ ان دو سالوں میں میں کیا کروں؟“ اور جواب میں اُس نے وہی باتیں دہرائیں جو اکثر اُس کے پوچھنے پر کہا کرتا تھا۔

”تم تو بس اتنا کرنا میری جان کہ میرے حوالے سے اچھے اچھے خواب سنانا اور تہاری آنکھوں میں جویر نے محبتوں کے دیپ جلائے ہیں، انہیں یوں ہی جلائے رکھنا۔ میں واپسی میں ابھی چلتے دیپوں کی روشنی میں تمہیں تمہارے خوابوں کی تعبیر دوں گا۔ حسین تعبیر۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ ثاقب حسن کا وعدہ۔ جو تمہاری قسم تمہارے پنا زندگی کو زندگی نہیں سمجھتا۔“

ثاقب حسن کا محبتوں سے چور لہجہ اُسے اپنی گرفت میں لے گیا۔ ویسے بھی اُس نے اپنی کتاب زندگی کے اس باب کو بند نہیں کیا تھا جو دوبارہ کھولنے کی ضرورت پڑتی۔ ہر ورق سانسے تھا اور ہر لفظ واضح۔ ”سنو۔“ وہ کہنے لگا۔ ”شہرِ وزاحمد کی طرف سے کسی اندیشے میں گرفتار مت ہونا۔ وہ بہت اچھے انسان ہیں۔ تم پر کسی بات کو جتنا میں گے نہیں۔ ویسے تم کو شش کرنا کہ زیادہ ترقوت اپنی ماں کے گھر رہو۔ لو کیاں نیٹے جاتی ہی رہتی ہیں۔ تم بھی کسی نہ کسی بہانے چلی جایا کرنا۔“

”ہاں۔ میں نے بھی یہی سوچا ہے۔“

”بس تم میں امید رکھوں کہ اب تم آزرہ نہیں ہوگی۔ شہرِ وزا رہے تھے کہ تم بہت الجھی ہوئی سی نظر آتی ہو۔“

”آجین تھقی اور شاید اب بھی ہے۔ بہر حال میں کوشش کروں گی کہ ان حالات سے سمجھوتہ کر سکوں۔“ پھر کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالتی ہوئی بولی۔ ”میں واپس کیسے جاؤں گی؟“

”میرا خیال ہے شہرِ وزا خود لینے آئیں گے بلکہ تم بیٹھو، میں دیکھ کر آتا ہوں کہ آئے یا نہیں۔“

”وہ اٹھ کر چلا گیا۔“ کچھ دیر بعد آکر کہنے لگا۔

”شہرِ وزا آچکے ہیں۔ تم جاؤ، میں کچھ دیر دیر یہاں سے نکلوں گا۔“ پھر بہت آہستگی سے اُس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

”خدا حافظ۔“ اُس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔ اور وہ بس لمحہ بھر کوس کی طرف دیکھ سکی پھر فوراً اٹھ کر چلی آئی۔

”شہرِ وزا جگہ گاڑی لیے منتظر تھے۔ وہ بہت خاموشی سے دوسری طرف کا دروازہ کھول کر ان کے برابر بیٹھ گئی اور وہ بھی اسی خاموشی سے گاڑی اسٹارٹ کر کے مین روڈ پر لے آئے۔

”آپ نے کیوں زحمت کی؟ ڈرائیور کو بھیج دیتے۔“ وہ اپنی ہتھیلیوں پر ٹھہری نمی ٹشو پیپر میں جذب کرتی ہوئی بولی۔

”ارے۔“ وہ حیران ہوئے۔ ”آپ تو واقعی خاصی بیوقوف ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”ڈرائیور سے میں نے یہ کہہ کر آپ کو لینے بھیجا تھا کہ میں یہاں موجود ہوں۔ اب اگر وہ گاڑی لے کر آتا تو آپ کی تہا واپسی مشکوک نہ ہوتی۔ ویسے بھی اس وقت اسی کے سلسلے ہم دونوں کو ساتھ جانا چاہیے ورنہ پتا نہیں وہ کیا سمجھیں؟“

”ان کی وضاحت پر وہ اپنی احتقانہ بات پر دل ہی دل میں خاصی نادم ہوئی، اس لیے کچھ کہہ نہ سکی۔“

”میرا خیال ہے ثاقب نے آپ کو ٹینشن سے نکال لیا ہوگا۔ اور اب آپ مجھے قصور وار نہیں سمجھیں گی؟“ وہ کیٹ ان کرتے ہوئے کہنے لگے۔

”قصور وار کوئی بھی نہیں ہے۔ میں خود ہوں۔“ اُس نے کہا۔ اور رُخ موڑ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ وہ سمجھ گئے، وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی اور دوسرا کوئی موضوع تھا بھی تو وہ اُس سے کیا بات کرتے، اس لیے بقیہ راستہ خاموشی میں گزرا۔

ثاقب حسن چلا گیا۔ جس روز وہ جا رہا تھا، اُس روز اُس نے اپنے جانے کی اطلاع اُسے فون پر دی۔ وہ بہت آزرہ ہو رہا تھا۔ اُس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

”ربیع۔“ کاش میں حالات کا شکار نہ ہوتا یا پھر تمہارے گھر والے مجھے اپنے ہی جیسا سمجھ کر قبول کر لیتے تو تمہارے درمیان یہ وقتی دُوری بھی حائل نہ ہوتی۔ میں یہیں تمہارے آس پاس رہ کر بہتر زندگی کے لیے جدوجہد کرتا۔ یا پھر کہیں جانا بھی تو تم میرے ساتھ ہوتیں۔“

اُس کے ٹوٹے لہجے پر ربیعہ کا دل دکھنے لگا تھا۔

”میں مانتا ہوں کہ میں بہت زیادہ مسائل میں گھرا ہوا ہوں۔ لیکن مسائل ہمیشہ تو نہیں رہتے ناں بالآخر جلد جدا نہیں مات دے ہی دیتی ہے اور اب جبکہ میں بھی اپنے مسائل کو مات دینے جا رہا ہوں تو پتا نہیں کیوں بجائے خوش ہونے کے میرے اندر اداسیوں کے موسم گھر کرتے جا رہے ہیں۔“

”تم اپنے گھر سے دور جا رہے ہونا اس لیے۔“ اُس نے کہا تھا۔

”گھر سے نہیں ربیعہ، تم سے۔ تم مجھے بہت یاد آؤ گی۔“

وہ کہتا چاہتی تھی کہ میں بھی تمہیں یاد کروں گی، لیکن اپنے آس پاس شہرِ وزا احمد کو محسوس کر کے اُس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ لیکن آنکھوں میں اُترتے پانی کو نہیں روک سکی تھی۔ جس نے اُس کی پلکوں کو بھی نم کر دیا تھا۔

”تم رورہی ہو۔؟“ اُس کی خاموشی محسوس کر کے وہ پوچھنے لگا تھا۔

”نہیں تو۔“ آواز میں آنسوؤں کی آمیزش شامل تھی۔

”پلیز ربیعہ، رونام۔“ اُس نے فوراً ٹوکا۔ ”ورنہ میں بہت ڈسٹرب ہوں گا۔“

اُس نے پلکوں پر اتنی نمی انگلیوں کی پوروں پر سمیٹ لی تھی۔ اور جب ریسپورڈر کے گروہ پہلی تو شہرِ وزا صوفے پر بیٹھے اپنی کوئی نائل دیکھ رہے تھے۔ وہ حقیقتاً اُس کی طرف متوجہ نہیں تھے۔ لیکن اُسے لگا جیسے اُن کا روم اُس کی طرف متوجہ ہو رہا ہے آواز نہ تو صوفے سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔

اور اسی شام اس نے شہرِ وزا احمد سے کہا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے اماں کے گھر جانا چاہتی ہے۔ اُنہیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ انہوں نے اسی سے ڈر کر کیا اور پھر ان کی اجازت سے خود اُسے اماں کے گھر چھوڑ گئے تھے۔

آج تیسرا دن تھا اسے اماں کے گھر گئے ہوئے اور یہاں کیونکہ اُس پاس شہرِ وزا احمد موجود نہیں تھے اُس لیے اُس کی سوچیں پھر صرف ثاقب حسن قابض تھا۔ گذشتہ تین دنوں سے وہ نہ صرف اُس کی سنگت میں گزرنے لمات کو سوچتی رہی تھی بلکہ اُس کے بارے میں بھی بہت کچھ سوچ ڈالا تھا۔ اس وقت بھی وہ برآمدے میں تھا تھیں بیٹھی تھی۔ جیوں آپا رات کے کھانے کی تیاری میں لگی ہوئی تھیں۔ کلثوم اور ہما اندر چتا نہیں کس کام میں نظر نہ اور اماں مغرب کی نماز پڑھنے کی غرض سے ابھی اُس کے پاس سے اٹھ کر گئی تھیں۔

آگن میں لمحہ بہ لمحہ اترتا اندھیرا لہجے سے اُجالے کو اپنی آغوش میں سینے کی کوشش کر رہا تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے سردی اپنے عروج پر تھی، ابھی جاتے ہوئے اماں اُس سے کہہ کر گئی تھیں کہ وہ بھی اندر چلی جائے لیکن اُسے یہاں بیٹھنا اچھا لگ رہا تھا۔ تخت پوش پر ٹانگوں کو دیر سیدھا کر کے اُس نے چادر پیروں

پڑا لی اور پشت دیوار کے ساتھ لگائی تو ایک سرد لہر پورے وجود میں دوڑ گئی۔ اس کے باوجود وہ یوں ہی بیٹھی رہی۔ اس پاس یادوں کے جگنو جگنے تو وہ ہر شے سے بے گانہ ہو گئی۔ پلکیں ایک دوسرے سے لگے کیا ملین کر وہ خواب جزیروں میں پھٹنے لگی۔

جھوٹی آپا کین سے نکل کر آئین تو اسے یوں بیٹھے دیکھ کر ٹھٹھک کر رک گئیں۔ پہلے وہ یہی سمجھیں کہ وہ بیٹھے بیٹھے سوئی ہے لیکن جب غور کیا تو اس کی پلکیں ہلکے ہلکے لرز رہی تھیں اور وہ جانے کس کے تصور میں کھوئی ہوئی تھی کہ ہونٹ دکش مسکراہٹ کی گرفت میں تھے۔ جھوٹی آپا نے اس کا یہ روپ کچھ دیر تک دلچسپی سے دیکھا۔ انہیں قدرے حیرت بھی ہو رہی تھی کیونکہ جب سے اس کی شادی ہوئی تھی، وہ افسردہ اور اُلجھی ہوئی نظر آتی تھی اور اس وقت وہ پہلی بار اس کے چہرے پر اطمینان اور ہونٹوں پر خوبصورت مسکراہٹ دیکھ رہی تھیں۔

اپنے طور پر انہوں نے یہی تیاں کیا کہ وہ حالات سے سمجھوتہ کر کے شہر و زماں کو دل سے قبول کرتے ہوئے مطمئن ہو گئی ہے۔ انہیں اس خیال سے خود بھی اطمینان ہوا اور وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر اندر جانے کو تھیں کہ اسی وقت اس نے آنکھیں کھول دیں۔ جھوٹی آپا کو سامنے دیکھ کر وہ قدرے جھینپ گئی۔

”یہاں سردی میں کیوں بیٹھی ہو؟“ جھوٹی آپا اندر جانے کا ارادہ ترک کر کے اس کے پاس بیٹھ گئیں۔

”بس یوں ہی۔“ وہ ناگہن سمیٹتی ہوئی بولی۔

کچھ دیر تک جھوٹی آپا اس کی طرف دیکھتی رہیں پھر اُسے چھینٹنے کی غرض سے بولیں۔

”ابھی تصور میں تم شہر و زماں سے باتیں کر رہی تھیں؟“

”نہیں تو۔“ وہ فوراً کہہ گئی۔

”پھر؟“ جھوٹی آپا کی سوالیہ نظروں کے جواب میں وہ شپٹا گئی۔ نظریں چڑاتی ہوئی بولی۔

”جھوٹی آپا۔ میں تو بس یوں ہی بیٹھی تھی۔“

”اچھا۔“ انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ربیعہ۔ مجھے انسانوں کی بہت زیادہ پہچان تو نہیں ہے، لیکن شہر و زماں کے بارے میں میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ بہت اچھے انسان ہیں۔“

”آپ مجھے کیا سمجھانا چاہتی ہیں؟“

”یہی کہ گزری تمام باتوں کو بھول جاؤ۔ اور اب جبکہ ایک اچھا انسان تمہارا شریک سفر ہے تو اپنے دل میں صرف اسی کا خیال رکھو۔ اور یہی نہیں بلکہ ہمیشہ اس کے ساتھ وفادار رہنے کا عہد کر لو۔“

”جھوٹی آپا۔“ وہ طویل سانس لے کر بولی۔ ”جب گزری باتوں کو بھول جاؤ گی تب آپ کی باتوں پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی۔“ قدرے توقف کے بعد آواز داری سے کہنے لگی۔ ”ایک بات بتاؤں ثاقب حسن ہمارا چلا گیا ہے“

”تمہیں کیسے پتا چلا؟“ جھوٹی آپا ناگواری سے پوچھنے لگیں۔

”ایک دن اسیلا سے ملاقات ہوئی تھی، اس نے بتایا تھا۔“ جھوٹی آپا کی ناگواری محسوس کر کے اس نے جھوٹ بولا۔

”دیکھو ربیعہ۔ تمہیں اب ان باتوں سے دلچسپی نہیں ہونی چاہیے۔ ثاقب حسن یہاں رہے یا کہیں بھی جائے تمہیں اس سے کیا، تو اپنے گھر کو دیکھو۔“ اس کے سر جھکانے پر کہنے لگیں۔ ”تمہاری سسرال والے بہت اچھے اور نیک لوگ ہیں اور خاص طور پر شہر و زماں کا معاشرے میں ایک نام ہے، مقام ہے۔ اگر خدا نخواستہ کسی کو بھی یہ معلوم ہو گیا کہ تمہارے دل میں اب بھی کسی اور کا خیال ہے تو وہ اسے نہ صرف اپنی توہین سمجھیں گے بلکہ۔“

”جھوٹی آپا۔“ وہ ان کی بات کا ٹپٹپٹ۔ ”کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ آپ چاہتی ہیں، میں گزری ہر بات بھلا دوں۔ ضرور بھلا دوں گی۔ لیکن کچھ وقت تو لگے گا ناں؟“

”ٹھیک ہے، وقت لگے گا۔ لیکن تم کوشش بھی تو کرو۔“

”میں کوشش کر رہی ہوں جھوٹی آپا۔ آپ فکر نہ کریں۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”اب انہیں کیسے بتائی کہ اُسے ایسی کوئی کوشش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خواب سارے جو اس

نے اس آئین میں بیٹھ کر سمجائے تھے، کبھی پھولوں کی کیا ری کے پاس کھڑے ہو کر، کبھی گرمیوں کی راتوں میں کھلے آسمان تلے چار پائی پر سیدھی لیٹی، تو ستاروں کے جھرمٹ کو دیکھتے ہوئے۔ ان سارے خوابوں کی تعبیر لئے اس شخص کے ذریعے سے ملنے والی ہے جس کے ساتھ وہ اسے وفادار رہنے کا درس دے رہی ہیں۔

”ربیعہ۔ صوفیہ۔“ اماں اُن دونوں کو پرکارتی ہوئی آگئیں۔ ”بیٹا، اتنی ٹھنڈ میں یہاں کیسے بیٹھی ہو؟ اندر چل کر بیٹھو۔“

”چلیں جھوٹی آپا۔“ وہ چادر پھینک کر اٹھتی ہوئی بولی۔ ”ذرا جھوٹی دونوں کو بھی دیکھیں کیا کر رہی ہیں؟“

جھوٹی آپا بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ پھر دونوں اندر آکر بیٹھی ہی تھیں کہ آپا میاں آگئے۔ ان کے آتے ہی کلثوم اور بہانے دسترخوان بچھا کر کھانا لگا دیا۔ کھانے کے دوران ہی بس آپا میاں نے اُن سب سے تھوڑی بہت باتیں کیں۔ اُس کے بعد اپنے بستر پر چلے گئے۔ وہ چاروں بہنیں اب میاں کو شب بخیر کہہ کر چھوٹے کمرے میں آگئیں۔

لحافوں میں دیک کر کچھ دیر تک ہنسی مذاق کرتی رہیں پھر جب نیند آنے لگی تو بہانے اُٹھ کر لاٹ آف کر دی۔ صبح نماز کے بعد جب اماں ناشتا بنانے کی غرض سے کچن میں گئیں تو وہ بھی ان کے پیچھے چلی گئی۔ اُسے دیکھ کر اماں کہنے لگیں۔

”تم یہاں کیوں آگئیں؟“

”کیوں اماں؟ میرا یہاں داخلہ منع ہے کیا؟“ وہ پٹری کی کینچ کر بیٹھتی ہوئی بولی۔

”نہیں بیٹا، منع کیوں ہے۔ میں تو سردی کی وجہ سے کہہ رہی ہوں۔“

”سردی صرف میرے لیے تو نہیں ہے اور آپ ہٹیں، ناشتا میں بناؤں گی۔“

”بیٹا۔“

”اماں۔“ آخر پہلے ہی تو میں بنایا کرتی تھی۔

”پہلے کی بات اور تھی۔ اب تم یہاں مہمان ہو۔“

”کوئی مہمان نہیں ہوں۔ بس آپ ہٹیں۔“ اُس نے زبردستی اماں کو وہاں سے اٹھا کر اندر بھیج دیا اور خود اُن کی جگہ پر آ بیٹھی۔

جب سے وہ کچن کا کام کرنے کے قابل ہوئی تھی تب سے صبح اماں کے ساتھ مل کر ناشتا وہی بنایا کرتی تھی۔ اُسے اس گھر سے گئے ہوئے بہت زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ پھر بھی اسے یوں لگتا ہے جیسے وہ ایک لمبے عرصے کے بعد اس جگہ پر بیٹھی ہو۔ کلثوم اور بہانے اسکول جانے کے لیے تیار ہو کر ناشتا کرنے کی غرض سے کچن میں آئیں تو اُسے روٹی پکاتے دیکھ کر حیران ہوئیں۔

”آپ۔ آپ کیوں پکا رہی ہیں؟“

”فضول سوال کرنے کے بجائے، آرام سے بیٹھ کر ناشتا کر لو۔“ اُس نے مگوں میں چائے ڈال کر اُن دونوں کے سامنے رکھ دی۔

”بڑا مزہ آئے جو ابھی شہر و زماں آجائیں۔“ کلثوم نوالہ منہ میں رکھ کر چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔

”ہاں، کہیں گے مہری بیوی سے کام کروا رہے ہیں۔ آئندہ نہیں جھجھوں گا۔“ بہانے ہنستے ہوئے بولی۔

”وہی آپ کی تہہ زبانی ہیں بہت اچھے۔ اتنے پیسڈم، اتنے جینس۔“

اُس نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ ٹرے میں اب میاں کے لیے ناشتا رکھنے لگی۔

”آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟“ ہمارے پوچھنے پر وہ چونک کر اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

”کس بات کی؟“

”بھئی، ہم شہر و زماں کی تعریف کر رہے ہیں۔“

”کہہ رہی ہوں۔“ وہ ٹرے اٹھا کر اُن دونوں کے درمیان سے نکلتی ہوئی اندر آگئی۔ اب میاں کے سامنے ٹرے رکھی تو انہوں نے اُسے بھی اپنے پاس بٹھا لیا۔ اور اپنے ساتھ ناشتا کرنے پر اصرار کیا۔ اماں جلدی سے اس کے لیے چائے بنا کر لے آئیں تو وہ شرمندہ ہو گئی۔



اتماں میں خود ہی لے آئی۔  
 کوئی بات نہیں بیٹا۔ چلو اب تم ناشتا کر لو۔  
 اُس نے خاموشی سے ابامیاں کے ساتھ ناشتا کیا۔ پھر کیونکہ اُماں نے اُسے کوئی کام نہیں کرنے دیا، اس لیے وہ دوبارہ جاکر کھانا میں گھس گئی۔ اس کا سونے کا ارادہ نہیں تھا۔ لیکن نیند بھراں ہو گئی۔  
 دوبارہ جب اس کی آنکھ کھلی، کافی دن چڑھ آ گیا تھا۔ چھوٹی آپا صفائی وغیرہ سے فارغ ہو چکی تھیں۔ وہ بستر سے نکل کر باہر آئی، تو اُماں دھوپ میں بیٹھی نظر آئیں۔ اُن کے ساتھ بوا بھی تھیں۔ اپنے مخصوص انداز میں سرگوشیاں میں باتیں کر رہی تھیں۔  
 اُنھ گئیں بیٹا۔؟ اُس نے بوا کو سلام کیا تو اس کی آواز سن کر اُماں پر چھنے لگیں۔  
 ہاں۔ میں سونا تو نہیں چاہتی تھی لیکن پتا نہیں کیسے نیند آ گئی؟ وہ سوئیٹر اتار کر اُماں کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ بدن کو دھوپ (اچھی لگ رہی تھی)۔  
 بیٹا۔ شادی ہو جائے تو پھر سیکے میں ٹوکیاں صرف سونے ہی کے لیے آتی ہیں۔ بوا کہنے لگی: سسرال میں نیند آ پئی کہاں رہتی ہے۔ میاں کی نیند سونا اور میاں کی نیند اٹھنا۔ پھر جب بچے ہو جاتے ہیں تو عورت اُن کے لیے وقف ہو جاتی ہے۔  
 بوا۔ آج کیسے آنا ہوا؟ وہ اس موضوع سے بٹھنے کی غرض سے پوچھنے لگی۔  
 بیٹا۔ تمہاری بہن کے لیے ایک رشتہ لالی ہوں۔  
 اور اس سے پہلے کہ بوا تفصیل بتائیں، چھوٹی آپا بچن سے نکل کر سامنے آ کھڑی ہوئیں۔  
 اُماں۔ میں نے آپ سے کہا تھا ناں کہ میرے لیے سوچنا چھوڑ دیں۔ اور بوا! میں آپ کو بھی کئی بار منع کر چکی ہوں پھر آپ کیوں ہر دوسرے ہفتے کسی نہ کسی کا پیغام لے کر چلی آتی ہیں۔ مجھے نہیں کرنی شادی۔ اور آپ سن لیں اُماں، اگر کوئی اس نیت سے ہمارے گھر آیا تو میں اسے دروازے ہی سے واپس کر دوں گی۔  
 صوفیہ۔ اُماں شاید انہیں سمجھانا چاہتی تھیں۔ لیکن وہ اپنی بات کہہ کر پیر پختی ہوئی اندر چلی گئیں۔  
 تمہاری لڑکی تو بہت بدتمیز ہو گئی ہے۔ بوا ناگ پرانگی رکھتے ہوئے بولیں۔  
 نہیں بوا۔ وہ فوراً بول پڑی۔ چھوٹی آپا بدتمیز نہیں ہیں۔ اصل میں اب تک اُن کے ساتھ جو کچھ ہوتا رہا ہے، اس سے دلیراشتہ ہو کر وہ ایسی باتیں کہہ گئی ہیں۔  
 رعبہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اُماں نے اُس کی تائید کی۔ پھر بوا جو اٹھنے کا ارادہ کر رہی تھیں، اُماں نے انہیں زبردستی روک لیا۔ البتہ وہ وہاں سے اُٹھ آئی۔  
 اندر آ کر بیٹھا۔ چھوٹی آپا حسبِ عادت چادر میں پناہ گرہیں ہو چکی تھیں۔ وہ اُن سے بات کرنا چاہتی تھی۔ لیکن جانتی تھی، اس وقت نہ وہ کچھ سنیں گی، نہ کہیں گی اور ہو سکتا ہے اُسے ڈانٹ بھی دیں۔ اس لیے وہ فی الحال انہیں اُن کے حال پر چھوڑ کر بچن میں آ گئی۔ چھوٹی آپا سبزی بلتے ہوئے اُٹھ کر گئی تھیں۔ اُس نے اُن کی جگہ سنبھال لی۔ پھر اُماں نے بار بار منع کرنے کے باوجود اُس نے نہ صرف سبزی بنائی بلکہ چڑھا بھی دی۔ پھر چاول نکال کر چھیننے لگی۔ اُسے چھوٹی آپا کے دکھ کا ہمیشہ سے احساس رہا تھا۔ اور اس وقت بھی وہ ان ہی کے بارے میں سوچتے ہوئے اندر ہی اندر گڑھ رہی تھی۔  
 کاش۔ میں چھوٹی آپا کے لیے کچھ کر سکتی۔ اُس نے سوچا۔ اُسی وقت باہر گاڑی رکنے اور پھر مارن کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ چالوں کی سطح پر اس کی حرکت کرتی انگلیاں ٹھہر گئیں۔ پھر دروازے پر دستک ہونے لگی۔ اور اس نے اُماں کو دروازے نہ حرف جانے دیکھا۔ واپس میں شہزاد احمد اُماں کے ساتھ آ رہے تھے۔ اُس نے چاہا کہ جلدی سے ہاتھوں میں پکڑا چالوں کا تھا کہ اُماں کے کنارے پر کھڑے دے اور خود بھی دروازے کی اوٹ میں ہو جائے لیکن وہ بس سوچتی رہ گئی۔ ادھر اُماں بھی انہیں اندر لے جانا چاہتی تھیں اور وہ پتا نہیں کس موڑ میں تھے، اندر جانے کے بجائے وہیں دھوپ میں رکھی چارپائی پر آ بیٹھے۔  
 اور بیٹھے ہی اُن کی نظر اس پر پڑی تو ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اور وہ جو بے خیالی میں اُن کی طرف

بچے جارہی تھی، ایک دم کھڑی ہو گئی۔ چالوں کا تھا شلیف پر رکھ کر کچن سے نکلی تو اُن سے کہنے لگیں۔  
 شہروز کے لیے اندر سے کرسی اٹھاؤ۔  
 نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ وہ فوراً بول پڑے۔  
 اچھا تو بیٹا۔ آرام سے بیٹھو۔ اُماں جھٹ اندر چلی گئیں۔ وہ ویسے بھی شہروز کے آنے سے بوکھلا گیا کرتی تھیں۔ بہت کم وقت میں چاہتی تھیں کہ اُن کے لیے پتا نہیں کیا کچھ کر ڈالیں۔ اس وقت بھی وہ پچھلے روازے سے پروس کے کسی بچے کو بلانے چلی گئی تھیں۔  
 آپ کھڑی کیوں ہیں؟۔ بیٹھ جائیں۔ انہوں نے بے حد عام سے لہجے میں اُسے مخاطب کر کے کہا تو وہ ابرائی کے دوسرے سرے پر جا بیٹھی۔  
 آپ اس وقت کیسے آئے؟۔ وہ یوں ہی بات کرنے کی غرض سے پوچھنے لگی۔  
 ہاں۔ میرا اس وقت آنا واقعی اچھے کی بات ہے۔ میرا خیال تھا ابھی آپ کچھ دن بیہوش رہیں گی لیکن ابھی فتن میں اتنی کانٹوں آیا، انہوں نے کہا ہے، میں اسی وقت آپ کو لے آؤں۔  
 دوسرے جھٹا جانے یا سوچنے۔  
 اگر آپ نہیں جانا چاہتیں تو۔  
 نہیں میں چل رہی ہوں۔ وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی اور اندر جانے کو تھیں کہ وہ کہنے لگے۔  
 سنیں۔ ذرا اپنا حلیہ ٹھیک کر لیں۔  
 حاجی۔ وہ جلدی سے اندر گئی۔ اپنے آپ پر نظر ڈالی، کپڑے شکن آلود تھے اور دوبارہ جب سر اُٹھی تھی تو منہ بھی نہیں دھویا تھا۔ دل ہی دل میں شرمندہ ہوتی ہوئی بیگ کھول کر کپڑے نکالنے لگی۔ اُسی وقت ماں ہاتھوں میں تھما اٹھاٹھے پچھلے دروازے سے نمودار ہوئیں۔  
 آپ کہاں جلی گئی تھیں؟۔ وہ استری کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑاتی ہوئی پوچھنے لگی۔  
 یہ سموسے وغیرہ۔ اور میں نے تمہیں منہ کیا تھا باورچی خانے میں مت بیٹھو۔ کیا سوچتے ہوں گے شہروز کو دونوں میاں رہنے کے لیے آئی اور ہم نے تمہیں کام پر لگا دیا۔ اُماں دبی دبی آواز میں بولیں تو اُسے ہنسی آ گئی۔  
 کچھ نہیں سوچتے وہ۔ بس آپ جلدی سے اُنہیں چلے وغیرہ دیں۔ وہ زیادہ دیر نہیں رکھیں گے۔ اور میں بھی اُن کے ساتھ جارہی ہوں۔  
 تمہیں لینے آئے ہیں؟۔  
 ہاں۔  
 اُماں اُس کا جواب سن کر کچن میں چلی گئیں۔ اور وہ جلدی جلدی کپڑے استری کرنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہوئی تو سوچا نہالے لیکن پانی گرم کرنے کا مسئلہ تھا اس لیے بس منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لیے۔ بالوں میں برش کرتے ہوئے چھوٹی آپا کے پاس آئی۔ چادر کے اندر پتا نہیں وہ سوری تھیں یا نہیں اس لیے ہلکے سے ایک دو آواز دیں، جواب نہ ملا۔ پھر اُس نے اُن کا کندھا ہلا ڈالا۔  
 کیا ہے؟۔ وہ چادر میں سے منہ نکال کر ناگوار سے بولیں۔  
 میں جارہی ہوں۔ اُس نے اطلاع دی۔  
 کہاں؟۔  
 شہروز احمد کے گھر۔ وہ جلدی میں یہی کہہ گئی۔  
 کیا مطلب؟ کیا وہ تمہارا گھر نہیں ہے؟۔ چھوٹی آپا کے ٹوکنے پر احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط کہہ گئی ہے۔  
 میرا مطلب ہے۔ اپنے گھر جارہی ہوں۔ اُس نے ہنسی میں بات سنبھالی۔  
 اس وقت کیوں جارہی ہو؟۔ شام میں چلی جانا۔  
 کیا کروں، شہروز اسی وقت لینے آ گئے ہیں۔

”اچھا تو خدا حافظ۔“ چھوٹی آپا نے دوبارہ منہ پر چادر ڈالنی چاہی کہ اُس نے اُن کا ہاتھ پکڑ لیا۔  
 ”کیا مطلب؟“ آپ شہروز سے نہیں ملیں گی؟“  
 ”اس وقت نہیں۔“  
 ”کیوں؟“

”میرا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ اگر پھولے ہوئے چہرے کے ساتھ اُن کے سامنے چلی گئی تو وہ سمجھیں گے کہ آنا ناگوار کر رہا ہے؟“  
 ”وہ ایسا کچھ نہیں سمجھیں گے۔ آپ چلیں باہر۔“ اُس نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا لیکن چھوٹی آپا نے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”ربیع۔“ بچہ تنگ مت کرو۔ تم جاؤ وہ انتظار کر رہے ہوں گے۔“ چھوٹی آپا چادر اڑھ کر روٹ بدل گئیں اُس کا دل چاہا وہ اُن کے پاس بیٹھ کر انہیں سمجھانے کی کوشش کرے لیکن اماں آواز دے رہی تھیں، اس لیے وہ کمرے سے نکل آئی۔ شہروز احمد کے سامنے رکھی ٹرے میں چائے کے ساتھ دیگر لوازمات سب کچھ اور اماں انہیں دوپہر کے کھانے تک رکنے کے لیے اصرار کر رہی تھیں۔

”اس وقت میں اتنی کے حکم پر اُس کے ضروری کام چھوڑ کر آیا ہوں۔ پھر کسی دن خاص طور سے کھانے کے لیے آ جاؤں گا۔“ وہ اماں کو سہولت سے منع کر رہے تھے۔ اُس پر نظر پڑی تو کہنے لگے۔  
 ”چلیں۔“

اُس نے اثبات میں سر ہلایا تو کھڑے ہو گئے۔ پھر اچانک انہیں یاد آیا تو پوچھنے لگے۔ ”آپ کی چھوٹی آپا نظر نہیں آ رہی؟“

”اُن کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اندر لیٹی ہوئی ہیں۔“ فوری طور پر اُسے یہی جواب سوجھا۔  
 ”چلیے، اُن کی مزاج پُرسی کر لوں۔“ انہوں نے کہا تو وہ اماں کی طرف دیکھنے لگی اور اُن کا اشارہ پا کر انہیں اندر لے گئی۔

”چھوٹی آپا۔“ شہروز آئے ہیں۔“ اُس نے چھوٹی آپا کا کندھا ہلا کر کہا تو وہ منہ پر سے چادر ہٹا کر شاید کہنا چاہتی تھیں کہ یہ اطلاع وہ پہلے بھی دے چکی ہے، لیکن شہروز پر نظر پڑی تو انہوں نے اپنے ہونٹ ہنسی کی سی طبیعت ہے آپ کی؟“ وہ پوچھ رہے تھے۔ اُن کے انداز، اُن کے لہجے میں جانے کیا بات ہوئی تھی کہ مقابل دامن پیلنے کی کوشش میں سمجھی بھی کا سیاب نہیں ہو پانا تھا۔ چھوٹی آپا کے بھینچے ہوئے ہونٹ ڈھیلے پڑ گئے۔ اور وہ جو اندر رہی اندر رہی تھی کہ چھوٹی آپا کوئی سخت جملہ نہ کہہ دیں۔ اس وقت قدرے منظر ہوئی۔ جب اُس نے چھوٹی آپا کو نرم آواز میں کہتے سنا۔

”میں ٹھیک ہوں۔ اور آپ اتنی جلدی کیوں جارہے ہیں؟“

”بس کچھ کام ہے۔ پھر کبھی فرصت سے آ جاؤں گا۔“

چھوٹی آپا اٹھنے لگیں تو انہوں نے روک دیا۔

”پلیز آپ لیٹی رہیے۔ ہم چلتے ہیں۔“ انہوں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے اپنا بیگ اٹھا لائی۔ ”اچھا چھوٹی آپا۔“ اس نے مسکرا کر چھوٹی آپا کو خدا حافظ کہا۔ اور اُن کے ساتھ چلتی ہوئی کمرے سے نکلی تو اماں برآمدے میں کھڑی تھیں۔ وہ ان سے گلے ملی انہوں نے دونوں کو دعائیں دیں۔ پھر شہروز پھر کمرے سے آنے کا کہتے ہوئے اُسے لے کر باہر آ گئے۔

شہروز احمد واقعی اُن میں اپنا ضروری کام چھوڑ کر آئے تھے۔ اتنی کی بات کو وہ مال نہیں سکتے تھے۔ اس لیے کام چھوڑ کر اُسے لینے چلے آئے۔ اور اب خیال تھا کہ گھر چھوڑ کر دوبارہ اُن سے ملے جائیں گے لیکن اتنی یہاں بھی روک لیا۔

”اتنی۔“ میں شام میں جلدی آ جاؤں گا۔ وہ بڑی عجلت میں بولے کہ جیسے ہی اتنی اجازت دیں گی، وہ نکل جائے گا۔ لیکن اتنی نے سنجیدگی سے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا۔ پھر دو گھنٹہ اُن کے ہاتھوں میں تھما دیے۔

”کیا ہے؟“ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے کبھی ٹکٹ اور کبھی امی کی طرف دیکھنے لگے۔

”تمہیں تو میرے کہنے کے باوجود خیال نہیں آیا۔ اس لیے میں نے خود ہی تمہارا پروگرام سیٹ کر دیا ہے۔ یہ دو۔“ اسی سلسلے میں ہیں۔ آج چار بجے کی فلائٹ سے تم اور ربیع اسلام آباد جا رہے ہو۔“

”کس سلسلے میں؟“ اُن کے پوچھنے پر اتنی وقفہ آگیا۔

”کس سلسلے میں نہیں۔ بس وہاں کی مٹی اٹھا کر واپس آ جانا۔“

”آئی ایم سوری امی۔“ میرا مطلب ہے۔“

”مجھے کوئی مطلب سمجھانے کی کوشش مت کرو۔“ پھر اُسے مخاطب کر کے کہنے لگیں۔

”جاؤ ربیع۔ تم تیاری کرو۔“

اُس نے ابک نظر شہروز احمد کی طرف دیکھا پھر چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ کچھ دیر بعد جب وہ کمرے داخل ہوئے تو خالص جھنجھلائے ہوئے تھے۔ فوری طور پر اُس سے تو کچھ نہیں کہا۔ بس خوانخواہ چیزوں کی بے دلتی رہے۔

وہ تنگیوں سے اُن کی طرف دیکھنے لگی۔ صبح بستانی پر ہلکی ہلکی کیسریں نمودار ہو گئی تھیں۔ وہ اندر ہی اندر نے لگی۔ کہیں اس سے کچھ کہہ دیں لیکن انہوں نے تو اُس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ تب اس سارے کے قصور وار اپنے آپ کو سمجھتے ہوئے بڑی شکل سے اپنے اندر ہمت پیدا کرتی ہوئی اُن کے سامنے اکھڑی

”تجھے انسوں سے کہ میری وجہ سے۔“ اس سے آگے الفاظ بھی ساتھ چھوڑ گئے اور آواز بھی۔ وہ صوفے پر سے پشت اوپر پھر سر رکاتے ہوئے اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ کسی بجم کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی۔  
 ”میں امی سے کہہ آئی ہوں کہ۔“ اُن کے اس طرح دیکھنے سے اس نے پھر بولنے کی کوشش کی۔  
 ”اگر ڈانٹ کھائے کا شوق ہے تو ضرور ان کے پاس جائیں۔“

”کوئی بات نہیں وہ جو کہیں گی، میں سن لوں گی۔“

وہ جانے لگی تو انہوں نے پکار لیا۔

”ربیع۔“ اُس سے بڑھتے قدم رک گئے۔ لیکن ہٹ کر دیکھا نہیں۔

”اتنی کے پاس جانے کے بجائے آپ ایک سوٹ کیس پیک کر لیں۔“ انہوں نے کہا اور اٹھ کر اسٹڈی میں گئے۔

”کس مشکل میں چھٹا گیا ہے نا قہ حسن مجھے؟“ وہ دل ہی دل میں بڑ بڑاتی ہوئی الماری کی طرف بڑھ گئی۔ اپنے کپڑے نکال نکال کر بیڈ پر آچھالنے لگی۔ اُسی وقت اُس کی چھوٹی ننہ بڑا دروازے میں سے جھانک پڑی تھی۔

”بھائی۔“ میں اندر آ جاؤں؟“

”اُو بھئی، پوچھنے کی کیا بات ہے؟“ وہ مسکرا کر بولی۔

”اصل میں بھائی جان بھی ہیں نا، اس لیے پوچھنا پڑا۔“ پھر ادھر ادھر دیکھتی ہوئی بولی۔ کہاں ہیں مائی جان؟“

”اسٹڈی میں۔“

”کچھ خفا ہیں۔“

”نہیں تو۔“ وہ کچھ سوٹ منتخب کر کے باقی دوبارہ الماری میں رکھنے لگی۔

”کیا؟“ بس یہی چند سوٹ لے جائیں گی؟“ زندہ بیڈ پر رکھے کپڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑے کا اظہار کیا۔

”بہت ہیں۔“ وہ لا پرواہی سے کہتی ہوئی سوٹ تہہ کر کے اٹیچی میں رکھنے لگی۔

”ارے نہیں بھائی۔“ یہ تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ یہ تو آپ دو ہی دن میں پہن ڈالے گا۔“ نذا خود ہی الماری کی



شہر و خوبصورت مناظر کو اپنے کیمرے میں محفوظ کرنے لگے اور وہ انہیں اپنے کام میں مصروف دیکھ کر بہت خاموشی سے اُس چھوٹی سی پیازٹی پر چڑھ گئی۔

اوپر آئی پرکھڑے ہو کر اُس نے دور دور تک نظریں دوڑائیں۔ کہیں کہیں کچھ منجلیے برف سے کھیلنے نظر آئے اور کچھ بے فکرے چوڑے جو شاید برف خاص طور پر برقباری دیکھنے آئے تھے۔ اُس نے ایک تو شہر و کو دیکھا پھر وہیں گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی۔ اور باتوں سے برف کو ایک جگہ جمع کرنے لگی۔

کتنی دیر گزر گئی تھی۔ شہر و کیمروہ بند کر کے اُس کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگے۔ پھر وہ انہیں اُس چھوٹی سی پیازٹی پر بھی نظر آگئی۔ اُس کے آگے برف کا ڈھیر تھا۔ انہوں نے یوں ہی دیکھا آنکھوں سے لگا کر دیکھا تو وہ بہت قریب نظر آئی۔ اتنی قریب کہ اُس کا ہر نقش واضح تھا۔ اُس کی سرخ گندمی رنگت میں بے پناہ کشش تھی۔ تازیدہ ہونٹ جانے کس خیال سے متحرک تھے۔ کبھی مسکراتے اور کبھی نیم وا ہوتے تو اُس کے برابر سے جیسے دانت جھلک دکھانے لگتے تھے۔

آنکھیں ایک ہی جگہ ٹھہری ہوئی تھیں۔ انہوں نے دیکھا اُس کی خوبصورت آنکھوں میں تندیوں روٹھ تھیں اور ذرا اوپر سیدھی شفاف ہانگ جو سیاہ بالوں کے بیچ چمکتی ہوئی لگ رہی تھی۔ شاید آڑی ہوئی یا آن ٹھہری تھی۔ جو کہیں کہیں بالوں میں بھی نظر آرہی تھی۔ گذشتہ ایک ماہ سے وہ اُن کے اُس پاس رہتی تھیں لیکن اس طرح انہوں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یا اگر دیکھا بھی تھا تو اس طرح نہیں وہ نہ اول ہی دل میں ہلچل مچا دیتی جیسا کہ اب پکار رہی تھی۔

”انہوں شہر و احمد۔“ اپنے آپ کو سرزنش کرتے ہوئے انہوں نے دور میں آنکھوں سے ہٹا کر تو وہ بہت دور نظر آئی۔

”کیا حماقت تھی؟“ اپنے آپ کو ٹوکا۔ لیکن یہ حادثہ اُن کے ساتھ زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ وہ رطکی ریمو اکر ام علی کی آنکھوں میں چھپی روشن تندیوں تک کو کھوج آئے تھے۔ اُس کے ہونٹوں کا مترا ہونا، اُس کی شفاف ہانگ میں ٹھہرے ہوئے روئی کے گالے۔

”اور سچ تو یہ ہے کہ ان مناظر میں سبھی یہ ڈھیر ساری خوبصورتیاں اس ایک وجود کی مرہون منت و دل حقائق کو جھٹلانے پر کسی صورت تیار نہیں تھا۔

”میرے خدا۔“ پیشانی پر آئے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر اُس کی طرف سے رخ موڑتے ہوئے آپ کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگے۔

”وہ میرے پاس امانت ہے۔“

”امانت۔“ دل ہنسا۔ مذاق اڑایا۔ ”وہ تمہاری ہے شہر و احمد صرف تمہاری۔ کیا اتنے لوگوں کو موجودگی میں تم نے اُسے اپنا نہیں کہا تھا۔ اور اُس نے اقرار نہیں کیا تھا؟“

”ہاں۔ یہ سب ہوا تھا۔ دنیا دکھاوے کے لیے۔ ورنہ دل سے نہ میں راضی تھا اور نہ وہ۔ ہم جلتے تھے کہ یہ سب نامک ہے۔“

”اپنے ہارے میں تم کہہ سکتے ہو۔ اُس کے بارے میں نہیں۔ وہ ہر بات سے لاعلم تھی اور اُس نے تم ہی مجازی خدا تسلیم کیا۔“

دل سے اُسے شہر و سے گھرا کر وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے اُس کے سر پر جا کھڑے ہوئے۔ وہ بڑے سے ایک گھر و نہ جلتے بیٹھی تھی اور شاید تصور کی آنکھ سے وہ اس گھر و نہ سے کہیں اپنے آپ کو کھڑا بھی دیکھ رہی تھی اور شاید کسی اور کا خیال بھی اُس کے ساتھ تھا۔ اُن کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہو گیا تو وہ اُس کے قریب ہی پنچوں پر بیٹھ گئے۔ وہ ایک دم چونک کر اُن کی طرف دیکھنے لگی۔

”برف کا گھر و نہ زیادہ دیر تک کھڑا نہیں رہ سکے گا۔“ انہوں نے پتا نہیں یوں ہی بات کہہ دی تھی اُسے جتایا تھا، وہ خود بھی نہیں سمجھ سکے۔

”میں جانتی ہوں۔“

”جانتی ہیں تو بنایا کیوں؟“ اور پھر اس میں اپنے خوابوں کی تعمیر کیوں تلاش کر رہی ہیں؟“ آپ کو کیسے معلوم کہ میں اس میں خوابوں کی تعمیر تلاش کر رہی تھی؟“ وہ نظریں چراتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”آپ کی آنکھوں سے جن کی سطح پر آپ کا ہر خواب جھلکتا نظر آ رہا ہے۔“

”تم نے میری آنکھوں میں کیسے دیکھ لیا شہر و احمد۔“ اُس نے سوچا اور اٹھنے کو تھی کہ انہوں نے روک دیا۔

”ایک منٹ۔ میں اس گھر و نہ سے کے ساتھ آپ کی تصویر بناؤں گا۔“ وہ اٹھ کر قدرے فاصلے پر چلے گئے۔ اور اُس کی تصویر بنانے کے بعد کہنے لگے۔

”چلیں۔“ وہ فوراً کھڑی ہو گئی اور جان بوجھ کر اُن سے دو قدم پیچھے پلنے لگی۔

اُن کے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی تو ایک دم سے بہت زیادہ ٹھنڈک کا احساس ہونے لگا۔ گو کہ کمرہ قدرے گرم تھا لیکن شاید احساسات بیدار ہو گئے تھے۔ اس لیے ہاتھ، چہرہ یہاں تک کہ پورا وجود بے حد سرد لگا۔ باہر تھی تو ہر طرف جی برف نے شاید احساسات پر بھی ہکی سی تہہ جمادی تھی جو کس بات کا حساس ہی نہیں ہوا۔ اور اب دل چاہ رہا تھا، فوراً کبل میں چھپ جائے۔ لیکن شہر و نہ آتے ہی انٹر کا پرچانے کا کہہ دیا تھا اس لیے اُسے بیٹھنا پڑا تھا۔

”شال کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ کر وہ دونوں ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑنے لگی۔ اور جب ہتھیلیاں کچھ گرم ہونے لگیں تو وہ اپنا چہرہ تھپتھپانے لگتی۔ وہ اُس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہے تھے پھر بھی بار بار نظریں جھٹک جاتیں۔ ہر بار دل چاہا، اُس کے رخ ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیں۔ وہ کوئی غیر نہیں، اُن کی اپنی ہے۔ اپنی مرضی سے اپنے سارے حقوق انہیں سوپ چکی ہے۔

”وہ چائے لے کر آیا تو وہ سر جھٹک کر اُس کی طرف متوجہ ہو گئے اور اُس کے ہاتھوں سے ٹرے لے کر میز پر رکھی۔ وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کر آگئی۔ اور کپ میں چائے ڈالنے لگی۔ پھر اُن کے آگے چائے لکھ کر اپنا کپ لے کر دوبارہ اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔

”عجب بات ہے، باہر تھی تو ٹھنڈک کا اتنا احساس نہیں تھا۔“ وہ چائے کا سپ لے کر یوں ہی بات کرنے کی غرض سے بولی۔

”آپ چائے پُر کر فوراً کبل میں چلی جائیں۔“ انہوں نے اُس کے دل کی بات کہہ دی تھی پھر بھی وہ کہنے لگی۔

”نہیں اب تو سردی کا احساس اتنا نہیں رہا۔“

”اچھا۔“ وہ ہنس دیے۔ ”مجھے تو آپ کا وجود کا نیتا ہوا لگ رہا ہے۔“

”نہیں تو۔“ وہ ساری چائے ایک ہی بار پی کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ خالی کپ ٹرے میں رکھا اور بالکونی کی طرف جانے لگی۔ انہوں نے پتار یا۔

”کہاں جا رہی ہیں؟“

”میں یہاں سے کھڑے ہو کر اپنے بنائے ہوئے گھر و نہ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”کوئی ضرورت نہیں اس وقت بالکونی میں چلنے کی۔ چلیں کبل اوڑھ کر بیٹھیں۔“ قدرے رعب سے کہا۔

”تو وہ دیر سے پلٹ آئی۔ بیڈ پر بیٹھ کر ذرا سا کبل اپنے اوپر کھینچی لیکن جب محسوس ہوا کہ وہ اُسے ہی دیکھ رہے ہیں تو پوری کبل میں جا چھپی۔ وہ خالص محفوظ ہوئے۔ اور سگریٹ سلگا کر اپنے لیے اور چائے بنانے لگی۔

”دوبالیں آئے۔“ خبر ہو گئی تھی۔ ایسی گہری میندر سونی کہ رات میں نہیں اٹھی۔ انہوں نے کھانے کے لیے ایک دوبارہ اُسے آواز دی لیکن وہ بے خبر تھی۔ کبل اُس کے چہرے سے سرک گیا تھا۔ اور ایک بازو بھی باہر نکلا۔ اور وہ اُس کی بے خبری پر حیران تھے۔ حیرت کی بات تو تھی کہ اُن کے جذبوں کو بیدار کر کے خود مرے

سے سو رہی تھی۔ کاش وہ اُس وقت دیکھتی کہ شہر وڑکی آنکھیں زندگی میں پہلی بار رینگے سے آشنا ہو رہی تھیں۔

اپنے آپ سے کیسے لڑا جاتا ہے، وہ اب جان رہے تھے۔  
انہوں نے خواہشات کیسے جنم لیتی ہیں، آج معلوم ہو رہا تھا۔

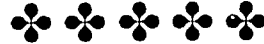
اور

دل کو سمجھانا کس قدر مشکل ہے، یہ تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

رات طبع بہ لمحہ بھیگتی جا رہی تھی اور وہ لڑکی ربیعہ اکرام علی گہری نیند سو رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر شہر وڑاؤ کا جی چاہ رہا تھا، وہ بھی اُس کی طرح گہری نیند سو کر رہا تھا۔ بے خبر ہو جائیں لیکن ہمیشہ تو وہی نہیں ہوتا جو دل چاہتا ہے۔ انہوں نے بھی بہت کوشش کی لیکن پلکیں ایک دوسرے سے ملنے پر آمادہ ہی نہیں ہوئیں۔

کتنی دیر تک کمرے میں ادھر ادھر ٹہلتے رہے۔ کسی کسی وقت رُک کر اُسے دیکھنے لگتے۔ پھر اپنے آپ کو سرزنش کرتے ہوئے اُس کے پاس سے ہٹ جاتے۔ دل کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ اُن کی نگاہ میں نہیں آ رہا تھا۔ زندگی میں یہ کیسا مقام آگیا ہے۔

”میں اس طرح بے اختیار تو کبھی نہیں ہوا۔“ انہوں نے سوچا اور صوفے پر نیم دراز ہو کر کھیل سے تنگ کھیچ لیا۔ اب اُس کا چہرہ براہ راست اُن کی نگاہوں کی زد میں تھا۔ بہت کوشش کی نظروں کا کارِ بدل لیں، کسی طرح کامیابی نہیں ہوئی، تو سگریٹ کا گہرا کش لے کر دھواں اُس کی طرف چھوڑ دیا۔ بس لمحہ بھر کو ہی درمیان میں وضد کی چادر سیٹھی تھی اور جب دھند چھٹی تو وہ دُشرب کر دینے والا چہرہ پھر سامنے تھا۔



دیکھ نہیں تھا کہ شہر وڑاؤ کو کبھی لڑکیوں سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ جیسی وجیہ شخصیت کے وہ کا تھے اور جو اسٹیشن ان کا تھا، اس لحاظ سے تو بے شمار لڑکیاں اُن کی آرزو مند تھیں اور اکثر یہی کسی کسی بہانے ان کے راستے میں آتی رہی تھیں لیکن انہوں نے کبھی توجہ ہی نہیں دی یا پھر شاید کسی نے اثرِ انٹیکٹ ہی نہیں کیا تھا جو وہ کسی کے لیے سوچتے۔

وہ آئیڈیلزم پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ کبھی کوئی خاکہ نہیں تراشا کہ شاہراہ حیات پر قدم سے قدم چلنے والی کیسی ہوگی۔ بس خیال تھا جب وقت آئے گا، اتنی خود ہی سوچیں گی اور جسے منتخب کریں گی سعادتمندی سے سر جھکا دیں گے اور اتنی تو بہت پہلے سے اُن کے لیے سوچنے لگی تھیں۔

لیکن ابوجی کی اچانک وفات نے اُن کے کان دھوپ پر جو قداریاں ڈال دی تھیں، اس سے وہ نہ خود اپنی ذات سے نظریں چرانے پر مجبور ہوئے بلکہ اتنی کو بھی منع کر دیا کہ وہ فی الحال ان کے بارے میں نہ جب تک مہر و زکی قابل نہیں ہو جاتا۔ اور جب مہر و زان کے ساتھ افس کی دتر داریاں شیش کرنے کے فائز تھیں تو اتنی ایک بار پھر ان کے لیے سوچنے لگیں اور باقاعدہ لڑکی کی تلاش بھی شروع کر دی۔ وہ ابھی شادی نہیں چاہتے تھے۔ اس کی کوئی خاص وجہ تو نہیں تھی، بس چاہتے تھے، پہلے بڑا اپنے گھر کی ہو جائے۔ اور انہوں نے دیے لفظوں میں اتنی سے کہا تھا لیکن انہوں نے اُن کا یہ مندر کسی طرح نہیں مانا۔

ان ہی دنوں ثاقب حسن اُن کے پاس آیا۔ بے حد پریشان اور زندگی سے مایوس۔ پہلی بار بھی وہ اسی طرح مایوس حالت میں ملا تھا۔ اس وقت غالباً وہ فائنل ایئر میں تھا اور امتحانوں کی فیس نہ ہونے سے بے حد مایوسی کے عالم میں ان کی سائیٹ پر مزدوری کرنے کی عرض سے آیا تھا۔ اس وقت اتفاق وہ بھی سائیٹ پر موجود تھے۔

ثاقب حسن نے اُن کے پاس آکر کہا کہ وہ صرف ایک ہفتہ کے لیے کوئی کام چاہتا ہے۔ اور اُن

استفسار پر اس نے بتایا تھا کہ وہ پڑھ رہا ہے اور اس وقت کسی انتہائی ضرورت کے تحت یہ کام کرنے کے لیے چلا آیا ہے۔ اُس نے صاف لفظوں میں نہیں بتایا تھا کہ اس کے پاس امتحانوں کی فیس کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ شاید خود داری اُسے آئی تھی لیکن وہ کچھ سمجھ گئے تھے اور انہوں نے سوچا تھا، اگر وہ یہاں مزدوری پر لگ گیا تو پھر اس کی اسٹیڈی کا حرج ہوگا۔ اسی لیے وہ اسے اپنے ساتھ افس لے گئے اور اُس کی ضرورت بغیر مزدوری کے پوری کرنے کی کوشش کی لیکن اُس نے انکار کر دیا تھا۔ پھر انہوں نے بعد اصرار قرض کے طور پر کچھ رقم دی تھی۔ اور جب کچھ عرصے بعد ثاقب حسن اُن کا قرض لوٹانے آیا تو اسی دن سے اُن کی دوستی کی ابتدا ہوئی تھی۔

پھر اکثر ثاقب حسن اُن کے پاس آئے لگا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ وہ بے شمار مسائل میں گھرا ہوا اور حالات کا شکار ہونے کے باوجود خاصا خود دار ہے۔ کیونکہ اس نے اول روز کے بعد پھر کبھی اپنے کسی مسئلے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اور ایک دو بار انہوں نے اسے جا بک آفر بھی کی تو اس نے شکر کے ساتھ منع کر دیا تھا۔ شاید وہ اُن کے سامنے اپنے آپ کو مجبور ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا اور دوسری بار جب وہ پریشان حال اور زندگی سے مایوس ان کے سامنے آیا تو وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ بے حد کمزور اور شکستہ سا نظر آ رہا تھا۔

”کیا مسئلہ ہے؟“ مجھے بتاؤ۔“ انہوں نے نرم لہجے میں پوچھا تھا۔

”کیا آپ میرا مسئلہ حل کریں گے؟“ وہ کچھ یقین اور غیر یقینی میں گھبر کر ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”اگر میرے اختیار میں ہوا تو ضرور حل کروں گا۔“

”آپ کے اختیار میں ہے شہر وڑاؤ۔“ وہ فوراً بولا تھا۔

”اچھا۔ اگر تم اتنے یقین سے کہہ رہے ہو کہ اسے حل کرنا میرے اختیار میں ہے تو ضرور حل کروں گا۔“ وعدہ؟“ ثاقب حسن نے اپنا ہاتھ میز کی سطح پر رکھ دیا تھا۔

”ارے۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں ذرا سانس کرائے تھے۔ وعدہ لینے کی ضرورت کیوں پیش آئی ثاقب حسن؟ کیا تمہیں میرا اعتبار نہیں ہے؟“

”اعتبار کی بات نہیں ہے۔ بس میں کچھ غیر یقین سا ہوں۔“

”چلو، تو پھر میں تمہارے یقین کی خاطر وعدہ بھی کر لیتا ہوں۔“

ثاقب حسن طویل سانس لے کر گویا مطمئن ہو گیا تھا۔ اور اپنی پتھیلی پر رکھے اُن کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے اُس نے انہیں اپنے اور ربیعہ کے بارے میں بتایا اور پھر اُن سے ربیعہ سے شادی کر لینے کے لیے کہا۔ وہ کس قدر حیران ہوئے تھے اور انہیں ثاقب کی دماغی حالت پر شبہ بھی ہوا تھا۔ صاف منع کر دیا۔

لیکن ثاقب حسن نے اُن کی بہت منت سماجت کی یہاں تک کہہ دیا کہ وہ ان کے علاوہ کسی اور پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ اُسے یقین ہے کہ وہ ربیعہ کو اُس کی امانت سمجھ کر اپنے گھر رکھیں گے، اور جب وہ اپنی جدوجہد میں کامیاب ہو کر لوٹے گا تو شہر وڑاؤ اس کی امانت اُسے لوٹا دیں گے۔ شہر وڑاؤ احمد بھی تیار نہیں ہوتے۔ لیکن وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے پر تیار تھا اور یہیں وہ میسر ہو گئے اور انہوں نے ہامی بھری۔ پھر ربیعہ باقاعدہ نکاح کے بعد اُن کے گھر آئی۔

گو کہ وہ اس ساری صورتحال سے لاعلم تھی لیکن انہوں نے ”شب زفاف“ کے اولین لمحوں میں ہی ثاقب حسن کا خط اس کے ہاتھ میں تھا کہ ساری صورتحال اس پر واضح کر دی تھی اور خود بری الذمہ ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک بے ضرر سی لڑکی اگر کچھ عرصہ اُن کے گھر۔۔۔ وہ لے گئی تو اس سے انہیں کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ لیکن وہ یہ بھول گئے تھے کہ اس بے ضرر سی لڑکی کو وہ باقاعدہ بیاہ کر لائے ہیں۔ اور جس بندھن

میں بندھے ہیں، اس کے تقاضے دنیا داری کے لیے ہی ہیں بہر حال نبھانے پڑیں گے۔  
کل تک بلکہ کچھ وقت پہلے تک انہیں اس لڑکی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اتنی کے حکم پر وہ اسے ام  
پر فضا مقام پر لے آئے تھے۔ خیال تھا زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ یہاں ٹک کر واپس کی راہ لیں گے۔ اور  
کے لیے تو ایک ہفتہ بھی بہت زیادہ تھا۔ ظاہر ہے ایک ایسی لڑکی کے ساتھ وہ کیا فرح کر سکتے تھے جس  
صرف وجود اس کے ہونے کا احساس دلاتا تھا۔ اور اب اچانک جیسے ہر شے بلکہ کائنات کا ذرہ ذرہ اس  
موجودگی کا نہ صرف احساس دلا رہا تھا بلکہ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ہے تو سب کچھ ہے۔

”میرے خدا۔“ انہوں نے گھنے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ کچھ حیران ہو  
تھے، پشیمان بھی کہ ان کی سوچیں کس رخ پر بہنے لگی ہیں۔ کتنے یقین سے ناقب حسن نے کہا تھا کہ وہ ان کے  
علاوہ کسی اور پر اعتبار نہیں کر سکتا۔

”لیکن اسے سوچنا چاہیے تھا کہ میں بھی ایک انسان ہوں اور سینے میں پتھر نہیں عام انسانوں جیسا دل رکھ  
ہوں۔“ انہوں نے اپنا دفاع کرتے ہوئے سوچا

اپنی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے نبھانے کے لیے اگر کچھ وقت کے لیے میں نے اپنی ذات کو نظر  
کر دیا تھا تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ میں ہمیشہ ہی اپنے آپ سے غافل رہتا۔ مجھے بہر حال اپنے لیے  
سوچنا تھا۔ اور ناقب حسن! ایک جیتا جاگتا وجود جس کا غیر شاید قدرت نے دوسروں کو تسخیر کر لینے  
والی مٹی سے اٹھایا ہے، میرے تیر کر کے اتنے اطمینان سے کیسے چلا گیا۔ اس نے یہ کیوں نہ سوچا کہ زندہ  
میں بعض لمحات ایسے بھی آتے ہیں جب انسان بالکل ہی بے بس و بے اختیار ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ میں  
رہا ہوں۔

بخدا! اس گزرتی شب کا ہر پل گواہ ہے کہ میں نے اس چہرے سے نظریں ہٹانے کی بہت کوشش کا  
لیکن کسی طرح بھی مجھے اپنی کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی۔

”یہ ناقب حسن مجھے کس امتحان میں ڈال گیا ہے؟“ وہ کھیل پھینک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اپنے آپ  
سے اچھے ہوئے بالکونی میں نکل آئے۔ رات کا سفر اپنے اختتام پر تھا۔ گہرے بادلوں میں سے کہیں کہیں  
اُجالے کی ہلکی سی کرن دن کے آنے کی نوید دے رہی تھی۔

”اگر میں وہاں کھڑی ہوتی تو کیا میں بھی برف میں چھپ جاتی؟“ اس کی سادہ سی سرگوشی کہیں اس پاکر  
سنائی دینے لگی۔ گویا یہاں بھی وہ ان کے ساتھ ساتھ تھی۔ گھبرا کر دوبارہ اندر آئے۔ وہ ابھی تک آٹھ  
سو رہی تھی۔ دل چاہا جھنجھوڑ کر اٹھا دیں اور پوچھیں ”میری نیند چرا کر تم اتنے سکون سے کیسے سو رہی ہو؟“  
بے اختیار ایک قدم اس کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ جیسے ہوش میں آگئے۔

”مجھے اس سے دور چلے جانا چاہیے۔ شاید اس کے سحر سے نکل سکوں۔“ انہوں نے سوچا اور کوٹ پہن کر  
جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ پھر جاتے جاتے ایک کاغذ پر چند لائنیں لکھ کر اس کے سر پر رکھ گئے تھے  
ان کے جانے کے کوئی آدھ گھنٹہ بعد وہ اٹھی تھی۔ انہیں کمرے میں نہ پا کر پہلے یہی سمجھی کہ ہاتھ روم میں  
گئے یا پھر بالکونی میں۔ لیکن دونوں دروازے بند تھے۔ کندھے اُچکاتے ہوئے دوپٹے کی تلاش میں ادھر اُدھر  
ہاتھ مارا۔ تو تکیے پر رکھا کاغذ ہاتھ میں آگیا۔ فوراً دیکھنے لگی۔

”میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں، واپسی میں دیر ہو جائے

گی شام یا ہو سکتا ہے رات بھی ہو جائے۔“

”مطلع کرنے کا شکریہ شہر و زاہد۔“ وہ قدرے اونچی آواز میں بڑبڑائی۔ یہ تکلف نہ بھی کرتے تو مجھے کوا  
سا انتظار رہتا تھا۔“

اب جب یہ معلوم ہو گیا تھا کہ شہر و زاہد اس پاس موجود نہیں ہیں۔ اور فوراً آئیں گے بھی نہیں تو وہ اطمینان  
سے گنگنائی ہوئی اٹھی۔ منہ ہاتھ دھو کر انٹرکام پر ناشتے کے لیے کہا اور بالکونی میں نکل آئی۔

اس وقت برفباری نہیں ہو رہی تھی البتہ گہرے بادلوں کے قافلے ایک دوسرے کا تعاقب کرتے چلے آئے  
تھے۔ اس نے گہری سانس لے کر دوبارہ خارج کی تو ہونٹوں سے بھاپ نکلی۔ جیسے سگریٹ کا دھواں۔ وہ  
ابھی محفوظ ہوئی اور بار بار ہونٹوں سے بھاپ اڑاتے لگی۔

دروازے پر دستک دے کر شاید ویٹر اندر آ گیا تھا۔ میز پر برتن رکھنے کی آواز آنے لگی تھی۔ اس نے کچھ  
بانتظار کیا۔ پھر اس کے جانے کے بعد اندر آئی۔ اطمینان سے بیٹھ کر ناشتا کیا۔ پھر ابھی چائے کے دو تین  
سپ ہی لیے تھے کہ انٹرکام پر منیجر نے بتایا کہ کراچی سے اس کی کال ہے۔ وہ کپ چھوڑ کر تقریباً بجائی ہوئی  
نیچے آئی۔ دوسری طرف اٹی تھیں۔

”السلام علیکم اٹی۔“ ان کی آواز سننے ہی اس نے سلام کیا۔ بھاگنے کی وجہ سے سانس پھولی ہوئی تھی جیسی  
اتنی قدرے پریشانی سے پوچھنے لگیں۔

”کیا ہوا بیٹا، خیریت سے تو ہونا ہے۔“

”جی ٹھیک ہوں، اصل میں بہت جلدی میں بیٹھیاں آرتی ہوئی آئی ہوں اس لیے سانس پھول رہی ہے۔“  
”اور یہ شہر و زاہد کہاں ہے؟“

”وہ ابھی کسی کام کے سلسلے میں نکلے ہیں۔“  
”وہاں بھی اسے کام یاد آگئے اور نہیں کیلا چھوڑ کر گیا ہے؟“ اٹی کے کہنے پر لمحہ بھر کو وہ گوبڑا گئی۔ پھر  
فوراً سنبھلے ہوئے بولی۔

”جی، میں خود نہیں گئی۔ اصل میں سردی اتنی ہے کہ باہر نکلنے کی ہمت نہیں ہوئی اور نہ کیسی ہے؟“ آخر  
میں بات بدل گئی۔

”ٹھیک ہے۔ اچھا شہر و زاہد تو اس سے کہنا مجھے فون کرے۔“

”جی اچھا۔“ اس نے خدا حافظ کہہ کر ریسپور رکھ دیا۔ اور منیجر کا شکریہ ادا کرتی ہوئی اوپر آگئی۔ اب کرنے  
کو کچھ نہیں تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں کمرے کی صفائی ہو چکی تھی اور ویٹر ناشتے کا سامان بھی لے گیا تھا۔ کچھ دیر  
تک وہ بیوی بے دلی سے کمرے میں ادھر سے ادھر تھلتی رہی۔ پھر میگزین لے کر بیڈ پر آ بیٹھی۔ کھل ٹانگوں پر  
کھینچ کر میگزین کی ورق گردانی کرتے ہوئے اچانک ذہن بچھک گیا۔

”تم تو بس اتنا کرنا میری جان کہ میرے حوالے سے اچھے اچھے خواب سجاانا اور تمہاری آنکھوں میں جو میں نے  
محبوبت کے دیپ جلائے ہیں، انہیں یوں ہی جلتا رکھنا۔“

اس پاس دھیمی دھیمی سرگوشیاں سنائی دینے لگیں تو اس نے پکیں موند کر بیڈ کی پٹی سے سر نکال لیا اور کھو  
جانا تو اس کی عادت تھی۔ پھر اس وقت کوئی اور موجود بھی نہیں تھا۔ نہ کوئی دستک دینے والی آواز نہ چونکا  
دینے والی آہٹ۔ کچھ بھی نہ تھا۔ بس گئے دنوں کے کچھ حسین لمحات جو در دل پر دستک دیتے چلے آ رہے تھے۔  
اور دل کے در پر بچے کیا وہ کسے کہ بادوں کی برسات آرتی چلی آئی جس میں اس کا قن من بھیلنے لگا۔

وہ کالج سے بس اسٹاپ تک کا فاصلہ اس کی ہمار ہی میں طے کرنا۔

وہ کبھی کبھار اس کا نرمی سے ہاتھ چھو لینا۔

وہ آندروں میں حوصلہ دیتے ہوئے اس کا ہونٹ بھینچ لینا۔

کیا کیا نہ یاد آیا۔ یادوں کے میلے میں بھٹکتے ہوئے وہ حال سے بالکل ہی نانا تو رہی تھی، جب ہی تو شہر و زاہد  
کے آنے کا پتہ آیا نہیں چلا۔ وہ اسے نظر انداز کرنا چاہتے تھے، لیکن اس کا یہ روپ نظر انداز کر دینے والا ہرگز  
نہیں تھا۔ پکوں کارلرنا۔ ہونٹوں کا متحرک ہونا۔ اور چہرے پر پھیلے قوس و قزح کے رنگ۔

وہ سینے پر ہاتھ باندھے عدا خاموش نظروں سے آتے دیکھتے گئے۔ اس کے متحرک ہونٹ اچانک  
سکڑے اور پھر ایک دوسرے پر جم گئے۔ انہوں نے دیکھا وہ بار بار ایسا کر رہی تھی۔ بے خیالی میں انہوں نے بھی  
اسی کے انداز میں اپنے ہونٹوں کو حرکت دی اور جیسے ہی ہونٹ نیم وا ہو کر دوبارہ ایک دوسرے پر جمے، وہ

چونک گئے۔ "شائبہ"۔ دل ہی دل میں دہراتے ہوئے وہ بے چین ہو گئے۔ جس سے فرار کی خاطر وہ صبح ہی یہاں سے نکل گئے تھے۔ خیال تھا اس سے دور ہوں گے تو اس کے سحر سے بھی آزاد ہو جائیں گے۔ لیکن وہ تو ہر جگہ جیسے ان کے ساتھ ساتھ رہی تھی۔ اس کا خیال اتنا زور آور تھا کہ کہیں بھی نہیں لینے دیا بالآخر ہار مان کر وہ واپس لوٹ آئے اور جس کی خاطر لوٹے تھے، وہ کسی اور کے تصور میں کم شدت سے اُسے یاد کر رہی تھی۔

ان کے اندر ٹوٹ پھوٹ ہونے لگی اور غرض اس کا تصور توڑنے کی غرض سے کھانسنے لگے۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور انہیں دیکھ کر سیدھی بیٹھتی ہوئی پوچھنے لگی۔

"آپ کب آئے؟"

"ابھی جب آپ نے دیکھا۔" وہ کرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھے اور جیب سے سگریٹ نکال سٹیکانے لگے۔ وہ کچھ دیر تک اُن کی طرف دیکھتی رہی پھر اس خیال سے کہ شاید وہ لیٹنا چاہیں۔ بیڈ سے اُتر آئی۔

"آپ کیوں اُٹھ گئیں؟" اُس نے جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے کنارے والے صوفے پر جا بیٹھی، پھر کہنے لگی۔

"اتنی کافون آیا تھا؟"

"خیریت؟ کیا کہہ رہی تھیں؟"

"کوئی خاص بات نہیں البتہ یہ کہہ رہی تھیں کہ آپ انہیں فون کر لیجیے گا۔"

"اچھا۔" کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگے۔ "فون کرنے کی بجائے کل ہم لوگ خود چلتے ہیں۔"

"جیسے آپ مناسب سمجھیں۔"

"یہی مناسب ہے۔" پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔ "چلیے مال روڈ چلتے ہیں، آپ کچھ شاپنگ کریں۔"

"ہاں۔" اپنی طرف اشارہ کیے وہ کچھ کنفیوز سی ہو گئی۔ "لیکن مجھے تو کچھ نہیں لینا۔"

"کیوں؟ بڑا کے لیے گفٹ نہیں لیتا۔"

"ہاں، اس نے کہا تو تھا۔" وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"چلیں جلدی سے ڈریس چینج کر لیں، پھر آکر شاپنگ کریں گے۔"

وہ خاموشی سے اٹھی۔ اور اپنے کپڑے لے کر باتھ روم میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو وہ جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔

"کوٹ پہن لیں، باہر سردی زیادہ ہے۔" وہ اسے ہلکا سا سوئٹر پہنے دیکھ کر کہنے لگے۔ اُس نے سوئٹر پھینک کر کوٹ اٹھا لیا اور ان کے ساتھ باہر نکل آئی۔

یہ پہلا موقع تھا جو وہ اُن کے ساتھ شاپنگ کے لیے آئی تھی۔ بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس کا خیال تو یہی بہت ہے کہ وہ اسے اپنے گھر میں جگہ دے ہوئے ہیں اور ان کی طرف سے نزدیک کوئی چیز اسے نہیں لینا چاہیے۔ اس لیے وہ ہر شے پر سرسری نظر ڈالتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔

"آخر انہیں پوچھنا پڑا۔" کیا لیں گی بڑا کے لیے؟

"میں کیا کہہ سکتی ہوں؟" وہ دامن پکانے لگی۔

"ارے۔" وہ قدم روک کر کھڑے ہو گئے۔ اُس نے تو بڑے مان سے کہا تھا کہ آپ اپنی مرضی پسند سے کوئی چیز لے آئیے گا۔

ہاں لیکن مجھے اندازہ نہیں ہے کہ وہ کیا چیز پسند کرے گی؟

"آپ جو بھی چیز لیں گی، وہ ضرور پسند کرے گی، یہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔" اچھا۔ "وہ سنسن پڑی۔" یہ جاننے کے باوجود کہ میری پسند صرف ظاہری خوبصورتی کی حد تک ہے۔" ہاں۔ وہ براہ راست اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگے تھے۔ وہ زروس ہوئی اور رُخ موڑ کر دوکان کے داخل ہو گئی۔

بڑا اور اتنی کے لیے اس نے سوٹ اور گرم شال پسند کی۔ اور جب پیک کرنے کے لیے کہا تو وہ چونچنے لگے۔ اپنی سنسنز کے لیے نہیں لیں گی؟

"نہیں۔" اس نے منع کیا۔ اس کے باوجود انہوں نے خود سلیزین سے تین سوٹ اور پیک کرنے کے لیے کہا۔ وہ خاموشی سے دیکھتی رہی لیکن باہر کرکچر پڑی۔

"یہ سب بڑا کے لیے ہیں۔ میں اپنی کسی سنسنز کو نہیں دوں گی۔"

"آپ رست دیکھیے گا۔ میں دے دوں گا۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے اور اب واپس چلیں۔"

"واپس بھی چلیں گے۔ پہلے آپ اپنے لیے تو شاپنگ کر لیں۔"

"مجھے کچھ نہیں لینا۔" وہ قطعیت سے بولی۔

"کیوں نہیں لینا؟ اتنی اور خاص طور پر بڑا پوچھے گی کہ آپ اپنے لیے کیا لائی ہیں، تو کیا دکھائیں گی؟"

"میں کچھ بھی کہہ دوں گی، بس اب واپس چلیں۔" وہ الجھ کر بولی۔

"اس طرح نہیں۔ آئیے ادھر چلتے ہیں۔"

"شہر و پلینز، آپ سمجھتے کیوں نہیں؟" وہ روہانسی ہو گئی۔

"کیا سمجھانا چاہتی ہیں آپ مجھے؟" اس کا الجھنا اور خفا ہونا اچھا لگ رہا تھا۔

"میں کیا سمجھاؤں گی، آپ خود۔" وہ خاموش ہو کر کچلا ہونٹ کاٹنے لگی۔

"چلیے، یہ سمجھنے سمجھانے کی باتیں بعد کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ فی الحال تو آپ میرے ساتھ آئیں۔"

وہ اسے لیے ہوئے ایک دوکان کے اندر داخل ہو گئے۔ پھر مختلف ڈاکانوں سے اس کے لیے مختلف

بیزیز خریدیں۔ اس دوران وہ احتجاجاً خاموش رہی اور کسی چیز میں دلچسپی کا اظہار بھی نہیں کیا۔ حالانکہ ہر

راہنہوں نے اس کی پسند پوچھی۔ کوئی بھی چیز پیک کر وائے سے پہلے اس سے پوچھا کیسی ہے؟

واب میں وہ ان کی طرف سے منہ پھیر گئی۔ وہ اس کی اس حرکت سے محفوظ ہوئے۔ واپسی میں تمام

شاپنگ بیگ بیڈ پر رکھے اور خود بھی وہی نیم دراز ہوتے ہوئے کہنے لگے۔

"میں نے سنا تھا اردکیاں شاپنگ کی بڑی دلدادہ ہوتی ہیں۔ لیکن آپ تو سارا وقت بہت بیزار رہیں۔"

کیا واقعی آپ کو شاپنگ سے کوئی دلچسپی نہیں؟

جواب میں وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

"ارے۔" وہ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور اس کے قریب آتے ہوئے قدرے پریشانی سے پوچھنے

لگے۔ "ربیعہ کیا ہوا ہے؟"

وہ اور شدت سے رونے لگی۔

"ربیعہ۔" انہوں نے بیکار اور چاہا کہ اس کی دونوں کلاشیاں تھام کر چہرے سے ہاتھ ہٹا دیں۔ لیکن پتا

نہیں وہ کیا سمجھے، یہی سوچ کر اپنے آپ کو باز رکھا۔

"پلینز خاموش ہو جائیں۔" قدرے رعب سے کہا تو وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑنے لگی۔

"میں نے کچھ غلط کہہ دیا کیا؟" وہ اُس کی جھگی پکوں پر نظریں جماتے ہوئے بولے۔

"شہر زرا آمد۔ آپ جانتے ہیں کہ میں زبردستی آپ پر مسلط کی گئی ہوں۔ آپ کا یہی احسان بہت ہے

کہ مجھے اپنے گھر میں جگہ دی اور اس نام نہاد بندھن کے تقاضے نبھانے کی خاطر آپ کو اپنے ضروری کام چھوڑنے



پڑتے ہیں۔ اس سے زیادہ آپ مجھے زبرد نہ کریں۔ میں آپ کا احسان اتارنے کی اہل نہیں ہوں۔ بار کے اختتام پر اس نے سر اٹھا یا تو وہ اس کی شرفی مائل آنکھوں میں دیکھتے رہ گئے۔ اور دل میں یہ خواہش بھی جاگی کہ ان بے حد حسین آنکھوں کی پہریدار پلکوں کو نرمی سے چھولیں۔

”ربیع۔“ بشکل تمام اپنے آپ کو بولنے پر آمادہ کر پائے۔ ”سب سے پہلے تو دل سے یہ خیال نکال دیکھ کر میں نے آپ پر کوئی احسان کیا ہے یا کر رہا ہوں۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ بندھن نام نہاد پر یہ ملتے جھوٹے سہی پھر بھی ایجاب و قبول نے مجھے کچھ دتر داریوں یا فرائض کا پابند کر دیا ہے اور میں ان فرائض سے کبھی غافل نہیں ہوا۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

”ابھی تو ابتداء ہے اور دو برسوں میں جانے کتنے موسم آئیں گے، جب مجھے آپ کے لیے نہ صرف سوجنا بلکہ کرنا بھی ہے۔ تو کیا ہر بار آپ یہ سمجھیں گی کہ میں آپ پر احسان کر کے آپ کو زبرد کر رہا ہوں اور کیا ہر بار آپ مجھے اس بندھن کے نام نہاد ہونے کا احساس دلائیں گی۔ پلینز ربیع میرے اندر یہ احساس زندہ ہے میں خود اس حقیقت سے آگاہ ہوں۔ آپ بار بار کسی بات کو مت دہرائیں اور پھر مجھے صرف آپ کا نہیں اپنا بھی خیال ہے۔ مجھے اپنی پوزیشن بھی صاف لگنی ہے۔ کیا آپ نہیں جانتیں کہ مجھے اپنے ہر عمل کے لیے اپنی اتنی کے آگے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ وہ میرا آپ کی ذات کو نظر انداز کرنا کسی طرح برداشت نہیں کریں گی۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں ناں؟“ وہ فقط ایک لفظ ”جی“ تک نہ کہہ سکی۔

”ربیع۔“ رکاش وہ آگے ”میری جان“ کا اضافہ بھی کر سکتے تھے۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو اتنی سنجیدگی سے نہ سوجھیں۔ یہ ساری باتیں معمول کا حصہ ہیں، انہیں اسی طرح فیس کریں۔“

”آئی ایم سوری۔“ وہ نادم نظر آنے لگی۔  
”کس بات کے لیے؟“  
”میں نے آپ کو پریشان کیا۔“  
”تم نے مجھے کس طرح پریشان کیا، یہ تم کیا جانو۔“ انہوں نے سوچا پھر رینگ میں اُس کی مدد کرنے لگے۔

اتنی جان ان کی اتنی جلدی اور اچانک واپسی پر حیران رہ گئیں۔ ابھی کل ہی تو انہوں نے ربیع سے فون بات کی تھی۔ اور اس نے اپنی آمد کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔  
”اتنی جلدی واپس کیوں آ گئے؟“ اتنی اچنبھے سے پوچھنے لگیں۔  
”ربیع سے پوچھیں۔“ انہوں نے مسکرا کر اس پر بات ڈال دی اور اس کے گرد بڑا کر دیکھنے سے غافل محفوظ ہوئے۔

”کیا بات ہے بیٹا؟ کیا وہاں دل نہیں لگا یا شہر وز زبردستی واپس لے آیا ہے؟“  
”نہیں تو۔ اصل میں۔“ فوری طور پر کوئی بہانہ نہیں سوچا تو پھر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ انہیں رقم بگا اس کی بات سنہلاتے ہوئے کہنے لگے۔

”اصل میں یہ خاصی نازک مزان ہیں۔ وہاں کے موسم کی شدتیں برداشت نہیں کر پائیں۔ جلتے ہی زلہ اور زکام شروع ہو گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ یہ بخار وغیرہ میں مبتلا ہوتیں، میں واپس لے آیا۔ آپ ان کی شکل نہیں دیکھ رہیں۔“

”ہاں۔“ اتنی نے اُس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام لیا۔ کمزور لگ رہی ہے ورنہ میرا تو خیال تھا، وہاں کی آب و ہوا اچھا اثر ڈالے گی۔  
”ویسے بیانی، اچھا ہوا آپ آگئیں۔ آپ کے بغیر گھر سونا سونا لگ رہا تھا۔“ نڈا اُس کے گلے میں بازو جامل کرتی ہوئی بولی۔

”ربیع۔“ اب آپ جلدی سے نڈا کو اس کا گفٹ دے دیجیے۔ ورنہ یہ یوں ہی جھوٹی محبت جتناقی ہے گی۔“ انہوں نے ہنستے ہوئے نڈا کو چھیڑا تو وہ برا مانتی ہوئی بولی۔  
”آپ کا مطلب ہے۔ میں صرف گفٹ کی خاطر۔؟“  
”بالکل۔“

”جی نہیں۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے گفٹ کی۔ میں ایسے ہی بھالی سے بہت پیار کرتی ہوں آپ سے بھی زیادہ۔“  
”مجھ سے بھی زیادہ؟“ انہوں نے آنکھیں دکھائیں۔  
”بالکل۔“ وہ ان ہی کے انداز میں کہہ کر ہنستی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔  
”جا کہاں رہی ہو؟“  
”چائے لانے۔“

”ہاں یار۔ بہت شدید خواہش ہو رہی ہے چائے کی اور پلینز ذرا جلدی لانا۔“ پھر اتنی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگے۔ ”مہر و کساں ہے؟“  
”آفس میں۔“  
”کوئی پرابلم تو نہیں ہوئی اُسے۔“

”نہیں، ایسی کوئی بات کی تو نہیں اُس نے۔ میرا خیال ہے اب وہ آفس کے معاملات اچھی طرح سمجھنے لگا ہے۔“  
”یہ تو اچھی بات ہے۔“ انہوں نے کارڈ ٹیبل کھینچ کر سامنے رکھی اور اس پر ٹانگیں سیدھی کرتے ہوئے طینان بھر اسانس لے کر بولے۔

”مجھے بھی بہت طینان ہو گیا ہے۔“ اتنی کہنے لگیں۔ ”تمہاری دن رات کی مصروفیت نے مجھے پریشان رو دیا تھا۔ اب کچھ وقت فراغت کا تہن بھی مل پائے گا۔“  
”ہاں۔“ انہوں نے کہا اور نڈا کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جو چائے لے کر آ رہی تھی۔  
پھر چائے پیتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

”میں اب سوئوں گا۔ اور پلینز کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔“ پھر اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے کہنے لگے۔  
”نڈا۔“ اولی تو کسی کو میرے آنے کا علم نہیں ہے پھر بھی کوئی فون وغیرہ آئے تو میرا مت بتانا۔“  
”جی اچھا۔“ نڈا نے سر ہلایا پھر اچانک جیسے کچھ یاد آیا تو کہنے لگی۔ ”دو دن پہلے آپ کی کہیں باہر سے کال آئی تھی۔“  
”کون تھا؟“

”شاید ثاقب حسن نام تھا۔“ نڈا نے آنے میں بھونچال لے آئی تھی۔ وہ فوراً اس کی طرف دیکھنے لگے۔  
”بالکل غیر ارادی طور پر سر اٹھا کر نڈا کی طرف دیکھنے لگی تھی اور شاید اُس کے مزید کچھ کہنے کی منتظر بھی تھی۔  
”ربیع تھا کہ بے اختیار اُس سے کوئی سوال کر بیٹھتی، وہ اس سے پہلے بول پڑے۔“  
”کچھ کیا ثاقب حسن نے؟“ میرا مطلب ہے کوئی میسج وغیرہ چھوڑا؟“  
”نہیں کہہ رہے تھے پھر رنگ کر لیں گے۔“

”اچھا، انتظار رہے گا۔“ اس کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں کہتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے اور اُن کے پیچ پر غور کرتی رہ گئی۔  
”بیٹا۔“ تم بھی کچھ دیر آرام کر لو۔“ اتنی نے اسے مخاطب کیا تو وہ چونک گئی۔ پھر فوراً سنبھلتے ہوئے بولی۔  
”نہیں اتنی۔ میں ٹھیک ہوں۔ بلکہ میرا خیال ہے میں نڈا کو اس کا گفٹ دے دوں۔“

”میں کچھ بھی نہیں لوں گی۔“ نذر ابرامان کر بولی تھی۔  
 ”کم آن نذر۔“ شہروز تو یوں ہی مذاق کر رہے تھے اور پھر مجھے تمہاری محبت پر بالکل شبہ نہیں ہے۔  
 ”سچ کہہ رہی ہیں؟“ نذر ابرامان محبت سے پوچھ رہی تھی۔  
 ”بالکل سچ۔“ اُس نے مسکرا کر نذر کا گال تھپکا، پھر سوٹ کیس کی تلاش میں ادھر ادھر نظر میں دوڑ گئی۔

”آپ کا سوٹ کیس اتنی نے آپ کے کمرے میں رکھا دیا ہے۔“  
 ”اچھا میں ابھی لے کر آتی ہوں۔“ وہ جلدی میں چل پڑی۔ کمرے میں داخل ہوئی تو ٹھٹھک کر رُک پڑا۔ شہروز مسہری پر نیم دراز سگریٹ پینے میں مصروف تھے۔ اس پر نظر پڑی تو نظریں اسی پر جمی رہنے وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔  
 ”میں کہہ کر آیا تھا کہ کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے پھر آپ یہاں کیوں آئی ہیں؟“ بچے کی نفی اُس نے محسوس کی۔  
 ”لیکن وجہ نہ جان سکی۔“

”آئی اہم سوری۔ میں بھول گئی تھی۔“  
 ”میری باتیں یاد رکھا کیجیے۔“

”جی۔“  
 ”کس کام سے آئی تھیں؟“

”جو بھی کام تھا، بعد میں کر لوں گی۔“ وہ جلدی سے کہہ کر باہر نکل آئی۔ اور اُس کے پیچھے بند دروازہ کو دیکھتے ہوئے وہ اٹھ گئے۔ اپنے رویے پر خود حیران ہوئے پھر اپنے آپ کو مرنش کرنے لگے۔  
 اصل میں وہ اُس کے ساتھ بہت اچھے موڈ میں آئے تھے۔ اور اتنی اور نذر کے ساتھ خوشگوار میں باتیں بھی کیں لیکن اچانک شائبہ حسن کے ذکر نے اُن کے اندر ناگواری کی لہر دوڑادی تھی۔ گذشتہ دو سے وہ بالکل بھی نہیں سوئے تھے اور ان کی آنکھوں کو درجہ بجائے والی ریمیں ہی تھیں۔ اب گھر آتے ہی اُن نے سوچا وہ سکون سے طبی تان کر سوئیں گے، لیکن نذر نے اُنہما نے میں شائبہ حسن کا نام لے ان کا سارا درہم برہم کر دیا تھا اور پھر جس طرح نذر کے منہ سے شائبہ حسن کا نام سن کر ریمیں نے چونک کر دیکھا تھا سے بھی وہ خامے ڈسٹرب ہوئے تھے۔

اور اس وقت سے اپنے کمرے میں آکر وہ اپنے آپ کو یہی سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ کچھ کمنا ایک فطری عمل تھا۔ اور ظاہر ہے اسے اسی کے نام پر چونکنا ہے۔ پھر وہ کیوں بڑا مان رہے لیکن دل کسی طرح، کوئی بھی بات ماننے پر آمادہ نہیں تھا۔ اپنے آپ سے لڑ رہے تھے کہ وہ سائنس اور اس سے بات کرتے ہوئے اندر کی ساری تلخی بچے میں سمٹ آئی۔ اب وہ چلی گئی تھی، شاید ان کے رویے کو محسوس کر کے، تو وہ پیشانیوں میں گھبر گئے۔

کئی بار سوچا جا کر دیکھیں وہ کیا کر رہی ہے اور کسی بھی طرح اپنے رویے کی تلافی کر دیں لیکن ذہنی سوچ پر عمل کرنا مناسب نہیں لگا تو اپنے آپ پر جبر کر کے سونے کی کوشش کرنے لگے۔ پھر جب آئی تو گزشتہ دو راتوں کے رنج کے کسر پوری کر دی۔ پورا دن اور پوری رات سوتے رہے۔ صبح بہ جلدی ان کی آنکھ کھلی تو طبیعت خاصی فریض تھی۔ ذہن بھی ہلکا پھلکا تھا۔ فوری طور پر کوئی بات یاد آئی پھر جب سوٹ کیس پر نظر پڑی تو یاد آیا کہ وہ تو صبح آئے تھے۔ فوراً کلائی پر بندھی ٹھہری دیکھی۔ دن کی تاریخ دیکھ کر حیران رہ گئے۔

”میرے خدا، اتنی بے خبری کی نیند تو میں کبھی نہیں سویا۔“ پیشانی پر آئے بالوں کو انگلیوں سے پیچھوئے سوچا پھر فوراً ہی ریمیں کا خیال آیا۔ وہ کمرے میں موجود نہیں تھی۔ بہت آہستگی سے بیڈ سے اترے اور اسی طرح احتیاط سے اسڈی کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ وہ صوف پر سو رہی تھی جہاں آ

نے کے بعد سے وہ خود سو یا کرتے تھے۔ انہیں افسوس ہونے لگا۔ چنانہیں وہ آرام سے سوئی ہوگی یا نہیں۔ چنانہیں ان کے بارے میں کیا خیال کیا ہوگا؟

یہی سب سوچتے ہوئے گاؤں میں نکل آئے۔ رخصت ہوتا اندھیرا اُجالے کی آغوش میں پناہ میں دیر رہا تھا۔ مچلیں گھاس شبنم سے غسل کر کے بکھر آئی تھیں۔ اور چاروں طرف قطار سے گے پودوں پر لپکتے پتوں کی انہیں مسیح بخیر کہہ رہے تھے۔ جو مائیں الگ مرگوشیاں کرتی ہوئی اُن کے چہرے کو چھو رہی تھیں۔ انہوں نے آہستہ آہستہ پورے لان کا چکر لگایا اور پلٹنے گئے تو مہروز کو اپنی طرف آنا دیکھ کر وہیں رُک گئے۔

”السلام علیکم۔“ مہروز نے قریب پہنچ کر سلام کیا تو جواب میں انہوں نے اسے گلے سے لگالیا۔  
 ”کیسے ہو؟“ مسکرا کر پوچھا۔

”فائن۔“ آپ بتائیے، ہنسی مون سے اتنی جلدی واپس کیسے آگئے؟“  
 ”بس یار۔“

”میں کل شام میں آپ سے ملنا چاہتا تھا لیکن آپ سو رہے تھے۔“

”ہاں میں بہت لمبی نیند سویا۔ تم مجھے اُٹھا رہے تھے۔“

”میں نے کہا تھا لیکن بھائی نے منع کر دیا، کہنے لگیں آپ نے سختی سے منع کیا ہے کہ کوئی ڈسٹرب نہ کرے؟“  
 ”ہاں، میں نے ایسا ہی کہا تھا۔“ انہوں نے اعتراف کیا۔ ”تم بتاؤ آفس میں سب ٹھیک ہے؟“

”اور تو سب ٹھیک ہے، بس ذرا جے کنسٹرکشن والے پے منٹ میں کچھ پس و پیش سے کام لے رہے ہیں۔“

”پے منٹ کے معاملے میں وہ ایسے ہی ہیں، جب پیسوں کی بات آتی ہے، ان کی کمپنی دیوالیہ ہو جاتی ہے۔“  
 ”پہنچتے ہوئے بولے۔“

”اگر ایسی بات ہے تو آپ ان کا ایگریمنٹ کینسل کر دیں۔“

”نہیں خیر ایسی بات بھی نہیں ہے۔ میں دیکھ لوں گا انہیں۔“ دونوں آفس کے معاملات ڈسکس کرتے ہوئے ریمیں نے تو خانا سا اُن کے لیے چائے لے آیا۔

”بھائی اُٹھ گئیں؟“ مہروز چائے کا کپ اُن کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”پتائیں، اصل میں میں بہت جلدی اُٹھ گیا تھا۔ اس وقت وہ سو رہی تھیں۔“ انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔  
 ”پھر فوراً چائے کا کپ ہونٹوں سے لگالیا۔“

”ویسے آپ بہت لمبی ہیں شہروز بھائی کہ ریمیں بھائی جیسی لڑکی آپ کی شریک سفر ہے۔“

”اچھا۔“ وہ خاموش رہے۔ ”کیا وہ بہت اچھی ہے؟“  
 ”کیوں؟“ آپ کو شک ہے کیا؟“

”نہیں خیر مجھے تو شک نہیں ہے، وہ واقعی بہت اچھی لڑکی ہے۔“ صرف مہروز کے سامنے ہی اعتراف کیا، ”دل بھی گواہی دے رہا تھا۔“

”اتنی بھی ان کی بہت تعریف کرتی ہیں اور نذر تو جی جان سے فدا ہے۔“

”وہ کچھ کہنا چاہتے تھے کہ ریمیں کو کمرے سے نکلتے دیکھ کر اپنی بات ہونٹوں میں روک لی جب کہ مہروز اسے سمجھتے ہی کہنے لگا۔“

”بڑی عمر ہے آپ کی، ابھی ہم آپ ہی کا ذکر خیر کر رہے تھے۔“

”ابھی تو میں زندہ ہوں۔“ وہ انہیں نظر انداز کر کے پوری طرح مہروز کی طرف متوجہ تھی۔  
 ”کیا مطلب؟“ مہروز واقعی نہیں سمجھا۔

”بھئی ہمارے ہاں ذکر خیر تو اب صرف مرنے والوں ہی کا کیا جاتا ہے اور میں تو خوش قسمتی سے کہہ لو یا بد قسمتی سے زندہ سلامت کھڑی ہوں۔“

”ربیع۔“ انہوں نے ٹوکا۔ ”صبح ہی صبح کیسی باتیں کرنے لگیں؟“  
”سوری۔“ وہ نظریں جھکا کر بولی۔

”بھائی، آپ کی یہی بات بہت اچھی ہے۔ فوراً مصالحت پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ آپ کی جگہ کو“  
ہوئی تو بیس، بحث کرنے کھڑی ہو جاتی۔ سارا الزام میرے سر رکھ کر کہتی ”مہروز نے ایسی بات کہی جب  
نے ایسا جواب دیا۔ اور جب تک مجھے بھائی جان سے ڈانٹ نہ پڑا دیتی، اسے چین نہ آتا۔“  
”مہروز۔“ اب انہیں مہروز کو ٹوکنا پڑا۔ بات کو مزید طول دینے کے بجائے جا کر ربیعہ کے لیے  
کا کہو۔“ وہ اٹھنے لگا تو اُس نے روک دیا۔

”میں چائے نہیں پیوں گی اور ویسے بھی اب میں کچن میں جا رہی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی وہ کچن کی  
گئی۔ اور وہ اسے چلتے ہوئے دیکھتے رہے۔ سمجھ گئے کہ وہ ان کے کل کے رویتے سے خفا ہے اور  
ہے تو بھی احتجاجاً انہیں نظر انداز کر رہی ہے۔  
پھر جب وہ تہلے کے بعد آفس کے لیے تیار ہو کر ناشتے کی غرض سے ڈائننگ روم میں آئے تو  
دیکھتے ہی کہنے لگیں۔

”خوب سوئے؟“

”جی کسی نے اٹھایا ہی نہیں۔“ لنگھویں سے اُس کی طرف دیکھا۔

”تم نے خود ہی تو منہ کیا تھا اور یہ اب کہاں کی تیاری ہے؟“

”ظاہر ہے آفس جاؤں گا۔“

”بیٹا، آفس تو تمہیں جانا ہی ہے۔ اگر دو ایک دن اور آرام کر لیتے تو۔“

”لیکن اتنی گھر میں بیٹھ کر کیا کروں گا؟“

”گھر میں بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے؟ ربیعہ کو اُس کے میکے لے جاؤ۔“

”آج ہی؟“

”ظاہر ہے بچی اپنے گھر والوں سے ملنا چاہے گی۔ اور کیا تمہیں اس بات کا خیال نہیں ہے؟“  
تبھی انداز اختیار کیا۔

”ربیعہ نے کہا ہی نہیں۔“ وہ خود ہی الذمہ ہونا چاہتے تھے کہ اتنی نے ٹوک دیا۔

”کیسی باتیں کرتے ہو شہروز احمد؟ کیا ہر بات وہ کہے گی تب ہی تمہیں خیال آئے گا۔ تمہیں اُس کے  
خیال رکھنا چاہیے۔“

”جی آئندہ ایسا ہی ہوگا۔“ وہ چلے کا آخری گھونٹ لے کر کھڑے ہو گئے۔ ”ربیعہ! ناشتے کے بہ  
چاہیے گا، چلیں گے۔“

”جی۔“ وہ اُن کی طرف دیکھنے کا حوصلہ نہیں کر پائی۔ یوں ہی سر جھکائے ہوئے بولی تھی۔

پھر ناشتے کے بعد وہ ڈرتے ڈرتے کمرے میں آئی تھی۔ کہیں وہ کوئی سخت بات نہ کہہ دیں۔ لیکن  
میں موجود نہیں تھی۔ اُس نے شکر کیا اور جلدی سے الماری سے سوٹ نکال کر ہاتھ روم میں گھس  
اپنے آپ میں گھسیٹ لیں۔ ٹھیک کہا تھا شہروز نے کہ اتنی ان کا اُس کی ذات کو نظر انداز کرنا کہ  
نہیں کریں گی اور اب ایسا ہی ہوا تھا۔ تیار ہو کر وہ کمرے سے نکلی تو شہروز اتنی کے ساتھ ٹی وی لائونج  
نظر آئے۔ اُسے دیکھتے ہی کہنے لگے۔

”وہ گفت لے آئیں جو میں نے آپ کی سسٹر کے لیے لیے تھے۔“

وہ ان ہی پیروں واپس لوٹ گئی اور جب تینوں گفت ایک شاپنگ بیگ میں لے کر واپس آئی  
اجازت لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اُس نے بھی اتنی سے اجازت لی اور اُن کے پیچھے چل پڑی۔

”آئی ام سوری ربیعہ۔“ وہ گاڑی اُس کے گھر جانے والے رستے پر ڈالتے ہوئے بولے۔ ”کل میں آپ  
کے ساتھ کچھ تفریق سے پیش آیا۔“

”یہ چھوٹی جھوٹی باتیں تو معمول کا حصہ ہیں شہروز احمد اور مجھے انہیں نہیں کرنا ہے۔“ وہ اتنی جلدی اپنی بات  
لوٹاتے جانے پر حیران تھے۔ جب ہی تو بقید تمام راستہ کچھ بول ہی نہ سکے۔  
اتناں کے گھر میں وہی معمول تھا۔ ناشتے کے بعد چھوٹی آپا صفائی میں لگی ہوئی تھیں اور اماں برآمدے میں  
رکھے تخت پوش پر بیٹھی شاید دوپہر کے کھانے کے بارے میں سوچ رہی تھیں کہ کیا کپنا چاہیے؟۔ ان دونوں کو  
آتے دیکھ کر کھل اٹھیں۔ اسے بیٹے سے لگا یا پھر شہروز کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے چھوٹی آپا کو آواز دینے لگیں۔  
”صفویہ۔ اندر سے کرسی لیتی آؤ شہروز میاں کے لیے۔“

”ارے نہیں اماں۔ میں یہیں بیٹھ جاتا ہوں۔“ وہ وہیں اماں کے پاس تخت پوش پر بیٹھ گئے جب کہ وہ  
ابھی آئی، کہتی ہوئی اندر چلی گئی۔

چھوٹی آپا تک شاید اماں کی آواز نہیں پہنچی تھی، جب ہی وہ اب تک جھاڑو دینے میں مصروف تھیں۔ اس  
نے پیچھے سے جا کر ان کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے اور اس کے ہاتھوں کو چھوتے ہی چھوٹی آپا کہنے لگیں۔  
”ارے ربیعہ۔ تم کب آئیں؟“

”ابھی۔“ وہ سامنے سے آکر ان سے لپٹ گئی پھر الگ ہوتے ہوئے بولی۔ ”یکسا حلیہ بنا رکھا ہے؟ رکھیں  
جھاڑو۔ شہروز بھی آئے ہیں۔“

”اچھا کہاں ہیں؟“

”باہر اماں کے پاس بیٹھے ہیں۔“

”چلو پھر وہیں چلتے ہیں۔“ چھوٹی آپا ہاتھوں سے بال ٹھیک کرتی ہوئی اُس کے ساتھ کمرے سے نکلیں۔  
شہروز کو سلام کیا پھر اماں کے پاس بیٹھے ہوئے اُن کا حال احوال پوچھنے لگیں۔

”ارے بیٹا۔ پہلے جانے وغیرہ کا تو پوچھ لو۔“ اماں نے ٹوکا۔ تو چھوٹی آپا فوراً معذرت کرتی ہوئی اُٹھنے  
لگیں لیکن اُس نے روک دیا۔

”چھوٹی آپا۔ ہم ابھی ناشتا کر کے آرہے ہیں۔“

”صرف چائے پی لینا۔“

”میں بالکل نہیں پیوں گی البتہ شہروز سے پوچھ لیں، یہ پینا چاہیں تو۔“

”صرف ایک کپ چائے پر آپ ہمیں ٹرانا چاہتی ہیں تو ضرور پلاویں ورنہ میں تو آج فراغت سے آیا تھا۔ اُن  
کے ہلکے پھلکے لہجے میں ہلکی سی شوقی تھی۔

”شہروز بھائی، آپ کا اپنا گھر ہے۔ ابھی میں آپ کو چلے بھی ضرور پلاؤں گی اور کھانے میں جو آپ پسند  
کریں گے وہی۔“

”اچھا۔“ وہ ہنسنے بیٹھ جائیں آرام سے۔ مجھے اس وقت چلنے کی بالکل خواہش نہیں ہے۔“

”تکلف تو نہیں کر رہے؟“

”بالکل نہیں۔“

”چلیے اب یہ بتا دیں۔ کھانے میں کیا پسند کریں گے؟“

”بھئی جو آپ پکا دیں گی، وہی کھانوں گا۔“ پھر اسے متوجہ کرتے ہوئے کہنے لگے۔ ”کیوں ربیعہ، میں نے کبھی  
کسی خاص چیز کی فرمائش کی ہے۔ اُس نے بس نفی میں سر ہلا دیا۔ اور اماں کا پانڈا کھول کر اُس میں سے چھالیہ  
نکالنے لگی۔“

”ربیعہ۔“ چھوٹی آپا کو اچانک یاد آیا تو کہنے لگیں۔ ”ایک خوشخبری سنو، بڑی آپا کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔“  
”کیا۔؟“ اس کے منہ سے حیرت اور خوشی کی ملی جلی چیخ نکل گئی۔ ”سچ اماں کیسا ہے؟ کس پر کیا ہے؟“

میرا خیال ہے یوں خالی ہاتھ جانا مناسب نہیں ہے۔

لیکن اب تو آگئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر بیٹھے اتر گئی۔ انہوں نے ہڈی لاگ کی۔ پھر اس کے قریب آکر جیب سے پرس نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا اور اس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں کہنے لگے۔

آپ بچے کی خال ہیں۔ اول تو آپ کو خالی ہاتھ نہیں آنا چاہیے تھا۔ اور اگر آہی گئی ہیں تو پلیز بچے کا ہاتھ خالی مت رہنے دیجیے گا۔ اس نے جمل ہو کر ان کے ہاتھ سے پرس لے کر اپنے بگ میں رکھ لیا۔

بڑی آپا کو اس نے ڈھیروں مبارکبادی اور فوراً اپنے کو گود میں اٹھالیا۔ دوہلا بھائی بھی گھر پر تھے۔

نہرو ان کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئے کسی کسی وقت اس کی طرف دیکھ لیتے۔ جو بچے کو گود میں لیے

لہی اس کے ہاتھوں کو اپنے گالوں کے ساتھ لگا لیتی اور کبھی اس کی پیشانی پر اپنی پیشانی لگا لیتی۔ ساتھ ساتھ بڑی آپا سے باتیں بھی کیے جا رہی تھی۔ ملازمہ ٹرائی گھسیٹتی ہوئی اندر آئی تو بڑی آپا نے اسے چلے بنانے کا اشارہ کیا۔ اس نے بچے کو ان کے برابر لٹایا، پھر اگر چلا۔ بنانے لگی۔

ربیعہ۔ دوہلا بھائی اسے مخاطب کر کے شرارت سے کہنے لگے۔ تم ہن ہون کا کیا تحفہ لائی ہو؟

کیا مطلب؟

بھئی جس طرح ہمارا ہن ہون کا تحفہ یہ نومولود ہے۔

میرے خدا۔ یہ دوہلا بھائی کیا کہہ رہے ہیں، وہ بھی شہر و زاحمد کے سامنے۔

اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ہتھیلیاں تر ہو گئیں اور چہرے سے لگا جیسے گرم گرم بھاپ نکل رہی ہو۔ شہر و زاحمد کی موجودگی کے احساس نے تو سر اٹھانے کے قابل بھی نہیں چھوڑا تھا۔ دل چاہا سب کچھ

ہیں چھوڑ کر بھاگتی ہوئی میاں سے نکل جائے۔ شہر و زاحمد اس کی کیفیت محسوس کر رہے تھے۔ اس لیے

س سے پہلے کہ دوہلا بھائی اسے مزید پھیرتے، انہوں نے موضوع بدلنے کی غرض سے بزنس کی باتیں پھیر

ریں۔

اس نے دل ہی دل میں شکر کرتے ہوئے جلدی سے چائے بنا کر ٹرائی ان کے آگے دھکیل دی۔ اور

پنی چائے لے کر دوبارہ بڑی آپا کے پاس آ بیٹھی۔ پھر چائے پیتے ہی وہ جانے کی بات کرنے لگی۔ دوہلا

بھائی، شہر و زاحمد کو کھانے کے لیے روک رہے تھے۔ اس نے معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ کھانا وہ آٹاں کے

گھر کھائیں گے۔ پھر اسے مخاطب کر کے کہنے لگے۔

چلیں ربیعہ۔

جی۔ وہ اجازت طلب نظروں سے بڑی آپا کی طرف دیکھنے لگی۔

ربیعہ۔ شہر و زاحمد نے دوبارہ پکارا اور اس کے دیکھنے پر جانے کیا اشارہ کیا۔ وہ نہیں سمجھی تو

دل ہی دل میں اس کی بیوقوفی پر ماتم کرتے ہوئے خود ہی کہنے لگے۔

اصل میں ہم اتنی جلدی میں آئے کہ بچے کے لیے کچھ لانا سکے۔ انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اسے یاد

آیا فوراً بگ کھول کر ان کے پرس میں ہاتھ ڈالا اور یہ دیکھ بغیر کہ ہاتھ میں کتنے کانوٹ آیا ہے، بچے کی

طرف بڑھایا ہی تھا کہ شہر و زاحمد نے اس کا ہاتھ مٹھی میں ڈال لیا۔

کیا عاقبت ہے؟ وہ دے دے لہجے میں ڈانٹا۔

کیا ہوا؟ سا دگی سے پوچھنے لگی۔ انہوں نے جواب نہیں دیا۔ غیر محسوس طریقے سے اس کا ہاتھ پیچھے

کیا پھر بڑی آپا اور دوہلا بھائی کے منع کرنے کے باوجود وہی پانچ سو روپے بچے کو دیے اور یوں ہی اس

کا ہاتھ پکڑے ہوئے باہر گئے۔ وہ ان کی اس حرکت پر اندر ہی اندر بہت اُلجھ رہی تھی لیکن جب گاڑی میں

بیٹھے ہی انہوں نے اس کا ہاتھ اس کی آنکھوں کے سامنے کیا تو وہ دس کانوٹ دیکھ کر بے حد شرمندہ ہوئی۔

آخر کہاں رہتی ہیں آپ؟ انہوں نے غصے سے کہا تو وہ سر جھکا کر پچلا ہونٹ کاٹنے لگی۔

آپ نے دیکھا ہے اور بڑی آپا اس وقت کہاں ہیں؟ ایک ہی سانس میں سوال پر سوال کیے گئے۔

تو ربیعہ۔ تو تو پاگل ہی ہو گئیں؟ چھوٹی آپا ہنسیں۔

پاکل کر دینے والی خوشی ہی تو ہے۔ میں ابھی اسے دیکھوں گی۔ چلیں شہر و زاحمد۔ انہیں مخاطب کرتے

ہے امتیاز ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ گئی اور وہ جو اس کے چہرے پر خوشی کے اُن گنت رنگوں کی برساتا

رہے تھے۔ کندھے پر اس کے ہاتھ کا لمس محسوس کر کے چومک گئے۔

چلیں گے۔

چلیں گے نہیں، ابھی چلیں۔ کندھے پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے اصرار کیا۔ پھر آٹاں کی طرف

ہوئے کہنے لگی۔ کیوں آٹاں، میں ابھی جاؤں ناں؟

چلی جانا بیٹا۔ اتنی جلدی کیا ہے؟ دوپہر کے کھانے کے بعد چلی جانا۔

نہیں آٹاں۔ میں ابھی جاؤں گی۔ دوپہر کے کھانے تک آ جاؤں گے۔

جیسی تمہاری مرضی۔ آٹاں کی اجازت ملتے ہی وہ شہر و زاحمد کی طرف دیکھنے لگی تو وہ کندھے اچکا کر

ہو گئے۔

ہیں کہاں بڑی آپا؟ ہسپتال باگھر؟ وہ جاتے جاتے پلٹ کر پوچھنے لگی۔

گھر پر ہیں۔ چھوٹی آپا اس کی بکھلا ہٹا پر بے ساختہ ہنسیں اور وہ جلدی سے شہر و زاحمد کے

آٹے۔

گلتا ہے آپ کو بچے بہت اچھے لگتے ہیں۔ وہ گاڑی اشارت کرتے ہوئے کہنے لگے۔

ہاں، بہت اچھے لگتے ہیں۔ وہ اپنی دھن میں مگن کہنے لگی۔ بڑی آپا کے لیے میں نے بہ

مانگی تھیں کہ اللہ میاں انہیں بیشادے۔

بیشادے کیوں؟

اصل میں ہمارا کوئی بھائی نہیں ہے ناں اور آٹاں کو بھی ہمیشہ بیٹے کے نہ ہونے کا احساس رہا۔

ہم سب کی خواہش تھی کہ بڑی آپا کی گود میں پہلے بیٹا آئے۔

چلیے۔ آپ کی دعائیں رائیگاں نہیں گئیں۔ ویسے بھی شاید شدت سے مانگی جانے والی دعا

ہوتی ہیں۔

شاید نہیں، یقیناً۔

اچھا۔ انہوں نے ذرا سی گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا پھر وڈو اسکریں پر نظر پڑ جاتے ہوئے

اور کون کون سی دعائیں آپ شدت سے مانگا کرتی ہیں؟ وہ ان کی بات پر چونکی اور فوری طور پر

دینے کے بجائے قیاس کرنے لگی کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

آپ نے بتایا نہیں؟ انہوں نے دوبارہ پوچھا تو وہ براہ راست جواب دینے کے بجائے۔

رک رک کر یوں بولی۔

کوئی ایک ہیں شہر و زاحمد؛ دعائیں تو بے شمار ہیں جو مدت سے مانگا کرتی ہوں لیکن میں یہ بھی

کہ مستعجب وہی دعائیں ہوں گی۔ جنہیں اوپر والا میرے حق میں بہتر سمجھے گا۔

آپ ٹھیک کہتی ہیں اور حقیقت میں بھی ایسا ہی ہے لیکن اکثر لوگ دعاؤں کے مستعجاب

شکوہ کناں رہتے ہیں۔

ان اکثر لوگوں میں مجھے بھی شامل کر لیں کیونکہ میں بھی کبھی کبھی شکاں ہو جاتی ہوں۔ انہیں

اچھی لگی اور کچھ کہنا چاہتے تھے کہ وہ ایک طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی۔

آپ شاید معمول گئے بڑی آپا کا گھر یہ ہے بس یہیں روک دیں۔

انہوں نے گاڑی بند کی پھر اس سے کہنے لگے۔

اگر یہ بچے کے ہاتھ میں چلا جاتا تو۔؟

آئی ایم سوری۔

آئی ایم سوری۔ اس کے لیے میں کہا اور گاڑی فل اسپید پر چھوڑ دی۔

”ذہن کو حاضر رکھا لیجیے۔ آئندہ آپ کی اس قسم کی حماقتیں ہرگز برواشت نہیں کروں گا۔ سمجھیں آپ اماں کے گھر داخل ہونے سے پہلے انہوں نے اسے وارننگ دی تھی۔“

وقت دے پاؤں گزر رہا تھا۔ اگر ثاقب حسن کا خیال درمیان میں نہ جوتا تو وہ اب تک شہر و زامہ کے گھر اور ان کے ماحول میں مکمل طور پر رہا پس گئی ہوتی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ اس گھر میں کچھ عرصہ کی مہمان ہے۔ اس لیے اتنی کی بے پناہ شفقوں نرا کی جان چھڑکنے والی اداؤں اور مہر و زکی معتبر کر دہ والی باتوں کے باوجود اس نے اپنی حد قائم رکھی۔

انہی اس کی ہر بات میں بھی انکے کی عادت کو اسے کی سعادت مندی پر معور کرتی تھیں۔ لیکن حقیقت میں وہ امن بچا کرتی۔ اس کا خیال تھا اسے اس گھر کے معاملات میں دخل دینے یا رائے دینے کا کوئی حق نہیں کیونکہ وہ برے سے اس گھر کی فردہی نہیں ہے۔ سچہ بہنے ہو گئے تھے اسے اس گھر میں آئے ہوئے اور اس تمام عرصہ میں اس نے کبھی ارادہ اپنی قائم کی ہوئی حد میں لٹکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے انداز میں اب بھی لگتا اور جھجکا اتنی کی ضرورت کی چیز لینے کے لیے بھی سو بار سوچتی تھی۔ خاص طور سے کبھی اپنی ضرورت کا اظہار نہیں کیا۔ اتنی احساس دلاتی یا شہر و زخم دے کہتے تب بھی پہلے انکار کرتی پھر مجبوراً ہتھیار ڈالنے پڑتے۔

اس کا خیال تھا گھر والے بہت جلد اس کے اس رویے سے بیزار ہو جائیں گے کہ ہنستی کھنکھاتی زندگی وہ روتی صورت کہاں سے آگئی ہے لیکن اس کے برعکس اب اس کے گرد وہ ہوتے گئے۔ اس کا دھبہ میں بولنا اور دھیرے دھیرے چلنا سب کو اچھا لگتا تھا۔ ادویوں ہی دے پاؤں ہی تو وہ شہر و زامہ کے کے دروازوں سے ہوتی ہوئی ایوانوں میں جا سکتی تھی۔ اسے خود خبر نہیں تھی کہ وہ اس شخص کو اپنا اسیر کر گئی جسے ثاقب حسن اس کا محافظ بنا گیا تھا۔

اور خبر ہوتی بھی کیسے۔ شہر و زامہ جس آگ میں جل رہے تھے، انہوں نے اس کی تپش سے اسے محفوظ رکھا تھا۔ اب تک تو وہ اپنے آپ سے ہی لڑ رہے تھے کہ جو بڑا ہے، غلط ہو رہا ہے۔ وہ ان کے پاس لا رہے اور انہیں خیانت کا مرتکب نہیں ہونا چاہیے۔ وہ شروع سے ہی خلصہ حقیقت پسند تھے لیکن کبھی بھی حقائق سے نظر پر چڑا بھی لیتا ہے کبھی حالات سے مجبور ہو کر اور کبھی یوں ہی دل کے کہنے میں آکر۔ اور ان ساتھ پتا نہیں کیا معاملہ تھا کہ اس روز آفس سے ذرا جلدی آگئے۔ وہ اس وقت اتنی کے پاس بیٹھی تھی رہا وہیں آکر بے تکلفی سے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے۔

”ربیعہ۔ میں آپ کی خاطر جلدی آگیا ہوں۔ چلیے کہیں آؤٹنگ کے لیے چلتے ہیں۔ آپ کو کچھ شاپنگ کرادوں گا۔“ وہ اتنے کے اس انداز پر بہت حیران ہوئی۔

”چلیں جلدی کریں۔“ اس کی حیرت سے پوری نکلی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہلکے سے مسکرائے۔ ”جاؤ بیٹا۔ شہر و زامہ سے لیے وقت نکال کر آیا ہے۔“ اتنی نے کہا۔ وہ چپ چاپ ان کے کمرے سے نکل آئی۔ وہ بھی اس کے پیچھے چلے آئے۔ ٹی وی لاؤ ریجنگ آئے تو فون کی بیل بجنے لگی۔

”آپ علیہ ٹھیک کر کے آئیں۔“ اس سے کہا اور خود فون کی طرف بڑھ گئے۔ پھر ابھی وہ کمرے کے دروازے تک ہی پہنچی تھی کہ وہ پکار کر کہنے لگے۔

”ربیعہ۔ آپ کا فون ہے۔“

وہ وہیں سے پلٹ آئی اور ریسپور ان کے ہاتھ سے لے کر کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف ثاقب حسن جس کی آواز سننے ہی وہ گھبرا کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ ان کی پیشانی شکن آلود تھی۔ اور ہونٹ جھنجھنے ہو۔

اسے متوجہ پا کر قوسوں کی زوردار آواز پیدا کرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

”ربیعہ۔“ ثاقب حسن اس کی مسلسل خاموشی پر بیکار سے جا رہا تھا۔

”ہاں کہو۔“ اس کے حلق سے جھنجھسی پھنسی آواز نکلی۔

”کہاں کھڑی ہوئی ہو؟“ میری پکار کا جواب ہی نہیں دے رہیں۔

”میں تمہیں ہی سن رہی ہوں۔ کہو کیسے ہو؟“

”تمہارے بن اڈھور اہوں۔“

”یہ بتاؤ، منزل کتنی دور ہے؟“

”زیادہ دور نہیں ہے میری جان۔ بس کچھ وقت اور۔ کیا تم گھبرا گئی ہو؟“

”ہاں۔“ اس نے اعتراف کیا۔ ”تم مجھے کس مشکل میں ڈال گئے ہو۔ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا۔“

”کیا اچھا نہیں لگ رہا؟“

”تم خود سوچو ابھی تمہارا فون شہر و زامہ ریسپونڈ کیا تھا۔ وہ کیا سوچتے ہوں گے؟“

”وہ کچھ نہیں سوچیں گے۔ خواہ مخواہ ایسی باتوں سے پریشان مت ہوا کرو۔“

”اس کے خاموش رہنے پر کہنے لگا۔“

”میں تمہیں ایک اچھی خبر سناتا ہوں۔ مجھے ایک بڑی فرم میں بہت اچھی جاب مل گئی ہے۔“

”پہلی جاب کا کیا ہوا؟“

”ظاہر ہے چھوڑ دی۔ اب جو جاب ملے ہے وہ میری توقع سے کہیں بڑھ کر ہے اور میں انشاء اللہ بہت جلد۔“ شاید لائن کٹ گئی تھی۔ اس نے کچھ دیر انتظار کیا پھر آہستگی سے ریسپونڈ رکھ دیا۔ اب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، اپنے کمرے میں کیسے جلے اور کیسے شہر و زامہ کا سامنا کرے۔ شش و پنج میں مبتلا کھڑی سوچ رہی تھی، کہ وہ خود ہی کمرے سے نکل آئے۔ اسے جویوں کھڑے دیکھا تو کہنے لگے۔

”چلنا نہیں ہے؟“

”جی۔“ وہ اسی طرح ان کے ساتھ چل پڑی۔ خیال تھا راستے میں وہ کسی نہ کسی بہانے ثاقب حسن کا ذکر ضرور کریں گے اور پوچھیں گے کہ وہ کیا کر رہا تھا لیکن انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ اپنا موڈ بھی کافی حد تک خوشگوار کر لیا تھا۔ آؤٹنگ کے دوران اس سے ادھر ادھر کی بکلی بکلی باتیں کرتے رہے اور شاپنگ کے دوران ہر چیز اس کی پسند ہو چھتے رہے۔ اس کا ایک ہی جواب ہوتا۔

”مجھے واقعی اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”ضرورت ہے یا نہیں، آپ کو لینی ہے۔“ وہ رعب سے کہہ کر اس کی پسند ہو چھتے پھر واپسی میں رات کھانا چائیز میں کھایا۔ جب گھر آئے تو سب اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ اس نے گھڑی دیکھی، گیارہ بجے والے تھے۔ اپنے کمرے میں آتے ہی اس نے تمام پیٹ بے دلی سے صوفے پر ڈال دیے اور شہر و زامہ کی طرف جاتے جاتے پیٹ کمراس کی طرف دیکھنے لگے۔

”کیا بات ہے؟“ تھک گئی ہیں؟“ وہ شاید اس کی بیزاری محسوس کر گئے تھے۔

”نہیں۔“ وہ کھردرے لہجے میں بولی۔

”پھر۔؟“

”پھر شہر و زامہ کہ یہ ساری باتیں معمول کا حصہ ہیں، اس کے باوجود مجھے اتنا کچھ نہیں چاہیے؟ وہ اتنے اسے پکڑوں کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی۔

”کیوں نہیں چاہیے؟“ ان کا لہجہ بے حد مدہونہ لگا۔

”میں کیا کروں گی ان سب کا؟“

”آپ انہیں استعمال کریں گی۔“ وہ اس کی طرف آتے ہوئے بولے۔ ”آپ میری منکوحہ ہیں شہر و زامہ

کی منکوہ۔ جس کا معاشرے میں ایک مقام ہے۔ ایک نام ہے اور جب تک آپ یہاں رہیں گی،  
کو میرے اسٹیڈیٹ کے مطابق رہنا ہوگا۔ سمجھیں آپ۔  
”شہر و زعماء۔“ اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔ اور وہ چھٹی چھٹی آنکھوں سے اُن کا یہ  
روپ دیکھ رہی تھی۔



شہر و زعماء کا چہرہ اچانک سرخی مائل ہو گیا تھا۔ اس کی حیرت سے پوری کھلی آنکھوں میں دیکھنے  
کاٹ دار لہجے میں بولے۔

”میں غلط نہیں کہہ رہا۔ آپ کو خود ہر بات سمجھنی چاہیے، لیکن آپ نے تو شاید کوئی بھی بات غور  
نہ سمجھنے کا تہیہ نہ کر رکھا ہے۔ ذرا۔ اپنے حلقے پر غور کریں اور آپ اسی حالت میں میرے ساتھ  
نکل آئیں۔ کم از کم بالوں میں برش کرنے کی دقت ہی رکھتیں۔“

اس کے سر جھکا لینے پر وہ مزید بولے۔ ”جانتی ہیں، شاپنگ سنٹر میں مجھے اپنا ایک بہت  
ساتھی نظر آیا تھا، جس کی مجھے برسوں سے تلاش تھی۔ لیکن محض آپ کی وجہ سے میں اس سے  
سکا۔“

وہ کہنا چاہتی تھی۔ ”میری وجہ سے؟“ لیکن آواز نے ساتھ نہیں دیا۔ بس اپنی طرف اشارہ  
ہی کر سکی۔

”ہاں، آپ کی وجہ سے۔ کیا امپریشن پڑا؟ اس پر آپ کا؟“ ملگیا، شکن آلود لباس۔ بکھرے  
اور جہرے پر چھائی بیزاری۔ میں جانتا ہوں ربیعہ بیگم کہ آپ کو مجھ سے یا اس گھر سے نہ دلچسپی۔  
نہ کوئی سروکار۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ہر وقت اپنے عمل سے اس کا اظہار بھی کر رہے  
کی آنکھوں میں ڈھیر ساری نمی اُتر آئی جسے چھپانے کی خاطر پہلے پلکیں جھپکیں پھر رخ موڑ گئی۔

”اچھی کے سامنے مجھے جواب دہ ہونا پڑا ہے۔ وہ سمجھتی ہیں، میں آپ کا خیال نہیں رکھتا۔ کہ  
اُن کے سامنے تو مجھے ترخو کریں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ اس گھر میں کچھ وقت کی بہان ہیں لیکن۔  
سب لوگ نہیں جانتے۔ اس لئے خدا کے لئے تکلف چھوڑ دیں۔ جبراً ہی ہی، اس گھر کو اپنا گھر  
لیں۔ اور اسی طرح رہیں، جس طرح میری بیوی کو رہنا چاہیے تھا۔“

وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ کہ شاید وہ کچھ کہے۔ لیکن وہ اسی طرح رخ موڑے  
کھڑی رہی۔

”کیا میں امید رکھوں کہ آئندہ مجھے کوئی بات سمجھانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔؟“ آپ نے  
خیال رکھیں گی۔“

جواب میں ہنوز خاموشی تھی۔  
”آپ شاید میری زبان نہیں سمجھتیں۔ مجھے ثاقب حسن سے کہنا پڑے گا۔ وہی شاید آپ کو تارا  
’میرے خدا۔‘ یہ کون سا مقام ہے؟“ آنکھوں میں ٹھہری ساری نمی رخساروں پر اترنے لگی  
چاہا، یوں ہی رخ موڑے موڑے کمرے سے اور پھر اس گھر سے ہی نکل جلے۔ کہیں دور جہاں  
نہ ہو۔ یا صرف شہر و زعماء۔ یا پھر صرف ثاقب حسن۔

اسٹیڈی کا دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز نے اُسے اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ اگر  
کمرے میں تنہا رہ گئی ہے۔ لیکن نہ وہ سینے میں دبی سانس کو خارج کر سکی اور نہ ہی پلٹ کر دیکھنے  
ہمت ہوئی۔ آہستہ روی سے بیڈ تک آئی اور پھر ٹیکے پر سر رکھتے ہی ضبط کے بندھن ٹوٹ  
آنسوؤں کو روکنے کی ساری کوششیں ترک کرتے ہی جیسے سیلاب اُتر آیا تھا۔

دکاش ثاقب حسن اپنی محبت میں اندھا ہو کر یہ قدم کبھی نہ اٹھاتا۔ مجھے میرے حال پر چھوڑنا  
کہا تھا۔

”کرب سہہ لیتا۔“ انتہائی دکھ سے سوچتے ہوئے اس نے چادر سر تک کھینچ لی۔ آسواہ بھی اسی  
دانی سے بہہ رہے تھے اور یوں ہی روتے ہوئے جانے کب نیند اس پر مہر بان ہو گئی۔

صبح اس کی آنکھیں شدت گریہ کی پتیلی کھا رہی تھیں۔ کتنی دیر تک وہ اپنی آنکھوں پر پانی کے  
چھینے مارتی رہی۔ سو جن تو کسی حد تک کم ہو گئی لیکن سرخی اسی طرح برقرار رہی۔ اب ناشتے کی میل پر

سب سے سامنا ہونا تھا۔ اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سب کے پوچھنے پر کیا جواب دے شیش و پتھ  
میں مبتلا کھڑی سو رہی تھی کہ شہر و زعماء آگئے۔ شاید اسے بلانے آئے تھے، قدرے جھنجھلائے ہوئے

رات کی باتوں کا اس پر کچھ اثر ہی نہیں ہوا جو انہیں خود بلانے کے لیے آنا پڑا۔ شاید تنبیہ کرنے کا  
ارادہ بھی تھا لیکن اُسے دیکھ کر ٹھسک گئے۔ سرخ ہوتی آنکھیں جن میں کوئی شکوہ نہیں تھا۔ انہیں  
پشیمانی سے ہلکا کر گئیں۔

”آئیے۔ سب ناشتے پر انتظار کر رہے ہیں۔“ نرم لہجے میں کہا تو وہ چپ چاپ اُن کے ساتھ چل پڑی۔  
ڈائننگ روم میں داخل ہوتے ہی انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”رات ربیعہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ بہت دیر تک سو نہیں سکیں۔“  
کسی کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی انہوں نے اس کی سرخ آنکھوں کی وضاحت کر دی۔

”بیٹا۔ پھر یہاں کیوں چلی آئیں؟ میں ناشتا تمہارے کمرے میں بھجوا دیتی۔“ اتنی نے شفقت سے کہا۔  
”میں اب ٹھیک ہوں۔“ وہ آہستہ آواز میں کہتی ہوئی کسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

”مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی۔ شہر و زعماء اسے ڈاکٹر کے پاس ضرور لے جانا۔“ اچھی کی نظریں اس پر  
تھیں اور مخاطب شہر و زعماء کو کیا۔

”آپ فکر نہ کریں۔ اب یہ بالکل ٹھیک ہیں۔ کیوں ربیعہ؟“ اس کی طرف یوں دیکھا جیسے اس سے  
بڑے اچھے مراسم ہوں۔

”جی۔“ اس نے کہا اور جلدی جلدی سلاٹس پر کھن لگا کر پلیٹ اُن کے سامنے رکھ دی۔ پھر چلے  
بنانے لگی۔

”بھائی۔“ مہروز اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ”میں نے بہت فلمیں دیکھی ہیں جن میں ساس بہو کے  
جھگڑے، خند بھانج کی مار لگائی اور بیوی کا شوہر پر چیخنا چلانا وغیرہ قسم کے بہت سیں ہوتے ہیں۔ آپ  
نے بھی ایسی فلمیں دیکھی ہوں گی؟“

اس کے نفی میں سر ہلانے پر کہنے لگا۔  
”بہر حال جب شہر و زعماء کی شادی ہوئی تو میرا خیال تھا۔ اب ہمارے گھر میں اسی قسم کے سین ہوا  
کر رہا ہے۔ لیکن اڑائی تو دور کی بات، آپ تو کسی کی کسی بات سے اختلاف ہی نہیں کرتیں۔ واقعی اختلاف  
ہوتا نہیں ہے یا شہر و زعماء نے آپ پر دہشت جمادی ہے کہ خبر دار۔“

”مہروز۔“ اچھی کے ٹوکنے پر وہ فوراً خاموش ہو گیا لیکن اسے دیکھتے ہوئے جھنڈوں کو یوں حرکت  
دینے لگا جیسے پتھر رہا ہو۔ سچ بتائیں، کیا بات ہے؟“ اسے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

”ارے۔“ آپ تو ہنستی ہوئی اچھی لگتی ہیں ورنہ میں تو سمجھا تھا، آپ کی شکل خاصی مضحکہ خیز ہو  
جاتی ہوگی۔ جب ہی سینے سے گریز کرتی ہیں۔“

”گریز تو نہیں کرتی۔ بس بلا وجہ نہیں ہنستی۔“  
”کبھی کبھی بلا وجہ بھی ہنس لینا چاہیے۔ بلکہ اکثر۔ صحت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔“

”تمہارے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔  
”بیٹا۔ مہروز کی باتوں میں تم نے ڈھنگ سے ناشتا بھی نہیں کیا۔“

”بس اچھی۔ ویسے بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ شہر و زعماء کہنے پر چلی آئی۔“ اس نے انہیں اپنے نام پر  
جوڑتے دیکھا۔ پھر فوراً وہاں سے اٹھ گئی۔

رات وہ صرف اپنے بارے میں سوچتی اور کڑھتی رہی تھی کہ اس کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ اور اب جب وہ غیر جانبداری سے سوچنے لگی۔ تو شہر و زامند بے قصور نظر آئے۔ ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ شادی کے مجبور کرنے پر اس سے شادی کر بیٹھے تھے اور ایک مخصوص مدت تک ہی سہی، انہیں اس بندھن کی نیچا نا تو تھا اور وہی ان کے ساتھ تعاون نہیں کر رہی تھی۔ وہ بھی کیا کرتی؟ شروع دن سے اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اسے یہاں سے چلے جانا ہے۔ یہ گھر اس کا نہیں اور نہ ہی اس گھر کے مکینوں سے اس کا کوئی ناتا ہے۔ پھر وہ کیوں اپنے آپ کو یہاں ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرے بس وقت ہی تو گزارنا ہے، جو کسی نہ کسی طرح گزر رہی جلے گا۔

لیکن اب احساس ہو رہا تھا کہ اس طرح شہر و زکی پوزیشن خاصی اکوڑ ہو رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے گھر میں سب یہی جانتے تھے کہ انہوں نے اپنا پسند سے اس سے شادی کی ہے۔ پھر وہ اسے خوش رکھنے میں ناکام کیوں ہو رہے ہیں؟ اس نے اپنے اس گھر میں گزریے روز و شب کو سوچا تو کو ایسا دن یاد نہیں آیا جب اس نے بیوی کی حیثیت سے یا اس گھر کی بہو ہونے کے نلتے کوئی کام کیا ہو اتنی باتیں تو جا کر ان کے پاس بیٹھ جاتی۔ ورنہ خود سے کبھی خیال نہیں آیا۔ اسی طرح بڑا بھی جب کبھی فارغ ہوتی، خود سے اس کے پاس آ بیٹھتی تھی۔ اور مہر و ز کا کہہ تو اس نے آج تک اندر سے دیکھا ہی نہیں تھا۔

کیا بڑی بھانج ہونے کے نلتے اس کا یہ فرض نہیں تھا کہ وہ بڑا اور مہر و ز کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور ضرورتوں کا خیال رکھے اور تو اور وہ تو شہر و ز سے بھی غافل تھی۔ جب وہ آفس کے لیے نکلتے تو زونیر دکھاوے کے لیے ہی سہی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ انہیں چھوڑنے باہر تک لگتی ہو۔ اور کبھی جب انہیں واپسی میں بہت زیادہ دیر ہو جاتی تو کسی پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔

اس کے برعکس شہر و ز اپنا کردار خوبی سے نبھا رہے تھے۔ اس کے ساتھ اماں کے گھر جاتے تو اپنے گرد کوئی حصار توڑ دیتے تھے۔ سب کے ساتھ اس کے مزاج کے مطابق باتیں کرتے اور اس سے یوں پیش آتے جیسے وہ ان کی من چاہی بیوی ہو، ورنہ اگر وہ بھی اس کی طرح ہی لیا دیا انداز اختیار کیے لے تو اتنا اس کی طرف سے کبھی مطمئن نہ ہوتیں۔ یقیناً اس کے لیے کڑھتے ہوئے ان کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

اسے اپنے آپ پر حیرت ہونے لگی کہ اس نے یہ ساری باتیں پہلے ہی کیوں نہ سمجھ لیں؟ شہر و ز امجد کے بار بار ٹوکنے کے باوجود نظر انداز کرتی رہی۔ اور کل تو واقعی اس نے مدد کر دی تھی کہ یوں سر جھاڑ کر نہ پوچھو ان کے ساتھ چل پڑی۔ اپنا کل کا علیہ اور رویہ یاد کر کے بے حد مذمت محسوس ہوئی۔ سارا دن پیشانیوں میں گھری تلاقی کا سوچتی رہی۔

شام میں شہر و ز آفس سے لوٹے، اس وقت وہ ندرا کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ روزانہ سے مختلف قدرے گہرے رنگ کا سلی سوٹ ہر رنگ ٹاپس اور ہلکا ہلکا میک اپ بھی کر رکھا تھا۔ ندرا باتیں کرتے ہوئے کلائی میں پڑی چوڑیوں کو شہادت کی انگلی سے یوں چھیڑ رہی تھی جیسے ستارے تارا کو چھیڑا جاتا ہے۔

انہوں نے لمحہ بھر تک کرا سے دیکھا۔ پھر قدرے اونچی آواز میں سلام کیا۔ وہ چونک کر پہلے سیدھی بیٹھی۔ پھر کھڑی ہو گئی۔

”کبھی طبیعت ہے آپ کی؟“ وہ بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”ٹھیک ہوں۔ بلکہ بالکل ٹھیک۔“ لہجہ میں قدرے بے تکلفی پیدا کی اور ان کے حیرت سے دیکھ

پر کہنے لگی۔ ”چلے لاؤں آپ کے لیے؟“

وہ سمجھ گئے، ان کی باتوں کا خاطر خواہ اثر ہوا ہے۔ اور عجیب بات یہ تھی کہ وہ خود بھی سارا دن

پیشانیوں میں گھبرے رہے تھے کہ ناحق اسے اتنی باتیں سنا ڈالیں۔ خیال تھا اس وقت اس سے معذرت کر لیں گے لیکن اس کا یہ روپ اچھا لگ رہا تھا۔ اور معذرت کرنے کا مطلب تھا، وہ پھر یہاں جیسی بنو جاتی اس لیے منس اس کا یہ روپ برقرار رکھنے کے لیے یوں ظاہر کرنے لگے جیسے ابھی تک خفا ہوں۔

”چلے کمرے میں بھجوا دیجیے گا۔“ سنجیدگی سے کہا۔ اور اٹھ کر چلے گئے۔ اس نے ندرا سے معذرت کی اور کچن کی طرف چلی گئی۔ پھر وہ خود ہی ان کے لیے چائے لے کر کمرے میں لگئی۔ وہ ڈریس چینج کر کے صوفے پر نیم دراز تھے۔ اسے دیکھ کر کہنے لگے۔

”آپ نے کیوں زحمت کی؟ ملازم کے ہاتھ بھجوا دیتیں۔“

”میرا خیال ہے، مجھے خود آنا چاہیے تھا۔“ انہوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ خاموشی سے کپ اس کے ہاتھوں سے لے کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

وہ کچھ دیر تک خاموشی سے ان کی طرف دیکھتی رہی۔ شاید بیٹھنے کے لیے کہیں۔ لیکن وہ جان بوجھ کر نظر انداز کر رہے تھے۔

”شہر و ز۔“ انہیں کسی طرح متوجہ نہ ہوتے دیکھ کر خود سے پکارا اور ان کے دیکھنے پر کہنے لگی۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں یہاں رہتے ہوئے بھی ہر بات سے غافل رہنے کی کوشش کرتی رہی۔“

”میرا مطلب ہے۔“

”آپ کا مطلب جو بھی ہو۔“ وہ بات کاٹتے ہوئے بولے۔ ”بس مجھے اتنا یقین دلادیجیے کہ آئندہ اپنے مخصوص خول میں بند نہیں رہیں گی۔“

”ایسا ہی ہوگا۔“ وہ جلدی سے کہہ گئی۔

”کیسا؟“ بے ساختہ مسکراہٹ کو بمشکل ہونٹوں میں دبا کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”میرا مطلب ہے، آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔“

”اور جو آپ نے شکایت کا موقع فراہم کیا تب؟“ انہوں نے نظریں اس پر جمادیں۔ شاید وہ کہے

”جو چاہے سزا دے لیجیے گا۔ اور پھر کبھی جو اس کی طرف سے شکایت کا موقع ملے تو سزا کے طور پر وہ کپ کی بقیہ زندگی اپنے نام کھوا لیں۔“

”تب جو قدم آپ ثاقب حسن کے آنے پر اٹھائیں گے، وہ ابھی اٹھا لیجیے گا۔ قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔“ وہ سہولت سے کہتی ہوئی ان کے ہاتھ سے خالی کپ لے کر کمرے سے نکل گئی اور وہ کتنی دیر تک بے حس و حرکت بیٹھ رہ گئے تھے۔

پھر واقعی اس نے خود اپنی قائم کی ہوئی حد بندی توڑ ڈالی۔ کچھ دن تک بڑی سہولت سے ویسی رہی جیسی وہ اور سب گھروالے اسے دیکھنا چاہتے تھے۔ صبح لان میں ان کے ساتھ چہل قدمی کرنا۔ ناشتے کی ٹیبل پر مہر و ز اور ندرا کے ساتھ ہلکا ہلکا مذاق پھر دوپہر کے کھانے کے لیے خاص طور سے اپنی رلنے دینا۔ اور شام میں جب وہ لوٹتے تو وہ کمرے کے بجائے برآمدے ہی میں انہیں اپنی منظر کشی لیکن پھر احساس ہونے لگا جیسے وہ دھوکا دے رہی ہے۔ ان سب کے ساتھ ساتھ خود اپنے آپ کو کبھی اور یہ کہ وہ مزید کہیں نہیں کھیل سکے گی۔ پھر اس سے پہلے کہ دوبارہ اپنے خول میں بند ہوتی، راہ فرار اختیار کر لگی۔

یعنی اُمی سے اجازت لے کر کچھ دنوں کے لیے اماں کے گھر چلی آئی۔

اماں ان دنوں چھوٹی آپا کے لیے بہت فکر مند رہنے لگی تھیں۔ اور جب سے بیوہ اپنے گھر کی ہوئی تھی تب سے تو وہ اور بھی چاہتی تھیں کہ چھوٹی آپا جلد سے جلد اپنے گھر بار کی ہو جائیں کیونکہ ایک تو دبیر ان سے چھوٹی تھی۔ دوسرے اب کلثوم اور ہما بھی چھوٹی آپا کے قد کے برابر ہو گئی تھیں۔ اماں کو خدمت تھا، کہیں اب آنے والے کلثوم اور ہما کی طرف اشارہ نہ کرے گئیں۔



اور ادھر جب سے چھوٹی آپا نے بوا کے منہ پر ان سے کہہ دیا تھا کہ آئندہ وہ ان کے لیے کوئی بیٹا لائیں۔ وہ شادی نہیں کریں گی، تب سے بوا نے بھی آنا چھوڑ رکھا تھا۔ اماں کو یہ پریشانی بھی تھی، اب کس سے کہیں۔؟ ہرگز گئے گئے سلسلے تو نہیں کہہ سکتی تھیں البتہ اپنے خاص ملنے والوں کو کہہ سکتا تھا۔

اُس وقت جب کہ چھوٹی آپا دوپہر کے کھانے کے سلسلے میں کچن میں مصروف تھیں۔ اماں اس سے ایشانی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

”میتا۔ تم شہر وڑ سے کہو۔ وہ کہیں اپنے ملنے جلنے والوں میں صوفیہ کے لیے بات کرے۔“

بولیں یا۔؟ بے خیالی میں اُس کے منہ سے چیخ نکل گئی تو اماں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے پر کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے؟

”نہیں اماں۔ لیکن میرا خیال ہے شہر وڑ سے کہنا مناسب نہیں ہے،“ وہ نظریں چراتی ہوئی بولی۔ اب صاف صاف کیسے کہہ دیجی کہ وہ کیوں ان کے گھر کے مسئلے سننے اور پھر حل کرنے لگے۔ ان کا اس گھر سے ناہا، ہی کیا ہے۔؟

”کیوں مناسب نہیں ہے۔؟ آخر تمہاری بڑی آپا نے بھی تو اپنے میاں سے کہہ رکھا ہے اور ایک تو وہ کسی کا پیغام لائے بھی تھے لیکن میں نے منع کر دیا۔“

”کیوں منع کر دیا آپ نے؟“ وہ واقعی متعجب تھی کہ آخر وہ لہا بھائی کا لایا ہوا پیغام اماں نے کیوں ریجیکٹ کر دیا۔؟

”بیٹا۔ وہی مسئلہ تھا، اتنا بڑا کنبہ اور کمانے والا ایک۔“

”اماں۔ یہ مسئلہ تو ہر دوسرے گھر کا ہے۔ خود آپ اپنے گھر کو دیکھ لیجیے۔ بے چارے بابا یا اکیلے کمانے والے ہیں اور پھر۔“ اُس نے فوراً ٹپلا ہوٹل دانٹوں میں دبایا ورنہ وہ کہنے جا رہی تھی اس مسئلے کو اہمیت دے کر آپ نے میری زندگی داؤ پر لگا دی۔

”اماں۔ قسمت بھی کوئی چیز ہے۔“ وہ وجہ وجہ لہجے میں بولی۔ ہر انسان کی قسمت میں جو کچھا ہے، وہ اُسے ضرور مل کر رہے گا۔ کوئی کسی کے نصیب کا چھین نہیں کھا سکتا۔ آپ اس بات پر یقین کیوں نہیں رکھتیں؟

”بی بی، مجھے سبق مت پڑھاؤ۔ میں تم سے زیادہ جانتی ہوں۔ اماں نے کبھی ابامیاں کو اس موضوع پر زیادہ نہیں بولنے دیا تھا، اسے کیسے بولنے دیتی؟ اسے چپ کر کر کہنے لگیں۔

”تمہیں اگر شہر وڑ سے بات کرنے میں کوئی اعتراض ہے تو میں خود اس سے کہہ دیکھتی ہوں۔“

”نہیں اماں۔“ وہ فوراً بول پڑی۔ ”میں خود بات کر لوں گی۔ آپ کچھ مت کہیے گا۔“

”ٹھیک ہے لیکن یاد سے کہنا اور اگر ہو سکے تو اپنی ساس سے بھی تذکرہ کر دینا۔ وہ مجھے اچھی عورت لگتی ہے۔“ اُس نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

شام میں شہر وڑ آفس سے واپسی پر پہلے اُس کے پاس آئے۔ وہ بھی اُسے لینے آئے ہیں جب وہ کچھ دن رہنے کی غرض سے آئی تھی اور صبح اُس نے بتا بھی دیا تھا، اس لیے اُن کے بیٹھے ہی کہنے لگی ”میں نے شاید صبح آپ کو بتا دیا تھا۔ کہ میں ابھی کچھ دن یہیں رہوں گی۔“

”مجھے یاد ہے۔“ وہ اس کا مطلب سمجھ کر دل ہی دل میں محفوظ ہوئے۔ لیکن کچھ نہیں کہا۔ اُس کے منہ سے سُنا چاہتے تھے کہ وہ کیا کہتی ہے؟ اور وہ کہنے لگی۔

”پھر آپ لینے کیوں آئے ہیں؟“

”آپ سے کس نے کہا کہ میں آپ کو لینے آیا ہوں؟“

وہ غجلی سی ہو کر نظریں چراتی ہوئی بولی۔

”پھر؟“

”بیوقوف روکی۔ اس گھر میں میری نام نہاد زوجہ آئی ہوئی ہے اور آفس سے واپسی پر میرا فرض بنتا تھا، میں گھر جانے سے پہلے اس کا دیدار کرتا چلوں۔ اس کا احوال پوچھوں اور یہ کہ میں تو اس کے بیٹا نہیں رہ سکتا یا وہ میرے پتارہ لے گی؟“

اُسے عجیب سی نظروں سے دیکھتے پا کر کہنے لگے۔ ”اور آپ جانتی ہیں کہ میں اپنے فرائض سے کبھی غافل نہیں ہوتا۔“

”جی۔“ اس نے اطمینان بھرا سانس لیا۔ ”میں سمجھی شاید۔“

”آپ ہمیشہ غلط سمجھتی ہیں۔“ وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑے۔ ”اور جس روز صبح مجھے لگیں، بہت سی باتوں کا ادراک ہو گا۔ بلکہ زندگی گزارنے کے ڈھنگ بھی سیکھ لیں گی۔“

”اچھا۔“ وہ خواہ مخواہ ہنس پڑی۔

”کونٹش کر دیکھیے۔“ پھر لٹختے ہوئے بولے۔ ”اب چلوں گا ورنہ کہیں آپ کچھ اور نہ سمجھ لگیں۔“

”میں کچھ نہیں سمجھوں گی۔ آپ پلینر بیٹھ جائیں۔“

”کوئی کام ہے؟“

”نہیں ہمارا چائے لے کر آرہی ہے۔ پی کر جائیے گا۔“

”ہمارا چائے لا رہی ہے۔ آپ کو خیال کیوں نہیں آیا؟“ بلا ارادہ ہی وہ ٹوک گئے تھے۔

”ہمارے میں نے ہی کہا ہے۔“

”اچھا۔“ پھر تو میٹھا پڑے گا۔ اور چائے بھی پینی پڑے گی۔ وہ دوبارہ بیٹھ گئے۔

پھر جب ہمارا چائے لے کر آئی تو اسی وقت ابامیاں بھی آگئے جنہوں نے چائے کے بعد انہیں جانے نہیں دیا بلکہ رات کے کھانے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک بیٹھے رہے تھے اور جب جانے لگے تو کلثوم اور ہما کے ملا کر پر کل انہیں کلفٹن لے جانے کا وعدہ بھی کیا۔

حسب وعدہ اگلے دن وہ چار بجے آگئے۔ اسے اُن کے آنے کا قطعی یقین نہیں تھا اور اُس نے کلثوم اور ہما سے بھی کہہ دیا تھا کہ شہر وڑ نے یوں ہی جان چمڑانے کے لیے وعدہ کر لیا ہو گا۔ ورنہ انہیں اتنی فرصت نہیں ہے

بین جب انہیں آتے دیکھا تو فوراً کلثوم اور ہما کے سر پر پہنچ گئی۔

”شہر وڑ آ بھی گئے ہیں اور تم دونوں ابھی تک تیا نہیں ہوئیں؟“

”شہر وڑ بھائی آ گئے؟“ دونوں خوشی سے اچھل پڑیں۔

”بیوقوف۔ میں نے تو یوں ہی کہا تھا۔ چلو اب جلدی کرو۔“ وہ انہیں جلدی تیار ہونے کا کہہ کر بڑے کمرے میں آئی تو چھوٹی آپا ان سے چائے کا پوچھ رہی تھیں۔

جب باہر جا رہی رہے ہیں تو چائے وغیرہ بھی وہیں پی لیں گے۔ پھر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

”کہیں آپ اسی خلیے میں جانے کا ارادہ تو نہیں رکھتیں؟“

”نہیں، میں چنچ کر رہی ہوں۔ چلیں چھوٹی آپا، آپ بھی جلدی سے۔“

”میں نہیں جا رہی۔“ چھوٹی آپا فوراً بول پڑیں۔

”کیوں؟“ اُس کے ساتھ ساتھ شہر وڑ نے بھی پوچھا۔

”میرا موڈ نہیں ہے۔ ویسے بھی اماں اکیلی ہو جائیں گی۔“ چھوٹی آپا نے عذر تراشا۔

”اکیلے میں اماں کو ڈر نہیں لگے گا۔ بس آپ چلیں۔“ چھوٹی آپا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی شہر وڑ بول پڑے۔

”آپ نہیں جائیں گی تو ہمیں اپنا پروگرام کینسل کرنا پڑے گا؟“

”بالکل۔“ اُس نے تائید کی اور ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے لگی۔ چھوٹی آپا مدد کے لیے اُن کی طرف دیکھنے لگیں۔

”شاید ہی ان کی طرف لڑی کریں۔ لیکن آپا۔“ نے بھی جانے کے لیے کہا تو میوہ را انہیں اٹھنا پڑا۔

پھر جب چاروں بہنیں تیار ہو کر آئیں تو شہر وڑ اکیلے بیٹھے تھے۔ اُس نے لتاں کی تلاش میں ادھر ادھر

ظہر دوڑائیں۔ اسی وقت وہ شہر کے لیے چائے لیے آتی نظر آئیں۔ انہیں دیکھ کر شہر و زوراً اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ اور بڑھ کر ان کے ہاتھ سے کپ تھام لیا۔ پھر اس کی طرف خشکین لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے۔

”ربیع۔ آپ کو خیال نہیں آیا، اماں چائے بناری تھیں؟“

”تو کیا ہوا؟“ اماں کہنے لگیں۔ ”یہ سب تیار ہو رہی تھیں۔ میں نے سوچا چائے ہی بنا لوں۔“

”آپ ربیع سے کہہ دیتیں۔ خود آپ نے کیوں زحمت کی؟“

”چلو، تم چائے پو۔“ اماں نے کہا تو انہوں نے کھڑے کھڑے ہی دو تین گھنٹہ میں چائے ختم کر ڈالی پھر فالی کپ اس کی طرف بڑھا دیا جسے لے کر وہ فوراً کچن میں چلی گئی۔

اسے ان کا یوں سب کے سامنے ڈانٹا بہت بُرا لگا تھا۔

”پتا نہیں۔ اپنے آپ کو کیا سمجھتے گے ہیں؟“ اندر ہی اندر کھلتے ہوئے سوچا۔ کچھ زیادہ ہی بوز کوڑا لگے ہیں۔ سمجھتے ہیں، میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کسی دن سب کے سامنے ایسی کھڑی کھڑی سناؤں گی کہ باپ پر گے۔ کپ رکھ کر واپس آئی تو اندر کے غصے کا اظہار چہرے سے بھی ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ تو گئے لیکن کوئی وجہ نہیں دی۔ اماں سے اجازت لے کر باہر نکل آئے۔ وہ کچھ روٹھی روٹھی سی آن کے برابر آ بیٹھی تھی۔

”موڈ ٹھیک کریں۔“ گاڑی اشارت کرتے ہوئے سرگوشی میں قدرے زحمت سے کہا۔

”زحمت جلتے کی کوشش نہ کریں ورنہ سنجیدگی سے خفا ہو جاؤں گی۔“ لہجے کی خشکی وہ چھپانہ سکی جسے مرا رکے انہوں نے ایک نظر اُس پر ڈالی، پھر گاڑی علی اسٹیڈ پر چھوڑ دی۔

”پتا ہے شہر وز بھائی۔“ بھانجی باتوں کے دوران اچانک انہیں مخاطب کر کے کہنے لگی۔ ”آئی کہہ رہی تھی آپ نے جان چیرٹانے کے لیے ہم سے وعدہ کیا ہے اور یہ کہ آپ اپنا کام چھوڑ کر بھی نہیں آئیں گے۔“ ہو سکتا ہے، اُن کے نزدیک وعدے کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ لیکن میں جب وعدہ کرتا ہوں تو ہر حال میں اُسے بُرا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ بات انہیں اب تک سمجھ لینی چاہیے تھی۔ وہ صرف اسے سناتے کی غرض سے آہستہ آواز میں بولے۔ اور کون سی بات سمجھی ہیں، جو یہ سمجھیں گی۔

وہ خاموشی سے گردن موڑ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ ہمارے غصے آ رہا تھا کہ اُس نے کیوں یہ بات چھوڑا۔

س وقت اُلجھنا مناسب نہیں سمجھا اس لیے خاموشی اختیار کیے کبھی۔ ساحل پر اترتے ہی ٹھنڈی ٹھنڈی نم ہوائے یوں استقبال کیا کہ اس کا موڈ آپ ہی آپ ٹھیک ہو گیا۔ میں اُن سے پھر بھی بات نہیں کی۔ چھوٹی آ پانے وہ جگہ منتخب کی جہاں لوگوں کی آمد و رفت نہ ہوتے کے بارے میں ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اب کوئی انہیں یہاں سے اٹھنے کے لیے نہ کہے۔ وہ نہ لگی ریت پر چلیں گی اور نہ ہی انہیں لہروں کا تعاقب کرنا پسند ہے۔

”بھئی، ہم تو لہروں کا تعاقب ضرور کریں گے۔“ کلثوم نے کہا ساتھ ہی ہما کو چلنے کا اشارہ کیا۔

”ہم جا رہی شہر وز بھائی؟“ بھانجی پوچھنے لگی۔

”ہاں۔ لیکن زیادہ دور نہیں۔“ وہ دونوں نرم نرم ریت پر تقریباً بھاگتی ہوئی بانی تک چلی گئیں۔ ”آپ دونوں پلین، میری وجہ سے یہاں نہ کر کے رہیں۔“ چھوٹی آ پاشہر وز بھائی کو مخاطب کر کے کہنے لگی تو اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”میں کہیں نہیں جاؤں گی چھوٹی آ پ۔“ آپ کے پاس بیٹھوں گی۔ وہ جان بوجھ کر انہیں نظر انداز کر کے چھ آپ کے پاس بیٹھی تو وہ ہونٹ جھنجھٹے ہوئے شہلے کے انداز میں آگے نکل گئے۔

”ربیع۔ یہ کیا حرکت ہے؟“ چھوٹی آ پ اسے سرزنش کرنے لگیں۔ تمہیں یہاں نہیں بیٹھنا چاہیے؟“

”نہیں؟“ ”شہر وز بھائی ہو سکتا ہے، مانند کریں۔ جاؤ بے چارے اکیلے کھڑے ہیں۔ جاؤ ناں، کیا تمہیں خیال ہے؟“ چھوٹی آ پ نے اُسے دھکیلا۔ تو وہ اندر ہی اندر گڑھتی ہوئی اُن کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ انہیں مخاطب

یا، خود کلامی کے انداز میں کہنے لگی۔

”گھٹا ہے سب نے کچھ جوڑ کر رکھا ہے۔ ہر ایک کی زبان پر ایک ہی جملہ ہے۔ ”کیا تمہیں خیال نہیں ہے؟“

میں نے ٹھیک لے رکھا ہے ہر بات کا خیال رکھنے کا۔“

وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے جو بُری طرح جھنجھلا رہی تھی۔

”میں نے آپ کو نہیں بتلایا۔ آپ اطمینان سے وہاں بیٹھ سکتی ہیں۔ وہ بھی ناگواری سے بولے۔

”اطمینان سے۔“ ”بچے میں ہلکا سا طنز سمٹ آیا تھا۔ کہیں اطمینان ہے میرے لیے؟“ یہاں آئی ہوں تو آپ کہیں گے صوفیہ اکیلی بیٹھی ہیں، آپ کو خیال نہیں ہے۔ اُن کے پاس تھی تو وہ آپ کے بارے میں حساس دلا رہی تھیں۔ آخر آپ سب مجھے سمجھتے کیا ہیں؟ کیا میں بے جس ہوں جو ہر وقت میرے احساس بویڈا کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ برائے مہربانی مجھے ہر وقت ٹوکنے سے گریز کریں ورنہ۔“

”ورنہ۔“ اس کے خاموش ہونے پر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ وہ کچھ دیر تک پرسوج انداز میں

ن کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر کچھ کہے بغیر چل پڑی۔ وہ حیران ہوئے اور اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ نرم ریت پر قدموں کے نشان چھوڑتی لمحہ بہ لمحہ اُن سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے کا تعاقب کرتی ہیں اس کے پیروں سے ٹکراتے لگیں۔ وہ پھر بھی چلتی رہی۔ اور وہ جو اس پر نظریں جمائے کھڑے تھے اس وقت چونک گئے، جب وہ گھٹنوں تک پانی میں تھی۔ اس وقت بھی وہ رُکی نہیں تھی۔

”ربیع۔“ ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ پہلے پلٹ کر چھوٹی آ پ کی طرف دیکھا، وہ ہر طرف سے بے نیازی پر انگلی کی مدد سے کلیں میں پھینچنے میں مصروف تھیں۔ انہیں متوجہ نہ پا کر انہوں نے ربیع کے پیچھے دوڑ لگا دی۔

”ربیع۔“ اس سے کچھ فاصلے پر تھے کہ آواز دے والی، وہ نہیں رُکی تو ایک پل میں درمیانی فاصلہ طے کر کے اُس کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

”ارادے کیا ہیں آپ کے؟“ انہوں نے غصے سے پوچھا۔

”شہر وز احمد۔“ وہ براہ راست اُن کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔ ”اگر میں آپ کی ورنہ کے جواب میں یہ کہتی کہ میں ان پانیوں میں اتر جاؤں گی تو آپ مذاق سمجھتے۔ ہنس کر ٹال دیتے۔ اس لیے میں علیٰ غلہ ہر کر رہی ہوں۔“

”ہوش میں ہیں آپ؟“

”قطعاً ہوش میں ہوں اور آپ پلینر سامنے سے ہٹ جائیں۔ میں پچ پچ پانیوں میں اترنا چاہتی ہوں۔ مجھے نہیں گوارا ایسی زندگی جس میں خود میرا عمل دخل نہ ہو۔“

”یہ بات آپ اس سے کہیں جس نے آپ کے لیے یہ راستہ منتخب کیا ہے۔“

”ثاقب حسن کا ذکر ہو اور اُن کی پیشانی شکن آلود نہ ہو، یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔“

”نندہ رہی تو اس سے بھی پوچھ لوں گی کہ میرے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق اسے کس نے دیا تھا؟“

”واپس چلیں؟“ وہ اس سلسلے میں مزید کوئی بات نہ کہنا چاہتے تھے اور نہ سننا چاہتے تھے۔

”میں آگے تو جاؤں گی واپس نہیں۔“

”بیوقوفی کی باتیں مت کریں۔“ وہ اُس کی کلائی تھام کر تقریباً کھینچتے ہوئے واپس لے آئے اور چھوٹی آپ کے پاس بٹھاتے ہوئے نازل لہجے میں انہیں مخاطب کر کے کہنے لگی۔

”ہم لوگ ذرا آگے تک نکل گئے تھے۔“

”مرا رہو کھو۔“ اُس نے گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے سوچا۔ نہ صرف دوسروں کو بلکہ اپنے آپ کو بھی۔ اور چاہتے ہیں، میں بھی اُن کی طرح پل بھر میں موڈ تبدیل کر لیا کروں۔ ناممکن، مجھ سے یہ سب نہیں ہو سکتا۔ میں کبھی بھی ان کی طرح اتنی کامیاب اداکاری نہیں کر سکتی۔

”تم تو پوری جھجک گئی ہو۔“ چھوٹی آ پ کے کہنے پر اس کی سوچیں منتشر ہو گئیں۔ طویل سانس لے کر

سیبھی ہو بیٹھی۔

”میرے منہ کرنے کے باوجود باز نہیں آئیں۔ اتنی دُور نکل گئیں۔“ شہر و زان کے سامنے بیٹھے ہوئے۔

”تمہیں شہر و زبھائی کی بات مان لینی چاہیے تھی۔ دیکھو تمہارے ساتھ وہ بھی بھیگ گئے ہیں۔ چھوٹی آپا نے یوں ہی ان کی طرف دُوری کی لیکن وہ ہتھکے سے اکھڑ گئی۔

”بہت گناہگار ہو گئی ہوں میں ان کی بات نہ مان کر۔ سزاوار تھی ہوں تو دیکھئے نہ اچھے۔“  
”ربیع۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“ چھوٹی آپا کے ساتھ وہ بھی حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔  
”پاگل ہو گئی ہوں۔“ پشانی گھٹنوں پر رکھ کر چہرہ چھپا لیا تو انہوں نے اشارے سے چھوٹی آپا کو روک دیا کہ اسے نہ چھیڑیں۔ چھوٹی آپا سر ہلاتی ہوئی دُور چلی گئی اور ہٹا کو دیکھنے لگیں جو دنیا جہاں سے بے خبر جا رہی۔ اور یہاں کتنی دیر تک مکمل خاموشی چھائی رہی۔

لٹے چپ چاپ سر کرتے رہے۔ آسمان کی وسعتوں پر سفر کرتا سورج اب شاید نیلے پانیوں میں اترنے کی تیاری کر رہا تھا۔ بیچ آسمان میں جو دُور دُور دیکھا تھا اب تاریخی لبادہ اوڑھ چکا تھا۔ اس کی طرف شاہین پانی کی سطح پر چمکتی نظر آ رہی تھیں، کائنات کو انوکھا حسن بخش کر لکھ رہی تھی اور جھل جھل ہورہا تھا۔ دیکھیں صوفیہ۔ غروب آفتاب کا منظر کس قدر دل فریب ہے۔“ شہر و زان نے چھوٹی آپا کو مخاطب کر کے کہا تو وہ اسی طرف دیکھنے لگیں۔

”آپ آنے سے انکار کر رہی تھیں۔ اچھا ہوا آگئیں ورنہ اس دلفریب منظر کو دیکھنے سے محروم رہ جاتیں۔“

”میں تو بے بھی محروم ہوں۔“ جانے کیسے چھوٹی آپا کہہ گئیں۔ ورنہ وہ تو خاصی محتاط رہا کرتی تھیں تاہم طور سے دوہا بھائی کے سامنے۔ اور شہر و زان امد کے سامنے بہت ریزہ ریزہ کر اپنے آپ کو مطمئن پوز کیا کرتا۔ اس وقت پتا نہیں کیسے، اندر کسی محرومی کے احساس نے اچانک بیدار ہو کر ان کے چہرے اور پیچھے کمرے میں لے لیا تھا۔ جسے محسوس کر کے وہ کہنے لگی۔

”ہر شخص ہی محروم ہے۔ کسی نہ کسی پہلو سے اُدھورا۔“

”نہیں شہر و زبھائی۔ ہر شخص محروم نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو محرومی کا احساس کبھی نہ جاتا۔ کسی کو اللہ عیال نے بساط سے بڑھ کر نواز دیا ہے تو کسی کو بساط بھر بھی نہیں۔“  
وہ جو گھٹنوں میں چہرہ چھپائے بیٹھی تھی، چھوٹی آپا کی بات پر چونکی اور سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

”انسانوں کے درمیان یہ تفریق گو کہ خود اس کی اپنی پیدا کردہ ہے لیکن ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ جو بُندی پرکھڑا ہے، وہ پستی والے کو تھام لے اور ہم انسانوں نے اس تفریق کو تو قبول کر لیا ہے لیکن ان کی دوسری بات پر عمل نہیں کرتے۔ بندیوں کو چھوٹنے والے پستیوں کی طرف حقارت سے دیکھتے ہیں۔ آپ کہیں گے شہر و زبھائی کہ سب ایک جیسے نہیں ہوتے اور میں بھی مانتی ہوں کہ سب ایک جیسے نہیں ہوتے لیکن زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جن کی میں بات کر رہی ہوں۔“

”مجھے آپ سے اتفاق ہے۔“ وہ کہنے لگی۔ ”لیکن جو معاشرتی یا طبقاتی فرق کو آپ نے بندی اور پستی کا نام دے دیا ہے تو یہاں میں اختلاف کروں گا۔ پتا نہیں آپ کے تصور میں بندی کیا ہے۔ میں تو جب سر اٹھا کر دیکھتا ہوں تو بندی پر صرف آسمان ہی نظر آتا ہے جو بلا امتیاز سب پر سایہ فگن ہے اور جسے ہم میں سے کوئی بھی نہیں چھو سکتا۔“

قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔ ”اور گھرے پاتالوں کا نام پستی ہے۔ میرے نزدیک پاتال ہیں! مگر تلے جو اپنے کردار کے ہر پہلو سے اُدھورا ہوا اور جو اپنی آبروی حفاظت نہ کر سکے۔ ایسا شخص جو خود اپنے ضمیر کی عدالت سے سزاوار نہ ہو سکے۔ اسے کوئی دوسرا کیسے تھلے گا بھلا۔؟“

”چلیے آپ نے بندی اور پستی کی نشاندہی کر دی اور یہ بھی کہ اپنے غلط کردار و عمل کی بنا پر ہی آدمی پستی پر گرتا ہے لیکن بعض لوگوں کو بنا کسی تصور کے، بنا کسی گناہ کے پستیوں میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ ان بارے میں آپ کیا کہیں گے؟“

”وہ واقعی قابلِ رحم ہیں لیکن یہ فیصلہ کون کرے گا کہ وہ خود گئے ہیں یا دھکیلے گئے ہیں؟“  
”یہ جاننا کون سا مشکل کام ہے۔“ اس نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔ وہ بھی یوں جیسے مذاق اڑا رہی تھی۔ ”جو طاقتور ہوگا وہ یقیناً دوسروں کا حق مارے مارے پستی میں جاگرا ہوگا اور کمزور کو دھکیلا گیا ہوگا۔“  
”ہاں داؤبے۔ آپ کے سر پر جو جھوٹ نمائے تھی، وہ اتر گئی کیا؟“ وہ مسکراہٹ دبا کر بولے تو وہ پھر ملتی نظر آنے لگی۔ ”عجب لڑکی تھی، دل کے تاروں کو چھو کر بھی انجان۔“  
”ہاں تو صوفیہ۔ آپ کیا کہہ رہی تھیں؟“ وہ اسے مزید چھیڑنے کا ارادہ ملتوی کر کے پھر چھوٹی آپا کی طرف خیر ہو گئے۔

”چھوٹیں شہر و زبھائی، ہم کچھ زیادہ ہی سنجیدہ گفتگو لے بیٹھے ہیں۔ اس وقت تو ہمیں اس ماحول کی مابست سے بکھی بکھکی باتیں کرنی چاہئیں۔“

”ہاں۔“ وہ طویل سانس لے کر براہِ راست اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”ماحول کی مناسبت سے تو یہ کہنے کو جی چاہ رہا ہے کہ یہاں اُترتی دھیر ساری خوبصورتیاں اس لڑکی کی مرہونِ منت ہیں جو روحی بھی ہم سے لائق نظر آنے کی بھرپور کوشش کر رہی ہے۔“

”میرے خدا۔“ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ چھوٹی آپا کی طرف دیکھا، وہ ہنس رہی تھیں اور ہنسنے پر آمادہ۔ سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے؟ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ اور کائنات کو آواز دے ڈالی۔ اس کا آواز پر ان دونوں نے چونک کر دیکھا اور بھائی چلی آئیں۔

”کیا ساری زندگی یہیں بیٹھے رہنے کا ارادہ ہے؟“ اپنی کیفیت چھپانے کے لیے ان دونوں کو نواخواہ لائے لگی۔

”اُن پر کیوں خفا ہو رہی ہیں؟“ شہر و زان اٹھتے ہوئے بولے۔ ”آپ خود بھی تو یہاں اطمینان سے بیٹھی ہیں۔“

”پہلیں چھوٹی آپا۔“ وہ ان کی بات نظر انداز کر کے چھوٹی آپا کو اٹھانے لگی۔ پھر واپسی میں پہلے انہوں نے بائیں میں کھانا کھایا۔ اس کے بعد اس کے کہنے پر کچھ دیر کے لیے بڑی آپا کے پاس رُکے اور جب گھر کے رکائی حیر ہو چکی تھی۔ دن بھر کے تھکے ہارے ابا میاں سوچے تھے۔ اور اُمتان اُن کی راہ تک رہی تھیں۔ شہر و زان سب کو چھوڑنے اندر تک آئے۔ پھر کھڑے کھڑے ہی جانے کی اجازت چاہی۔

”کب تک یہاں قیام کا ارادہ ہے؟“ وہ انہیں سی آف کرنے دروازے تک آئی تو پوچھنے لگی۔  
”ارادہ تو بہت زیادہ دن رہنے کا ہے۔“

”لیکن میں اجازت نہیں دوں گا۔“  
”کیا۔؟“ وہ آگے کہنا چاہتی تھی کہ مجھے آپ کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے لیکن وہ فوراً بول پڑے۔

”جب تک کچھ حق رکھتا ہوں۔ اُسے استعمال بھی کروں گا۔“  
”حق استعمال کر رہے گے۔“ وہ دروازہ بند کر کے بڑبڑاتی ہوئی اندر آئی۔ اور تھکن کا بہانہ کر کے فوراً مرنے کے لیے لیٹ گئی۔

اگلے دن ناشتے کے بعد بھی معمول کے کام شروع نہیں ہوئے تھے کہ مہر و زان آگیا اُسے لینے کے لیے۔ اس وقت سبزی وغیرہ لینے گئی ہوئی تھیں۔ اور وہ چھوٹی آپا کے ساتھ برآمدے میں رکھے تخت پر بیٹھی یوں ہی کوئی پرانا اخبار دیکھ رہی تھی۔ مہر و زان آیا تو وہ اسے لے کر اندر جانے لگی تھی کہ وہ بھی شہر و زان کے ساتھ وہیں برآمدے میں بیٹھ گیا۔

”کیسے آئے؟“ وہ یوں ہی پوچھ گئی۔

”بڑے بھائی نے آپ کو لینے بھیجا ہے۔ وہ خود آتے لیکن آج کوئی ضروری میٹنگ تھی اس لیے فرض مجھے سوئپ دیا۔“

”جب تک کچھ حق رکھتا ہوں، اسے استعمال بھی کروں گا۔“ فوراً ذہن پر ان کی بات کی کہی بات دہا دینے لگی تو کتنی دیر تک وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔ کچھ حیران اور کچھ بے یقین سے انداز سے مہر و زکی طرہ دیکھے گئی۔

”میرے سر پر سیگ نکل آئے ہیں کیا؟“ وہ اسے یوں اپنی طرف دیکھتے پاکر سر پر ہاتھ پھیرنا لپچے میں شوخی تھی۔

”سیگ تمہارے نہیں تمہارے بھائی کے نکلے ہیں جس کی وجہ سے ان کا دماغ کچھ اُلٹا ہو گیا ہے سنا ہی بھی کم دینے لگا ہے۔ اور کچھ دنوں کے بعد یقیناً انھیں بھی متاثر ہوں گی۔“ وہ جو منہ میں آیا، چلی گئی۔

”الٹی خیر۔“ یہ تو خطرناک بات بتا رہی ہیں آپ۔“ وہ پریشان نظر آنے کی ایک سنگ کرتا ہوا بولا۔

”رات میں نے ان سے کہا تھا کہ میں ابھی کچھ دن سپیا رہوں گی پھر اس وقت انہوں نے نہیں کچھ بھیج دیا؟“

”میں تو حکم کا غلام ہوں بھابی۔ انہوں نے کہا اور میں چلا آیا۔“

”اور اب جا کر ان سے کہہ دو کہ میں آج نہیں آؤں گی۔“ وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔

”نہیں ربیعہ۔“ چھوٹی آچا جو سر جھکائے بیٹھی تھیں، اس کی بات پر فوراً بول پڑیں۔ کوئی بات ہوگا جب ہی انہوں نے بلایا ہوگا۔ تمہیں بتع نہیں کرنا چاہیے۔“

”مہر و زکی آجانی بات پر یوں ہی ان کی طرف متوجہ ہوا تھا لیکن پھر بہت دیر تک ان پر سے نظر نہیں ہٹا سکا۔

”میں جانتی ہوں، کیا بات ہے۔“ اس نے سوچا۔ محض اپنا حق استعمال کر کے مجھ پر جتانے کی کوشش کی ہے؟“

”تو پھر آپ چل رہی ہیں؟“ مہر و زکی سوچتے دیکھ کر پوچھنے لگا۔

”ہاں۔“ یہ جلتے گی۔“ اس کے بجائے چھوٹی آپلے جواب دیا اور اٹھتے ہوئے بولیں۔ تم جب تک ڈریس چیلنج کر لو، میں چائے بناتی ہوں۔“

”چائے کا تکلف رہنے دیں۔“ مہر و زکی دھکا۔

”تکلف کیسا؟“ اور پھر اماں کے آنے تک تو آپ کو رکنا ہی ہے۔ کیوں نہ اس دوران ہم چائے ہی پی لیں۔“

”ہاں چھوٹی آپا۔“ میں بھی پیوں گی۔“ وہ اٹھ کر اندر چلی گئی اور جب چھوٹی آپا کچن کی طرف جلتے تو وہ چونکا اور کچھ تاسف کا تاثر لیے اس کی نظریں ان کا تعاقب کرتی گئی تھیں۔

کچھ دیر بعد جب وہ صبح کر کے اپنا بیگ اٹھائے، اس کے پاس آئی تو اسی وقت چھوٹی آپا بھی چائے کے گر آئیں۔ اس کے سامنے ٹرتے رکھی تو وہ ان کے نرم ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔ دھلے دھلے اُٹلے اُٹلے شفاف ہاتھ کہ جنہیں بے اختیار تمام لینے کو دل چاہے اور کوئی جی داری انہیں تھامتے نہ کر سکتا تھا۔

واپسی میں وہ کھو یا کھو یا سا تھا جیسے اپنی کوئی چیز وہیں چھوڑ آیا ہو۔ یا کوئی نیا احساس ساتھ آیا ہو۔ پتا نہیں کیا تھا، کچھ بے قراری سی۔ جانے پالینے کی تھی یا کھو دینے کی؟ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کے برعکس وہ غصے میں تھی۔

بار بار یہ خیال کہ شہر و زاحمد لینے نام نہاد حقوق کا ناجائز استعمال کر رہے ہیں، اسے طیش دل رہا تھا۔ ہاتھوں انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا لے وہ مسلسل مضبوط کر رہی تھی ورنہ دل تو چاہ رہا تھا کہ مہر و زکی سامنے دل کی تھیں اس نکال لے۔ وہ اگر اپنے آپ میں ہوتا تو اس کی کیفیت محسوس کر کے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کی کوشش ضرور کرتا لیکن تمام راستہ اس کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوا۔

اسے گھر کے سامنے اتار کر کسی ضروری کام کا بہانہ کر کے کہیں چلا گیا۔ وہ اندر آئی تو ٹی وی لڑج میں اسے سامنا ہو گیا۔ وہ بہت عجلت میں تھیں۔ اسے دیکھ کر محبت سے مسکرائیں اور صرف اتنا کہا۔

”اگلیں بیٹا؟“ اس کے بعد اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

وہ کچھ دیر تک وہیں کھڑی رہی۔ پھر اپنے کمرے میں جاتے جاتے کیا خیال آیا کہ فون کے پاس رشہ زکی کے آفس کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ دوسری طرف فون ان کی سیکرٹری نے اٹھا لیا۔ اس نے جب ان بات کرنے کے لیے کہا تو وہ معذرت کرتی ہوئی بولی۔ وہ اس وقت ضروری میٹنگ میں مصروف ہیں۔

”میں ان کی مسز ہوں۔“ اس نے بھی حق استعمال کر ڈالا۔ وہ خواہ کہیں بھی مصروف ہوں، فوراً میری سہارا بنیں۔“

سیکرٹری کے ”اوکے“ کہنے پر انتظار کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد، منتوں سے ان کی آواز ٹھٹھکی تو وہ بغیر سلام کے کمرے کے کونڑے پہنچے میں بولی۔

”مشرعہ و زاحمد۔ بہت جلدی آپ نے اپنا حق استعمال کر ڈالا۔“

”کون؟“ ربیعہ؟“ وہ واقعی حیران تھے کیونکہ اس نے کبھی انہیں رنگ نہیں کیا تھا۔ اس وقت بھی یہ یقین نہیں تھا کہ وہ ہوگی اور پتا نہیں کیا کہہ رہی تھی۔

”جی، اتنے مستعجب کیوں ہیں شہر و زاحمد۔ یہ میں ہی ہوں۔“

”دیکھ کیا کام ہے؟“

”مجھے آپ سے کیا کام ہو سکتا ہے بھلا؟“

”ربیعہ۔“ انہوں نے تنبیہی لہجہ اختیار کیا۔ ”اگر کوئی کام نہیں ہے تو فون بند کر دیں۔ میں اس وقت مصروف ہوں۔“

”میں پوچھ رہی ہوں ایسی کون سی مصروفیت ہے جو۔“

”شٹ آپ۔“ پوری بات سننے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا تو وہ ریسپونڈ کر کے دل ہی دل میں بدلہ لینے ہستی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔ بیگ سے کپڑے نکال کر الماری میں رکھ رہی تھی کہ ملازم نے آکر کہا۔

”بیگ صاحبہ بلا رہی ہیں۔“

اس نے ابھی آتی ہوں، کہہ کر بقیہ کپڑے رکھے اور الماری بند کر کے جلدی سے کمرے سے نکل آئی۔

الائوں میں بیٹھی نظر آئیں۔ وہ جا کر ان کے پاس بیٹھی تو وہ کہنے لگیں۔

”بیٹا۔ تم نے بڑا تو نہیں مانا؟۔ میں نے تمہیں اس وقت بلوایا۔“

”جی۔“ وہ حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئی۔

”تم بہت بھر رہے کے ارادے سے گئی تھیں لیکن بات ایسی ہے کہ تمہاری بہن موجودگی ضروری تھی۔

”لپچہ چل جانا۔“

”مجھے آپ سے کیا ہے؟“ لیکن مہر و زکی تو آپ کا نام نہیں لیا۔ وہ تو کہہ رہا تھا اسے شہر و زکی

”جیسا ہے۔“ وہ کھوٹے کھوٹے لہجے میں بولی۔

”شہر و زکی نے بھیجا ہوگا۔ کیونکہ میں نے شہر و زکی کہا تھا۔ اور ہو سکتا ہے مصروفیت کی بنا پر اس نے

”مہر و زکی کو بھیج دیا ہو۔“

”وہ چپ چاپ اتنی کی طرف دیکھے گئی۔ انداز ایسا تھا کہ دیکھ تو انہیں رہی تھی لیکن ذہن کہیں اور بٹسک

رہا تھا۔ ابلانے میں کتنی غلطی ہو گئی تھی۔ شہر ورنے حق استعمال نہیں کیا تھا لیکن وہ ایسا کر گئی تھی۔ کچھ دیر پہلے فون پر ان سے بات کرتے کرتے جو انداز اختیار کیا تھا، اسے سوچ کر پسینہ آ گیا۔ پتا نہیں سوچا ہو گا انہوں نے اور اس کے بارے میں کیا خیال کیا ہو گا۔

میرے خدا۔ اس نے ڈھیر ساری لذتوں میں گھر کر سوچا اب ان کا سامنا کیسے کر پائے گی۔ ہاں تو بیٹا۔ اتنی نے کہا۔ تو اس نے مشکل تمام اپنی ساری توجہ ان کی طرف مبذول کی۔ میں تمہیں اس لیے بلوایا ہے کہ آج شام میں نیا کے کمرال والے آرہے ہیں۔ میں نے خافسانا کو کی دیا بات تو دے دی ہے۔ پھر بھی تم خود دیکھ لیتا۔ خدا اچھی جا کر چیک کر لیتا۔ کسی چیز کی کمی ہو کوئی دشمن بناؤ نامقصور نہ ہوتو۔

”آپ فکر نہ کریں۔ میں سب دیکھ لوں گی۔ بلکہ کچھ چیزیں میں خود تیار کروں گی۔ وہ فوراً بول پڑا اور ذرا انتظامات پر بھی نظر رکھنا۔“

”جی بہتر۔ وہ سعادت مندی سے بولی پھر پوچھنے لگی۔ کسی خاص سلسلے میں آرہے ہیں؟“

”ہو سکتا ہے شادی پر زور دیں۔“

”تو کیا آپ ابھی نیا کی شادی نہیں کرنا چاہتیں؟“

”نہیں، میں چاہتی ہوں، وہ تعلیم مکمل کر لے پھر۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔ ”اگر وہ اصرار کریں گے۔ پھر تو کرنی پڑے گی۔ بہر حال آج کروں یا کل۔ کرنی تو ہے۔“

”جی۔“ وہ اس معاملے میں مزید کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ اس کے نزدیک یہ ان کا گھر بیلو معاملہ تھا اس گھر کی فرد بہر حال نہیں تھی۔

”میں کچن دیکھ لوں۔“

”ہاں ضرور۔“

”امی کی اجازت ملے ہی وہ آن کے پاس سے اٹھ کر کچن میں آ گئی۔ سامان چیک کرتے ہوئے، ساتھ خافسانا سے پوچھتی گئی کہ وہ کیا پکالنے کی تیاری کر رہا ہے۔ پھر ایک آدھ دوش جو وہ چاہتی تھی، اس کا سامان اسی وقت اس نے منگوایا۔

پھر سارا دن وہ خاصی مصروف رہی۔ ڈرائنگ روم کی صفائی اپنی نگرانی میں کروائی۔ کچن میں وقت سے جانا اور ڈرائنگ روم میں ٹیبل پر ہر چیز قرینے سے رکھنا۔ اپنی دانست میں پوری کوشش کی کوئی بے ترتیبی نہ ہو۔

دوپہر میں امی نے کہا بھی کہ کچھ دیر آرام کر لو۔ لیکن وہ مصروف رہی۔ پھر جب ہر طرف سے بے طرح اطمینان ہو گیا، تب اپنے کمرے میں آئی۔ گھڑی کی طرف دیکھا، چار بجے تھے۔ اب سونے کا وقت نہیں رہا تھا۔ فریض ہونے کے لیے نہانے کا ارادہ کیا اور فوراً ہاتھ روم میں گھس گئی۔ نہا کر نکلی۔ تب کیا، ہانوں کے سامنے اچھے چلیے میں جانا چاہیے۔ جلدی سے الماری کھول کر کیڑے منتخب کرنے

ہلکا فیروز رنگ اس پر بہت سوٹ کرتا تھا۔ اس نے وہی نکال لیا اور ابھی الماری بند کر کے پلٹی ہی تھی لاؤنج سے آئی شہر ورنی آواز اس کے پیسے وجود کو لمحہ بھر کے لیے سن کر گئی۔ صبح کا واقعہ جو وہ صراحت میں گھر کر چلا بیٹھی تھی۔ ایک دم یاد آیا تو اسے سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

”آن کا سامنا کیسے کروں گی؟“ یہ سوچ کر پھر پریشان ہو گئی۔ اپنا بھجی یاد آیا کہ اس طرح کہہ رہی تھی۔ ”میں پوچھ سکتی ہوں ایسی کون سی مصروفیت ہے جو۔“

میرے خدا۔ یہ سب نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ ان سے زیادہ دیر ٹھیک نہیں سکتی تھی لیکن فو پر ان سے بچنے کے لیے ان کے اس طرف آنے سے پہلے ہی کپڑے لیے، نیا کے کمرے میں چلی

نیا اس کی آڑی آڑی رنگت دیکھ کر تشویش سے بولی۔

”آپ کو کیا ہوا ہے؟“ وہ کچھ بولی ہی نہ سکی۔ بس نفی میں سر ہلا دیا۔

میرا خیال ہے تب تک گئی ہیں۔ نیا نے خود ہی قیاس کیا۔ تو وہ پھر نفی میں سر ہلاتی ہوئی کرنے انداز میں اس کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”جانی۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟“ اس کی مسلسل خاموشی سے نیا گھبرا کر پوچھنے لگی پھر کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”آپ کے تو ہاتھ بھی ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔“

”مجھے کچھ نہیں ہوا۔“ وہ اس خیال سے کہ کہیں نیا گھبرا کر شہر ورن کو نہ بلا لائے، فوراً بول پڑی۔ میں لیٹ چکی ہوں۔ ابھی ابھی نہا کر نکلی ہوں۔ اس لیے ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ ہاں تم یہ سوٹ دیکھو

م میں پہننے کے لیے کیسا ہے؟“

”آپ پہنیں گی؟“ نیا نے قدرے تعجب سے کہا۔

”ہاں کون؟“

”رہنے دیں جانی۔“ نیا نے اس کے ہاتھ سے سوٹ لے کر ایک طرف ڈال دیا۔

”اچھا تو ہے۔“ اس نے کہا۔

”ہاں۔ اچھا تو ہے۔ پھر بھی اسے مت پہنیں۔“ نیا بولی۔

”پھر؟“ وہ سوالیہ نشان بن کر پوچھ بیٹھی۔

”ساری بازھیں۔ ایمان سے آپ پر بہت سوٹ کرے گی۔“

”نیا پائیز۔ مجھے کچھ میزبانی کے فرائض بھی انجام دینے ہیں۔ اور ساری میں بہت الجھن محسوس کروں

۔ بلکہ مجھ سے کوئی کام نہیں ہو گا۔“ اس نے منع کر دیا لیکن نیا نے بہت محبت سے اس کے گلے میں دو ڈال دیے۔

”میری خاطر جانی۔ ایمان سے آپ بہت اچھی لگیں گی۔ اور کوئی کام کرنے کی کیا ضرورت ہے بیٹے

بے ملازم سے کہہ دیجیے گا۔“

”مجھے بازھنی بھی نہیں آتی۔“ اس نے نیا شوشا چھوڑا۔

”میں بازھ دوں گی۔ بلکہ نہیں بھی لگا دوں گی کہ نہ آپ کو سنبھالنی پڑے گی اور نہ ہی وقت محسوس ہوگی۔“

”ٹھیک ہے۔ اب خود جا کر میری الماری میں سے اپنی مرضی سے کوئی ساری نکال لاؤ۔“ اس نے ہتھار لے ہوئے کہا۔ تو نیا اس کے کال پر پیار کرتی ہوئی فوراً اٹھ کر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو اس کے

ہاتھوں میں وہی رنگ کی ساری تھی جیسا وہ سوٹ لاتی تھی۔ پھر نیا خود ہی استری بھی کرنے لگی۔ وہ کچھ دیر تک اس طرف دیکھتی رہی۔ پھر یوں ہی ذرا کر سیدھی کرنے کی غرض سے لیٹ گئی۔

”نیا۔“ امی کپکارتی ہوئی اندر آئیں۔ پیرا سے دیکھ کر کہنے لگیں۔ ”تم یہاں ہو بیٹا۔ میں تمہارا ہی پوچھنے

”جی کوئی کام ہے؟“ وہ آٹھتے ہوئے بولی۔

”نہیں۔ میں یہ کہنے آئی تھی کہ اب تم تیار ہو جاؤ۔ یہاں بس آنے ہی والے ہوں گے۔“

”ٹھیک ہے، تیار ہو کر میرے پاس آ جانا۔“ امی جاتے جاتے کہتی گئیں۔

پھر وہ تیار ہونے کے بہانے نیا کے کمرے میں ہی رہی۔ اصل میں تو وہ شہر ورن آمد سے ٹھپ رہی تھی۔

ان ہی کے ڈر سے امی کے کہنے کے باوجود تیار ہونے کے بعد ان کے پاس نہیں گئی۔

جب ملازمہ بلانے آئی اور اس کی زبانی معلوم ہوا کہ یہاں آچکے ہیں، تب وہ کمرے سے نکلی اور یہ

ال کمرہ ہانوں کے سامنے تو وہ کچھ کہنے سے رہے، اسے سہارا دے گیا۔ ڈرائنگ روم کے دروازے

مقدمہ لگتے ہی وہ ٹھٹھک کر روک گئی۔

بالکل ملتے شہر ورن بیٹھے تھے۔ اور اسی وقت وہ یوں ہی بلا ارادہ ادھر متوجہ ہوئے تھے، اس پر نظر پڑی

تو ایک پل میں جانے کتنے رنگ اُن کی آنکھوں میں آسمان تھے۔ ساری میں اس کا ترشا ہوا دروازہ قد سے نمایاں ہو گیا تھا۔ حالانکہ اُس نے پلو کو دوسرے کندھے تک پھیلا رکھا تھا۔ فیروزی رنگ دائم پرہت سٹوٹ کر رہا تھا۔ ساتھ فیروزے کا سیٹ اور میک اپ وہ عام دنوں سے کس قدر مختلف رہی تھی۔ اور پشت پر پھیلے اس کے گھٹا بال۔

کوئی تو وقت تھم جانے کی نوید دے۔

وہ اسے دیکھتے رہیں، یونہی دیکھتے رہیں۔

کوئی تشنگی نہ رہے، کوئی کسک نہ رہے۔

”شہر و زاحمد۔ یکساں حاکم ہے؟“ دل کے ٹوکنے پر شعلے لیکن بے اختیاری پر اختیار نہ رہا۔ جگہ سے کھڑے ہو گئے۔

”آئیے ربیع۔“ یہ لہجہ صرف اسی کے لیے تھا۔ جس کا خمیر تسخیر کر لینے والی مٹی سے اٹھا یا گیا۔ جو دل کے تاروں کو چھو کر بھی انجان تھی، بے خبر تھی۔ پھر اس کے قریب چلے آئے۔ مخصوص انداز۔ اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اور اپنے ساتھ لیے ہوئے سب کے درمیان آ گئے۔ اتنی نہ سنا۔ نظروں سے اسے دیکھا اور محبت سے بولیں۔

”یہ ربیع ہے۔ میری بہو، آپ نے پہلے اسے دیکھا ہوگا۔“

”ہاں۔ بس شادی پر ہی دیکھا تھا۔ پچھلی بار جب آئے تھے تو یہ شاید کیے گئی ہوئی تھیں۔“ سانس کہنے لگیں۔ اسے محسوس ہوا جیسے سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے ہوں۔ بہت ساری نظروں اور قریب بیٹھے شہر و زاحمد کے وجود سے اٹھتی محسوس کن بہک نے اُسے زور سے کر دیا تھا۔ دل چاہ بھی بہانے اٹھ کر چلی جائے یا پھر اپنے اور شہر و زاحمد کے درمیان کچھ فاصلہ ہی پیدا کر دے۔ ہر کندھا بار بار اُس کے کندھے سے ٹکرا رہا تھا۔ نماز ٹرائی دھکیلنا ہوا کر رہا تھا۔ اُس نے موقع غنیمت جانا اور فوراً اٹھ کر ٹرائی اپنی طرف کھینچ لی۔ اور ملازم کو جانے کا اشارہ کیا۔

پھر سب کو اسکو آتش سرور کرنے کے بعد اُچی کے پاس جا بیٹھی۔ سرگوشی میں ان سے پوچھا کہ کیا ڈانٹنگ روم کا جائزہ لے لے اور اُن کی اجازت ملتے ہی وہاں سے چلی آئی۔ باہر آتے ہی پہلے اطمینان طلب سانس لیا۔ پھر ڈانٹنگ روم میں داخل ہوئی تو ٹیبل کا جائزہ لینے کے بجائے کرسی کھینچ کر وہیں گئی۔ اچانک ایک نامعلوم سا احساس اس کے گرد حصار کھینچنے لگا تھا، جس میں مقید ہوتے ہی نے سوچا۔

اگر ثاقب حسن جان لیتا کہ اس زندگی میں مجھے قدم قدم پر ایسی صورت حال کا سامنا ہوگا تو شاید قدم کبھی نہ اٹھاتا یا پھر میرے حصول کا خیال دل سے نکال دیتا۔

کب سوچا تھا کہ محبت میں ایسی ٹری آزمائشوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔؟

کیا محبت زندہ ہے؟“ دل دھڑک دھڑک کر اس سے سوال کرنے لگا تھا۔ اور وہ اپنا ہر کرنے جاری تھی کہ شہر و زاحمد اس کے سامنے اُن کھڑے ہوئے اور یوں ہی کبھی کبھی کھوجانا تو اُن عادت تھی۔ دل سوال کر رہا تھا۔ ذہن جواب سوچنے میں مصروف اور نظریں ان پر جمی رہ گئیں۔

”ربیع۔“ انہوں نے پکارا اور اندر کے شور میں اسے اُن کی آواز سنائی ہی نہ دی۔

”ربیع۔“ دوبارہ پکارنے کے ساتھ میز کو بھی انگلیوں سے بجایا تو وہ چونکی اور فوراً کھڑی ہو گئی۔

”کیا سوچنے لگی تھیں؟“

”کچھ نہیں۔“ اُس کے بچے کی افسردگی اُن سے چھپی نہ رہ سکی۔

”آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟“ بے قراری سی بے قراری۔

”جی۔“ مختصر یہی کہہ سکی۔

”یہاں کیوں چلی آئیں؟“ میں اس سادے انتظام کا از سر نو جائزہ لینے آئی تھی۔ ”پھر اپنے آپ پر قابو پا کر ان سے پوچھنے سب ٹھیک ہے ناں؟“ ”نظاہر تو سب ٹھیک ہی لگ رہا ہے۔“

”نظاہر۔“

”ہاں ربیع جی۔ نظاہر تو سب ٹھیک ہی لگتا ہے۔ اندر کا حال خدا جلے یا وہ جس پر بیٹے۔“ ذومعنی ت کہی، پھر زکے نہیں۔

پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے کھانے میں سب کے ساتھ شریک ہونا پڑا۔ اتنی بڑے فخر سے بتا رہی ہیں کہ یہ سارا انتظام ربیع نے کیا ہے۔ اور سب کی تعریفوں پر وہ شرمندہ ہوتی رہی۔ پھر رخصت ہوتے رہے سلمان (نڈا کا منگسترا) نے خاص طور سے اس سے کہا کہ وہ یہ سارے ڈھنگ اپنی نند کو منور دے گئے۔ وہ بکے سے مسکرائی تھی۔

ہر طرف سے اپنا اطمینان کر لینے کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں آئی تو شہر و زاحمد پر بیٹھے کوئی بڑی دیکھنے میں مصروف تھے۔ (حقیقت میں اس کا انتظار کر رہے تھے)۔ وہ سیدھی ڈرلنگ روم کی چابی لے کر ڈرلنگ روم کے واپس آئی تو وہ اسی طرح بیٹھے تھے۔ وہ دل ہی دل میں ان کے یہاں بٹنے کا جواز سوچتی ہوئی ساری تپہ کر کے ہینگر پر لٹکانے لگی۔ یہ کام بھی ہو گیا اور جب مصروف رہنے کوئی بہانہ نہ رہا تو مجبوراً ان کی طرف متوجہ ہونا پڑا اور وہ تو اسی انتظار میں تھے۔ سیکڑیں ایک طرف ہ کر پوچھنے لگی۔

”فادرش ہو گئیں آپ؟“ اس نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

”یہاں آکر بیٹھیں۔“ انہوں نے قریب والے صوفے کی طرف اشارہ کیا تو وہ خاموشی سے چلتی ہوئی ہیں جا بیٹھی۔ بند مٹھی ہونٹوں پر ہلے وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتے رہے، پھر اطمینان سے سنانے ہی میں پرتائیں سیدھی کرتے ہوئے بولے۔

”میں یہ معلوم کرنا چاہ رہا ہوں کہ صبح فون پر آپ کیا کہہ رہی تھیں؟“

”میرے خدا۔ جس بات کا ڈر ہو، وہ ضرور ہو کر رہتی ہے۔ کیا تھا جو وہ صبح والا واقعہ بھول جائے۔“

”نہ سوچا۔“

”بتائیے۔ کس کے حقوق کی بات کر رہی تھیں، میرے یا اپنے؟“

اس کے خاموش رہنے پر کہنے لگی۔ ”میں واقعی اس وقت بہت مصروف تھا آپ کی بات ڈھنگ سے سن نہیں سکا۔“

اُن کے بچے میں خفگی نہیں تھی بلکہ دوستانہ انداز تھا۔ اور اس کی بات نہ سن سکنے کا تھوڑا املاں بھی۔ ”آئی ایم سوری شہر و زاحمد۔“ وہ بمشکل اپنے آپ کو بولنے کے قابل بنا سکی۔ ”میں نے غلطی نہیں کی بنا۔ آپ کو رنگ کر لیا تھا۔“

”کیسی غلط فہمی؟“ وہ صاحت طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔

”میرا خیال ہے اب جب کہ غلط فہمی نہیں رہی تو اُسے دہرانے سے کیا فائدہ؟“

”پھر بھی میں جانتا چاہوں گا۔“ وہ بضد تھے۔

”اور میں بتانا نہیں چاہتی۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں کہتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔

”ربیع۔“

”کیونکہ وہ نہیں بیٹھی۔“ رخ موڑتے ہوئے بولی۔

”مجھے نیند آ رہی ہے۔“

”اچھا۔“ وہ کھڑے ہو گئے۔ ”ایک بات بتائیں، ایما نداری سے۔ کیا میری کسی بات نے آپ کو دکھ

پہنچایا ہے؟  
”نہیں۔“ وہ اُن کی طرف دیکھ کر بغیر بولی۔

”کچھ خفا لگتی ہیں؟“  
”نہیں شہر و زاحمد۔“ وہ اُن کی طرف پلٹی۔ ”میں کبھی کسی سے خفا نہیں ہوتی۔ اپنی اب تک کی زندگی میں کبھی کسی سے نہیں روٹی۔ پتا نہیں کیوں ہمیشہ مجھے ایسا لگا اگر میں روٹی لگتی تو کوئی مٹا نہیں پاتا۔ آپ کو بھی شہر و زاحمد۔ اس کچھ وقت کے ساتھ میں خیال رکھنا ہے کہ۔“  
”مجھے خبر خاموش رہ کر وہ بولی۔  
”مجھے تو ٹھننے نہ دینا۔“



”میں نہیں کیوں روٹھنے دوں گا جھلا؟“ انہوں نے سوچا۔ کوئی اپنی متاع عزیز کو خفا نہیں کر سکتا اور سے خفا ہو سکتا ہے۔ وہ کچھ اور بھی سوچتے کہ وہ بولی اور اُس کی آواز اُن کی سوچوں کو توڑ گئی۔  
”اگر آپ کہیں تو میں اسٹڈی میں چلی جاؤں۔“ وہ انہیں جلنے پر آمادہ نہ دیکھ کر کہنے لگی۔

”کیوں؟“  
”آپ کو وہاں دقت ہوتی ہوگی۔“

”نہیں۔ اوکے۔ شب بخیر۔“

وہ اس خیال سے کہ کہیں وہ اصرار نہ کرنے لگے، جلدی سے شب بخیر کہہ کر چلے گئے۔  
وہ بھی سونا چاہتی تھی۔ اتنے دنوں بعد آج کا دن مصروف گزارا تھا۔ اور مصروفیت نے تصور عطا کی تھی۔ دل چاہا کہ بیک پر سر رکھے اور پل میں غافل ہو جائے لیکن بیڈ پر جانے کو دل نہیں چاہا۔ اچانک احساس ہونے لگا تھا کہ وہ کسی دوسرے کے بیڈ روم پر قابض ہو گئی ہے یہاں کی کوئی چیز اس کا نہیں۔ وہ زبردستی کی مہمان ہے اور شاید بن جائے گی۔

آہستہ روی سے چلتی ہوئی وہ کھڑکی کے پاس اکھڑی ہوئی۔ لان میں اتری چاندنی نے اسے فوراً کو دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ آسمان کے سینے پر جگمگاتے ستاروں کے درمیان پورا چاند کا منہ پراچی چاند کے کمرے میں شادان و فرحان تھا۔ اُس کی نظریں چاند کے اندر کسی کا عکس تلاش کرنے لگیں۔ کتنی دیر گزر گئی۔ آنکھیں دھکنے لگیں۔ لیکن وہ جسے تلاش رہی تھی، وہ کہیں نہیں ملا۔ نہ پورے میں اس کا عکس چھلایا اور نہ ستاروں کے جھرمٹ میں۔ وہ پریشان ہو گئی۔

”میرے خدا۔ میرے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ انتہائی دکھ کے احساس میں گھر کر اُس سوچا۔

”یہ کون سا راستہ ہے جہاں سے پلٹ کر دیکھنے پر کوئی نظر نہیں آتا ہے۔ نہ سامنے۔ کس سمت کے آواز دوں؟ کسے نکالوں؟“ آنکھوں میں ہنسی اتری تو ہر شے دھندلا گئی۔

گھر پر پیشانی ٹیک کر پلکیں موندیں تو آنکھوں میں ٹھہری ہنسی، چپ چاپ رخساروں پر اتر آئی۔ لمحے سرکتے رہے۔ چپ چاپ، بن آہٹ کے۔ کہیں کوئی آواز نہیں تھی۔ کوئی ہمدرد نہیں، غمگسار نہیں۔

کاش۔ کوئی تو ہو جو پکوں سے بے آواز ٹوٹتے موتیوں کو محسوس کر کے چلا آئے۔ نرمی سے پوچھتے۔

”کیوں روتی ہو؟“

”تمہارے آنسو اتنے ارزاں نہیں ہیں، انہیں بول مت لٹاؤ۔“

لیکن کون تھا جبے آواز آنسوؤں کا سبب پوچھتا۔ اُس نے خود ہی سارے آنسو اپنے دامن میں لیے اور تھکے تھکے قدموں سے صوفے پر آ بیٹھی۔ پتا نہیں ذہن تھکا ہوا تھا یا دل آزرہ کہ کوئی اچھی با

ہئی۔

مختلف اندیشے، مختلف وسوسے جو آہستہ آہستہ دل میں جگہ بناتے جا رہے تھے اور بے شمار سوالات اس کے اپنے متعلق تھے اور جن کے جواب ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ سو گئی تھی۔

صبح معمول کے مطابق اُس کی آنکھ نہیں کھلی۔ جس وقت شہر وز آٹھ کر آئے، وہ بے خبر سو رہی تھی۔ انہوں نے اٹھا نا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے بھی آج پچھی کا دن تھا۔ وہ کوئی آواز پیدا کیے بغیر کمرے سے نکل آئے۔ حسب معمول لان میں کچھ دیر چل قدمی کرتے رہے۔ آج مہر و ز آٹھ کر نہیں آیا تھا۔ شاید چھٹی کی وجہ سے باہر۔ انہوں نے اُس کے کمرے کی بند کھڑکی کو دیکھا، پھر اندر چلے آئے۔

خانا ساماں چائے لے کر آ رہا تھا۔ انہوں نے روزانہ کی طرح لاؤنج میں بیٹھ کر چائے پی۔ ساتھ ساتھ اخبار دیکھتے رہے۔ اس دوران اتنی اور پھر مہر و ز بھی اپنے کمرے سے نکل آیا۔ نڈا آئی تو سیدھی کچن میں چلی گئی۔ ربیعہ نہیں آئی۔ ”اُمی انہیں مخاطب کر کے پوچھنے لگیں۔

”نہیں۔ اور میں نے اٹھایا بھی نہیں۔“ وہ اخبار تہہ کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے بولے۔  
”اچھا کیا نہیں اٹھایا۔ شاید کل کی مصروفیت نے اسے تھکا ڈالا۔“ قدرے توقف کے بعد وہ کہنے لگیں۔  
”تنگ اور سعادت مند لڑکی ہے۔ کبھی کسی کام کو منحرف نہیں کرتی۔ کل سارا دن مجال ہے جو اس کے ماتھے پر ہی شبنم بھی آئی ہو۔ یہ یقیناً ہماری خوش نصیبی ہے کہ ربیعہ جیسی لڑکی اس گھر میں آئی ہے۔“

”بھائی جان کی پسند کو داد دیجیے اُمی۔“ مہر و ز شرارت سے بولا۔  
”شہر و ز کی پسند ہمیشہ سے ہر معاملے میں اچھی رہی ہے۔“ اُمی مسکرا کر کہنے لگیں تو وہ اپنی جگہ پہلو بدل گئے۔

”کل نرا کے سسرال والے بھی بہت تعریف کر رہے تھے۔“  
”اتنی بات پر انہیں موضوع بدلنے کا ہانا مل گیا کیوں بولے جیسے ان ہی کی بات پر نہیں یاد آیا ہو۔“  
”ہاں اُمی۔ پھر نڈا کے بارے میں آپ کیا کہتی ہیں؟“

”میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔ اس کے سسرال والے تو اب جلدی شادی کرنا چاہتے ہیں جب کہ خیال تھا، بعد اُن کم امتحان تو دے لے۔“

”نڈا کے امتحان کوئی بہت زیادہ دور تو نہیں ہیں۔ یہی کوئی تین چار مہینے ہیں۔ اور اتنا عرصہ تو شادی کی ہی میں بھی لگ ہی جاتا ہے۔ آپ ان سے کہہ دیں جیسے ہی نڈا امتحانوں سے فارغ ہوگی، ہم شادی کر دیں گے۔“

”نڈا نے کل بھی ان سے یہی کہا تھا لیکن پتا نہیں ان لوگوں کو کس بات کی جلدی ہے۔“  
”میں ایک بار پھر اُن سے بات کر کے انہیں قائل کرنے کی کوشش کروں گا۔ اور میرا خیال ہے، وہ ہماری نمانا لیں گے۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔ ”اس دوران اگر مہر و ز کی بھی کہیں بات ہو جائے

۔“  
”ہاں میری اپنی بھی یہی خواہش ہے کہ ساتھ ساتھ مہر و ز کی شادی بھی کر دیں۔“ اُمی نے فوراً ان کی تائید کی۔  
”پھر کوئی لڑکی دیکھی آپ نے؟“

”لڑکیاں تو کئی دیکھی ہیں بیٹا اور سب ہی ماشاء اللہ بہت اچھی ہیں لیکن میں جو چاہتی ہوں وہ۔“ اُمی مڑھ کر پتا نہیں کیا سوچنے لگیں۔

”آپ کیا چاہتی ہیں؟“ وہ پوچھنے لگے۔  
”میں شاید ربیعہ جیسی لڑکی ڈھونڈتی ہوں۔“

”بھائی جیسی لڑکی ڈھونڈتی ہے تو۔“ مہر و ز بے اختیار بولا اور پھر فوراً خاموش بھی ہو گیا۔  
”ہاں ہاں کہو۔“ خاموش کیوں ہو گئے؟ ”شہر و ز چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے اور اُسے جھینپتے دیکھ

اسے حوصلہ دینے کی غرض سے بولے۔



”کمال ہے یار۔ بات تمہاری شادی کی ہے اور تم تمہارا ہی مشورہ نہیں لے رہے۔ میرا خیال ہے بلا مجھ اپنی پسند بتا دو۔“

”میں۔۔۔؟ وہ سر کھجائے لگا۔

”کم آن مہروز۔ اتنی بالکل اعتراض نہیں کریں گی۔“ شہروز نے پراس کا حوصلہ بڑھایا۔

”میں بھائیوں اعتراض کروں گی؟ کیا شہروز کی پسند پر اعتراض کیا تھا میں نے؟ اور پھر بھٹیا، تم تو میرا مسئلہ حل کر رہے ہو۔ جلدی بناؤ۔“

”اتنی بات پر کچھ حوصلہ ہوا تو کہنے لگا۔“ اصل میں کل اچانک ایک لڑکی اچھی لگی؟

”یہ حادثہ اچانک ہی ہوا کرتا ہے۔“ شہروز ہنسنے لگا۔ ”تم کچھ اتنا پتا بھی تو بتاؤ۔“

”آپ لوگ جانتے ہیں۔“

”ہم تو بہت سارے لوگوں کو جانتے ہیں۔ اب ہمیں کیا معلوم کہ تم کس کی بات کر رہے ہو؟“

”میں بھائی کی بہن کی بات کر رہا ہوں غالباً اُن سے بڑی ہیں۔“

”مہروز سر جھکا کر کہہ رہا تھا۔ چاہتا تھا اپنی بات کا رد عمل دیکھے لیکن فوراً سر نہ اٹھا سکا۔

”کون صوفیہ؟“ ان کی آواز میں حیرت کا عنصر نمایاں تھا۔

”میں نام نہیں جانتا۔“ اُس نے لاعلمی ظاہر کی۔

”تم نے کہاں دیکھا اسے؟“

”کل جب بھائی کو لینے اُن کے گھر گیا تھا۔“

”شہروز اس پر سے نظر ہٹا کر اتنی کی طرف دیکھنے لگے۔ اور پھر کتنی دیر تک ان دونوں میں سے کو کچھ نہ بول سکا۔ پھر وہ خود ہی کہنے لگا۔

”آپ بھائی جیسی لڑکی چاہتی ہیں جو اس گھر کے پرسکون ماحول کو برقرار رکھے تو ایسی لڑکی آپ کو اور کب ملے گی۔“

”کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا۔“ آپ کہیں گی، میں نے شاید لڑکی کو ٹھیک طرح سے دیکھا؟ تو میں نے اُسے دیکھا ہے۔ چلتے ہوئے بھی۔ اس کے پیر میں شاید نقص ہے۔ وہ چلتے ہوئے ذرا ٹنگڑا رہتی ہے۔“

”تمہیں اس سے ہمدردی ہوئی ہوگی۔ اتنی بڑی دیر بعد بولیں۔

”نہیں۔“ وہ فوراً بول پڑا۔ ”محض ہمدردی کی بنا پر میں اتنا بڑا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اور یہ فیصلہ میں اسی وقت نہیں کیا تھا۔ وہاں سے آتے کے بعد ہر پہلو سے سوچا، اس کے بعد میں نے فیصلہ کیا تھا۔“

”اقتسام پر وہ اتنی کی طرف دیکھنے لگا۔ تو وہ کہنے لگیں۔

”بھٹیا۔ مجھے تمہاری پسند اور تمہارے فیصلے سے کوئی اختلاف نہیں اور نہ اعتراض ہے۔ پھر بھی میں

”گی کہ تم توجواں ہو، جذباتی بھی ہو سکتے ہو۔ اور جذبات میں کیے گئے فیصلے بایر انداز نہیں ہوتے۔ بہتر۔

”کہ تم کچھ وقت اور سوچ لو۔“

”مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اگر آپ کو اختلاف ہو یا اعتراض، تو آپ بخوشی میری پسند

”ریجیکٹ کر سکتی ہیں۔ میں قطعی برائیاں مانوں گا اور آپ جہاں کہیں گی وہیں شادی بھی کر لوں گا۔ اس۔

”برعکس اگر میری پسند کا سوال اٹھائیں گی تو میں نہ صرف آج بلکہ آئندہ بھی جب کبھی آپ مجھ سے پوچھیں

”اسی کا نام لوں گا۔“

”اس کی بات پر اتنی کچھ دیر تک سوچتی رہیں پھر شہروز سے پوچھنے لگیں۔

”تم کیا کہتے ہو؟“

”میں کیا کہوں؟ وہ اُلٹا اُن ہی سے پوچھنے لگے۔

”میرا مطلب ہے، تمہارا وہاں آنا چاہتا ہے۔ تم نے اس لڑکی کو کیا پایا؟“

”میں وہاں بہت تو نہیں جاتا۔“ وہ دامن بچاتے ہوئے بولے۔ ”بہر حال آپ خود سوچ سکتی ہیں کہ ایک

”ہی گھر میں اور ایک ہی ماحول میں پروان چڑھنے والی لڑکیاں بہت زیادہ مختلف تو نہیں ہوں گی؟“ قدرے توقف

”کے بعد کہنے لگے۔

”ویسے اچھی لڑکی ہے۔ میں ذرا احساس کمتری کا شکار ہے۔“

”یہ احساس کمتری ان لوگوں نے بخشا ہوگا جو اسے دیکھ کر یہ جھجکت کر دیتے ہوں گے۔ محض ذرا نقص

”کی بنا پر۔“

”مہروز کی بات پر اتنی ہلکے سے مسکرائیں۔ جان گئی تھیں کہ اُس کے پاس ہر بات کا جواب موجود ہوگا۔

”بہر حال بھٹیا۔ مجھے خوشی ہے کہ تم اس نقص کے ساتھ اسے قبول کر رہے ہو اور ایک بات یاد رکھنا کہ

”زندگی میں کبھی تم نے اس نقص کی بنا پر اُس کی دل آزاری کی تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔“

”ایسا کبھی نہیں ہوگا اتنی۔“ وہ ان کے کندھے پر سر رکھا کر بولا۔

”پھر یہ سلسلہ کب شروع کر رہی ہیں؟“ شہروز اتنی کو رضامند دیکھ کر پوچھنے لگے۔

”ایک کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔“ مہروز کے فوراً بولنے پر شہروز اور اتنی بے ساختہ ہنس پڑے۔ اسی

”وقت بڑا ناشتہ کے لیے بلانے آگئی۔ تو اتنی اس سے کہنے لگیں۔

”بھٹیا۔ اپنی بھائی کو بھی اٹھا دو۔ ناشتا ہمارے ساتھ کرے، پھر بے شک سو جائے۔“

”بڑا سر ہلاتی ہوئی چلی گئی۔ وہ اٹھ چکی تھی۔ اور اب کمرے سے نکلنے ہی والی تھی کہ نڈا کو دیکھ کر معذرت

”کرتی ہوئی بولی۔

”سوری۔ مجھے اُٹھنے میں کچھ دیر ہوگئی۔“

”زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ ہم لوگ بھی اب ناشتا کرنے جا رہے ہیں۔“

”اچھا۔“ وہ گھڑی دیکھتے ہوئے نڈا کے ساتھ آگئی۔ پھر ناشتے کے دوران مہروز اُسے مخاطب کر کے

”کہنے لگا۔

”بھائی، آج اتنی آپ کے گھر جا رہی ہیں۔“

”میرے گھر؟“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”میرا مطلب ہے آپ کے ٹیکے۔“ وہ اُس کے سوال کا جواب دیتا ہوا بولا۔

”اچھا۔“ وہ اچھا کہہ کر چپ ہو رہی۔

”کیا بات ہے؟“ آپ پوچھیں گی نہیں، کس لیے؟“ شہروز کے ٹوکنے پر پہلے اُس نے اُن کی طرف

”دیکھا پھر مہروز اور نڈا پر سے ہوتی ہوئی اُس کی نظر میں اتنی پر جا بھاہیں۔

”بھٹیا۔ میں تمہاری بہن صوفیہ کے لیے جانا چاہتی ہوں۔“

”پھوٹی آپا کے لیے؟“ اُس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی اور فوری طور پر اتنی کی بات کا مطلب سمجھ

”میں نہیں آیا۔

”ہاں، لیکن پہلے یہ بتا دو وہ کہیں منسوب تو نہیں؟“ فوراً اُس کی سمجھ میں آگیا۔ نفی میں سر ہلاتی ہوئی بولی۔

”نہیں۔ لیکن آپ کس لیے جانا چاہتی ہیں؟“

”ظاہر ہے، اب اس گھر میں صرف مہروز ہی رہ گیا ہے۔“

”مہروز۔“ اُسے بالکل یقین نہیں آیا۔ اور یقین آتا بھی کیسے، اتنے معمولی معمولی لڑکے انہیں یہ جھجکت کر

”چکے تھے۔ تصدیق کے لیے کبھی مہروز کی طرف دیکھی، کبھی شہروز کی طرف۔ وہ اس کی کیفیت سمجھ گئے کہ وہ

”غیر یقین سی ہے اور اس خیال سے کہ کہیں اس کے منہ سے کوئی غلط بات نہ نکل جائے۔ ٹیبل کے نیچے اُس کے

”پیر کو اپنے پیر سے دبا کر سنبھلے کا اشارہ کیا اور وہ فوراً سنبھل بھی گئی۔

اتماں حیران تھیں کہ ابھی دور در پہلے ہی تو انہوں نے اس سے کہا تھا کہ شہر وز سے یا اپنی ساس سے کہے  
روہ اپنے ملنے جلنے والوں میں صوفیہ کے لیے کوئی لڑکا دیکھیں اور اب اتنی جلدی وہ اپنی پوری کسرال کے  
ساتھ موجود تھی۔ وہ بھی کسی اور کا نہیں، مہر وز کا رشتہ لے کر۔ اور اس سے بڑی خوشی اتماں کے لیے کیا ہو سکتی  
تھی۔ لیکن کیونکہ ایسے موقعوں پر وہ کمال ضبط کا مظاہرہ کیا کرتی تھیں۔ اس لیے اب بھی تحمل سے کام لیا۔  
چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے ابامیاں بھی اس وقت موجود تھیں اور اس سے پہلے کہ ابامیاں کے منہ  
سے صوفیہ آپ ہی کی بیٹی ہے " قسم کا کوئی جملہ نکلتا، اماں فوراً بول پڑیں۔  
"گو کہ ہمیں سوچنے کی ضرورت تو نہیں ہے کیونکہ ہماری بیٹی ربیعہ آپ کے گھر میں ماشاء اللہ خوش و خرم  
ہے۔"

"اشاء اللہ صوفیہ بھی خوش و خرم رہے گی، اتی نے فوراً جواباً کہا۔  
"اس میں کوئی شک نہیں۔ پھر بھی ہم صوفیہ کے رائے لے لیں، پھر کوئی جواب دے سکیں گے۔" اتماں  
نے آئندہ پر بات ٹالی۔  
"آپ ابھی ساس سے پوچھ لیں۔ میں منہ میٹھا کر کے ہی جاؤں گی۔" اتی اطمینان سے بیٹھ گئیں کیونکہ انہیں  
مہر وز کے لیے اس گھر کے علاوہ اور کہیں نہیں جانا تھا۔ اتماں نے ابامیاں کی طرف دیکھا تو وہ ربیعہ سے کہنے  
لگی۔

"جاؤ بیٹا۔ تم بہن سے بات کر لو۔"  
وہ اٹھ کر کچن میں آگئی جہاں چھوٹی آپا چائے بنانے میں مصروف تھیں۔ اسے دیکھتے ہی کہنے لگیں۔  
"بس چائے تیار ہے۔ میں ابھی لے کر آرہی ہوں۔"  
"آپ کو چائے لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ شرمیلے مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔  
"کیوں؟"

"اس لیے کہ اندر آپ کے کسرال والے آئے ہوئے ہیں۔"  
"کیا مطلب؟" اور کون آیا ہوا ہے؟" چھوٹی آپا ایک دم اس کی طرف دیکھنے لگیں۔  
"اور کوئی نہیں ہے۔ اتی، شہر وز اور نرہا ہیں۔" پھر آواز دھبی کر کے بولی "یہ سب آپ کو مہر وز کے لیے  
مانگے آئے ہیں۔"  
"کیا؟" چھوٹی آپا کے منہ سے چیخ نکل آواز نکلی۔

"چھوٹی آپا پلنر۔" وہ کہنا چاہتی تھی، آہستہ بولیں۔ لیکن چھوٹی آپا آہستہ تو کیا بولتیں۔ اسے اپنے سامنے  
سے دھکیلتے ہوئے اندر چلی گئیں۔ وہ ان کے پیچھے بھاگی لیکن دروازے ہی میں اس کے قدم رگ گئے۔  
چھوٹی آپا کو پتا نہیں ابامیاں کی موجودگی کا علم تھا کہ نہیں براہ راست اتی کو غائب کر کے کہنے لگیں۔  
"بگم صاحبہ آپ کو شاید معلوم نہیں ہے کہ میں لنگڑی ہوں۔ میں چلتی ہوں تو لوگ میرا مذاق اڑاتے  
ہیں اور اکثر کو تو میرا نام بھی معلوم نہیں کیونکہ ان میں، میں لنگڑی مشہور ہوں۔"

"بیٹا۔ یہاں آکر میرے پاس بیٹھو۔" اتی نے چھوٹی آپا کی باتوں کا بالکل برا نہیں منایا بلکہ محبت سے  
اپنے پاس بلانے لگیں۔ جبکہ اتماں کے ساتھ ابامیاں بھی پتا نہیں شدید شک میں تھے یا انہیں سکتہ ہو گیا  
تھا۔ حیرت سے آنکھیں اور منہ کھولے چھوٹی آپا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور چھوٹی آپا اتی کے بلانے پر  
ان کے پاس جانے کے بجائے دو قدم پیچھے ہٹتی ہوئی بولیں۔

"مجھے ہمدردی نہیں چاہیے۔ کوئی ضرورت نہیں ہے مجھ پر ترس کھانے کی۔ اپنے بیٹے پر رحم کھائیں، آخر  
کیا سوچ کر آپ یہاں آئی ہیں؟"  
صوفیہ۔ "ابامیاں اچانک ہوش میں آگئے اور انہیں سمرن نش کرنا چاہتے تھے لیکن انہوں نے موقع ہی نہیں  
دیا۔

"تم کچھ کہو گی نہیں؟" اتی پوچھنے لگیں۔  
"میں کیا کہوں اتی۔ آپ بہتر سمجھتی ہیں۔" وہ ابھی تک گو گو کا شکار تھی۔  
"بھائی، آپ ہمیشہ ہر معاملے میں دامن بچا جاتی ہیں، ندانے پھینچا۔ ویسے اس نے حقیقت بیان کی تھی۔  
"میں دامن نہیں بچا رہی۔ بس اس معاملے میں کوئی رائے نہیں دے سکوں گی؟" اس کے ساتھ ہی وہاں سے  
اٹھ کر چلی آئی۔ اپنے کمرے میں آکر ابھی وہ اس ساری بات کو نئے سرے سے سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ  
شہر وز آگئے۔  
"کیا حرکت تھی؟" قدرے ناگواری سے پوچھنے لگے۔  
"کون سی؟" وہ واقعی نہیں سمجھی۔  
"اس طرح وہاں سے اٹھ کر کیوں چلی آئیں؟"  
"کیا مجھے نہیں آنا چاہیے تھا؟" وہ اٹنا ان ہی سے پوچھنے لگی۔  
"عجیب لڑکی ہیں آپ۔ اتی ایک اہم موضوع پر بات کر رہی تھیں اور آپ کے اٹھ کر آنے سے وہ پتا نہیں  
کیا سمجھنے لگیں۔"  
"تک۔" کیا سمجھنے لگیں؟"  
"یہی کہ آپ کو صوفیہ کے لیے مہر وز پسند نہیں۔"  
اس کے خاموشی سے دیکھنے پر کہنے لگے۔ "کیا واقعی ایسا ہے؟"  
"نہیں تو۔"  
"پھر؟"  
"پھر میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔" وہ الجھی الجھی سی بولی۔  
"کیا سمجھ میں نہیں آ رہا؟" سیدھی سی بات ہے کہ آج ہم صوفیہ کے لیے مہر وز کا پروپوزل کر جائیں  
گے۔"

"لیکن اتی شاید نہیں جانتیں کہ۔"  
"اتی بھی جانتی ہیں اور مہر وز بھی۔" وہ جان گئے تھے کہ وہ چھوٹی آپا کے نقص کی طرف اشارہ کرے گی، اس  
لیے اس کی بات کاٹ کر کہنے لگے اور وہ بے خیالی میں ان کی طرف دیکھنے لگی۔  
"اب بھی کوئی الجھن ہے؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ذرا سا مسکرائے تو اس نے اثبات میں  
سر ہلا دیا۔  
"وہ بھی کہہ ڈالے۔"  
"یہ سب نہیں ہونا چاہیے۔"  
"کیوں؟" وہ واقعی حیران تھے۔

"اس لیے شہر وز اور احمد کے میں یہاں کچھ وقت کی مہمان ہوں۔ اور یہ بات آپ بھی جانتے ہیں۔ ہمارا نا  
بندھن کچے دھلگے سے بھی کمزور ہے۔" ان کے ہونٹ بھینچنے پر رخ موڑتی ہوئی بولی۔  
"جس روز یہ ناتا ٹوٹنا ظاہر ہے کہ ٹوٹنا ہی ہے، اس سے چھوٹی آپا کی زندگی متاثر ہوگی۔"  
"ناتا ہمارا ٹوٹے گا۔ ان کی زندگی کیوں متاثر ہوگی؟"

"ظاہر ہے، وہ میری بہن ہیں۔ اور میرے ساتھ ہونے والی ہر بات ان کے لیے طعنہ بن جائے گی۔"  
"اپنے دل سے یہ خدشات نکال دیجیے ربیعہ بیگم۔ میں آپ پر ایسا کوئی الزام نہیں آنے دوں گا جو آپ  
کی بہن کے لیے طعنہ بنے اور پھر مہر وز اسے مضبوط بندھن میں باندھ کر لائے گا۔ کچے دھلگے سے نہیں  
اپنی بات کہہ کر وہ رُکے نہیں، فوراً کمرے سے نکل گئے تھے۔

”آپ سب لوگ میرے دشمن ہیں۔ میرا تماشا بنانا چاہتے ہیں لیکن میں کسی کو ایسا نہیں کرنے دوں گا مجھے نہیں کرنی شادی کسی سے بھی نہیں۔ آپ سب لوگ چلے جائیں یہاں سے۔“ چھوٹی آپا نے دونوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ شاید وہ رونے لگی تھیں۔ اسی طرح وہ چھوٹے کمرے میں چلی گئیں اور دروازہ اندر بند کر لیا۔

ایک دم سے خاموشی چھا گئی اور کتنی دیر تک کوئی کچھ بول ہی نہ سکا۔ اماں اور ابامیاں کی طرح وہ بھی تھی اور کسی سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں کر پاتی تھی۔

بہت خاموشی سے اٹھ کر وہ کچن میں آگئی۔ چائے بنی رکھی تھی۔ اس نے ٹی پاٹ اٹھا کر ٹرے میں پھر ٹرے اٹھا کر اندر آگئی۔ ابھی تک ویسی ہی خاموشی تھی۔ وہ میز کے پاس گھٹنے ٹیک کر پیالوں میں چائے لگی۔ شہرہ نے اتنی کی طرف دیکھتے ہوئے جانے کیا اشارہ کیا اور جواب میں ان کا اشارہ سمجھ کر اس سے قدرے اونچی آواز میں کہنے لگی۔

”ربیعہ۔ گھر میں کوئی سیٹھی چیز رکھی ہو تو وہ بھی لے آئیں۔ ہم سب منہ میٹھا کر کے جا رہیں گے۔“ اس نے ہڑ بڑا کر پہلے انہیں دیکھا پھر اماں کی طرف دیکھنے لگی۔ اماں کچھ نہ بول سکیں تو ابامیاں کہنے لگیں۔

”میری بچی نے جو کچھ کہا اس کے لیے میں بہت شرمندہ ہوں۔“ کوئی بات نہیں بھائی صاحب۔“ اتنی کہنے لگیں۔ ”یقیناً حالات نے اسے تلخ بنا دیا ہے۔ ہمیں با رہا نہیں لگا۔ اور ہم مایوس بھی نہیں ہوئے۔ آپ اللہ کا نام لے کر ہاں کر دیجیے۔ پھر آہستہ آہستہ اسے بھی لیجیے گا۔“

”تو کیا اب بھی؟“ اماں حیران تھیں۔

”ہاں۔ ہمارا دامن ابھی تک پھسلا ہوا ہے اور ہم بنالیے سمیٹیں گے بھی نہیں۔“

”ہم ہاں بھی نہیں اور وہی نہ ملنے پھر؟“

وہ مان جلنے لگی۔ جب اسے یہ یقین مل جائے گا کہ ہم واقعی اس کے طلب گار ہیں، خلوص دل اور اس کے ساتھ۔ ہم نے اس کی ذات کی اچھا نیوں کو پالیا ہے، جن کی روشنی سے ہم اپنے گھر میں اجالا کرتا ہیں۔“ اماں اور ابامیاں کے ساتھ ساتھ وہ بھی ان کی عظمتوں کے سامنے سر جھکا کر رہ گئی۔

”شہرہ بیٹا۔ ڈرا بیور سے کہہ دو، اچھی سی میٹھاٹی لے کر آئے۔“ انہوں نے ماحول پر چھائی افسردگی کرنے کی غرض سے مسکرا کر کہا تو وہ فوراً کھڑے ہو گئے۔

”میں خود لے کر آتا ہوں۔“ پھر جاتے جاتے اس سے کہنے لگے۔ ”ربیعہ، آپ ذرا دوبارہ چا۔ بنانے کی زحمت کر لیں۔“

”جی۔“ وہ فوراً برقع سینے لگی تو اتنی کے اشارے پر نہا بھی اس کے ساتھ مل گئی۔ پھر اس کے ساتھ کچن میں آئی۔ وہ بہت خاموش ہو گئی تھی۔ اور نہ اسے بھی نظریں ملانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ خاموشی سے چا کاپانی جو چپے پر رکھا اور چائے کے برتن دھو کر دوبارہ ٹرے میں رکھنے لگی۔

نڈانے چاہا کہ اسے مخاطب کرے لیکن وہ کچھ اتنی لائق سی نظر آ رہی تھی کہ وہ بار بار پس اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ اسی وقت ہما اس طرف آئی۔ ان دونوں کو کچن میں دیکھ کر کہنے لگی۔

”آپ! آپ یہاں کیا کر رہی ہیں اور یہ نڈا باجی کو بھی کام سے لگا دیا ہے مجھ سے کہا ہوتا۔“ اس کے خیال جیسے یہ بہت بڑی بات تھی۔

”بس چائے ہی تو بنانی تھی۔“ اس نے ٹی پاٹ میں کھولنا ہوا پانی ڈالتے ہوئے کہا۔

”اور یہ نڈا باجی کیا سوچیں گی؟“ اسے یہی فکر لاحق تھی۔

”میں کچھ نہیں سوچوں گی۔“ چلتے مسکراتے ہوئے اس کا گال تھپتھپایا۔ ”تم یہ بتاؤ، صوفیہ باجی کو

ہیں؟“

”چھوٹے کمرے میں۔“

”اس میں ان کے پاس جا سکتی ہوں؟“

”اس وقت نہیں۔“ ہما نہیں جانتی تھی کہ چھوٹی آپا کس بات پر رو رہی ہیں اس لیے نڈا کے سامنے بات بنانی ہوئی کہنے لگی۔ ”ان کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو، کوئی ایسی بات کر جائیں جو آپ کو بری لگے۔“

”ہاں نڈا۔ پھر کسی وقت آنا تو مل لیتا۔“ اس نے ہما کی تائید کی پھر شہرہ کے آنے پر ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔ انہوں نے میٹھاٹی کے ڈبے ان کی طرف بڑھا دیے۔ جوان کے ہاتھوں سے لیتے ہی اس نے نڈا ہما کے سامنے رکھے اور کھولنے کے لیے کہا۔ خود جلدی جلدی پلٹیں نکالنے لگی۔

”یہ میٹھاٹی کس خوشی میں آئی ہے؟“ ہما پوچھنے لگی۔

”تمہیں نہیں پتا۔“ نڈا اس کی بے خبری پر حیرت سے بولی۔

”دہلی۔“

”بھئی شہر ہوں بھائی اور صوفیہ باجی کی نسبت طے ہوئی ہے۔“

”کیا؟“ ہما کو یقین نہیں آیا۔ تصدیق کے لیے ربیعہ کی طرف دیکھنے لگی۔ اور اس کے اثبات میں سر ہلانے پر کندھے جھٹکتی ہوئی بولی۔

”تو چھوٹی آپا اس لیے رو رہی ہیں؟“

”حالانکہ یہ رونے کی نہیں، خوشی کی بات ہے۔“ نڈا کے کہنے پر وہ زور سے ہنس پڑی، پھر میں کھنڈ کو تھانوں“ کہتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔ اس نے ایک ٹرے نڈا کے ہاتھوں پر رکھی اور دوسری خود اٹھا کر اندر چلی آئی۔

اندر کا ماحول کافی حد تک خوشگوار ہو گیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے یہاں سے نکلتے ہوئے اس نے اماں اور ابامیاں کے چہرے پر جو شرمندگی کے بادل دیکھے تھے، وہ چھٹ چکے تھے۔ اور یقیناً یہ اتنی کا کمال تھا۔ اس نے ابامیاں سے اجازت لے کر میٹھاٹی کی پلیٹ اتنی کی طرف بڑھا دی۔ پھر خوشگوار ماحول میں سب نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔ اور جب اتنی جانے کے لیے اٹھیں تو اماں ایک بار پھر ان سے چھوٹی آپا کے رویے کی معافی مانگنے لگیں۔

”اماں۔ آپ ناحق شرمندہ ہو رہی ہیں۔“ شہرہ و اماں کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ غلطی ہماری ہے جو یوں ہم منہ اٹھائے چلے آئے ہیں۔ ہمیں ربیعہ کے توسط سے نہ صرف صوفیہ کی مرضی معلوم کرنی چاہیے تھی بلکہ آمادہ بھی۔ وانا چاہیے تھا۔ بہر حال آپ دل پر بوجھ مت ڈالیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

اتنی نے شہرہ کی تائید کی پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

”چلو بیٹا۔“ وہ اس وقت ان سب کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی۔ چاہتی تھی کسی بھی بہانے میں رگ جائے لیکن اتنی نے اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے باہر نکل گئیں اور پھر وہ چپ چاپ ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

رات میں وہ اس خیال سے جلدی کرے ہیں آگئی کہ شہرہ و موجود ہوں گے اور وہ ان سے چھوٹی آپا کے رویے کی معافی مانگ لے گی۔ دل پر ایک بوجھ تھا۔ گو کہ وہ اتنی اور نڈا کے سامنے بھی شرمندگی کا اظہار کر چکی تھی لیکن شہرہ سے معذرت بھی ضروری تھی۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو یقیناً اپنی انسلٹ محسوس کرتا۔ لیکن انہوں نے بڑی فراخ دل سے سارا الزام اپنے سر لے لیا کہ انہیں ہی چھوٹی آپا کی مرضی معلوم کرنی چاہیے تھی۔

اور اب اس کا بھی فرض تھا کہ ان کی بڑائی تسلیم کرتے ہوئے معافی کے چند الفاظ ہی کہہ دے لیکن شہرہ کے کمرے میں موجود نہیں تھے۔ اس نے اسٹڈی روم کی طرف دیکھا، دروازہ بند تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ اسے شرمندگی سے بچانے کے لیے ہی وہ اتنی جلدی کرے میں بند ہو گئے ہیں۔

کچھ دیر تک کچھ ٹی سوچتی رہی، پھر یوں ہی ادھر سے ادھر ٹپٹپٹے لگی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

ویسے بھی جب تک دل بو جھل تھا، نیند نہیں آتی تھی یہی بار رک کر بند دروازے کی طرف دیکھا۔  
 "کاش انہیں کوئی کام یاد آجائے۔ کوئی چیز بھول گئے ہوں۔ آتے ہی اٹھانے چلے آئیں۔ کوئی ضرور  
 کال آجائے۔ کچھ تو ہو۔" لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ اور اسے ہی اپنے اندر ہمت پیدا کرنی پڑی۔ بے آوازہ  
 سے چلتی ہوئی دروازے تک آئی۔ اور کچھ دیر کے لیے سانس روک کر دروازے سے کان لگائے یہ  
 کرنے کی کوشش کرنے لگی کہ آیا وہ سو رہے ہیں یا کوئی کام کر رہے ہیں۔

پھر اندر ہی سی آہٹ محسوس کر کے اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور دروازے پر ہلکی سی دستک  
 ڈالی۔ زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا، فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور اسے دیکھ کر ہلکی آواز میں پوچھنے لگے۔  
 "ایچی پلہلم؟" اس نے یونہی بے خیالی میں اثبات میں سر ہلا دیا تو وہ بعد دروازہ کھل کر کمرے میں  
 پہلے ادھر ادھر کا جائزہ لے کر اپنا اطمینان کیا، پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔  
 "کیا بات ہے؟"

"مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے لیکن پلیز پہلے آپ بیٹھ جائیں۔"  
 وہ کندھے آچکاتے ہوئے بیٹھ گئے اور سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر جمادیں۔ اب اس کی سہج  
 نہیں آ رہا تھا، بات شروع کس طرح کرے۔

"جو بھی بات ہے صبح کر لیجیے گا۔" وہ اسے گو گو کی حالت میں دیکھ کر اٹھنے لگے کہ اس نے روک  
 نہیں۔ اس طرح مجھے نیند نہیں آئے گی۔"

"اچھا۔" وہ بیٹھے۔ "اگر سونے کے لیے اپنی بات کہنی ضروری ہے تو جلدی سے کہہ ڈالیے۔"  
 "میں چھوٹی آپا کی وجہ سے بہت شرمندہ ہوں۔" وہ بھی جلدی سے کہہ گئی۔

"ربیع۔" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ "صدیقہ کا طرز عمل بالکل فطری تھا۔ ان کی جگہ کوئی اور یا میں ہی  
 تو ایسا ہی کرتا۔ یہ تو اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے، کوئی جان لیتا ہے اور کوئی جان نہیں پاتا۔ بہر حال آپ۔  
 دل پر بوجھ مت ڈالیے۔ میں نے اتنی یا اندامیں سے کسی نے آپ سے کچھ کہا نہیں ناں، تو پھر آپ کیوں  
 خوار خواہ شرمندہ ہو رہی ہیں؟"

اس کے خاموشی سے دیکھتے رہنے پر کہنے لگے۔

"میں جانتا ہوں، آئندہ بھی وہ ایسا ہی کریں گی اور اگر ہم اسے اپنی ہنگ محسوس کر کے وہاں جانا چھوڑ  
 دیں تو اس طرح مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ ہمیں انہیں سمجھانے کے ساتھ یہ یقین دلانا ہے کہ ہم ان پر ترس نہیں کھا  
 سکتیں آپ۔"

وہ اسی طرح خاموشی سے سر جھکے گاؤں۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے پھر اسٹیڈی روم میں جا  
 سے پہلے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولے تھے۔  
 "میرا خیال ہے اب آپ سو سکیں گی۔"

شہر و زاحمد نے بڑی آسانی سے کہہ دیا تھا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن اب اسے یوں لگ رہا تھا  
 دنیا کا مشکل ترین کام چھوٹی آپا کو سمجھانا ہے۔ اس واقعے کے کوئی ہفتہ بھر بعد وہ اتنی کے کہنے پر عرض اس  
 سلسلے میں اماں کے گھر رہتے آئی تھی کہ چھوٹی آپا کو اس رشتے پر رضا مند کر سکے۔

لیکن چھوٹی آپا تو اس کی شکل دیکھتے ہی منہ پھیر کر کہیں میں چلی گئیں۔ اسے بے حد دکھ ہوا۔ گمان میں  
 بھی نہیں تھا کہ چھوٹی آپا اس سے بھی ناراض ہو سکتی ہیں۔ اماں کی طرف دیکھا تو انہوں نے اشارے سے  
 کیا کہ فی الحال اسے نہ چھیڑو لیکن اسے چپ نہیں آیا۔

کچھ دیر اماں کے پاس بیٹھ کر بہانے سے کچن میں چلی گئی۔ چھوٹی آپا پٹری پر بیٹھی چاول چن رہی تھی۔

نے یوں ہی بنا پیاس کے ایک گلاس پانی پیا۔ پھر اندر ہی اندر ڈرتی ہوئی دوسری پٹری کھینچ کر ان کے  
 نہ بیٹھ گئی۔ چھوٹی آپا نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ بدستور اپنے کام میں مصروف رہیں۔

چھوٹی آپا۔ مجھے سے کیوں خفا ہے؟" اس کے پوچھنے پر انہوں نے غصے سے چاولوں کی رٹے ایک طرف  
 ہی اور اٹھتے کو تھیں کہ اس نے ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

چھوٹی آپا۔ پلیز میرا قصور بتائیں۔ میں نے کیا کیا ہے؟"

ایسا کیا دھڑک رہا ہے۔" وہ دانت پیستی ہوئی بولیں۔ "بہت شوق ہے میری اماں بننے کا۔ میں  
 نہ ہوں تو یہی شرم نہ آئی، اپنی سانس سے میرے لیے کما گئے ہوتے؟"

کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" وہ صدمے سے جیسے رو دینے کو تھی۔

اپنی ہی طرح جانتی ہو۔ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ کیا اس دن اماں تم سے یہ نہیں کہہ رہی تھیں کہ شہر و ز  
 سانس سے میرے لیے بات کرو اور دو ہی دن بعد تم ان سب کو لے کر آگئیں۔" غصے سے چھوٹی

باچہ لال ہو گیا تھا۔

یہ سب کچھ کہ اماں نے مجھ سے کہا تھا لیکن یقین کریں، میں نے تو ابھی کسی سے تذکرہ بھی نہیں کیا تھا  
 لوگ خود ہی یہ بات چھیڑ گئے۔"

"چھوٹ بولتی ہو تم۔" وہ سختی سے اپنی بات پر قائم رہتے ہوئے بولیں۔

جو جاہلی قسم لے لیں اور پھر آپ ہی سوچیں، کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ادھر میں بات کروں اور ادھر وہ  
 تیار ہو جائیں؟"

تم نے منت کی ہوگی یا اپنا حق استعمال کیا ہوگا۔"

حق۔ کیسا حق؟" میرا کوئی حق نہیں ہے ان پر۔" وہ بلا ارادہ ہی کہہ گئی اور شکریہ چھوٹی آپا نے اس  
 ت پڑی نہیں کہنے لگیں۔

چھوٹی آپا ہوا اس گھر کی اور میں جانتی ہوں وہ لوگ تمہاری بات نہیں مانتے؟"

"ٹھیک ہے، وہ میری بات نہیں مانتے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ادھر میں منہ سے بات نکالوں اور  
 راپڑی کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ آخر کچھ وقت تو سوچنے میں بھی لگتا ہے۔"

تم کچھ بھی کہہ لو ربیع۔ میں نہیں مانوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارے کہنے پر یہاں آئے ہیں ورنہ  
 بے بیٹے کے لیے رٹکیوں کی کیا کمی؟"

چھوٹی آپا۔" وہ رونے لگی۔ "آپ بے شک ہامی نہ بھریں لیکن مجھے الزام تو نہ دیں۔ بخدا میں نے آج تک  
 گھر کا کوئی چھوٹا سا مسئلہ بھی شہر و زاحمد کے سامنے نہیں رکھا۔ آپ میرا یقین کریں میں کبھی بھی ان سے یا

سے آپ کے بارے میں بات نہیں کر سکتی تھی۔"

پھر انہیں کیا باؤلے کتنے کاٹا ہے کہ اچھی جھلی رٹکیوں کو چھوڑ کر مجھے لنگڑی کے لیے چلے آئے؟" وہ  
 مدد کے لیے میں بول رہی تھیں۔

خدا کے لیے چھوٹی آپا۔ اپنے آپ کو اس طرح مت کہا کریں، مجھے بے حد تکلیف ہوتی ہے۔" وہ اور  
 سے رونے لگی۔ "میرے بس میں ہوتا تو میں اپنی ٹانگ کاٹ کر آپ کے لگا دیتی۔"

ربیع۔" اب ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ یوں بلک بلک کر روئے اور چھوٹی آپا پتھر جی پیٹھی رہیں۔ اس  
 نصیب پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگیں۔ "اس طرح تو مت رو۔"

پھر کیا کروں؟" آپ میرا یقین جو نہیں کر رہیں۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"یقین دلانے کے لیے رونا ضروری ہے کیا؟" وہ بھی زچ کر دیتی تھیں۔

پھر اور کون سا طریقہ اختیار کروں؟" وہ سادگی سے پوچھنے لگی۔

مزید کوئی طریقہ مت آزماؤ۔ میں مان لیتی ہوں کہ تم نے کچھ نہیں کہا ہوگا۔" چھوٹی آپا کے سپاٹ لبو پر

وہ آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔  
 آپ میرا دل رکھنے کی خاطر ایسا کہہ رہی ہیں؟

”نہیں بھئی۔ میں نے تمہارا یقین کر لیا ہے۔ لیکن پلیز اب اس موضوع پر کوئی بات مت کرنا۔ اگر ایسے فی الحال ہی بہت تھا کہ چھوٹی کیا اس کا یقین کر کے اب خفا نہیں رہی تھیں۔ اس نے سوچا پھر کسی ان کا موڈ خوشگوار دیکھ کر بات کرنے کی کوشش کرے گی۔ دوپٹے کے پلو سے چہرہ صاف کرتی ہوئی برتنے کی غرض سے پونچھنے لگی۔

”کیا پکانے جا رہی تھیں؟“  
 ”ہاں چاول۔ لیکن اب تم آگئی ہو تو کچھ اور۔“  
 ”نہیں بھئی۔ میں تو دال چاول ہی کھاؤں گی۔“ وہ فوراً بول پڑی۔  
 ”شہر وڑ بھائی نہیں آئیں گے؟“  
 ”اس وقت تو نہیں آئیں گے۔ اور شام میں بھی آتے ہیں تو کون سا کھانے کے لیے رگ جاتے ہیں؟“  
 ”چھوٹی آپا کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہیں، پھر دوبارہ چاول کی ٹرے اٹھاتی ہوئی کہنے لگیں۔

”اچھا۔ اب تم اندر جا کر بیٹھو۔“  
 ”نہیں، میں یہیں ٹھیک ہوں۔ لائیے چاول میں چُن دیتی ہوں۔ آپ جب تک دال چڑھالیں، اُپر چھوٹی آپا کے منہ کرنے کے باوجود چاول کی ٹرے ان کے ہاتھوں سے لے لی۔ پھر کھانا کھنے تک وہیں رہی اور اُن کے ساتھ ہی اندر آئی تھی۔

”شام میں شہر وڑ آئے۔ حسب سابق کچھ دیر بیٹھے۔ بس ایک فرض جو ان کے خیال میں انہیں بچانا تھا لیا۔ اس دوران چھوٹی آپا ان کے سامنے نہیں آئیں اور پہلی بار ایسا ہوا کہ انہوں نے ان کے بارے میں بھی نہیں۔

پتا نہیں انہیں خیال نہیں آیا یا جان بوجھ کر نظر انداز کر گئے تھے۔ اس وقت اُس نے بالکل دھیان دیا۔ کہ ہمیشہ تھوڑے وقت میں بھی ہر ایک کے بارے میں پونچھنے والے اس وقت چھوٹی آپا کو کیسے لگا کر گئے ہیں۔ وہ تو جب رات کو سونے کے لیے لیٹی تو چھوٹی آپا خود ہی اس سے پونچھنے لگیں۔

”سنتو شہر وڑ بھائی میرے بارے میں پونچھ رہے تھے؟“  
 ”نہیں۔ بے خیالی میں اُس کے منہ سے پرج نکل گیا لیکن پھر فوراً سنبھلتے ہوئے بات بدلنے کی کوشش کرنے لگی۔ اصل میں آج وہ بہت غصہ میں تھے۔ آپ نے دیکھا نہیں کتنی جلدی آتے کر چلے گئے۔“  
 خیال آیا تو پونچھنے لگی۔  
 ”لیکن چھوٹی آپا۔ آپ تو ان کے سامنے آئی ہی نہیں۔ کہاں تھیں آپ؟“  
 ”میں اندر ہی تھی۔“ وہ دبے لہجے میں بولیں۔  
 ”کیا شہر وڑ سے بھی خفا ہیں؟“  
 ”میں ان سے خفا نہیں ہوں بلکہ شرمندہ ہوں۔“  
 ”کیوں؟“ ربیعہ نے انجان بن کر پوچھا۔  
 ”اس روز میں نے بہت بدتمیزی کا مظاہرہ کیا۔ پتا نہیں، وہ کیا سوچتے ہوں گے؟“ وہ اپنے آپ کو کچھ کہنے سے باز رکھنا چاہتی تھی کہ چھوٹی آپا مزید کچھ کہیں اور وہ کہنے لگیں۔  
 ”مجھے بعد میں احساس ہوا کہ مجھے کم از کم آپا میں اور شہر وڑ بھائی کا خیال تو کرنا چاہیے تھا لیکن میں کرتی، اپنے آپ میں نہیں رہی تھی۔ میں نے تو تمہارا خیال بھی نہیں کیا۔ تمہاری پوزیشن سسرال میں آکر رُو ہو گئی ہوگی۔ پرج بتاؤ ربیعہ، سب نے کیا کیا کیا تم سے؟“  
 ”چھوٹی آپا۔“ اُس نے چارپائی کی چُج پر رکھے اُن کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ کسی نے کچھ نہ

میاہی بیٹیاں آٹھ آٹھ دن رہنے آجائیں۔  
 "تو اب اس گھر پر بھی میری حق نہیں رہا۔" اس نے دکھ سے سوچا اور اندر گھر کرتے آزر دیوں  
 چہرے پر بھی منڈلائے تھے جنہیں محسوس کر کے بڑی آواز مڑتی ہوئی بولیں۔  
 "برداشت ماننا شروع۔ میں تمہارے جملے کو کبہہ رہی ہوں۔" پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا  
 کہنے لگیں۔

"دیکھو لڑکی کا اصل گھر اس کا سسرال ہوتا ہے، تم اگر ہر دوسرے دن بھاگ کر یہاں آ جاؤ گی تو اس  
 کو اس گھر میں کبھی بھی ایڈجسٹ نہیں کر سکو گی۔"

"میں روز روز کہاں آتی ہوں، ابھی بھی میں چھوٹی آپا کی وجہ سے آتی ہوں۔"  
 "کیوں؟ کیا ہوا صوفیہ کو؟" اس پر سے ہوتی ہوئی بڑی آپا کی سوالیہ نظر سب آماں پر پڑیں تو اماں  
 مہر وز کے رشتے اور چھوٹی آپا کے انکار کی ساری بات کہہ سنائی۔ بڑی آپا پہلے تو حیران ہوئیں پھر لڑا  
 انداز میں کہنے لگیں۔

"صوفیہ کا ذماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟ اتنے اچھے رشتے سے انکار کر رہی ہے۔ آخر چاہتی کہ  
 بات اس موضوع پر آ کر روکی تو اس نے شکر ادا کیا۔

"چنانچہ کیا چاہتی ہے؟"  
 "اماں، آپ کو اس سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟ مجھ سے یا ربیعہ سے تو آپ نے نہیں پوچھا  
 اسے کیوں اتنی اہمیت دے رہی ہیں؟"

"اہمیت کی بات نہیں ہے بیٹا؟" اس روز تم موجود ہو تیں تو دیکھیں کہ کس طرح اس نے  
 درمیان آ کر منہ کیا۔ تم میں اور ربیعہ میں تو ایسی جرات نہیں تھی۔ اور میں تو کہتی ہوں کمال عورت۔  
 کی ساس جو اس کی باتیں سن کر بھی براہیمان مانا بلکہ زبردستی منہ میٹھا کر کے گئیں۔ اب بھی انہوں نے  
 لیے بھیجا ہے کہ بہن کو سمجھائے۔"

"اسے خود سمجھنا چاہیے۔ سچی تو نہیں ہے اور میں تو کہتی ہوں شکر کرے کہ اتنے اچھے لوگ  
 ہیں ورنہ۔" کوئی غلط بات منہ سے نکلنے سے پہلے ہی بڑی آپا خاموش ہو گئیں۔

"تم اس سے بات کر دیکھو۔" اماں پر امید نظروں سے دیکھنے لگیں۔  
 "نہ جی، میں اس کے منہ نہیں گنتی جب آپ کا اور آپا میاں کا لحاظ نہیں کیا تو میرا کیا کرے گی؟  
 فوراً دامن بچا گئی تھیں۔

پھر سر شام ہی دوپہا بھائی آئے تو بڑی آپا ان کے ساتھ چلی گئیں۔ گوکہ اماں اور سب بہنوں  
 اصرار کیا کہ رات کے کھانے تک رگ جائیں لیکن وہ نہیں رگیں۔ اور ان کے جانے پر اس نے  
 بھی شہر وز کے آنے پر ان کے ساتھ چلی جائے گی۔ گوکہ وہ کافی دنارہنے کے ارادے سے آئی تھی  
 آپا نے جس انداز سے اس کے یہاں رہنے پر اعتراض کیا تھا، اس سے اپنا آپ کچھ ہلکا گئے لگا تھا  
 "تم کو شش کرنا کہ زیادہ تر اپنی اماں کے گھر ہو۔ ویسے بھی لڑکیاں میٹے جاتی ہی ہیں۔" ثناء  
 نے کہا تھا اور اس وقت اس نے بھی سوچا تھا کہ یہی مناسب ہو گا اور پھر فرار کا یہی ایک راستہ تھی  
 آج بڑی آپا نے پہلی رکاوٹ کٹ کر دی تھی۔

"میں جب تمہارے بارے میں سنتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے تم اماں کے گھر ہو۔" بڑی آپا کی  
 کے دل میں ترازو دو گئی تھی۔ ہو سکتا ہے اب تک اماں نے غور نہ کیا ہو لیکن اب ضرور غور کریں  
 ہو سکتا ہے کہ یہی ڈالیں۔

اس سے پہلے کہ اماں اس کے زیادہ آنے جانے پر مشکوک ہوں، اُسے سنبھل جانا چاہیے  
 سوچا اور جیسے ہی شہر وز آئے وہ بہت خاموشی سے اپنا بیگ اٹھا لائی۔ ان کے لیے یقیناً چیز

کر آیا تو سمجھی نہیں ہوا تھا، ہمیشہ وہ ہی ملنے کے لیے کہتے اور آج وہ ہلکے ہی تیار ہو گئی تھی۔  
 "خیریت؟" وہ کچھ بغیر رہ نہ سکے اور اس کے جواب نہ دینے پر کہنے لگے۔

"آپ تو غالباً جتنے بھر کے لیے آئی تھیں؟" بچی میں طنز نمایاں تھا۔  
 "ہاں۔ لیکن اب میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔ کیونکہ ایک ہفتہ تو کیا، پورا مہینہ بھی رہ لوں تو چھوٹی آپا کو قائل  
 کر سکوں گی۔" اس نے اپنے جانے کی وجہ یوں بیان کی۔

"میں کہاں صوفیہ؟" وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"اپنے کمرے میں۔" وہ چھوٹے کمرے کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی۔

"اراض ہیں۔"

"ہیں۔"

"چلے پہلے میں ان سے مل لوں۔" انہوں نے کہا تو وہ انہیں لے کر اندر آ گئی۔

چھوٹی آپا الماری کے پاس کھڑی تھیں۔ شہر وز کو اتنے دیکھا تو فوراً الماری کھول کر سر اندر کر لیا۔ وہ ان کی اس  
 ت پرانی بے ساختہ مسکراہٹ کو نہ روک سکے۔ اطمینان سے بیٹھتے تو کہنے لگے۔

"صوفیہ۔ جو بھی کام کر رہی ہیں، اسے بعد کے لیے اٹھا رکھیے اور یہاں میرے پاس آ کر بیٹھیں۔"

اور ساری دنیا میں ایک شہر وز احمد ہی تو تھے جن کے سامنے چھوٹی آپا بلا چس بوجہ اہمیت دار ڈال دیا کرتی تھیں۔ اُن  
 پر وقار بھی میں دیکھی جیسی محبت، نرم نرم شفقت کے ساتھ بڑے بھائی کا ہلکا سا رعب چھوٹی آپا کو مجبور کر دیا  
 نا۔ وہ بے بس ہو جاتیں۔

ہمیشہ یہ خواہش رہی تھی، کوئی اپنا بھائی ہوتا، بہت محبت کرنے والا، بہت شفیق۔ جو بات ملنے تو  
 دلنے کا فن بھی جانتا ہو۔ رعب لیکن محبت اور مان کے ساتھ۔ اور یہ مان شہر وز احمد نے حاصل کر لیا تھا۔ وہ بہت  
 ماموشی سے الماری بند کر کے ان کے پاس آ بیٹھیں۔

"کچھ خفا ہیں؟" مخصوص نرم لہجے میں پوچھا۔ وہ نفی میں سر ہلانے لگیں۔

روٹھے پر پابندی نہیں ہے۔ اور روٹھنا کوئی بڑی بات بھی نہیں ہے اس سے اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔

یہ مجھے خوش ہے کہ آپ اپنے حق کے لیے لڑنا جانتی ہیں۔ بندے کو بزدل کبھی بھی نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ  
 شکست اور آزمائشیں مقدر ہو جاتی ہیں۔ قدرے توقع کے بعد کہنے لگے۔

"میں تو نہیں کہوں گا کہ آپ مہر وز کے لیے ضرور ہامی بھر لیں لیکن یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ سوچیں ضرور"  
 "میں کیا سوچوں؟"

"کچھ بھی لیکن مثبت انداز سے۔ کوئی خوشی دروازے پر دستک دے تو کان بند نہیں کرنے چاہئیں بلکہ بڑھ  
 دروازہ کھول دینا چاہیے۔ اس لیے کہ خوشیاں مقدر سے ہی ملتی ہیں۔ ہم انہیں خرید نہیں سکتے۔ اور نہ ہی چھین  
 سکتے ہیں۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں ناں؟"

"جی۔ لیکن شہر وز بھائی۔" چھوٹی آپا کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہیں۔

"خاموش مت رہیں۔ کوئی ابھن، کوئی پریشانی ہو تو کبہہ ڈالیں۔"

"مجھے ڈر لگا ہے۔"

"کس سے؟"

"وقت سے جو پہلو بدلتا ہے تو انسان بدل جاتے ہیں۔" وہ اپنے خدشے کو زبان پر آپا نے سے روک نہ  
 سکی۔

"آپ فطرتاً ہی کہہ رہیں۔ مگر مہر وز میرا بھائی ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ وقت اس کا کچھ نہیں  
 لگا سکتا کیونکہ وہ وقت بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پھر بھی اگر آپ کے معاملے میں اس سے کوئی غلطی یا  
 دہائی ہوئی تو میں اسے معاف نہیں کروں گا؟"

اب اس سے زیادہ چھوٹی آپا کو اور کیا چاہیے تھا کہ وہ بھائی کے مقابلے میں انہیں اہمیت دے، پھر بھی وہ اندر ہی اندر اچھتی نکلیں۔ دنیا میں لڑکوں کی کمی تو نہیں پھر میں ہی کیوں؟ میں جو اس کے قدم ملا کر نہیں چل سکتی اور یہ بات وہ اچھی طرح جانتا ہے، پھر کیوں کہ مجھے اپنانے پر آمادہ ہوا، شاید یہ ترس اور اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہو سکتی۔

”صوفیہ۔“ شہر ورنے اُن کے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ رکھ دیا، کیا کوئی اور یقین چاہیے؟  
”نہیں شہر ورنہ بھائی۔“ سر پر ٹھہرے مضبوط ہاتھ نے وہ بے بس ہو گئیں۔  
”پھر میں گھر جا کر اُمی سے کیا کہوں؟“ وہ بوری طرح مطمئن ہونا چاہتے تھے۔  
”جو آپ کا دل چاہے۔“ وہ بے دم ہو کر بولیں۔

”گڈ گرل۔“ وہ ان کے سر کو ہیکے سے تھپکتے ہوئے مسکرائے پھر اُس کی طرف دیکھنے لگے اور وہ رتی مٹی موجود ہوتے ہوئے بھی موجود نہیں، حسبِ عادت کھچکی تھی۔ ان کے نرم بچے میں لفظوں کے مخصوص مسکراہٹ جوان کی شخصیت کو جاذبِ نظر بنا دیتی تھی۔

”ربیعہ۔“ انہوں نے پکارا لیکن اس میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ یونہی بیٹھی ایک ٹمک انہیں دیکھے، ربیعہ۔ آپ کہاں کھو گئیں؟ اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تو چونکی اور کچھ سمجھ میں نہ کھڑی ہو گئی۔ اُن کے ساتھ چھوٹی آپا بھی بے ساختہ ہنس پڑیں۔

”شہر ورنہ بھائی۔“ میں تو سمجھی تھی، آپ کی صحبت نے لے لے انسان بنادیا ہو گا لیکن یہ تو۔“  
”کیا یہ شروع سے ایسی ہیں؟“ وہ فوراً پوچھ بیٹھے۔

”ہاں۔“ بیٹھے بیٹھے کہیں غائب ہو جاتی ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کسی دن اپنے وجود و سمیت غائب نہ چھوٹی آپا کی شوقی لوٹ آئی تھی۔

”چھوٹی آپا۔“ آپ تو بس۔“ وہ خفقت مٹانے کو اُٹھنے لگی تھی کہ اُنہوں نے ٹوک دیا۔ پھر اُٹھتے ہوئے اُنکے صوفیہ۔ ہم چلتے ہیں۔ اور ربیعہ آپ اُمائے کہہ دیجیے۔ صوفیہ نے مہر ورنے کے حق میں دیا ہے۔ اُس نے شرارت سے چھوٹی آپا کی طرف دیکھا پھر ان سے پہلے کرے سے نکل آئی۔ اُمائے پھر تھیں۔ اسے دیکھتے ہی اشارے سے پوچھا۔ کیا ہوا؟

”سب ٹھیک ہے اُمائے۔“ چھوٹی آپا سامان گئی ہیں۔“ وہ اُمائے کے گلے میں بازو ڈالتی ہوئی بولی۔  
”شکر ہے خدا کا۔“ ورنہ میں تو بڑی پریشان تھی۔“ وہ کچھ کہتا چاہتی تھی کہ شہر ورنے کو کتے دیکھ کر فافا اور اُمائے سے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

”اچھا اُمائے، اب اجازت دیجیے۔“

”بیٹا، رات کا کھانا کھا کر جاتے۔“ اُمائے نے روکا۔

”پھر یہی بلکہ اب ہم سب اُمائے کے باقاعدہ رزم کرنے۔“

”کیوں نہیں۔“ جب چاہے آؤ۔ اُمائے اب خوشی چھپا نہیں پارہی تھیں۔

”میں اتنی سے طے کر کے آپ کو اطلاع کر دوں گا۔“ پھر تخت پوش پر دکھا اُس کا بیگ اُٹھالیا کے ساتھ چل پڑی۔

”اگر آپ رگنا چاہیں تو۔“ دروازے کے قریب رگ کرانہوں نے بغور اُس کی طرف دیکھا، کہیں اُن کے ساتھ نہیں چل رہی۔

”میرے خدا کس مشکل میں پھنس گئی۔“ اُس نے سوچا۔“ یہ شاید لے جانا نہیں چاہتے اور یہاں نہیں۔“

”کیا بات ہے؟“ اُسے سوچتے دیکھ کر پوچھا۔

”کچھ نہیں چلیں۔“ پلٹ کر ایک نظر انگن سے برا آمدتے ٹمک ڈالی۔ سب اپنے اپنے کام میں۔

بچے تھے۔ اپنا وجود بے معنی سا لگا۔ اپنی ہستی غیر معتبر۔  
”الہی۔“ ایسے بے نشان راستے کس کا مقدر نہ ہوں۔“ دل میں ہلکا ہلکا درد کوٹیں لینے لگی۔ ان کے برابر گارٹی بے بنیادہ اپنے مقدر سے سنت شاک تھی۔

”میں نے تو تمہیں کسی کا دل نہیں دکھایا۔ پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟۔“

”اُمائے کے گھر سے نکلتے ہوئے انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ اچانک کچھ چپ سی ہو گئی ہے۔ پھر تمام راستہ یہ وہ اس طرح خاموش اور لاتعلقی سی رہی تھی اور اب جب وہ اُمی کے ساتھ مہر ورنے کی باقاعدہ شگنی کا پروگرام بنا رہے تھے، تب بھی وہ اسی طرح بیٹھی تھی۔

”بیٹا۔ تم بھی کچھ کہنا۔“ اُمی نے اچانک اسے مخاطب کر کے کہا تو وہ چونک گئی۔ پھر سر جھکاتے ہوئے بولی۔  
”میں کیا کہوں؟۔“

”اُمی۔“ اُمی کچھ کہتا چاہتی تھیں کہ وہ بول پڑے۔

”اصل میں ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“

”کیا ہوا؟۔“ اُمی پریشان ہو گئیں۔

”میں دردمند ہوا ہوں۔“ وہ فوراً بول پڑی۔

”اچھا۔ تم اپنے کمرے میں جا کر لیٹو۔ میں چلے کے ساتھ ٹیبلٹ بھجواتی ہوں۔“ اُمی نے کہا تو وہ ممنون نظروں سے اُنہیں دیکھتی ہوئی وہاں سے اُٹھ کر آ گئی۔

”لینے کو دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن مضی اس خیال سے کہ کہیں اُمی لے دیکھنے نہ آجائیں۔ وہ چادر اوڑھ کر لیٹ گئی۔ کچھ دیر کے بعد شہر ورنہ خود ہی چائے لے کر آگئے، تو وہ بے حد نامت محسوس کرتی ہوئی اُٹھ بیٹھی، وہ اُس کے ہاتھ کو خود سامنے ہی بیٹھ گئے۔

”اُمی! اُمی سوری۔“ مجھے پتا نہیں سمجھی کبھی کیا ہو جاتا ہے۔“ وہ انہیں اپنی طرف دیکھتے پاکر نظریں چراتی ہوئی بولی۔

”کوئی کیفیت بنا سبب نہیں ہوتی ربیعہ۔“ وہ کہنے لگے۔ ”کوئی بات ہوتی ہے، جب ہی اچانک کیفیت بدلتی ہے۔ غرض میں آؤ اس ہونا اور اُمائے کے موسم میں کھلکھلا کر ہنسنا۔ ایسا یونہی نہیں ہوتا۔ پس منظر میں خود کو کوئی ایسی بات ہوتی ہے۔ آپ بتائیے، آپ کے ساتھ کیا ہوا؟۔“

”شہر ورنہ جمد۔“ ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ نظریں زاویہ بدلتی ہوئی اُن پر جا ٹھہریں۔  
”کسی نے کچھ کہا؟۔“ میرے حوالے سے یا کسی اور حوالے سے؟۔“

”نہیں۔“ وہ نفی میں سر ہلاتی گئی۔

”میرا خیال ہے، اُمائے کے گھر کوئی بات ہوئی ہے، جب ہی آپ وہاں سے چلی آئیں ورنہ آپ کا ارادہ تو۔“ اُن کی بات ہونٹوں میں رہ گئی۔ نیند و شک دے کر اُنہیں پکارتی ہوئی کہنے لگی۔

”بھائی جان۔“ آپ کافون ہے۔ شاقب حسن نام بتایا ہے۔“

”شاقب حسن۔“ انہوں نے دہرایا اور اس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں۔  
”تو یہ بات ہے، تم اس کی خاطر اپنا پروگرام کنسل کر کے چلی آئیں۔“ اور وہ اُن کی نظروں کا مقدمہ سمجھ کر بے بسی سے سر جھکا گئی۔ کیونکہ اس کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اس وقت شاقب حسن کافون آئے تھے۔

”چلیے۔“ وہ یقیناً آپ کی آواز سننا چاہے گا۔“

”پلیز اس سے کہہ دیں، میں یہاں نہیں ہوں۔“

”میں جھوٹ نہیں بولی سکتا۔“ وہ اُسے اپنے آپ سے اچھتے لڑتے سنگدلی سے دیکھ رہے تھے۔  
”تو پھر صاف کہہ دیجیے کہ میں بات نہیں کرنا چاہتی، وہ دے دے لیے جس میں چینی۔“

”بات آپ خود کہہ دیں۔“ ٹھہریئے میں فون ہیں لے آتا ہوں۔“

وہ فوراً چلے گئے۔ اور ابھی وہ اپنے آپ کو سنبھال ہی رہی تھی کہ وہ فون لے کر آگئے۔ سخت  
کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے ہاتھ سے ریسور لے کر کان سے لگایا۔  
”ربیعہ۔“  
”ربیعہ۔“  
ثاقب حسن بے قراری سے پکار رہا تھا۔



”ربیعہ۔“ لہروں پر سفر کرتی ثاقب حسن کی آواز اُسے پکار رہی تھی۔ اپنی طرف بٹا رہی تھی  
بے قراری سی بے قراری اور شاید بے بسی بھی کہ اختیار میں ہوتا تو آواز کے ساتھ ساتھ خود بھی لہروں  
کرتا ہوا، سامنے آن کھڑا ہوتا۔

”ربیعہ۔“ بولتی کیوں نہیں؟۔ یہ تم ہی ہونا؟۔ میری آواز سن رہی ہو؟۔  
اُس کی مسلسل خاموشی سے دوسری طرف وہ چیخ کر پوچھ رہا تھا۔ اور شہر و زامہ جانے کیوں آج  
جم کر کھڑے ہو گئے۔ شاید دیکھنا چاہتے تھے کہ جوابات وہ ان سے کہلوانا چاہتی تھی، وہ خود کہہ  
یا نہیں۔؟ کاش اتنی باحوصلہ ہو جاتے۔ صاف منع کر دے۔ سختی سے کہے۔ میں بات نہیں کرنا  
اب، نہ آئندہ کبھی۔

”ثاقب حسن۔“ میں اس وقت بات نہیں کر سکتی۔ اپنی تمام تر ہمتیں جمیع کر کے اُس نے اسی قدر  
اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ اور شہر و زامہ اُس کے منہ سے یہی بات سن کر مطمئن ہونا چاہتے تھے لیکن ایک  
لفظ نے انہیں مطمئن ہونے نہیں دیا۔

اس وقت۔ اس وقت نہیں۔ گویا آئندہ بات ہو سکتی ہے۔ انہوں نے تمنی سے سوچا۔  
لے کر کمرے سے نکل گئے۔

وہ چپ چاپ انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کے بعد بھی وہ کتنی دیر تک اسی طرح  
حرکت بیٹھی رہی۔ اس کا ذہن بالکل ماؤٹ ہو گیا تھا۔

کانی دیر بعد شہر و زامہ کسی کام سے اندر آئے۔ وہ اسی طرح بیٹھی تھی جیسے وہ چھوڑ گئے تھے۔ پہلے  
نے غور نہیں کیا۔ سرسری نظر اُس پر ڈالتے ہوئے اپنی الماری کی طرف بڑھ گئے۔ اور جب وہاں سے  
ہو کر پلٹے، تب اسے دیکھ کر چونکے۔ ایک ہی نقطہ پر نظریں مرکوز کی وہ کسی جیسے کی طرح ساکن تھی۔ وہ بے  
قدروں سے چلتے ہوئے اُس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ اُس نے پھر بھی حرکت نہیں کی۔

”ربیعہ۔“ انہوں نے پکارا۔ جواب میں خاموشی۔

”کیا بات ہے ربیعہ؟“ گھٹے قالین پر ٹیک کر اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جو

ندارد۔

”ربیعہ۔“ کیا ہو گیا ہے؟۔ آپ بولتی کیوں نہیں؟۔ اور وہ جیسے خواب میں بولنے لگی۔  
”کیا فائدہ ایسی زندگی کا جس پر خود میرا اپنا اختیار نہیں رہا۔ کچھ چلتی ہوں میں جو میری ڈور کبھی ثاقب  
کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اور کبھی شہر و زامہ تمام لیتے ہیں۔ میری اپنی نہ کوئی مرضی ہے اور نہ کوئی سوچ۔  
بل ایک خوف، ایک دھڑکا ایک مجرماً سا احساس گھیرے رہتا ہے۔ میری ہر بات۔ ہر قدم مشکوک  
کیوں؟ کیا خطا ہوئی مجھ سے؟۔ صرف اتنی ناں کہ میں نے ثاقب حسن سے محبت کی تھی اور محبت کی آ  
سنرا، وہ بھی کسی اور نے نہیں، خود اُس نے دے ڈالی؟“

اُس کا لہجہ کھوکھو یا کھوکھو اور آنکھوں میں سوچ کی پرچھاٹیاں تھیں۔ وہ سمجھ گئے، اپنے آپ میں نہیں  
نیچے سے اُٹھ کر اُس کے سامنے آ بیٹھے۔ اور اس کا کندھا چھو کر آہستہ سے بلایا۔

”ربیعہ۔“ کیا ہوا ہے؟“ اس نے سارے احساسات ایک دم بیدار ہو گئے۔ اور وہ سر جھک

طاف دیکھنے لگے۔  
”کچھ پریشان ہیں؟“ اُن کے لہجے میں اپنائیت تھی۔  
”ہاں۔“ اُس نے اعتراف کیا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں پھنسا لیں۔  
”کی کوئی ایسی بات ہے جو مجھ سے نہیں کہی جا سکتی؟“  
”بچے ہر بات آپ سے کہتی چاہیے؟“ اندری سارنٹی طنز بن کر لہجے میں سمٹ آئی۔ ”کیا نام آپ  
آپ سے؟ کیا تعلق ہے جو میں ہر بات آپ سے کہوں اور آپ کیوں پوچھتے ہیں؟ مجھے میرے حال  
پتہ نہیں چھوڑ دیتے؟“ وہ جیسے وحشت بھرے لہجے میں چیخ اٹھی۔  
”میں ایسا نہیں کر سکتا۔“

”کیوں؟“ کیا ثاقب حسن نے میرے دکھ سکھ شئیر کرنے کی ذمہ داری بھی آپ کو سونپی ہے؟“  
”کیا پتا چاہتی ہیں آپ؟“ وہ اُنہجے سے گئے۔  
”مجھے کچھ نہیں کہنا۔“ وہ بدتمیزی کا مظاہرہ کر گئی۔

”کہیں آپ میرا محاسبہ تو نہیں کرنا چاہ رہیں؟“ وہ خدشہ زبان پر لے آئے۔  
”میں ایسا کیوں کر دوں گی؟ کبھی فرست لے تو اپنا محاسبہ خود کر لیجیے گا۔ اور پلیز اس وقت مجھے  
چھوڑ دیں۔“ وہ ہونٹ بیچنے کر کھڑے ہو گئے۔ پھر جاتے جلتے کہنے لگے۔

”ربیعہ بیگم۔“ اگر ثاقب حسن سے بات نہ کرنے کا اتنا ہی دکھ ہے تو خود اُسے کال کر لیجیے۔“ وہ ایک  
سائے میں اگٹی تھی۔

”میرے کیا ہو رہا ہے؟“ اُن کے جاتے ہی اُس نے پیشانی گھٹنوں پر ٹکاتے ہوئے سوچا۔ ”شہر و زامہ  
ثاقب حسن کا طعنہ کیوں دے گئے ہیں۔ جب وہ ہر بات نہ صرف جانتے ہیں بلکہ خود بھی شریک ہیں  
پھر انہیں کیا حق پہنچتا ہے۔“ اول تو انہیں ثاقب حسن کی بات ماننی ہی نہیں چاہیے تھی اگر کسی وجہ  
ماں بھی لی تو پھر میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ ایک دم مجھ سے لا تعلق کیوں نہیں ہو  
تے۔ جب ملے تھا کچھ ثاقب حسن کی واپس تک یہاں رہنا ہے تو پھر وہ مجھ پر میری ذات پر  
انے کی کوشش کیوں کرتے ہیں؟۔

تو اس ساری پریشانی کا سبب یہ ہے ربیعہ اکرام علی کہ شہر و زامہ دل کے ایوانوں میں سبھی اس  
رت کو نکال باہر کیا ہے جس نے پہلے پہل محبتوں کی آشنائی بخشی تھی اور جو جاتے جاتے بھی اپنا پابند  
یا تھا۔

”مجھے آزاد کرو۔“

”مجھے آزاد کرو ثاقب حسن۔“ وہ ہلکے سے مڑ بڑائی۔

دل و دماغ میں شدید جنگ شروع ہو گئی تھی۔ یہ بات تو اُس نے اول روز ہی سوچ تھی کہ ثاقب  
حسن نے اُسے پانے کا جو طریقہ اپنا یا ہے، وہ انتہائی نامناسب ہے اور اُس نے شہر و زامہ سے بھی  
ہر بات کا اور اب تو وہ خاصی متشفر ہو رہی تھی۔ نہ صرف ثاقب حسن سے بلکہ شہر و زامہ سے بھی۔  
دونوں مرد جنہوں نے اسے کوئی بے جان شے تصور کر لیا تھا۔

دل نادان تھا، اب بھی خواب دکھانے پر آمادہ۔ ”تم چیز ہی ایسی ہو ربیعہ اکرام علی، کوئی تمہیں  
سننے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

”نہیں۔ نہیں۔“ دماغ سراپا احتجاج۔ اور یوں ڈیپریشن کا شکار ہو کر وہ بیمار پڑ گئی۔

”شہر و زامہ! مجھے اُسے سوتے دیکھ کر کوئی توجہ نہیں دی۔ اپنے طور پر وہ اس سے خفا تھے۔  
فلکی کا حق نہ رکھتے ہوئے بھی اور محض اس خیال سے کہ ناشتے کی ٹیبل پر امی ان سے ربیعہ کے  
ملنے سوال جواب نہ شروع کر دیں۔ وہ ناشتا کیے بغیر ہی افس چلے گئے۔“



رات بھر وہ بہت ڈسٹرب رہے تھے۔ ربیعہ کی باتیں، اس کا رویہ گو کہ سمجھ میں نہ آنے والا تھا۔ یہ بھی وہ آنکھیں رہے تھے۔ شاید انجانے میں یہ توقع کر بیٹھے تھے کہ وہ ثاقب حسن کے سنگرم وقت کو بھلا کر اب ان کے گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگی ہوگی۔ اور کچھ وقت گزرے گا کہ وہ انہیں بھی کہہ گی لیکن جس طرح کل وہ اچانک انماں کے گھر سے آگئی تھی۔ اور پھر ثاقب حسن کا فون جس سے ان یقین ہو گیا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ہرول سے آگاہ رہتے ہیں۔ حالانکہ انہیں اس بات کی ہونی چاہیے تھی کیونکہ وہ ہر حال ثاقب حسن کی امانت تھی لیکن وہ شاید حقائق سے نظریں پھرنے لگے۔ کیا ضروری ہے کہ وہ گئے دنوں کو یاد رکھے۔؟ وہ اکثر اپنے آپ سے کہتے۔

”یہ بھی تو ممکن ہے کہ ثاقب حسن ساری باتیں سارے پیمان بھلا ڈالے۔ کسی دن کوئی عذر تراشتے ہو۔“ میرا انتظار مٹ کر ناربیہ۔ میں لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ یہ وہ ایسی ہی باتیں سوچا کرتے اور شدت منتظر تھے ایسی کسی بات کے۔ جو ان کے اور ربیعہ درمیان کھڑی دیوار کو ایک دم دھادے۔ لیکن ان یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دیوار گرنے کے بجائے اور اترتی ہوئی جا رہی ہو۔

”کاش یہ روکی بہت عام سی ہوتی اور میں کبھی اس کی طرف متوجہ نہ ہوتا۔“ وہ اس سے فرار کی خاطر آفس آگئے تھے لیکن فرار شاید نصیب میں نہیں تھا۔ کہ کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ مسلسل اسے رہے تھے۔ کئی بار سر جھٹکا۔ اپنے آپ کو سبز زرخیز بھی کی۔ لیکن اسے سوچنے سے باز نہ رہ سکے۔

گیارہ بجے کے قریب اُمی کا فون آگیا۔ انہوں نے فوراً انہیں گھر آنے کے لیے کہا۔ وہ پوچھتے رہے آخر کیا کام ہے۔ لیکن اُمی نے حکم صادر کر کے فون بند کر دیا۔

اُمی کے لیے میں رعب کے ساتھ قدرے پریشانی بھی تھی جسے محسوس کر کے وہ خود بھی پریشان اور اسی وقت چل پڑے۔

گھر میں داخل ہوئے تو غیر معمولی خاموشی کا احساس ہوا۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اُمی کے کمرے جا رہے تھے کہ وہ انہیں ان کے اپنے کمرے سے نکلتی نظر آئیں۔ وہیں تک کہ انتظار کرنے لگے۔

”میں نہیں سمجھتی تھی شہروز احمد کہ تم اتنے غیر ذمہ دار ہو۔“ اُمی کا انہیں شہروز احمد کہہ کر مخاطب کے غصے کا اظہار تھا۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے ان کی طرف دیکھ گئے۔

”میں پوچھتی ہوں۔ ایسا کون سا ضروری کام تھا جو تم بیمار ہو کر کچھ بڑھ چلے گئے۔؟“ بیکل بیوی۔؟“ اُن کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔ پھر پوچھنے لگے۔

”کیا ہوا ربیعہ کو؟“

”کیوں؟ کیا تم نہیں جانتے۔؟“

”نہیں۔ کیونکہ صبح تو وہ ٹھیک تھیں۔“ وہ اپنی صفائی پیش کرنے کی خاطر بولے ورنہ صبح جاتے انہوں نے اسے دیکھا ہی نہیں تھا۔

”صبح ٹھیک تھی۔ تو اتنی سی دیر میں اسے کیا ہو گیا ہے؟“ او میرے ساتھ۔“ اُمی انہیں اپنے کا اشارہ کر کے چل پڑیں تو وہ کچھ سوچتے ہوئے اُن کے پیچھے اپنے کمرے میں داخل ہوئے۔ ساتھ پر وہ بے سندھ پڑی تھی۔ پتا نہیں کیسے اتنے کمشور بن گئے۔ کہ بس ایک نظر اس پر ڈالی پھرانی پوچھنے لگے۔

”ڈاکٹر کو بلایا؟“

”ہاں۔ ڈاکٹر ابھی دیکھ کر گیا ہے۔ اس کا کہنا ہے، یہ ٹینشن کا شکار ہے۔“ اُمی انہیں ٹوٹتی ہوئے سے دیکھتی ہوئی بولیں۔ ”کیا کہا ہے تم نے اسے؟“

”ہاں تم نے۔“ بغیر کسی بات کے وہ ٹینشن کا شکار نہیں ہو سکتی۔ کوئی بات ہوئی ہوگی تب ہی تو

”اُمی۔“ وہ اُن کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑے۔ ”میں کیا کہوں گا بھلا۔ ڈاکٹر نے یونہی کہہ دیا ہوگا۔“

”اچھا۔ تم اسے اٹھاؤ۔ میں کچھ کھانے کے لیے بھجی رہی ہوں۔ رات سے کچھ نہیں کھایا۔“ اُمی نے

”اُمی چلی گئیں تب وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ قریب آکر پیشانی چھو کر دیکھی۔ وہ بخار میں جل رہی تھی۔ قدرے تشویش تو ہوئی لیکن کوئی ملال نہیں جاگا۔ اور نہ کوئی ایسا احساس کہ یہ سب ان کی وجہ سے

ہوا ہے۔ اُن کے خیال میں ثاقب حسن سے بات نہ کرنے کا دکھ جیسے اُس نے کچھ زیادہ ہی محسوس کر لیا ہوگا۔ یہ غیب ہے۔ بیمار وہ کسی اور کے فراق میں پڑے اور تیمارداری میں کروں؟“ انہوں نے جل کر سوچا

پھر زور سے آواز دے ڈالی۔

”ربیعہ۔“ وہ ذرا سا کمسنائی اور کڑوٹ بدلنا چاہتی تھی کہ انہوں نے پھر پکارا۔ اور اس کی لرزتی پلکوں کو دیکھ کر کہنے لگے۔

”اچھے جائیں پلین۔“

وہ فوراً اُٹھ نہیں سکی۔ میں آنکھیں کھولی کہ ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”میں نے آپ سے کہا تھا ناں کہ مجھے ہر بات کے لیے اُمی کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہی ہیں۔ کہ اچانک آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ بتائیے میں کیا جواب دوں انہیں؟“ ان کا لہجہ روزانہ سے

بہت مختلف تھا اور آنکھوں میں ناگواری کی پرجھٹکیاں واضح طور پر نظر آ رہی تھیں۔

”ٹھیک تو ہے، وہ کیوں اس کے لیے جوابدہ ہوں؟“ اُس نے سوچا اور منہ کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

وہ کچھ دیر تک اُس کے بولنے کا انتظار کرتے رہے لیکن وہ خاموشی سے سر جھٹکے بیٹھی رہی جس سے وہ مزید جھنجھلا گئے۔

”جانتی ہیں اُمی نے مجھے اس وقت آفس سے بلوایا ہے صرف آپ کے لیے۔“

”میرے لیے؟“ وہ غور کلامی کے انداز میں بولی۔

”جی ہاں۔ آپ کے لیے۔“ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ آپ کی بات پر عمل کرتے ہوئے آپ کو آپ کے حال پر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ نتیجے میں اُمی کے سامنے جوابدہ ہونا پڑا۔ وہ ذرا سا سراپا کر کے دیکھنے لگی۔

”اب اُمی کو آپ ہی مطمئن کیجیے کہ میں نے آپ سے کچھ نہیں کہا۔ وہ سمجھ رہی ہیں۔“

دروازے سے باہر اُمی کی آواز سن کر وہ فوراً خاموش ہو گئے۔ اُمی اندر آئیں، اُن کے ہاتھوں میں ٹرس تھی۔ وہ بے حد زحمت محسوس کرتی ہوئی فوراً بستر چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”آپ نے کیوں زحمت کی اُمی؟“ میں خود آ رہی تھی۔ ”وہ اُن کے ہاتھوں سے ٹرس لیتی ہوئی بولی۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اور یہ تم کھڑی کیوں ہو گئی ہو۔“ چلو آرام سے بیٹھو۔“ اُمی نے پیار سے ڈانٹا۔ ”تو وہ کنگھیوں سے اُن کی طرف دیکھنے لگی۔ بہت غصے میں کھڑے تھے۔ پیشانی شکن آؤ داؤ ہونٹ جھٹکتے ہوئے۔

”عجیب شخص ہے۔ غصے میں بھی اچھا لگتا ہے۔“ اُس نے سوچا اور اُن کی طرف سے رخ موڑ کر دوبارہ اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔ ڈرتی تھی کہیں ان کے اس روپ میں الجھتی نہ چلی جائے۔ ویسے بھی اپنی عادت سے واقف تھی۔

”بیٹا۔ یہ اچانک کیا ہو گیا تھا تمہیں؟“ کل تک تو ٹھیک ٹھاک تھیں۔“ اُمی نے محبت سے پوچھا تو

کہہ نہ سکے۔ اور وہ اپنی پشت پر ان کی نظروں کی چٹین محسوس کر کے انہیں مزید غصہ دلانے کی غرض بولی۔

”یہ بات بے بات مجھے ڈانٹتے ہیں۔ کل اماں کے گھر سے آتے ہوئے راستہ بھر مجھ سے خفا ہو رہے۔ بنا کسی بات کے اور۔ اور صبح مجھے اتنا تیز بخار تھا، اس کے باوجود انہوں نے پروا نہیں کی مجھے اسی حالت میں چھوڑ کر آفس چلے گئے۔“ اتنی نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا۔ پھر اس سے کہنے لگیں۔ ”تم آٹھویں کلاس میں چلو۔ یہ پروا نہیں کرتا نہ کرے، ہم سب تو یہی ناں۔“ وہ فوراً گھڑی ہو گئی۔ ویسے بھی اب یہاں رکنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ ٹرے اٹھانے لگی کہ انہوں نے روک دیا۔

”رہنے دو۔ میں ملازم کو بھیج کر منگواتی ہوں۔“ وہ سر جھکا کر اسی کے پیچھے چل پڑی۔ پھر جیسے ہی اتنی کمرے سے نکلیں، انہوں نے بڑھ کر اس کی کلائی تھام لی۔ ”یہ کیا حرکت تھی؟“ غصہ عروج پر تھا۔ ”کون سی؟“ وہ انجان بنی۔ ”میں آپ کو ڈانٹا ہوں بات بے بات اور۔“

”اور شہزاد احمد۔ آپ بھول رہے ہیں کہ ہمارے درمیان بندہ بندھن نام نہاد رہی لیکن اس کے تقاضے بہر حال ہمیں نبھانے ہیں۔“ وہ ان کی بات کا ٹکڑا کر بولی۔ ”میں اس وقت اتنی سے یہی کہہ سکتی تھی اس بندھن کے توازن پر بھی بہت تعلق ہے۔“ انہوں نے اس کی کلائی پر گرفت مضبوط کی اور پھر ایک جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا۔

”پلیز۔“ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی۔ ”میرا ہاتھ چھوڑیں۔“ وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر جس طرح اپنی طرف کھینچا تھا، اسی طرح دروازے کی طرف دھکیل دیا۔ اور اس میں اتنی ہمت ہی نہیں رہی تھی کہ رک کر ان کے پیور دیکھ لیتی۔ فوراً باہر نکل گئی۔ پھر اتنی کے کمرے میں جا کر ہی اطمینان کا سانس لیا تھا۔

مہر و کی منگنی کے لیے اتنی نے جمع کا دن تجویز کیا تھا۔ اور انہوں نے اماں کے گھر بھی کھلوایا تھا کہ اس جمع کو منگنی کی رسم ادا کرنے آئیں گے۔ درمیان میں بس تین چار دن ہی تھے اور اسی میں ساری تیاریاں کرنی تھیں۔ اس کی طبیعت مکمل طور پر سنبھلی نہیں تھی، پھر بھی وہ اتنی کے ساتھ تیاری میں لگ گئی۔ منگنی کا چوڑا میونگ شوز، زیور کا ہلکا سیٹ اور میک اپ کا سامان وغیرہ ان ساری چیزوں کی خریداری کے لیے وہ اتنی کے ساتھ جاتی رہی تھی۔ اور اتنی نے بھی خاص طور پر ہر چیز میں اس کی پسند کو مدنظر رکھا تھا۔

نہرو کو اپنے سوٹ کے ساتھ میونگ چیزیں لیتی تھیں۔ اس روز وہ بھی ساتھ تھی۔ ایک دوکان سے وہ اتنی اور نہرو کے ساتھ نکل رہی تھی کہ سامنے سے ثاقب حسن کی بہن انیلا اور اس کی والدہ تو آتے دیکھ کر جھٹک گئی۔ پھر چاچا کو کترا کر نکل جائے یا رنج موڑنے لیکن انیلا اسے دیکھ چکی تھی، لپک کر اس کی طرف آئی۔

”ربیعہ۔ کیسی ہو تم؟“ ”اچھا ہوں۔“ اس نے حتی الامکان اپنے آپ کو نامزد رکھنے کی کوشش کی پھر بھی اس کی طرح گرم جوشی کا مظاہرہ نہ کر سکی۔ شاید اندر کہیں یہ خوف تھا کہ وہ نہرو اور اتنی کے سامنے ثاقب حسن کا ذکر نہ چھیڑ دے۔ اس لیے فوراً تعارف کرانے لگی۔

”ان سے ملو، یہ اتنی ہی یعنی میری ساس۔ اور یہ میری چھوٹی نندہ۔ اور نہرو میری دوست انیلا ہے۔ ہم کالج میں ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔“

”میری خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ نہرو نے انیلا سے ہاتھ ملاتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔ پھر اس سے بچنے لگی۔

”بھائی۔ آپ نے کبھی ذکر نہیں کیا۔؟“ ”بڑی بے وقار ہے۔ قبول کئی ہوگی۔“ انیلا نے اسے دیکھتے ہوئے ذومعنی بات کی۔ اب بھی اگر نہرو نکلتی تو یہ یقیناً کترا کر نکل جاتی۔

”نہیں۔ خیر ایسا بھی نہیں ہے۔“ وہ براہمانتی ہوئی بولی۔ ”اچھا یہ بتاؤ۔ تمہارے کوہ کہاں ہیں؟“ بڑا اشتیاق ہے ان سے ملنے کا۔ ”وہ اس وقت ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔“

”آپ کسی دن گھر آئیں ناں۔ بھائی جان سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔“ نہرو نے فوراً دعوت دے ڈالی۔ بلکہ اس جمعہ کو آجائیں، ہمارے ہاں ایک تقریب ہے، اس میں بھی شرکت کر بیٹھے گا۔

”بھئی سوری۔ اس جمعہ کو تو میں نہیں آ سکتی کیونکہ میرے اپنے گھر میں شادی ہے۔“ ”کس کی؟“ وہ یونہی پوچھ گئی۔

”میری بہنوں کی اور اب تو میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ تم لوگ بھی آنا کیونکہ تم لوگ خود مصروف ہو۔“ ”ہاں بس اتفاق ہے۔“ وہ ہنسی بہہ سکی۔

”طیے آپ شادیوں سے فارغ ہو لیں، پھر ہمارے ہاں آئیے گا۔“ نہرو نے کہا تو انیلا اس کی طرف بچنے لگی۔ اس کے نظریں چرانے پر بولی۔

”جو میری دوست ہے، وہ تو بلا نہیں رہی، تم ہی اصل کار کر رہی ہو۔“ ”نہرو اور میں ایک تو نہیں ہیں۔“ وہ فوراً بول پڑی۔ ”نہرو بلائے یا میں، ایک ہی بات ہے۔ کیوں ناں؟“

”بالکل۔“ اس نے تائید کی۔ ”پھر بھی تم جب تک اپنے منہ سے نہیں کہو گی، میں آنے کی ہامی نہیں بھروں گی۔“

”بھئی نہرو ناں۔“ اتنی اور نہرو کا خیال کر کے مجبوراً کہنا پڑا۔ ”نہرو دل تو چاہ رہا تھا۔ صاف منع کر دے بھی مت آنا۔“

”اؤں گی۔“ انیلا ہنسی۔ ”اچھا تو پھر حذرًا حافظ۔“ اس نے جلدی سے قدم آگے بڑھا دیے۔

”گھر آئی تو اپنی چیزیں لے کر جلدی سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ کچھ عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ اور اپنی کچھ میں نہیں آیا۔ کہ وہ کیا محسوس کر رہی ہے۔“

”زندگی میں اتفاقات کیوں ہوتے ہیں؟“ منہ ہاتھ دھو کر اطمینان سے بیٹھی تو سوچنے لگی۔ آخریوں بھی تو زندگی گزر سکتی ہے۔ بڑی بھلی جیسی بھی ہو۔ پھر کیا ضروری ہے کہ کوئی حادثہ، کوئی اتفاق ضرور نا ہو۔ چنانچہ کیسے ہوتے ہیں وہ لوگ جن کی زندگیوں میں اتفاقات خوشگوار اثرات چھوڑتے ہیں۔

”ہر میں ہوں، جب بھی عہد رفتہ کو بھلا کر حال میں گمن ہونے کی کوشش کرتی ہوں تو اچانک کوئی حادثہ، دن اتفاق رونما ہو کر مجھے اسی عہد میں دھکیل دیتا ہے۔ آخر کیوں؟“ بہت آزرہ ہو کر اس نے صوفے کی لپٹ سے سر ہٹا دیا۔

”پچھلے چند دنوں سے میں خوش تھی۔ اپنے حال میں گمن۔ سوچا تھا میرا وزا و چھوٹی آبا کی منگنی پر خوب غور کروں گی۔ لیکن آج انیلا نے اچانک سامنے آ کر میری ساری خوشی چھین لی۔“ اور انیلا کے ساتھ ٹانگ کی کبھی بات یاد آئی کہ جمعہ کو اس کی بہنوں کی شادی ہے۔

”تو ثاقب حسن اپنے اہم فرائض سے سبکدوش ہو رہا ہے۔“ اس خیال کے ساتھ ہی اس کا دل

زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ گھبرا کر سینے پر ہاتھ رکھا اور آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ یوں جیسے وہ پکارتا ہوا چلا آ رہا ہو۔

”ربیع۔ میں آگیا ہوں۔ اپنے سارے مسائل کو شکست دے کر۔“

”نہیں۔“ وہ خوفزدہ ہو کر سر کو زور زور سے نفی میں ہلاتے لگی۔

”ربیع۔“ شہر و زاحم کرے میں داخل ہوئے اور اسے سر کو زور زور سے جھٹکے دیتے دم قدرے پریشانی سے آواز دے ڈالی اور وہ اپنے آپ میں نہیں تھی۔ اُن کی پکار پر کسی اور کا ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی اور نہانی انداز میں چپینے لگی۔

”نہیں۔ میرے قریب مت آؤ۔ مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔ مجھے مت چھوؤ۔ میں اب تمہاری بہن ہوں۔“

”ربیع۔“ وہ اُس کے سامنے آکھڑے ہوئے اور وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

”خدا کے لیے چلے جاؤ۔ کسی نے دیکھ لیا تو۔؟“

”ربیع۔ کیا ہوا ہے؟“ اُس کی دونوں کلاٹیاں تھام کر چہرے پر سے ہاتھ ہٹائے تو وہ بھگی بھگی سے انہیں دیکھنے لگی۔ آہستہ آہستہ ذہن بیدار ہونے لگا اور جب حقیقت سمجھ پائی تو طویل سانس ہوئی دوبارہ صوفے پر ڈھٹے گئی۔ وہ کچھ دیر تک کھڑے اسے دیکھتے رہے پھر سامنے بیٹھتے ہوئے۔

”نیا چانک آپ کو کیا ہو جاتا ہے؟“

”میں خواب دیکھنے لگی ہوں۔ بہت بھیاںک قسم کے۔“ وہ صوفے کی پشت سے سر نکالتی ہوا جاگتے میں؟“

”ہاں جاگتے میں۔ کھلی آنکھوں سے۔ جیہی توڑ جاتی ہوں۔ مجھے آپ کی ذہنی کیفیت کچھ ٹھیک لگتی۔ میرا خیال ہے کسی نفسیاتی معالج سے رجوع کرنا پڑے گا۔“

”آپ کا مطلب ہے میں پاگل ہوں؟“

”ہیں نہیں لیکن ہو ضرور جائیں گی۔“ اس کی شاکی نظروں سے دیکھنے پر کہنے لگے۔ ”جب ہر با بوجھ اپنے دل پر اٹھائے پھیریں گی تو پاگل نہیں ہوں گی تو کیا ہوں گی۔؟ کوئی بات۔ کوئی پریشانی کوئی مسئلہ ہو تو کہہ ڈالا کیجیے۔“

”کس سے؟“ بلا ارادہ ہی اُس کے منہ سے نکل گیا۔

”مجھ سے۔“ ہو سکتا ہے میں آپ کی پریشانی کا کوئی حل نہ ڈھونڈ سکوں۔ لیکن کہہ دینے کے دل کا بوجھ ضرور ہلکا ہو جائے گا۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔ ”انسان کو ہر دور میں دوست، کسی ہمدم یا عکسار کی ضرورت رہتی ہے جب کہ آپ نے اپنے آپ کو بالکل تنہا کر لیا ہے۔ خوفزدہ ہیں، کہیں کوئی آپ کی زندگی کے اس راز کو پا نہ لے۔ کوئی جان نہ لے کہ بظاہر شہر و زاحم کے پر راج کرنے والی، حقیقت میں اس سے کتنی دور ہے۔ اور ربیع اکرام علی، کوئی جانے نہ جانتے میں ہوں ناں۔ بس پھر مجھ سے کیا پردہ داری؟ کیا آپ مجھ سے بھی خائف ہیں؟“

وہ کیا کہتی، خاموشی سے سر جھکا لیا۔

”اس طرح تو بہت مشکل ہو جائے گی ربیع۔ آپ کے لیے اور میرے لیے بھی۔ آپ بس میرا ہاتھ لیں کہ جب تک اس گھر میں ہیں۔ میں آپ پر کوئی آغ نہیں آنے دوں گا۔“ انہوں نے پکیٹ سے نکال کر ہنٹوں میں دیا۔ پھر دو تین کش لینے کے بعد کہنے لگے۔

”اپنے دل سے ہر خوف نکال دیں۔ اور میں تو یہاں تک کہوں گا کہ کچھ وقت کے لیے عہد رفتہ۔ ناما تو کر بالکل آزاد ہو جائیں۔ پھر دیکھیے زندگی کتنی سہل ہو جاتی ہے۔ اور زندگی سہل ہو جائے

وہ چمک جاتے ہیں۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں ناں؟“ اس نے کوئی جواب نہیں دیا، نہ ہی سر کو باریک نظر سے دیکھا۔

”نہیں۔“ انہوں نے کہا تو وہ بڑی مشکلوں سے پکڑوں کو ذرا سا اٹھا سکی۔

”ہم اچھے دوست تو ہو سکتے ہیں ناں؟“ اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔ ”اور پھر دوست ایک دوسرے سے کوئی بات چھپایا نہیں کرتے۔ آپ بھی آئندہ کوئی بات اپنے تنگ محدود نہیں چھپائی سمجھیں آپ؟“ میں اور میرے ساتھ اس گھر کا ہر فرد آپ کو خوش دیکھنا چاہتا ہے اور یہی صورت مان ہے، جب آپ سارے اندیشوں، ساری پریشانیوں سے نکل آئیں۔“

”کیا ایسا ممکن ہے؟“ اُس نے سوچا۔

”ہر بات ممکن ہے۔“ وہ جیسے اُس کی سوچ تک رسائی حاصل کر گئے۔ آپ کو شش تو کریں۔ اب ہی دیکھیے، اس گھر میں ایک خوشی کی تقریب ہونے والی ہے بلکہ آپ کے لیے تو ڈبل خوشی ہے کہ ایک دن اکو تادیور اور دوسری طرف بہن۔ پھر بھی آپ کرے میں بند ہو کر اپنی آگ تھک دینا بسائے چیں ہیں۔ اس کرے سے باہر نکلیں نہ اور اُمی کے ساتھ پروگرام سیٹ کریں۔ اور کل تو آپ بھی اپنے تپن کے ساتھ آنے والی ہیں۔ وہ یوں آپ کو آگ تھک دیکھ کر کیا سوچیں گی؟“

”میرے خدائے میں کیا کروں؟“ وہ اپنے آپ سے اٹھنے لگی۔

”چلیے آئیں، باہر کا موسم خاصا خوشگوار ہے۔ آؤ تنگ پر چلتے ہیں۔ آپ کی طبیعت، بہل جائے گی، اُسے۔“

”اُن کے اصرار پر وہ اُٹھ کر اُن کے ساتھ چل پڑی۔ پھر اچانک خیال آیا تو اپنے آپ پر نظر ڈالتی ہوئی بولی۔

”میں ڈریس چینج کر لوں۔“

”انہوں نے رک کر اسے دیکھا، پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

”ہاں۔ میں باہر انتظار کر رہا ہوں، آپ جیت کر آجائیں۔“

وہ جلدی سے الماری کی طرف بڑھ گئی۔ پھر جب تیار ہو کر باہر آئی۔ تو وہ گاڑی کے پاس کھڑے تھے۔ اسے دیکھتے ہی انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ قدرے جھجکتی ہوئی بیٹھ گئی۔ تو انہوں نے دوسری طرف سے اُگڑا بیج سیٹ سنبھال لی۔

”کہاں ملیں؟“ گاڑی اشارت کرتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

”میں کیا بتاؤں؟“

”کوئی ایسا جگہ جہاں جانے کی خواہش ہو۔“ انہوں نے مریوں سیٹ کیا کہ وہ لگا ہوں کی زد میں آگئی۔

”اگر میں کہوں مجھے سیدھا اور جانے کی خواہش ہے تب۔؟“

وہ اُس کے بچے میں بھی سی شرارت مسوس کر کے ہنس پڑے۔ پھر کیسٹ آن کرنے کے ساتھ گاڑی کی اسپر بھی بڑھا دی۔

شام کی فرصت بخش ہوا، اُس کے چہرے کو چھو کر بالوں سے اٹھیلیاں کرنے لگی تھی۔ اس وقت اس نے ملری میں بالوں کو یوں ہی کھلا چھوڑ دیا تھا۔ جواب فاصہ پریشان کر رہے تھے۔ کبھی اُس کے چہرے پر چلے آتے اور کبھی اُن کے کندھے کو چھو کر آنکھوں کے سامنے لہرا جاتے۔ اس صورت حال سے وہ خاصی زبردست ہو گئی۔

دیر نہ نظر تو اسے انہیں دیکھا۔ ان کے ہونٹ دکھش مسکراہٹ کی گرفت میں تھے اور آنکھوں میں ایک اٹھکا رنگ جسے وہ کوئی نام نہ دے سکی۔

بہت غیر محسوس طریقے سے اس نے اپنی طرف کا شیشہ بند کر دیا۔ تو آوارہ پنجہ کی مانند اڑتے بالوں کو جیسے ٹھکانا مل گیا۔ جو جہاں تھا، وہیں ساکن، جیسے یہی منزل ہو۔ یہیں بسا۔ پھر اُس نے بہت آہستگی سے بالوں کو کیش کیا۔ اور وہ جو اس کے بالوں سے اٹھتی تھک میں اپنا آپ فراموش کیے ایک نیا جہاں آباد کیے بیٹھے تھے،

ایک دم چونک گئے۔ اس کے وجود سے چھو کر آتی ہوائیں اب بند شیشے سے ٹکرا کر واپس پٹ رہی تھیں۔  
 شیشے کیوں بند کر دیا؟۔ ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”بس یونہی۔“

جب آپ ہر کام بس یونہی کرتی ہیں تو اس وقت یونہی اپنی خاموشی بھی توڑ دیجیے۔ میرا اب تک نہ سکا کہ آپ واقعی کم بولتی ہیں یا مجھ سے بات کرنا پسند نہیں کرتیں؟  
 یہ دونوں باتیں نہیں ہیں۔

”پھر؟“

”پھر یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آپ سے کیا بات کروں؟۔ وہ سادہ سے لہجے میں بولی۔  
 کرنے کو تو بہت سی باتیں ہوتی ہیں۔ موسم کی، رنگوں کی، روشنیوں کی اور خوشبوؤں کی۔“

”کر کہنے لگے۔“ اور دل کی باتیں۔“  
 ہاں کرنے کو تو واقعی بہت باتیں ہوتی ہیں لیکن میں ڈرتی ہوں، کہیں کوئی ایسی بات نہ کر جاؤں جو آپ ناگوار مگر رہے۔“

”ارے۔“ وہ ایک دم اسپنڈ آہستہ کر کے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ”آپ ڈرتی ہیں؟“  
 ”جی۔ اس لیے کہ آپ کے موڑ کا پتا نہیں چلتا۔ کبھی دوستوں کے دوست اور کبھی دشمنوں کے دشمنوں کے ان کے خاموش رہنے پر پوچھنے لگی؟ ایسا کیوں ہوتا ہے، آپ اچانک ایسا رویہ بدل کیوں لیتے ہیں؟ اصل میں جب میں آپ کو سوچتا ہوں تو سب اچھا لگتا ہے اور جب کس اور کا خیال آتا ہے تو کچھ نہیں لگتا۔ وہ شاید بے خیالی میں کہہ گئے تھے۔ فوراً احساس ہوا تو سنبھلتے ہوئے بولے۔“ خیر چھوڑ اب ایسا نہیں ہوگا۔ اب آپ سے دوستی بچی ہے نہ ناں؟“

”آس نے مسکرا کر سر جھٹک لیا۔ پھر جب انہوں نے گاڑی پارک کر کے آسے اترنے کے لیے کہا، تب نے سر اٹھایا۔ اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی۔ یہ جگہ اس کے لیے قطعی اجنبی تھی، اس لیے کچھ سی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔“

”میں اس کلب میں اکثر آتا ہوں۔“ وہ گاڑی لاک کر کے اس کی طرف آئے تو کہنے لگے۔ ”اسنوکر کھیلنے کا ڈیز۔ آئیے آج میں آپ کو اپنے دوستوں اور ان کی بیگمات سے ملواؤں۔ بہت دنوں سے سب امرا رہے تھے کہ میں آپ کو لے کر آؤں۔“ وہ کچھ نہیں بولی، چپ چاپ ان کے ساتھ چل پڑی۔ گیٹ سے دا ہو کر روش پڑی وہ کچھ دور ہی چلے تھے کہ لان میں سے ایک لڑکی نے زور سے پکارا اور پھر بھاگتی ہوا بلاٹھ بھلاٹھ کر دونوں کے سامنے ان کھڑ ہوئی۔

”اٹنے دنوں سے کہاں غائب تھے؟۔ بہت بے تکلفی سے اُن سے پوچھ رہی تھی۔

”کچھ مصروف رہا۔“

”کیسی مصروفیت۔؟“

”آس پر نظر پڑی تو اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

”یہ کون ہے؟“

”کون ہو سکتی ہے؟۔ وہ اُنٹا اُنسی سے پوچھنے لگے۔  
 ”ہوں۔“ وہ لڑکی پرسوج انداز میں کبھی اسے اور کبھی انہیں دیکھنے لگی۔ پھر مسکراتے ہوئے بولی۔  
 ”گرل فرینڈ تو نہیں کہہ سکتی، کیونکہ تم اس لفظ سے بہت چڑھتے ہو۔ اور یونہی کسی لڑکی کو لے کر گھومنا تمہاری عادت نہیں۔ اس سے یقیناً کوئی خاص نسبت ہوگی۔“

”زیادہ تہید باندھنے کی ضرورت نہیں۔ شی آزمائی واقع۔“

”ہاؤ سویت!۔“ وہ لڑکی چلائی۔ ”آخر ہمیں ان کے روشن کی سعادت نصیب ہو ہی گئی۔ نام کیا ہے

”ریچ۔“ پھر آس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”اور ریچ! یہ بدترین لڑکی سونیا ہے۔ ایک

”سوٹ لکھلا کر نہیں پڑی۔“

”ذرا غور کرو ریچ۔ بدترین بھی اور اچھی بھی۔“

”انہیں مخاطب کرنا فضول ہے۔ تمہاری ہر بات کا جواب ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے دیں گی۔“ درپردہ

”ہر ڈال۔“

”کیوں، بولی نہیں سکتیں کیا؟۔“ سونیا بغور اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”بولتی ہیں لیکن تمہاری طرح نہیں۔“

”کچھ دن میرے پاس چھوڑ دو۔“ فر فر بولنا سکھا دوں گی۔“

”نہا۔“ یہ ایسے ہی ٹھیک ہیں اور اب تم راستہ چھوڑ دو تو ہم اندر جائیں۔“

”چلو۔ میں بھی چل رہی ہوں۔“ وہ ایک طرف ہٹ کر شہ وز کے ساتھ چلنے لگی۔ ہال کمرے میں کافی

”تھے۔ کچھ اسنوکر کھیلنے میں مصروف کچھ کارڈز۔ اور خواتین دائرے کی شکل میں رکھی کرسیوں پر بیٹھیں،

ایک دوسرے کے ملبوسات اور جیولری پر تبصرہ کر رہی تھیں۔

”آس کے لیے یہ جگہ۔ یہ ماحول قطعی اجنبی تھا۔ وہ خوفزدہ تو نہیں تھی، پھر بھی ان اجنبی لوگوں کے دریا

”نے ہوئے بے اختیار ان کا بازو متھام لگی۔

”آس نے دیکھا شہ وز احمد اور ان کے ساتھ آسے دیکھ کر سب لوگوں میں ہلچل مچ گئی تھی۔ سب ان کی طرف

”بہ ہو گئے۔ اور خواتین میں سے اکثر لڑکیاں اٹھ کر ان کے پاس چلی آئیں۔ انہوں نے ایک ایک سے اس

”ارٹ کر دیا۔ جواب میں کچھ تعریفی جملے، کچھ برجستہ، کچھ رشک بھری نظریں اور کچھ حسد لیے ہوئے۔

”ب کچھ بس محسوس کر رہی تھی۔ اور جب موقع ملا تو سرگوشی میں بولی۔

”واپس چلیں۔“ انہوں نے بس سر ہلایا اور کچھ دیر بعد کسی ضروری کام کا بہانہ کر کے معذرت کرتے ہوئے

”ٹھٹھے ہوئے۔

”آپ کو شاید اچھا نہیں لگا۔“ واپسی میں اس سے کہنے لگے۔

”اچھا نہ برا، بس کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اور اپنا آپ اجنبی۔“

”آہستہ آہستہ اجنبیت دور ہو جائے گی۔“

”لیکن میرا دوبارہ یہاں آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

”کیوں؟“

”اس کیوں کا جواب گھر آنے پر دوں گی۔“ آس نے کہا تو وہ کچھ سوچ کر خاموش ہو گئے۔ لیکن گھر کے سامنے

”ماروکتے ہی کہنے لگے۔

”ہاں۔ اب اس کیوں کا جواب دیں۔“ اس نے پھر کو ان کی طرف دیکھا پھر سامنے گیٹ پر نظر میں جاتی ہوئی بولی۔

”کیوں کا جواب یہ ہے کہ مجھے وہاں کچھ بھی اچھا نہیں لگا۔ اس لیے دوبارہ نہیں جاؤں گی اور آپ کو بھی جانے

”ازت نہیں دوں گی۔“

ڈرامہ دیکھ رہے تھے۔ اُن کی تلاش نظر بہادر اور اُسر سے ڈھونڈنے لگیں۔ اصل میں وہ دیکھنا چاہتے تھے  
نے یہ جی ان کی بات لوٹائی ہے یا کسی نئے احساس سے آشنائی ملی ہے۔ کوئی نیا جذبہ جاگا ہے۔ وہ انداز  
کے ساتھ نہیں تھی اور وہ اسے کھوجتے ہوئے اپنے کمرے میں بیٹھے لیکن وہ وہاں بھی نہیں ملی۔

”عجیب لڑکی ہے۔“ سوچتے ہوئے وہیں بیٹھ گئے۔ آخر اسے یہیں آنا تھا لیکن اس سے پہلے ذرا  
کے لیے بلانے آگئی۔ وہ اُنھ کے ساتھ چل پڑے۔ ڈانٹنگ روم میں وہ اتنی کے ساتھ موجود  
اس کے برابر بیٹھے تو وہ لائق نظر آنے لگی۔ اور وہ باوجود کوشش کے اس کی کیفیت جان نہ پائے۔  
سے کھانا کھا کر اُٹھے اور کمرے میں آکر پھر اس کا انتظار کرنے لگے۔

اور وہ واقعی ان کا سامنا نہیں کرنا چاہا۔ رہی تھی۔ بار بار سوچتی، پتا نہیں وہ کیا کہہ گئی ہے اور پتا نہیں  
نے کیا سمجھا ہو۔ اور اب جب ان کے سامنے جائے گی، تو پتا نہیں وہ کیا کہیں گے۔ بس یہی سب  
کہ وہ رات بہت دیر تک نڈا کے پاس بیٹھی رہی اور جب یقین ہو گیا کہ وہ سوچے ہوں گے۔ تب اُٹھے گا  
کہہ رہی تھی کہ وہ اسے پکارتے ہوئے وہیں آگئے۔

”ریجہ۔ آپ ابھی تک سوئی نہیں؟“  
”جی۔“ وہ کچھ حیران سی ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے معمول کی بے قابو  
ٹوکا ہو۔

”اتنی دیر تک جاگتی ہیں، جب ہی بیمار پڑ جاتی ہیں۔ چلیں جا کر سوئیں اور نڈا تمہیں اتنی دیر تک جاگنے  
کس نے دیا ہے؟“

”سوری بھائی جان۔ بس اب سوری ہوں۔“  
نڈا نے نگہ سیدھا کرتے ہوئے اسے بھی جانے کا اشارہ کیا تو وہ جلدی سے اس کے کمرے سے  
آئی۔ اپنے کمرے میں داخل ہوئی تھی کہ وہ بھی سر پو پہنچ گئے۔ اس سے پہلے کہ کچھ کہتے وہ بول  
”جب دوستی نبھا نہیں سکتے تو کتنے کیوں ہیں؟“  
”کیا مطلب؟“ وہ نہیں سمجھے۔

”شام میں آپ نے مجھ سے پئی دوستی کی تھی۔ اور کہا تھا آئندہ موڈ خراب نہیں ہوگا پھر۔“  
”آپ نے ایسا موقع کیوں فراہم کیا؟“  
”میں نے کیا کیا ہے۔ بس نڈا کے پاس ہی تو بیٹھ گئی تھی۔“

نڈا کے پاس بیٹھ گئی تھیں۔ اور جو میں یہاں انتظار کر رہا تھا۔ وہ بے اختیار کہہ گئے اور وہ ایک  
میں آگئی۔

”مجھے آپ سے کام تھا۔“ شاید احساس ہو گیا تھا کہ کچھ غلط کہہ گئے ہیں۔ یا پھر قبل از وقت اس نے  
بنانے کی غرض سے بولے۔

”کیا کام تھا؟“  
”تھا۔ اب نہیں ہے۔“ جھنجھلا کر بولے۔

”آئی ایم سوری۔ آپ اسی وقت بلا لیتے۔“ وہ شرمندہ ہوتی ہوئی بولی۔  
”میرا خیال تھا آپ کوئی ضروری کام کر رہی ہوں گی۔ اس لیے نہیں بلایا۔ خیر اب سو جائیں۔“

اسٹڈی کی طرف جانے لگے کہ وہ پکار کر پوچھنے لگی۔  
”آپ خفا تو نہیں ہیں؟“ انہوں نے طویل سانس لے کر نفی میں سر ہلایا اور اپنے کمرے میں چلے گئے

اگلے دن آس کی بڑی نند آپنی ہمہ اپنے بچوں کے آئیں تو گھر میں ایک خوشگوار سی ہلچل مچ گئی۔ بچوں نے  
ہی آدھم چھانا شروع کر دیا۔ آپنی اتنی سے مہرزدی سنگنی اور پروگرام کی تفصیل معلوم کرنے لگیں اور وہ جرات سے

پتھی کہ اب اپنے خول میں بند نہیں رہے گی۔ اب واقعی اس خول سے نکل آئی تھی۔ پروگرام میں پیش پیش ہر  
میں مشورہ دیتے۔ اس کا اپنا گھر ہو۔ آپنی کے تینوں بچے عام، شانی اور روبی بار بار اس کے مرد منڈلاتے اور  
بیت محبت سے ان کی بات سنتی اور معصوم شرارتوں پر کھلکھلا کر ہنستی رہی تھی۔

بیت محبت کے کھانے کے بعد جب وہ کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے لیٹی تو اپنے آپ کو بہت فریش  
دوسرے کھانے میں محسوس کر رہی تھی۔

”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول  
”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول

”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول  
”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول

”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول  
”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول

”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول  
”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول

”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول  
”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول

”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول  
”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول

”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول  
”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول

”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول  
”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول

”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول  
”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول

”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول  
”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول

”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول  
”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول

”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول  
”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول

”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول  
”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول

”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول  
”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول

”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول  
”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول

”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول  
”ٹھیک تو کہتے ہیں شہر و زائد کہ میں نے اپنے آپ کو بالکل تیار کر لیا ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔ اپنے خول

ابھی۔ ”وہ مسکرائے۔“ اور آتے ہی معلوم ہوا کہ آپ ہمارے لیے کوئی خاص ڈش تیار کر رہے ہیں۔ آپ کے لیے نہیں، بچوں کے لیے۔“ اس نے مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا۔  
”چلیے۔ تو ہم صرف چائے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔“ انہوں نے کپ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ تو اس نے کچھ کھینچ لی۔

”یہ چائے بھی آپ کے لیے نہیں ہے۔“  
”ارے تو کیا میں آپ لوگوں کو دیکھتا رہوں گا؟“  
”دیکھنے پر بھی پابندی ہے۔“

”یہ پابندی قبول نہیں کروں گا۔“ اسے نظروں کی گرفت میں لیتے ہوئے بولے تو وہ جوا عتاؤ سے رہی تھی، زور ہو گئی، غیر محسوس طریقے سے رخ موڑ کر بچوں کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔  
”چلو بیٹا۔ آپ کسٹرڈ لیں۔“ دونوں بچے ٹیبل کے پاس آ بیٹھے۔ تو ان سے کہنے لگے۔  
”ماموں جانی آپ نہیں لیں گے؟“

”نہیں بیٹا۔ یہ میرے لیے نہیں ہے۔“  
”آپ۔“ کے لیے بھی ہے۔ وہ اسی طرح رخ موڑے ہوئے بولی۔  
”کیا چیز؟“ وہ بچوں کو کھانے کا اشارہ کر کے پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔  
”یہ کسٹرڈ۔“ وہ فوراً پلٹ کر بولی۔  
”اور۔۔۔؟“

”اور یہ چائے بھی۔“  
”اور۔۔۔؟“

”اور۔“ اس نے دہرایا اور ان کی طرف دیکھنے لگی۔  
وہی دلفریب مسکراہٹ جوان کے ہونٹوں پر ٹھہرتی تو مقابل اپنا ہوش بھلا دیتا ہے۔  
وہی رنگ جوا انھوں میں آرتے تو مقابل سارے محاذوں پر ہتھیار ڈال دیتا۔  
روشنی سی روشنی جوا انھوں سے پھوٹتی تو منزل کے بے نشان راستوں کو منظور کرتی چلی جاتی تھی۔  
اور۔

چاہتوں کے رنگ، اپنی طرف بلاتے ہوئے اور مقابل تو وہ تھی جسے پہلے ہی اپنا آپ بھلا دینے لاق تھا۔ کبھی کہیں کوئی ایک رنگ جو اچانک توجہ کھینچتا اور انھوں کے رستے دل میں اتر کر گرد و پیش کر دیا کرتا۔ پھر یہاں تو رنگوں کی برسات آتری تھی۔ وہ نیلے اپنے آپ میں رہتی۔ کچھ یاد نہیں رہا، وہ اور مقابل کون ہے؟ بس ایک شک انہیں دیکھ گئی۔ اور وہ کافی حد تک اس کی عادت سے واقف ہو چکے تھے یوں گم صدمہ دیکھا، توجہ جان گئے، اپنے آپ میں نہیں رہی۔ لیکن یہ زبان کے کس کس بات نے اسے بنایا ہے۔ کتنی دیر تک چپ چاپ بیٹھتے دیکھتے رہے۔ شاید خود ہی شہیل جائے، لیکن وہ ۴۱ کھڑی تھی۔ وہ اسے چڑکاتا نہیں چاہتے تھے، لیکن اس خیال سے کہ کہیں اچانک کوئی آند جائے۔  
وہ ڈالی۔  
”ریج۔“

”ہاں۔“ جیسے وہ خواب میں بولی۔  
”جیسی اس طرح کھڑے کھڑے تھک جائیں گی۔ بیٹھ جائیں۔“ اور ذرا سی پکلیں جھپکنے کی دیرتہ جیسے نیند سے بیدار ہو گئی۔

فرد ابھی احساس ہو گیا کہ پچھلے کئی لمحوں سے ان کے ساتھ اسی طرح کھڑی ہے۔ دل ہی دل؟ محسوس کرنے کے ساتھ اپنے آپ کو ملامت کرتی ہوئی اسی طرح کمرے سے نکل آئی جب کہ وہ پیچھے

تھے۔  
”اچھا دن جمعہ تھا اس لیے، یا پھر آجی کے آنے سے رات دیر تک سب لوگ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ رہے۔ پکلی رنگوں کے ساتھ ہنسی مذاق میں کبھی کوئی نشانہ دیتا، کبھی کوئی۔ وہ بھی سب کے ساتھ شریک رہے۔ وہ بھی اب مہروز کے ساتھ اس کا ایک نیا رشتہ استوار ہو رہا تھا، اس لیے وہ زیادہ تر اسے ہی چھیڑتی رہے۔“

”وہ بھابی۔ اس نئے رشتے کے حوالے سے آپ مجھ سے چھوٹی ہو جائیں گی۔ پھر میں آپ کا لحاظ روں گا۔“ مہروز نے کہا تو وہ انھیں دکھاتی ہوئی بولی۔  
”خبردار میں بڑی ہی ٹھیک ہوں۔“  
”آپ کو بڑھانے کا شوق ہے؟“ بڑا پوچھنے لگی۔

”ہاں۔ ذرا رعب بڑھتا ہے۔ ویسے کوئی میرے رعب میں آتا نہیں ہے۔“ وہ ہنسی۔  
”کیوں مہروز۔ بھی تمہارے رعب میں نہیں آتے؟“ آجی نے پھر بڑا۔  
”تو کریں۔ یہ کسی کے رعب میں آنے والے ہیں؟“ اٹھا رعب جملتے ہیں۔ اور پتا ہے آجی فقے میں شکل اتنی خوفناک ہو جاتی ہے کہ۔

”کرتابل آجی سدا بہہ کھو بیٹھا ہے۔“ انہوں نے بات اچانک لی۔ وہ سمجھ گئی، کیا یاد دل رہے ہیں بچائی ہوئی بولی۔  
”ظاہر ڈر کے مارے بندے کی حالت ایسی ہو چکی جاتی ہے۔“

”میں مہروز۔ تمہیں پہلے تو اتنا غصہ نہیں آتا تھا۔“ آجی سنجیدگی سے پوچھنے لگیں۔  
”رے پھر بڑا آجی۔ آپ بھی کس کی باتوں میں آ رہی ہیں، یہ تو یونہی مذاق کر رہی ہیں۔“  
”میں مذاق نہیں کر رہی۔ بڑا سے پوچھیں۔ کیوں مہروز کل رات میں دیکھا نہیں تھا۔“ وہ اپنی بات پختہ ثابت کرنا چاہتی تھی۔

”ہیں بھابی۔ رات تو بھائی جان بس بوہنی خفا ہوئے تھے۔ ویسے آپ نے ان کا اصلی والا غصہ دیکھا ہے۔ جو کبھی کبھار آتا ہے۔“ وہ تصدیق کے لیے ان کی طرف دیکھنے لگی تو وہ ہنس پڑے۔ اسی طرح رات یہ فیصل بھی رہی۔ پھر جب نیند آنے لگی تو سب اٹھ گئے۔  
”برے سونے کی وجہ سے صبح کوئی بھی معمول کے مطابق نہیں اٹھا۔“ دس بجے سب ناشتے کی میز پر بیٹھنے لگا ہونے لگیں۔

”تہائی غیر ذمہ دار ہوتا ہے۔ معلوم بھی ہے آج کتنے کام ہیں۔ پھر بھی اتنی دیر تک سوتے رہے ہو۔“  
”سب کام ہو جائیں گے۔ آپ فکر کیوں کرتی ہیں۔؟“ انہوں نے اطمینان دلایا اور سب سے پہلے ناشتا اٹھ کھڑے ہوئے۔

”پھر سارا دن مصروف گزرا۔ اتنی کسی طرح مطمئن نہیں ہو رہی تھیں۔ کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ اسی سے بار بار ہر چیز کو نئے سرے سے چیک کر رہی تھیں۔ دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کر کے اور وہ اپنی اپنی تیاری میں لگ گئیں۔ وہ اس وقت بہت مگن تھی۔ شاید تمام اندیشے جو کہیں پل میں بیٹھ گئے تھے، وہ کہیں پس منظر میں جا چکے تھے یا اس نے خود ہی کہیں پیچھے دھکیل دیے تھے۔ وہ ہتکام سے تیار ہوئی۔ آئینے میں اپنا آخری جائزہ لے رہی تھی کہ ندادروانے میں پکار کر کہنے لگی۔  
”بلدی آئیں بھابی۔ سب تیار کھڑے ہیں۔“

”رہی ہوں۔“ اس نے کہا اور پرفیم اسپرے کر کے کمرے سے نکل آئی۔ لاؤنج میں کوئی بھی موجود نہیں اس نے نگاہیں ڈور سے باہر نظر ڈالی۔ اتنی گاڑی میں سامان رکھوا رہی تھیں۔ وہ باہر نکلتا چاہتی تھی۔ بلبل نے اس کے قدم روک دیے۔ کوئی اور موجود نہیں تھا۔ اس لیے مجبوراً اسے ہی پلٹنا پڑا۔

”ہیلو۔“ ریسورکان سے لگا کر اس نے بڑی عجلت سے کہا۔  
”میرے خدا۔ میں بڑی شدت سے دعا مانگ رہا تھا کہ تمہاری ہی آواز سننے کو ملے۔ یہ میں ہوں  
ثاقب حسن۔“

”آئی ایم سوری ثاقب حسن۔ میں اس وقت بالکل بات نہیں کر سکتی۔“ اس نے عجلت میں کہہ کر ریر  
دیا اور تیز ترین قدموں سے باہر نکل آئی۔  
”آپ کہاں رہ رہ گئی تھیں؟“ خروڑا حمد اس کے سر پرے میں الجھتے ہوئے پوچھنے لگے۔  
”وہ۔ فون۔“ بے خیالی میں اس کے منہ سے نکل گیا۔  
”کس کا فون تھا؟“

”رانگ نمبر۔“ وہ جلدی میں کہہ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔  
اماں کے گھر میں ایک خوشگوار پلن مچی ہوئی تھی۔ بڑے ماموں اور چچا چچی اپنی فیلینز کے ساتھ  
وہ سب سے مل کر اندر چھوٹی آپا کے پاس آگئی۔ بڑی آپا ان کے بالی سلجھا رہی تھیں۔ آستے دیکھنا تو  
کے ہاتھ میں تھا دیا۔

”نور بیچ۔“ یہ کام تم کرو مجھے اور بھی بہت کام ہیں، بڑی آپا اپنی بات کہہ کر کمرے سے نکل  
لاؤں میں خود ہی سلجھا دیتی ہوں۔“ چھوٹی آپا نے برتن لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے ان کا ہاتھ  
تھام لیا۔

”چھوٹی آپا۔ میں بہت خوش ہوں۔ اپنے ہاتھوں سے آپ کو سنواراؤ گی۔“  
”کیوں میں خوش نہیں ہوں۔“ چھوٹی آپا کا بوجھ سپاٹ اور افسردہ تھا۔  
”ارے کیوں؟“ وہ ان کے برابر بیٹھ گئی۔

”اپنی کم مائیگی کا احساس اور۔“  
”چھوٹی آپا پلیز۔“ اس نے ٹوک دیا۔ آخر میں بھی تو اس گھر میں گئی ہوں۔ کبھی کسی نے غلطی سے  
جتنا کہ میں ان کے مقابلے میں کم حیثیت ہوں۔ سب محبت کے ساتھ اتنی عزت دیتے ہیں کہ میں اپنے آپ پر  
بوجھاتی ہوں۔“

”تمہاری بات اور ہے۔“  
”کیوں؟“ میری بات اور کیوں ہے؟“  
”تمہیں وہ محبت اور چاہت سے مہیا کر کے گئے تھے۔ اور مجھ پر ترس کھا رہے ہیں۔“

”آپ نہیں سمجھیں گی چھوٹی آپا لیکن وقت آپ کو خود سمجھا دے گا۔ بس میری اتنی سی بات مان لیں کہ  
کے اندیشوں میں مت گھبریں۔ یقین کریں آپ وہاں بہت خوش رہیں گی۔“  
”جہاں۔“ نہ اسے دروازے پر دستک دے کر نکالنا تو وہ چھوٹی آپا کا کندھا تھکاتی ہوئی اٹھ کھڑا  
دروازہ کھولا تو نندا چھوٹی آپا کے کپڑے اور زیور وغیرہ لیے گھڑی تھی۔

”میں بھی اندر آ جاؤں؟“ نندا پوچھنے لگی۔  
”آ جاؤ۔“ نندا اندر آگئی تو اس نے دروازہ بند کر دیا۔

پھر دونوں نے مل کر چھوٹی آپا کو تیار کیا۔ پھر جب اماں نے کہا تو وہ انہیں لے کر بڑے کمرے میں آ  
جہاں اتنی نے گنگنی کی رسم ادا کرتے ہوئے انہیں انگوٹھی پہنائی اور ڈھیروں دعاؤں سے نوازا۔ اس کے بعد  
ہلکا چھلکا ہنگامہ جاگ اٹھا۔ ہنسی مذاق، ایک دوسرے پر چیمیزیں پھینکنا۔ فقرے بازی سب انجولنے  
رات کے کھانے کے بعد جب سب سے رخصت ہو کر وہ واپس آ رہی تھی تو بے حد مطمئن تھی۔

ایک عرصے کے بعد اس نے اماں اور بابا میں کو آنا غرض اور طمنی دیکھا تھا۔ اور وہ خود بھی تو چھوٹی  
لیے بہت سوچا کرتی تھی۔ کڑھا کرتی تھی۔ ان کی زندگی میں یہ خوشگوار سا موڑ اس کے لیے واقعی خوشی کا  
تھا اور اس خوشی میں وہ اپنے آپ کو بالکل فراموش کر گئی تھی۔ یہ بھی بھول گئی تھی کہ یہاں آنے سے پہلے

نندا آتا تھا۔ اور یہ بھی کہ آئندہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟۔ بس خوش تھی اور اندرونی خوشی کا عکس اس  
چہرے پر بھی چھلکارا تھا۔ ایک خوبصورت مسکراہٹ جو مستقل ہونٹوں پر ٹھہر گئی تھی۔ ہر کسی کی وقت ہنسی  
دھل کر جلتی رہی۔ بچا دیتی۔  
گھر آکر وہ کچھ دیر سب کے ساتھ بیٹھی تھی۔ پھر اپنے کمرے میں آئی تو سیدھی ڈورینگ روم میں چلی گئی آئینے  
اپنے آپ کو دیکھتی رہی۔ دل چاہا کہ کوئی سراہنے والا ہو۔ وارنٹکی سے کہے۔

”تمہاری آنکھیں۔“  
”تمہارے ہونٹ۔“  
”تمہارے بال۔“  
”تمہارا سراپا۔“

”اے یہ میں کیا سوچنے لگی؟ اپنے آپ کو ٹوکا اور جلدی سے ڈریس چینج کر کے نکلی تو کمرے میں شہر زاد  
بود تھے۔ اور یہیں بار ایسا ہوا کہ وہ ٹھٹکی نہیں، جھکی نہیں۔ پہلے ہاتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا، پھر آکر ان سے  
پتے لگی۔

”میرا اس وقت چائے پینے کا زبردست موڈ ہے۔ آپ پیئیں گے؟“  
”وہ یوں اس کی طرف دیکھنے لگے جیسے سوچ رہے ہوں کہ انہیں کیا جواب دینا چاہیے۔“  
”میرا خیال ہے اس وقت چائے پینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں ابھی بنا کر لاتی ہوں۔ وہ خود ہی کہتی ہوئی کمرے  
سے نکل گئی۔

”کچھ دیر کے بعد چائے لے کر آئی تو وہ اطمینان سے ٹیبل پر ٹانگیں سیڑھی کیے بیٹھے تھے۔ اس نے ایک  
س انہیں تھمایا اور کنارے والے صوفے پر جا بیٹھی۔  
”تھک گئی ہیں؟“ وہ پوچھنے لگے۔

”ہاں۔“ اس نے اعتراف کیا۔ اصل میں یہاں آکر میں بہت آرام طلب ہو گئی ہوں۔ اسی لیے ذرا ذرا سے  
ام میں تھکنے لگی ہوں۔“

”قدرتے تو وقت کے بعد کہنے لگی۔“ پتا ہے میرا دل چاہ رہا ہے۔ میں سو جاؤں۔ پرسکون نیند۔ اور ایک  
دل بہت تک لیے ہی سو رہوں۔ مجھے کوئی نہ چھیڑے، کوئی نہ اٹھائے۔“

”فرار چاہتی ہیں۔“ وہ اس کی طرف دیکھنے بغیر بولے۔  
”ہاں۔“ صاف گوئی سے بولی۔  
”فرار کا یہ راستہ یا طریقہ زور لانا ہے۔“

”اور میں بہت بزدل ہوں۔“ جواب ان کے جواب کی تصدیق کر دی۔  
”اور میں آپ کو بزدل نہیں دیکھنا چاہتا۔ کبھی بھی کسی بھی مقام پر، سمجھیں آپ۔“ وہ اتنی سنجیدگی سے بولے  
کہ کچھ دیر نہ سنی۔ خاموشی سے ان کی طرف دیکھتی رہی تھی۔

”زندگی میں بہت ساری باتیں ہماری مرضی کے خلاف ہو جاتی ہیں۔“ وہ کہنے لگے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں  
ہے کہ ہم ان پر زور کرتے رہیں۔ یا فرار کے طریقے سوچتے رہیں۔ اس کے برعکس ہمیں جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے  
دے انہیں نہیں کرنا چاہیے۔“

”نندا زور احمد پلیز۔ میں اس وقت کوئی لیکچر سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ وہ ڈرتے ڈرتے بولی کہیں انہیں  
ان کے جبکہ وہ ہنس پڑے۔

”آپ سے کچھ کہنا۔ ہمیں اس کے آگے مین بجانے کے مترادف ہے۔“  
”کیا مطلب؟“

”مطلب کو چھوڑیں۔ اور سو جائیں۔ لیکن طویل مدت کے لیے نہیں۔ صبح معمول کے مطابق اٹھ جائیے گا؟“

وہ آٹھ کھڑے ہوئے، پھر اپنے کمرے میں جلتے جلتے پلٹ کر بولے۔  
 ”اس بند خول سے نکل کر آپ اچھی لگتی ہیں۔ اسی طرح رہا کریں سب لوگوں کے ساتھ مل کر۔“  
 وہ ان کی طرف دیکھنا چاہتی تھی لیکن کوشش کے باوجود پلکیں نہ اٹھا سکی۔



شہر و زاحمد کچھ دیر تک اس کی جھکی جھکی پکوں کو دیکھتے رہے، جن کی ہلکی سی لرزش ان کے دل کو  
 کو ہلائے دے رہی تھی۔ خوابیدہ خواہشات اچانک بیدار ہونے لگیں تو بمشکل تمام اپنی ہر خواہش پر  
 باندھتے ہوئے وہ دروازے کے پیچھے غائب ہو گئے۔

اور۔

وہ جو سانس روکے بیٹھی تھی، دروازہ بند ہونے کی آواز پر پہلے پکوں کو ذرا سی حرکت دی اور اپنے  
 نہ پا کر طویل سانس لیتی ہوئی آٹھ کھڑی ہوئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے چاہا تھا کہ کوئی اسے سہرا ہے اور  
 گو کہ انہوں نے بہت زیادہ تعریف نہیں کی تھی۔ بس ایک جملہ، اور وہ جب لائے خوش ہونے کے، انہ  
 ہو رہی تھی۔

”ایسا کیوں ہوتا ہے؟“ اپنی جگہ پر لیٹی تو سوچنے لگی۔ کبھی کبھی انسان اتنا مجبور اور بے بس کیوں  
 جاتا ہے۔ اختیار ہوتے ہوئے بھی انہیں استعمال کرنے سے قاصر۔ ایک دیوار جو اول روز سے میر  
 اور شہر و زاحمد کے درمیان کھڑی کی گئی تھی، ہم اسے ڈھانے پر قادر کیوں نہیں؟ جبکہ اسے ڈھل  
 پھلا ٹھننے بلکہ صفحہ بہستی سے مٹانے کے سارے حقوق ہمارے پاس موجود ہیں۔ بس ایک الزام ہی  
 آئے گا مجھ پر بے وفائی اور ان پر خیانت کا۔“

”تو کیا تم اس دیوار کو ڈھانا چاہتی ہو؟“ اس کے اندر سے سوال اٹھنے لگا۔  
 ”میں؟“ وہ دھڑ دھڑ کرتے دل پر ہاتھ رکھ کر وہ حیران ہو گئی اور کوئی جواب ڈھونڈے سے نہ  
 ”تم میری محبت ہو۔“ اس پاس سرگوشیاں ابھرنے لگیں۔ زندگی کی طویل شاہراہ پر میں تمہارے  
 چلنے کا قصور بھی نہیں کر سکتا۔“

”میں تمہارا ہوں اور تمہارا رہوں گا۔ اور تم بھی ربیعہ اپنے آپ کو میری امانت سمجھو۔ تمہیں پانے  
 لیے اگر مجھے جان سے بھی گورنا پڑا تو گور جاؤں گا۔“  
 ”مناقب حسن۔“ ہونٹوں نے آواز جنبش کی۔ دل میں گزری محبتوں کا کوئی احساس، کوئی ملال نہیں با  
 تھا۔ پھر بھی جانے کیوں آنکھوں میں پانی اتر آیا۔

”دیکھو۔ رونے کی کوشش مت کرنا۔“ وہ جسے ایک دم سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ صاف  
 کی دھول میں اٹا ہوا تھا۔ آنکھوں کے وہ روشن دیپ جو کبھی ہی زندگی کا پتا دیتے تھے، ماند پڑے  
 تھے کچھ ٹوٹا ہوا سا۔ کچھ شکستہ سا کھڑا کھڑا تھا۔  
 ”جن آنکھوں میں محبتوں کے دیپ جلتے ہوں، ان میں پانی نہیں اترنا چاہیے۔ اور تم ربیعہ۔ محبتوں  
 دیپ کبھی بجھنے مت دیتا۔“

”مناقب حسن۔“ دل ہی دل میں اسے مخاطب کر کے کہنے لگی۔  
 ”گو کہ میں نے اپنے احساسات و جذبات کو تھپک تھپک کر سلا دیا تھا، زندگی کی ساری رنگینیاں  
 آپ پر حرام کر لیں، پھر بھی میں فرشتہ نہیں ہوں اور نہ ہی پتھر کی کوئی بے جان مورت کہ کوئی احساسات  
 نرمی سے چھوئے اور میں چمکوں نہ۔ کوئی آنکھوں میں وارنگلیاں سما کر دیکھے اور دھڑکنیں منتشر نہ ہوں  
 کیسے ممکن ہے بھلا۔؟ اور کوئی بھی کون، شہر و زاحمد۔ جو جہاں کھڑے ہو جائیں تو اس پاس کے  
 ماحول کو بھی رشک آنے لگتا ہے۔ جو جس پر نظر ڈالیں، وہ معتبر ہو جائے۔ پھر میں تو بہت کمزور لا

دل سی لڑکی ہوں۔ ساتھ ہی دترے دترے میں حسن تلاش کر کے اس میں کھو جھلنے والی اور شہر و زاحمد  
 نہیں آفتاب ہیں۔ خدا گواہ ہے میں نے ان میں حسن تلاش کرنے کی سعی کبھی نہیں کی۔ ان کا ہر روپ  
 اپنے اندر ایک حسن لیے ہوئے ہے۔

ایک ذرا سی سکراہٹ جو مجھے دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر ٹھہرتی ہے تو لگتا ہے جیسے ہر ایک شے  
 میری دوست اور ہمنما ہو گئی ہو۔  
 ایک ذرا سی کلیر جوان کی صبیحہ پیشانی پر نمودار ہو جائے تو سب دشمن۔

اور۔

ایک ہلکی سی فغلی جو کبھی ان کے بچے میں اتر آئے تو کائنات کا ذرہ ذرہ مجھ سے خفا ہو کر مجھے شدید  
 تنہائی کا احساس بخش جاتا ہے۔

یقین کرو ثاقب حسن۔ میں اول روز سے اپنے آپ سے لڑ رہی ہوں۔ پہلے مجھے تمہارے اس  
 اندام نے دھچکا پہنچایا کہ میرے حصول کے لیے تم نے بہت غلط طریقہ استعمال کیا۔ بمشکل تمام اپنے  
 آپ کو سمجھایا۔ سمجھوئے پر آمادہ ہوئی تو شہر و زاحمد اپنی تمام تر سرگمیزیوں سمیت مجھ پر چھلانے لگے۔  
 میں ان سے اور ان کی ذات کی تمام ظاہری و باطنی خوبیوں سے نظریں چراتے چراتے تھک گئی اور اب  
 اس مقام پر مجھے نگ رہا ہے، میں باگمی ہوں۔ ہاں ثاقب حسن، میں بارگمی ہوں۔ مزید اپنے آپ سے  
 نہیں لڑ سکتی۔ اور تم پلیز مجھے الزام مت دینا کہ مجھے اس راستے پر کھڑا کرنے والے تم خود ہو۔“

”اس نے دونوں ہتھیلیاں آنکھوں پر رکھیں تو احساس ہوا کہ آنکھوں کا پانی روانی سے بہہ رہا ہے۔  
 ”جن آنکھوں میں محبتوں کے دیپ جلتے ہوں، ان میں پانی نہیں اترنا چاہیے۔“ اس نے کہا تھا او  
 اب وہ بہہ رہی تھی۔

”میں ان دیپوں کو بجھا رہی ہوں۔ جنہیں تم نے جلایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ٹیکے میں منہ چھپا کر  
 روتی چلی گئی۔

ثاقب حسن نے اپنے گھر اپنے وطن اپنی مٹی سے دور جانے کا فیصلہ محض اس لڑکی ربیعہ اکرام  
 کی خاطر کیا تھا تاکہ جلد سے جلد کوئی مقام حاصل کر سکے اور پھر اپنے مسائل سے نکل کر اسے اپنا سک  
 اگر اس کا خیال نہ ہوتا تو وہ کبھی اپنے گھر سے دور نہ جانا لیکن صرف اس کی خاطر اس نے یہ بن باس قبول  
 کیا۔ وہ اس سے بڑی شدید محبت کرتا تھا۔ اور جیسا کہ اس نے کہا تھا کہ وہ اسے پانے کے لیے کچھ بھی  
 کر سکتا ہے تو اس نے اپنا کہا پرچ کر دکھایا تھا۔ جس گھر اور ماحول میں رہ کر وہ اس کا انتظار نہیں کر  
 سکتی تھی۔ وہ اسے اس گھر سے ہی نکال لایا۔ یوں کہ اس پر کوئی آپج نہ آئے۔ اور پھر یہ یقین تے کر  
 گیا کہ وہ برس دو برس تو کیا، ہزار برس بھی اس کا انتظار کر لے گی۔

وہ اتنا طویل انتظار تو اسے نہیں دینا چاہتا تھا۔ کیونکہ خود بھی اس سے جراثیم برداشت نہیں کر  
 پا رہا تھا۔ لیکن کیا کرتا، مجبور تھا اسے پانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ نہ صرف کسی اچھے مقام پر کھڑا ہو  
 بلکہ اپنے مسائل سے بھی آزاد ہو چکا ہو۔ اور اس کے لیے وہ دن رات محنت کر رہا تھا۔ اپنوں سے دور  
 احتیاج کے دیس میں جب فراغت کے لمحے میسر آتے تو وہ انہیں اس کے نام کر دیتا۔ اس کے سنگ  
 گذرے لمحات اس کی زندگی کا حاصل تھے۔

اس کا دھیرے دھیرے چلنا اور دھیمے دھیمے بولنا۔  
 کبھی لبوں کا بے اختیار مسکراتا اور کبھی آنکھوں کا بے اختیار جھپک جانا۔  
 وہ اس کی ایک بات، ایک ایک ادا سوچا کرتا۔ اور کبھی جب اسے سوچتے ہوئے دل کی  
 بے قراری بواہ ہو جاتی، اسے دیکھنے کو دل چھنے لگتا تو وہ فون کا سہارا لیتا۔ اس کی آواز سنتے ہی دل



بلے قرار کو قرار آجاتا۔ لیکن ادھر کچھ عرصے سے اسے یہ قرار بھی نصیب نہیں ہو رہا تھا۔ پہلی بار جب اس نے کہا تھا کہ تمیں بات نہیں کر سکتی تو وہ اسے اس کی کوئی مجبوری سمجھا تھا۔ باتیں سو میں۔ ہو سکتا ہے شہر وزکی والدہ وہاں موجود ہوں یا کوئی بہن یا کوئی اور جس کے سامنے بات نہ کر سکتی ہو۔ لیکن آج جب کہ وہ بے حد غصہ تھا۔ اس کی بڑی دونوں بہنوں کی شادی تھی ایک طرح سے وہ اپنے اہم فرائض سے سبکدوش ہو رہا تھا۔ اور یقیناً یہ اس کے لیے غشی کی بات تھی اور غشی میں وہ اسے بھی شریک کرنا چاہتا تھا۔

صبح ہی سے کال بک کرانی تھی اور سارا دن دھا کر رہا کہ فون وہی رسیو کرے۔ اس کی دھڑکن مٹا ضرور ہوئی لیکن ایک بار پھر اس نے کہہ دیا۔  
”میں بات نہیں کر سکتی۔“

اس کے بچے میں مجبوری ہوتی تو وہ اپنے آپ کو سمجھا لیتا۔ اس کے برعکس بھڑائی جسے وہ صاف محسوس کر گیا تھا اور پھر جس طرح اس نے رسیو پر پٹا تھا اس سے اس کی ناگواری کا احساس بھی ہوا پہلے وہ حیران ہوا، پھر پریشان اور اب تو کسی پل قرار نہیں تھا۔ بے شمار اندیشے، بے شمار دوسے منتظر تھے۔ ایک کے بعد ایک اس کی طرف بھاگے چلے آ رہے تھے۔

”بہت زیادہ وقت تو نہیں گزرا۔“ وہ سوچنے لگا۔ ”صرف ایک سال اور یہ کوئی اتنا لمبا عرصہ نہیں ہے جو انتظار کو کوفت میں بدل دے۔ محنت کرنے والے تو صدیوں کی بات کرتے ہیں اور کو مقدر جان کر اس کے دیپ جلا رکھتے ہیں۔ خواہ ان دیپوں کو خون جگر سے جلا نا پڑے، روغن ہیں اور ربیعہ اکرام علی تمہاری آنکھوں کے دیپ تو میں نے اپنی محنتوں سے جلائے تھے اور انہیں رکھنے کا عہد بھی لیا تھا۔ پھر عہد شکنی کیوں کی تم نے؟“

کیا تم نہیں جانتیں کہ میری زندگی کی ساری جدوجہد صرف تمہارے لیے ہے۔ میں زندہ بھی صرف اس پر ہوں کہ ان کڑی مسانتوں کے بعد تم انعام کی صورت ملو گے۔ اور ربیعہ اکرام علی! اب تو وہ مقام کہ منزل دو گام نظر آتی ہے پھر تم نے راستہ کیوں بدل لیا۔ تم مجبور نہیں ہو سکتیں، کبھی بھی نہیں۔ تمہاری بچی کی بھڑائی اور ناگواری اس بات کی گواہ ہے کہ تم نے وہ خواب سارے جو میں نے تمہاری آنکھوں سے سجائے تھے۔ وہ کسی اور کے تو مسطے پالے ہیں۔

”شہر و زاحمد۔“ اس کے پورے وجود میں تخی بھڑکی۔ ”اپنے پرائے سب میں ایک تم ہی قابل اہ نظر آئے تھے اور میں نے آنکھیں بند کر کے اپنی متاعِ عمری امانت کے طور پر تمہارے سپرد کر دیا اگر جو تم خیانت کے مرتکب ہوئے تو خدا کی قسم میں نہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”ثاقب حسن۔“ دل نے ٹوکا۔ ”یہ تم کسی باتیں سوچنے لگے۔ ساری باتیں خود ہی فرض کر رہا اس کے برعکس بھی تو ہو سکتا ہے۔ کوئی مجبوری کوئی مصروفیت کچھ تو ہو گا جو وہ لڑکی تمہاری بات نہ سکی۔ تم کیا جانو، اس کے حالات کیا ہیں؟ ہو سکتا ہے اسے مشکلات کا سامنا ہو۔“

”نہیں۔“ خود اپنی نفی کرنے لگا۔ ”اس کے بچے کی بھڑائی کچھ اور کبہ رہی تھی اور اس روز انہیں بھی فون پر بتایا تھا کہ ربیعہ سے ملاقات ہوئی تھی اور یہ کہ وہ کچھ آٹھری آٹھری سی تھی۔ میں نے ان بات پر توجہ محض اس لیے نہیں دی کہ وہ کچھ جانتی نہیں۔ میں نے سوچا تھا انیلا یقیناً مجھے ربیعہ سے کرنے کی خاطر ایسی بات کہہ رہی ہے ورنہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ مجھے ایمان کی حد تک یقین تھا کہ سارا بدل سکتا ہے ایک وہ نہیں۔ اور ایسا ہی یقین مجھے شہر و زاحمد پر بھی تھا۔“

”ثاقب حسن۔ اتنے بادل مت ہو یاد۔“ دل نے پھر ہچکچایا۔ ”جب تک اس سے تفصیل یا کرلو، کوئی رائے قائم مت کرو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ وہ ایک بزدل لڑکی ہے۔“  
”ہاں وہ بہت بزدل ہے۔“ اس نے اعتراف کیا اور اسی ایک بات نے اسے سہارا دیا۔ تو وہ آ

بے بابے میں نئے سرے سے سوچنے لگا۔ وہ بھی مجبور ہو سکتی ہے۔ بے بس بھی۔ اور ہو سکتا ہے کسی مشکل میں بھی گھری ہو۔ میں بھی اس کی طرف سے لا پڑا ہو گیا ہوں۔ صرف اسے یاد کر لینا یا سوچ لینا ہی کافی نہیں ہے۔ مجھے اس کی خبر ہنی چاہی تھی۔ اس تمام عرصے میں، میں صرف اپنے مسائل سے نکلنے کی سوچتا اور سچی کرتا رہا ہوں۔ میں اغیانہ کے ساتھ کہ یہ سب کچھ اس کے لیے کر رہا ہوں۔ اس کے لیے نہیں، اس کے حصول کے لیے کرتا رہا۔ وہ اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا۔

اسے رہنے کے لیے صرف ایک چھت ہی تو درکار نہیں تھی۔ زندگی کی اور بھی بہت ساری ضروریات ہیں اور شہر و زاحمد ان ضروریات کو پورا کرنے کے پابند نہیں ہیں۔ پتا نہیں وہ کس حال میں ہوگی؟ ہو سکتا ہے، غنا ہو اور غشکی میں بھی مجھ سے بات کرنے سے منع کیا ہو۔“

”میرے خدا۔ ان تمام پہلوؤں پر تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔“ وہ اندیشوں سے نکلنا تو اس کے لیے کڑھنے لگا تھا۔

اس نے اپنی کتابِ زندگی سے وہ باب جس میں ثاقب حسن کا نام رقم تھا۔ پھاڑا تو نہیں لیکن بند ضرور کر دیا۔ اس عہد کے ساتھ کہ دوبارہ اسے کبھی نہیں کھولے گی۔ یہ کام اسے بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا لیکن یہ اسی صورت ممکن تھا کہ اس کی موجودہ زندگی میں ثاقب حسن کا کوئی دخل نہ ہوتا۔ بہر حال اب اگر دخل تھا بھی تو اس نے سوچ لیا تھا کہ جب بھی موقع ملا وہ لے لے کچھ کی کوشش کرے گی۔ کہ جو زندگی، جو گھر اس کا منتظر ہو چکا ہے، اسے اسی میں رہنے دے۔ وہ یہاں سے نکلنا نہیں چاہتی۔ اور اگر نکلی بھی گئی تو دوبارہ ان راہوں پر کبھی نہ چلی سکے گی۔ اس لیے وہ اپنے لیے کوئی دوسرا راستہ تلاش کرے۔

یہ فیصلہ اس نے اپنے طور پر کیا تھا اور مطمئن بھی تھی۔ گو کہ نہیں جانتی تھی کہ شہر و زاحمد اس کے اس فیصلے کا خیر مقدم کریں گے بھی کہ نہیں۔ حالانکہ گذشتہ کئی روز سے وہ ان کا ایک نیاروپ دیکھ رہی تھی۔ ان کا بے اختیار اس کی طرف لپکنا۔ پہلے سے زیادہ خیال رکھنا اور ان کی آنکھوں میں جو مخصوص رنگ اتر گئے تھے جنہیں وہ کوئی نام دینا بھی چاہتی تو نہیں دے پا رہی تھی۔ ان ساری باتوں کا اس کے فیصلے سے کوئی تعلق نہ تھا۔

باجوڑ اس کے کہ شہر و زاحمد کی والہانہ نظریں اس کی دھڑکنیں منتشر کرنے کے ساتھ ایک نیا احساسِ خشقی تھیں۔ ان کی باتیں خوشرب کرنے کے ساتھ سوچوں کے نئے دروا کرتیں۔ اس خیال کی گرفت زیادہ مضبوط تھی کہ وہ اس نام نہاد بندھن کے تقاضے نبھانے کی خاطر ایسا کرتے ہیں یا پھر ثاقب حسن کی خاطر۔ ورنہ حقیقت میں انہیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ بہر حال اس نے یہ نہیں سوچا کہ وہ کیا سوچتے اور کیا چاہتے ہیں، اس نے صرف اپنی ذات کو مدنظر رکھا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے؟ اور وہ یہاں سے کبھی نہیں جانا چاہتی تھی۔

اس گھر میں اسے جو مہبتیں اور جو مقام ملا تھا، وہ اور کبھی نہیں مل سکتا تھا۔ صرف شہر و زاحمد کے بارے میں وہ سوچ سکتی تھی کہ انہوں نے دنیا داری کے لیے خیال رکھا۔ لیکن باقی لوگ کچھ نہیں جانتے تھے، وہ تو بے غرض مہبتیں لٹا رہے تھے۔ اتنی، نڈا، مہر و اور اپنی سب ہی اس کے گرد تھے اور اتنی پیاری بیٹوں کو چھوڑنے کا تصور ہی کر لے لے لگا تھا۔ اب اس مقام پر وہ وہی باتیں فرض کرنے لگی تھی جو شہر و زاحمد بہت پہلے سوچ رہے تھے۔

”ہو سکتا ہے ثاقب حسن باہر کی رنگینوں میں کھو کر اسے بھلا دے۔“  
اکثر لوگ ایسا کرتے ہیں۔ اور ان میں ثاقب حسن کا شمار بھی ہو سکتا ہے۔  
یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی لغزش جو بعد میں ندامت بن کر اسے وہیں رکنے پر مجبور کر دے اور کبھی کوئی غدر تراشتے ہوئے کہے۔

میر انتظار کرتا رہا۔ میں لوٹ کر نہیں آؤں گا۔

ایسی بہت ساری باتیں تھیں جنہیں سوچ کر اس نے اپنے آپ کو مطمئن کیا تھا۔ اگر کوئی دھمکا تھا تو شہر و زامہ کی طرف سے کہیں کسی دن وہ اس کے ہاتھ میں آزادی کا پروانہ نہ تھا۔ اگر وہ جانتی کہ بہت پہلے سے اس کے لیے اسی انداز سے سوچنے کے ہیں جو وہ اب سوچ رہی ہے تو وہ مکمل طور پر مطمئن ہو جاتی اور مکمل طمانیت کب، کیسے جلی ہے جو اسے مل جاتی۔

کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ عیدِ رفتہ سے ناتا ٹوٹا تو وہ اب صبحِ معنوں میں اس گھر کو اپنا گھر لگی پہلے جو اس کے اندر ایک جھبک تھی اور لگاتار تو وہ بہت حد تک نہیں رہا تھا۔ اب اسے کسی کام کے لیے کہنا نہیں پڑتا تھا، وہ خود سے آگے بڑھتی اور ہر بات میں اپنی رائے بھی دینے لگی تھی۔ گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی اس نے اپنے ذمے لے لیے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ وہ اپنی جگہ بیٹا چاہتی تھی بلکہ اس نے لیا تھا کہ جو مقدر میں ہوگا، وہ تو ہو کر رہے گا۔ پھر کیوں نہ اس وقت کو وہ خود اپنے لیے یادگار کر لے۔

کوئی تشنگی نہ رہے کہ کچھ پایا نہیں

کوئی خلش نہ رہے کہ کچھ کیا نہیں!

اور جب سوچ لیا جائے کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا تو قبل از وقت تفکرات سے جان بچھوٹ جاتی۔ وہ بھی مگن تھی اور مصروف بھی۔ کہ نہ کہ امتحانوں میں صرف دو مہینے رہ گئے تھے اور امتحانوں کے فوراً بعد صرف نڈا بلکہ مہروز اور چھوٹی آپا کی شادی بھی طے پا گئی تھی۔ نڈا کے جہیز اور مہر و زکی بڑی کے سلاہ امتی خاص طور سے اس سے مشورہ کرتیں اور اب وہ دامن نہیں بچاتی تھی بلکہ زیادہ تر کام اس نے اپنے ذمے لے لیے تھے۔

اس میں یہ تبدیلی شہر و زامہ کے لیے حیران کن تھی۔ کتنی خواہشیں تھیں جو اکثر ان کے اندر چلا کرتیں کہ۔ کبھی بے خیالی میں ہی سہی، وہ چلتی ہوئی ان کے پہلو میں آ بیٹھے۔ کبھی بے ساختہ ہنسنے اور بے اختیار ان کے کندھے پر پیشانی ٹکا دے۔ کبھی وہ انھیں تو ان کے کپڑے پر پسینہ کرتی ہوئی نظر آتے۔

اور۔

کبھی جو آفس میں دیر ہو جائے تو خوفناک ہو کر پھپھے۔

کہاں رہ گئے تھے؟

یہ ساری خواہشیں جو ان کے خیال میں حسرت تو بن سکتی تھیں، پوری نہیں ہو سکتی تھیں، وہ سب پوری ہو رہی تھیں۔

صبح جب وہ سو کر اٹھتے تو وہ ان کے کپڑے پر پسینہ کر رہی ہوتی۔

وہ عادت کے مطابق چہل قدمی کے لیے لان میں نکل جاتے تو کچھ دیر بعد ہی وہ چائے لینے ان کے پاس پہنچ جاتی۔

پھر ان کے آفس جانے تک کسی نہ کسی بہانے ان کے آس پاس موجود رہتی۔

اور جو کبھی آفس میں دیر ہو جاتی تو کوئی یاد فون کرتی۔

گوکہ وہ اسے اسی روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اور جب وہ اس روپ میں آئی تو حیران تھے۔ ٹوکا اس لیے نہیں کہ کہیں دوبارہ اپنے خول میں بند نہ ہو جائے۔

اس صبح لان میں ان کے ساتھ ادھر سے ادھر چکر لگاتی ہوئی ہلکی پھلکی باتوں کے دوران اپنا کام کہنے لگی۔

کبھی آپ نے سوچا، وقت کی رفتار اچانک تھم جائے تو کیا ہو؟

وہ قدم روک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ شاید جانتا چاہتے تھے کہ وہ درپردہ کیا کہنا چاہتی ہے۔

ہن اس کے چہرے سے کچھ بھی اندازہ نہیں ہوا تو کہنے لگی۔

میں نے سوچا کہ میں لیکن خواہش ضرور کی ہے۔

کیا مطلب؟

یہی کہ وقت تھم جائے اور جو چیز جہاں ہے ہمیشہ کے لیے وہیں رک جائے۔

میں سمجھتی تھی ایسی احمقانہ خواہشیں صرف میں ہی کرتی ہوں۔

دارے۔ وہ ذرا سا سکڑ گئے۔ یہ احمقانہ نہیں، انہونی خواہش ہے۔

انہونی۔ وہ ہنستا نہیں کیا سوچنے لگی۔

ایک بات بتائیں۔ آپ نے وقت تھم جانے کی خواہش کب اور کیوں کی؟ انہوں نے پوچھا تو وہ

پہلے ان کی طرف دیکھنے لگی۔ اب انہیں کیا بتانی کہ اس وقت بھی جب تم میرے سامنے میرے قریب

رہے ہو تو دل چاہ رہا ہے، وقت یہیں تھم جائے اور ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے ایک

بہت سے قریب ہمیشہ کے لیے رُکے رہیں۔

آپ نے جواب نہیں دیا؟ وہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کر بولے تو وہ کہنے لگی۔

اگر یہی سوال میں آپ سے کروں کہ آپ نے یہ خواہش کب اور کیوں کی تو؟

میں سمجھی وقت آنے پر اس کا جواب ضرور دوں گا۔

میرا جواب بھی محفوظ ہے اور اب اندر چلیں۔

چلیں۔ وہ اس کے ساتھ چل پڑے۔

اند آئی تو سیدھی کچن میں چلی گئی۔ خاندان ناشتا تیار کر رہا تھا۔ اس نے سب چیزیں اٹھا کر ٹیبل

رکھیں۔ پھر خود ہی چائے کوم کرنے لگی۔ اتنے میں سب ڈائننگ روم میں آ چکے تھے۔ پھر جب خود۔

آپ شام میں ذرا جلدی آ جائیے گا۔ میں کچھ دیر کے لیے اماں کے گھر جاؤں گی؟

ٹائی کی ٹاٹ درست کرتے ہوئے ان کے ہاتھ لمحہ بھر کے لیے وہیں رُک گئے۔ نظروں کا زاویہ بدل

آئے دیکھا۔ اپنی بات کہہ کر وہ بیڈ کی چادر ٹھیک کرنے میں لگ گئی تھی۔

کچھ دیر کے لیے کیوں؟ ابھی چلیں۔ شام میں واپسی پر میں آپ کو لیتا آؤں گا۔ اس پر نظریں جما

وہ بولے۔

نہیں ابھی مجھے کچھ کام ہے۔ شام میں چلوں گی۔

ایز بولاٹنگ۔ انہوں نے کندھے اچکا کر کہا اور خدا حافظ کہہ کر نکل گئے۔

وہ اپنا کمرہ ٹھیک ٹھاک کر کے نکلی تو اتنی کے پاس جا بیٹھی۔ ان کے پاس آج کل صرف ایک ہی

نوع تھا۔ بڑا اور مہر و زکی شادی کا اور اب تو وہ بھی ہر بات میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ اس وقت اتنی نے

پلن پر میلیں اور گوشت کناری وغیرہ لگانے کی بات کی تو اس نے فوراً اپنی خدمات پیش کر دیں۔

اتنی۔ یہ کام تو میں بھی کر لیتی ہوں۔

ہاں۔ لیکن۔

لیکن کیا؟ سارا وقت تو فارغ رہتی ہوں۔ اچھا ہے اس بہانے کچھ مصروفیت ہاتھ آ جائے گی۔

راہدار کرنے لگی۔ آپ ابھی دوپٹے وغیرہ نکال دیں۔ اس کے اصرار پر اتنی نے تین چار دوپٹے نکال

یہ تو وہ کہنے لگی۔

میں سلائی بھی اچھی کر لیتی ہوں۔ اگر نڈا پسند کرے تو اس کے کچھ سوٹ بھی سی دوں گی۔

اچھا لیکن پہلے شہر و ز سے پوچھ لو۔ اتنی نے۔ ہنس کر کہا تو وہ قدرے حیران ہوئی۔

کیوں؟ کیا وہ منع کریں گے؟

ہاں۔ اس کا کہنا ہے، جب درزی موجود ہیں۔ اور ہم انہیں افراط بھی کر سکتے ہیں تو پھر گھر میں بیٹے

کے لیے ضرورت ہے؟ اور اسے گھنٹوں مشین پر جھک کر بیٹھنا پسند بھی نہیں۔  
 "مشین پر میں بیٹھوں گی، وہ تو نہیں بیٹھیں گے۔" اس کی بات پر امی نے ہنس کر اس کا کندھا تھپا دیا۔  
 "جی۔" اس نے سر جھکا لیا۔ اسی وقت ملازم نے آکر بتایا کہ کوئی انیلا بی بی آئی ہیں، اسے  
 دل عجیب انداز سے دھڑکنے لگا۔

"کون انیلا؟" امی نے ملازم سے پوچھا تو وہ اپنے آپ پر قابو پاتی ہوئی جلدی سے بولی۔  
 "شاید میری دوست ہوگی۔ آپ کو یاد ہے ایک بار بازار میں ملی تھی؟"  
 "اچھا اچھا۔" امی نے پُرسوچ انداز میں سر ہلایا۔ "تم جاؤ بیٹا، یہ سب کام بعد میں دیکھ  
 گے۔"

"جی۔" وہ دوپٹے وغیرہ وہیں رکھ کر ان کے کمرے سے نکل آئی۔ اُسے انیلا کا آنا بالکل بھی اچھا  
 نہیں لگتا تھا۔ لیکن اب جب کہ وہ ابھی چکی تھی تو پہلے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ ٹی وی لاؤنج میں آئی تو  
 دیکھ کر ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ سجائی۔ اور نظارہ شکوہ کرنے لگی۔  
 "تہیں اب فرصت ملی ہے؟"  
 "فرصت ہی فرصت ہے۔" انیلا ہنسی۔ "لیکن اس روز جلدی میں تمہارے گھر کا پتالینا ہی بھول گئی تھی۔"  
 "پھر کیسے ملا میرا پتلا؟"  
 "ماتحت بھائی سے معلوم ہوا۔" انیلا اس کے چہرے پر نظر میں جمائے ہوئے معنی خیز انداز میں بولی۔  
 "کادلی زور زور سے دھڑکنے لگا۔ گھر اگر فوراً اپنے پیچھے دیکھا کہ کہیں امی تو نہیں آ رہیں۔ ادھر سے اب  
 ہوا تو پھر اس خیال سے کہ کہیں وہ بار بار شاقب حسن کا نام لے کر کوئی شین نہ لے، اس سے کہنے لگی۔  
 "آؤ میرے کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔"  
 "چلو۔" انیلا فوراً کھڑی ہو گئی۔  
 "غصہ۔" پہلے میں چائے وغیرہ کا کہہ دوں۔"  
 وہ جلدی سے کچن کی طرف چلی گئی۔ پھر ملازمہ سے چائے کا کہہ کر واپس آئی تو اسے لے کر اپنے کمرے  
 میں آگئی۔

"اب سناؤ اپنا حال احوال؟" اس کے برابر بیٹھی تو بے تکلفی سے پوچھنے لگی کہ بہر حال اس سے  
 تو رہی تھی۔  
 "میں کیا سناؤں؟ تم اپنی کہو اچانک غائب ہو گئیں کہ کچھ پتا ہی نہ چلا؟"  
 "غائب نہیں ہوئی۔ بیان آگئی۔" وہ خزانہ ہنسی۔  
 "اچھی جگہ ہے۔ میرا مطلب ہے اچھا گھر ہے؟" انیلا اس کے بڈروم کا جائزہ لیتی ہوئی بولی۔  
 "تمہاری ساس اور مندر سے ملاقات ہوئی۔ وہ بھی اچھی لگ رہی تھیں؟"  
 "ہاں۔ سب اچھے ہیں۔" اس نے اطمینان کا مظاہرہ کیا۔  
 "تم خوش ہو؟" انیلا پتا نہیں کیا جانا چاہ رہی تھی۔ اس نے سوچا یہ اچھا موقع ہے، وہ انیلا  
 سامنے اپنے آپ کو مٹھلین اور خوش ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی باتیں بھی کر دے جو اس کے  
 شاقب حسن تک پہنچ کر اسے اس کی طرف سے بظن یا متفکر کر دیں۔  
 "میں خوش ہوں انیلا۔ بے انتہا خوش۔ کبھی کبھی تو اپنے آپ پر بے انتہا شک آنے لگتا ہے۔  
 لوگ اتنی محبت کرتے ہیں۔ اور شہر و زکے بارے میں کیا کہوں۔ وہ تو دیوتا ہیں۔"  
 "واقعی۔" انیلا بغیر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔  
 "ہاں تم ان سب کو دیکھو، تمہیں یقین آجائے گا۔ اتنے دھیمے مزاج کے اور بے حد محبت کرنے والے ہیں

مجھے تو یقین واماں کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور پتا ہے کبھی میں سوچتی ہوں، میں اتنی ڈھیر ساری  
 باتوں کے قابل تو نہیں تھی۔"  
 "ملازمہ کو اتنے دیکھ کر وہ خاموش ہو گئی۔ اس کے ہاتھوں سے ٹپے لے کر لے جانے کے لیے کہا۔  
 "اتنا تکلف۔" انیلا ٹپے کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی۔  
 "کوئی اتنا تکلف نہیں ہے۔" اس نے پوری ٹیبل کیلینجی۔ "جلو اب تم تکلف مت کرنا اور ہاں آج  
 مارا دن یہیں رہنا۔ شام میں شہر و زکے آئیں گے ان سے مل کر جانا۔"  
 "گھر سے خالتو سمجھ رکھا ہے کیا؟"  
 "خالتو کیوں ہونے لگی؟ اتنے عرصے بعد ملی ہو، جی بھر کے باتیں کریں گے۔"  
 "جسے دونوں کی؟" انیلا نے اس کی دھکتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا، اس لیے فوری طور پر وہ کوئی جواب  
 دے سکی۔  
 "سنو۔" اسے خاموش دیکھ کر انیلا کہنے لگی۔ "تمہیں کبھی شاقب بھائی کا خیال آتا ہے؟"  
 "میں جھوٹ نہیں بولوں گی انیلا۔" وہ اس کے آگے چائے کا کپ رکھتی ہوئی بولی۔ "شروع شروع  
 میں اس کا خیال آتا تھا، لیکن پھر بہت جلد اس گھر کی اور اس گھر میں رہنے والے تمام لوگوں کی محبتیں حاوی  
 ہو گئیں۔ اور پھر میں خود بھی کئے و دنوں سے نانا توڑنا چاہتی تھی۔ یوں وہ کہانی وہیں ختم ہو گئی اور میں  
 نے اس باب کو بند بھی کر دیا۔"  
 انیلا کے خاموشی سے دیکھتے رہنے پر کہنے لگی۔  
 "اسی میں بہتر تھی انیلا میری بلکہ ہم سب کی۔ اگر میں ان چند دنوں کو اپنے اوپر طاری کر کے مسلسل  
 جاتی رکھتی رہتی تو میرے ساتھ ساتھ سب کی زندگی جہنم بن جاتی۔ ویسے بھی میں سمجھتی ہوں۔ اصل زندگی  
 تو یہ ہے۔ وہ تو ایک خواب تھا اور خواب کب تک ساتھ دیتے ہیں۔ ادھر آکھ کھلی، ادھر غائب۔"  
 "پھر وہ ایک پلیٹ اٹھا کر اس کے سامنے کرتی ہوئی بولی۔ "تم یہ لوناں۔"  
 "نہیں بس تھیک ہے۔" انیلا نے چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا اور پھر دو تین سپ لینے  
 کے بعد بولی۔  
 "ماتحت بھائی کے بارے میں نہیں پوچھو گی؟"  
 "کیا پوچھوں؟" وہ اس کی طرف دیکھتے بغیر سرسری انداز میں بولی۔  
 "بہی کہ آج کل وہ کہاں ہیں؟ کیا کرتے ہیں اور کس حال میں ہیں؟"  
 "دیکھو انیلا۔ اگر تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں تم سے اس شاقب حسن کے بارے میں پوچھوں جس سے  
 کبھی میں ملی تھی تو آئی ایم سوری، میں اس کے بارے میں کچھ نہیں پوچھوں گی کیونکہ میں اب کو بند کر دیں  
 اسے دوبارہ کھلانا مناسب نہیں ہے۔ ہاں اگر تم صرف اپنے بھائی کے بارے میں بتانا چاہتی ہو تو ضرور بتا  
 دو۔ ویسے بھی بہنوں کی باتیں بھائیوں کے ذکر کے بغیر آدھوری ہوتی ہیں۔" اپنے بات کے اختتام پر وہ  
 تسکراتی تھی۔ انیلا کچھ دیر تک چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہی، پھر کہنے لگی۔  
 "تم نے تو بات ہی ختم کر دی۔ پھر بھی میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ شاقب بھائی تمہیں اب تک نہیں  
 بھلا سکے۔ تم نے تو اپنی زندگی کے اس باب کو بند کر دیا۔ اور انہوں نے تو کوئی دوسرا باب کھلا ہی نہیں۔"  
 اب خاموش رہنے کی باری اس کی تھی۔ وہ جو بڑے اعتماد سے بول رہی تھی، ایک دم ہونٹ پیچھ کر  
 اس کی طرف دیکھنے لگی۔  
 "وہ آج کل شکاگو میں ہوتے ہیں۔" انیلا اس کی کیفیت سے بے خبر اپنی کہنے لگی۔ "تمہاری شادی کے  
 کچھ عرصے کے بعد ہی وہ چلے گئے تھے۔ میں نے اس وقت سوچا تھا کہ اب جب کہ تمہارے بٹنے کی ساری امیدیں  
 اٹھ کر گئی ہیں اور شاقب بھائی بھی یہاں سے بہت دور جا رہے ہیں تو کچھ وقت تو گئے گا۔ پھر بھی وہ سارا

کے دکھ بھلانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن ابھی کچھ دن پہلے ان کا فون آیا۔ وہ مجھ سے تمہارا بات کرنے لگے۔ کہنے لگے میں نے خواب میں دیکھا ہے، ربیعہ بہت پریشان ہے۔ تم پلنر اس کے بارے میں جا کر معلوم کرو۔ اور میں ان ہی کے کہنے پر تمہارے پاس آئی ہوں۔ قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔  
”میں دوستی کے ناتے تم سے ملنا ضرور چاہتی تھی ربیعہ۔ لیکن تمہارے گھر نہیں آنا چاہتی تھی۔ اس خیال سے کہ کہیں تم ڈسٹرب نہ ہو جاؤ۔ لیکن ثاقب بھائی کے مجبور کرنے پر مجھے آنا پڑا۔“  
”میں تمہارے آنے سے ڈسٹرب نہیں ہوئی۔“ اس نے جھوٹ بولا۔ ”تم ثاقب سے کہہ دو کہ خواہ  
کی تعبیر اکثر برعکس ہوا کرتی ہے۔ اور ربیعہ بھی بے حد خوش ہے۔“  
”تمہیں خوش دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔“ انیلا اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔  
”شکریہ۔“ وہ مسکرائی۔ ”اور سونو، اپنے بھائی سے کتنا میری فکر چھوڑ کر اپنے بارے میں سوچو  
اتنی طویل زندگی صرف یادوں کے سہارے نہیں گزاری جاسکتی۔“  
”تم ٹھیک کہتی ہو اور کاش میرا بھائی یہ بات سمجھ لے۔“ انیلا کے ہونٹوں پر افسردہ مسکراہٹ تھی۔  
وہ جانے کی بات کرنے لگی۔

”شہزاد کے آنے تک رکو ناں۔“  
”نہیں بھائی۔ وہ تو شام میں آئیں گے۔ میں اب چلوں گی۔“ انیلا اٹھ کھڑی ہوئی۔ شہزاد بھائی سے  
میرا سلام کہنا۔ اور اگر مٹا سب سمجھو تو کبھی ان کے ساتھ میرے گھر آنا۔  
”میں تمہارا دل رکھنے کے لیے ہاں نہیں کہوں گی کیونکہ تم جانتی ہو کہ میرا تمہارے گھر آنا کسی طرح بھی ناممکن  
نہیں ہے۔“  
”ربیعہ۔“ انیلا نے اس کے گلے میں بازو ڈال دیے۔ ”ایک طرف بھائی ہے، دوسری طرف تم۔  
اور آج بھائی پر اپنی دوستی قربان کرتے ہوئے مجھے بے حد دکھ ہو رہا ہے۔“  
”بھئی۔“ اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے بولی۔ ”اور بہت اچھی اچھی مل جائیں گی۔“  
”لیکن ان میں تم نہیں ہوگی۔“  
”ہم نہیں ہوں گے، کوئی ہم سا ہوگا۔“ وہ گنگنائی اور اسے لے کر کمرے سے نکل کر تولاؤنچ میں آئی  
مل گئیں۔ انہیں دیکھتے ہی کہنے لگی۔  
”کیا ہوا بیٹا؟۔ جا رہی ہو؟۔“  
”جی۔“ انیلا نے سلام کرنے کے بعد جواب دیا۔

”ابھی رکو ناں۔ ویسے بھی کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ کھانا کھا کر جانا۔“  
”بس آئی۔“ پھر کبھی آؤں گی۔“ اس نے معذرت کی۔ پھر اسے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئی۔ اگر  
نے کچھ دیر تک کراہتے ہوئے دیکھا پھر اتنی کوماز مہ کے ساتھ مصروف دیکھ کر دوبارہ اپنے کمرے میں  
آئی۔  
انیلا کے سامنے اس نے بہت پر اعتمادہ کر کے پناہ اطمینان کا مظاہرہ کیا تھا اور اس کے جاتے ہی سارا  
اطمینان بھی رخصت ہو گیا۔ گذشتہ کئی روز سے جو وہ یہ سوچ کر کچھ ہوگا، دیکھا جائے گا، بہت مطمئن اور مطمئن  
رہنے لگی تھی۔ اب وہ احساس بھی چھین گیا اور مسلسل ایک ہی جگہ کی تکرار ذہن کے در پہوں پر دستک دینے  
لگی تھی۔

”اب کیا ہوگا؟۔“ اور وہ چاہنے کے باوجود جو ہوگا دیکھا جائے گا، کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن نہ کر سکی۔  
”ایسا کیوں ہوتا ہے؟۔“ وہ پھر کے کھانے کے بعد حسب معمول جب وہ کچھ دیر سونے کی غرض سے  
لیٹ تو سوچنے لگی۔  
”میں جب بھی مطمئن ہوتے لگتی ہوں۔ اس گھر اور اس گھر کے کمینوں کے لیے اپنائیت کا احساس  
جاگتا ہے تو کوئی ایسی بات کیوں ہو جاتی ہے، جو مجھ سے یہ احساس چھین کر یہ باور کرا جاتی ہے کہ

پھر میری انہیں۔ گذشتہ کئی روز سے میں یہ سوچ کر کہ اب مجھے یہاں سے کہیں نہیں جانا، اتنی ملن  
جی تھی۔ کہ آج انیلا چلی آئی۔  
”جانیں میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟۔“  
وہ پھر انیلا میں گھبرنے لگی۔  
انیلا جب میرے بارے میں ثاقب من کو بتائے گی کہ میں اس گھر میں بہت خوش اور مطمئن ہوں۔  
پہن اس کا رد عمل کیا ہوگا؟۔

ہاتھ ثاقب حسن انیلا کی بات کو سچ مان کر خاموشی اختیار کر لے۔  
کاش وہ مجھ سے تصدیق نہ کرائے۔ پتا نہیں میں اس سے یہ ساری باتیں کہہ سکوں گی یا نہیں؟۔  
میرے خدا! مجھے مزید آزمائشوں میں منت ڈال۔“  
وہ بہت آرزوہ ہو رہی تھی اور اسے والے وقت کو سوچ کر خوفزدہ بھی۔ اور اسی طرح خوف اور  
رن میں گھری ہوئی۔

شام میں انھی تو ذہن اسی طرح پریشان تھا اور دل بوجھل۔ کوئی اچھی بات سوچی ہی نہ گئی۔ اپنے  
لے کر باقیہ روم میں گھس گئی۔ خیال تھا نہانے سے کچھ فریض ہو جائے گی۔ لیکن ذرا بھی فرق نہیں  
انہی کے سامنے کھڑی ہوئی تو اپنے آپ کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اتنی سی دیر میں چہرہ اترا گیا تھا۔  
جب پریشانیوں ہی میرا مقدر ہیں تو میں خوشیوں کا تعاقب کیوں کرتی ہوں؟۔ اس نے سوچا اور  
دیکھ کر باہر نکل آئی۔ بیانی وی پر کارٹون دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔  
اس اچانک پریشانی میں اچھ کر اسے یاد ہی نہیں رہا کہ اس نے شہزاد احمد کو جلدی آنے کا کہا تھا۔  
ایسا نہیں بھی یاد نہیں رہا تھا۔

لیکن نہیں۔ انہیں اچھی طرح یاد تھا اور وہ جان بوجھ کر نہیں آئے تھے۔ کیونکہ گذشتہ کئی روز سے وہ  
کالک بنا روپ دیکھ رہے تھے۔ ویسا ہی جیسا کہ وہ چاہتے تھے اور آج اس کے کہنے کے  
بدول نہیں آئے تھے۔ چاہتے تھے کہ وہ اپنا حق استعمال کرتے ہوئے ان سے باز پرس کرے،  
رازے جھگڑے اور پھر خفا بھی ہو۔

بس اپنی اس خواہش کی تکمیل کی خاطر وہ معمول سے زیادہ لیٹ ہوئے۔ جس وقت وہ کمرے میں  
ہوئے وہ اس طرح بیٹھی تھی کہ انہیں لگتا جیسے ان ہی کا انتظار کر رہی ہو۔ ہلکی سی مسکراہٹ ہونٹوں  
پر لگنے لگام لگا کر اس کے اندر کا شور ہی اتنا زیادہ تھا کہ باہر کی نہ کوئی آہٹ نہ سناؤں ہی آواز۔  
لڑنے سے جس وحشت بیٹھی رہی۔ وہ خشکی کا انداز سمجھتے ہوئے قدم بڑھا کر سامنے آکھڑے ہوئے  
خدا سا چنگی اور پوچھی کھڑی ہو گئی۔  
”کیا سوچ رہی تھیں؟۔“ وہ بیٹھے ہوئے پوچھنے لگے۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔  
”کھڑی کیوں ہو گئیں؟ بیٹھ جائیں۔“  
”کھانا۔؟۔“ بس اسی قدر بولی۔

”چائے؟۔“  
”ہاں۔“ لیکن ابھی فوراً نہیں۔“

وہ جس طرح کھڑی ہوئی تھی، اسی طرح بیٹھ گئی۔ انہوں نے قدرے تعجب سے اسے دیکھا۔ صبح سے  
مختلف لگ رہی تھی۔ وہ مسکراہٹ جو اب بات بے بات اس کے ہونٹوں کو چھوئے گی تھی اس  
کیا نام و نشان نہیں تھا۔ چہرے کی شادابی بھی ماند پڑ گئی تھی۔  
”اگر کوئی ہے اسے؟۔“ اپنے طور پر تکیا کرتے ہوئے جھک کر شوز اتارنے لگے۔ اس کام سے  
اگر سیدھے بیٹھ تو کہنے لگے۔

”آئی ایم سواری ربیعہ۔ آپ کے کہنے کے باوجود میں جلدی نہ آسکا۔ آپ کو شاید اناں کے تھا۔“ اس کے خاموشی سے دیکھنے پر بولے۔  
”خفا ہیں؟“

”نہیں تو۔ میں کیوں خفا ہوں گی؟“

”خفگی کی بات تو ہے کہ آپ نے کہا اور میں پھر بھی نہیں آیا۔“

”شہر و زاحمد۔“ پھر وہی اجنبیت، وہ انہیں دوبارہ اپنے خوں میں بند ہوتی گئی۔ بے حدفا سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگے۔

”میں نے شاید آپ کو بتایا تھا کہ میں کبھی کسی سے خفا نہیں ہوتی۔“

”کسی سے بے شک خفا نہ ہوں۔ لیکن مجھ پر یہ حق استعمال کر سکتی ہیں۔“ وہ ٹیل پر ڈاڑھ کرتے ہوئے بولے۔

”تم پر ہی تو حق نہیں ہے۔“ اس نے سوچا اور اناں کے اُبلے اُبلے پیروں کو دیکھنے لگی۔

”اچھا۔ آپ چائے بنا کر لائیں۔ پھر آپ سے بات کرتا ہوں۔“ انہوں نے کہا تو وہ چپ اٹھ کر چلی گئی کچھ دیر کے بعد چائے لے کر آئی تو وہ دریں چینج کر کے آرام سے بیٹھنے لگی۔

”خاموشی سے کپا آپ نہیں سمجھایا اور اپنا کپ لیے ہوئے دوبارہ اسی جگہ بیٹھ گئی کچھ دیر تک خاموشی سے چلے پیتے رہے۔ پھر وہ اسے مخاطب کر کے کہنے لگی۔

”ایک بات بتائیں۔ آج اس گھر میں کون سی غیر معمولی بات ہوئی؟“

”غیر معمولی؟“ وہ ہنسنے کی بجائے آواز جنبش کے ساتھ وہ اناں کی طرف دیکھنے لگی۔

”ہاں غیر معمولی بات جو آپ کی پریشانی کا سبب بنی ہے۔“

”میں پریشان نہیں ہوں۔“ وہ نظریں جھکاتی ہوئی بولی۔

”ربیعہ۔ میری طرف دیکھیں۔“ وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ تو کہنے لگی۔

”میں نے آپ سے کہا تھا اناں کہ اپنے آپ کو تنہا مت کریں۔ کوئی بات، کوئی پریشانی، ہو مجھ سے کہیں، پھر آپ کیوں نہیں کہتیں۔“

”کیا کہوں؟“ وہ الجھ کر بولی۔ تو وہ اٹھ کر اس کے صوفے پر تھوڑے فاصلے سے بیٹھ گئی۔

”ہم نے کئی دوستی کی تھی ناں؟ اور دوستوں سے کوئی بات چھپایا نہیں کرتے۔“ وہ دندہ دیدہ نظروں سے اپنے اور اناں کے درمیان فاصلے کو دیکھنے لگی۔ بظاہر ایک یا ڈیڑھ

اور طے کرنے کا سوچو تو صدیوں کی سفاقتیں۔

”ربیعہ۔“ اناں کی نیکار میں اصرار تھا۔ وہ اپنی ہمتیں مجتمع کر کے کہنے لگی۔

”آج ایسا آئی تھی۔ وہ میرے ساتھ پڑھتی رہی ہے۔ میری دوست تھی اور۔ اور وہ ناں کی بہن ہے۔“

”ثاقب حسن کا نام جب بھی اناں کے ہونٹوں کو چھو تو بالکل غیر ارادی طور پر اناں کی پریشانی شکر ہو جاتی اور ہونٹ جھینج جاتے۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ اور وہ جو اس کی پریشانی تشیر کر تھے، پہلے اپنے آپ کو سمجھانے لگے۔ کافی دیر بعد لیں اسی قدر کہہ سکے۔

”پھر۔“

”پھر یہ کہ اسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“

”کیا کہہ رہی تھی؟“

”بظاہر تو مجھ سے ملنے آئی تھی لیکن باتوں باتوں میں اناں نے ثاقب حسن کا ذکر چھپو دیا تھا۔ کیا کہا ثاقب کے بارے میں؟“

”کچھ بھی کہا ہو۔ میں نہیں چاہتی کہ یہاں اس کا ذکر ہو اور ہمارے علاوہ کوئی اور بھی اس کے سے میں جانے۔ آپ پلینر شہر و زاحمد کسی بھی طرح ثاقب حسن کو منہ کریں کہ وہ میری رہسوائی کا سامنا لے۔“ وہ رونے لگی اور وہ خاموشی سے اسے روتے ہوئے دیکھتے رہے۔

”ربیعہ۔“ اس کے آنسوؤں نے تجھنے کا نام نہیں لیا تو انہیں ٹوکنا پڑا۔ بس کریں، مت روئیں۔

”نہ آپ سے کہا تھا اناں کہ آپ پر کوئی الزام نہیں آئے دوں گا۔ تو میرا یقین کریں ثاقب حسن کے لے سے آپ پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ خواہ کوئی علی الاعلان اس کا نام لیتا ہوا ہی کیوں نہ اس میں داخل ہو۔“

”آپ کیا کریں گے؟“ وہ جھجکی جھجکی بلیکس اٹھا کر اناں کی طرف دیکھنے لگی۔ کناروں پر پانی ٹھہرا ہوا،

دل پر چلتا ہوا۔ دل چاہا اس کی آنکھوں کا سارا پانی اپنی انگلیوں پر سیٹھ لیں۔ بے اختیار ہاتھ بڑھایا

لیکن پھر فوراً سنبھل گئی۔ بچے کو نارمل رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”یہ میرا سکہ ہے، آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں؟“

”مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”کس سے؟“

”بتائیں۔ لیکن میں ڈرتی ضرور ہوں۔“

”اگر ڈرتی رہیں تو ہمیشہ اسی طرح پریشان رہیں گی۔ آج ثاقب حسن ہے تو کل کوئی اور ہو گا جس کا آپ کو خوفزدہ کر دیا کرے گا۔“

”اور کون ہو گا؟“ وہ سہم کر پوچھنے لگی۔

”کوئی بھی۔ ہو سکتا ہے میں۔ میرا مطلب ہے میرا نام بھی الزام بن سکتا ہے۔“

”پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔“

”وقت آپ کو سب سمجھا دے گا۔ چلیے آٹھ کر منہ دھو کر آئیں اور اب میں آپ کو روتے ہوئے

بیٹوں۔“ انہوں نے کہا تو وہ اٹھ کر ہاتھ رو میں چلی گئی۔ منہ دھو کر واپس آئی تو دوبارہ اسی جگہ

آئی۔

”اب جو میں کہہ رہا ہوں، اسے غور سے سنیں۔ اور میری باتوں پر عمل بھی کرنا ہے۔“ وہ پکیٹ سے

پٹ نکالتے ہوئے بولے۔

”جی۔“ وہ پوری طرح اناں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ انہوں نے پہلے سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر سلگایا

دو تین کش لینے کے بعد کہنے لگی۔

”زندگی میں بہت سارے واقعات و حادثات ایسے رونما ہوتے ہیں، جن کے بارے میں کبھی تصور

نہیں کیا ہوتا۔ ایسی باتیں جو کبھی گمان میں بھی نہیں ہوتیں، وہ ہو جاتی ہیں۔ ایسی باتوں کا سامنا

کے لیے گویا انسان پہلے سے تیار نہیں ہوتا، لیکن اسے اپنے آپ کو تیار کرنا پڑتا ہے۔ اور

ہیں کہ بجائے حالات کا مقابلہ کرنے کے مسلسل فرار کے راستے ڈھونڈتی ہیں۔ یاد رکھیں ربیعہ،

شنا فرما چاہے گا، وہ اتنا ہی پھستلا چلا جائے گا۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

”یوں فرار دوسری بات پر پریشان ہونا چھوڑ دیں۔ کیا آپ نہیں جانتیں کہ جس راستے پر آپ کٹھڑی

یا کٹھڑی لگی ہیں، اس میں کتنی دشواریاں ہیں؟ ہر دھڑکے قدم پر ایک گہری کھائی اور فراسی

شکایتیں آج سوچ سکتی ہیں کہ کیا ہو گا؟ آپ کو تو بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔“

”انہوں نے خاموش ہو کر سگریٹ کا آخری کش لیا پھر اسے ایش ٹرے میں ملنے کے بعد کہنے لگی۔

”اپنے آپ کو آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ابھی سے تیار کر لیں۔ آپ کو شاید

نہیں ہے لیکن میں آپ کو خبردار کر رہا ہوں کہ آئندہ آپ کو اس سے زیادہ دشواریوں کا

سامنا کرنا ہو گا۔ اگر اسی طرح بزدلی کا مظاہرہ کرتی رہیں تو کیسے ان دشواریوں سے نکلیں گی؟  
 اُس نے شاکی نظروں سے دیکھا تو کہنے لگے۔

”میں غلط نہیں کہہ رہا۔ آپ کا المیہ یہ ہے کہ آپ کی زندگی کی ڈور پہلے آپ کی والدہ کے ہاتھ رہی۔ اُس کے بعد شاہب حسن نے محبت میں کہہ لیں یا کمال ہوشیاری سے اپنے ہاتھوں میں ہوئے آپ کے دل پر ذہن پر اپنی گرفت مضبوط کر دی۔ آپ کی اپنی کوئی سوچ نہیں۔ اگر بھی تو بہت محدود۔ سب سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ اپنے ذہن کو دوسرے گرفت سے آزاد کرالیں، تب ہی آپ اُنے والی دشواریوں کو قبل از وقت محسوس کر کے اُن کا سامنا کرنے بلکہ اُن کا مقابلہ کرنے کی تدابیر سوچ سکیں گی۔“

”آپ کا اشارہ کن دشواریوں کی طرف ہے۔؟“ وہ الجھ کر پوچھنے لگی تو وہ کچھ دیر تک اُس کی دیکھتے رہے پھر طویل سانس لیتے ہوئے بولے۔  
 ”آئی ایم سوری ربیع۔ میں ان دشواریوں کی نشاندہی نہیں کروں گا۔“

”کیوں؟“  
 ”اُس کیوں کا جواب پھر کبھی زندگی میں موقع ملتا تب دوں گا۔“ پھر اُٹھتے ہوئے بولے۔  
 ”مجھے کئی کوشش کریں۔ بجائے اس کے کہ اپنے آج پر پریشان ہوں، کل کو سوچیں۔ اور کم از کم اندر خود فیصلہ کرنے کا حوصلہ پیدا کر ہی لیں۔“ اُن کا اشارہ کس فیصلے کی طرف تھا، وہ سمجھ نہیں سکی۔

”میں اُنے والے کل کے بارے میں سوچتی ہوں۔ اور وہ مجھے اپنے آج سے زیادہ غیر محفوظ آتا ہے۔ اور جہاں تک اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کی بات ہے تو اس بارے میں میں یہی کہہ گی کہ پہلے کسی نے مجھے فیصلے کا اختیار دیا نہیں اور اب یہ اختیار میرے پاس رہا نہیں۔“  
 ”ٹھیک تو کہہ رہی ہے۔“ اُنہوں نے سوچا اور اُن کی نظریں اس کے جھگے ہوئے سرے ہوا ہوئی گود میں رکھے ہاتھوں پر جا ٹھہریں۔ مخروطی انگلیاں ایک دوسرے میں پناہیں ڈھونڈتی ہاں ہولے کر زری تھیں۔

ایک نامعلوم سی آداسی، ستانا دھیرے دھیرے اُس کے وجود کا گھیراؤ کر رہا تھا۔ ایک دم بہت تیز تہا تہا سی لگی۔ انہیں پیچ آس پر ترس آنے لگا۔ تو اُس کے سامنے قالین پر گھٹنے ٹیک۔  
 ”بی اینی ربیع۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اُنہوں نے اُس کے کرزتے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ کر حوصلہ دیا۔ تو اُس کی پلکیوں پر آٹکے چند موتی ٹوٹ کر اُن کے ہاتھ کی پشت پر آ ٹھہرے۔  
 ”عجیب شخص ہے۔ کبھی ڈراتا ہے۔ اور کبھی حوصلہ دیتا ہے۔“ اُس نے سوچا اور اُن سے اُن کا ہاتھ ہٹا کر اُنھ کی کھڑی ہوئی۔

اُس نے شہر و زامہ کا تین کر لیا تھا کہ اس گھر میں اُس پر کوئی آج، کوئی الزام نہیں آئے گا خواہ کوئی علی الاعلان تا قیام حسن کا نام لیتا ہوا کیوں نہ آجائے اور اس یقین کے بعد وہ ایک بار پھر ہو گئی۔ وقت کو یوں بھی جیسے پر لگ گئے تھے۔ نلا اور ہر روز کی شادی قریب آ رہی تھی۔ اُس نے اپنے ذمہ جو کام لیے تھے، وہ سہولت سے نبھادیے تو اُن کی تیاری کے بارے میں پوچھ لگیں۔ وہ حیران ہوئی، اپنا تو اسے خیال ہی نہیں آیا تھا۔

”بیٹا۔ تم ساتھ ساتھ اپنے کپڑے بھی لے کر دزدی گودے دیتیں تو اب تک سب تیار جاتے۔“  
 ”ہاں۔ کیوں مجھے خیال ہی نہیں رہا۔“  
 ”عجیب لڑکی ہو تم۔ ایسے موقعوں پر تو سب کو اپنی فکر رہتی ہے اور تم ہو کہ۔“

لیکن اہی۔ میں اور کپڑے لے کر کیا کروں گی؟۔ میرے پاس پہلے ہی اتنے ہیں اور ان میں کتنے تو ابھی میں نے پہنے بھی نہیں ہیں؟ وہ اُن کی بات کاٹ کر کہنے لگی۔  
 ”تو کیا تم وہ پہنو گی؟“ اہی نے کچھ اس انداز سے کہا کہ وہ نفی میں سر ہلاتے لگی۔  
 ”اں۔ وہ پہننے کی ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ ابھی شہر و زامہ کو فون کرو کہ شام میں جلدی فارغ ہو جائے۔ پھر اُس کے ساتھ بازار چلی جانا۔“  
 ”جی۔“ وہ سعادتمندی سے کہتی ہوئی اُنھ کی کھڑی ہوئی اور ٹی وی لاؤنج میں آئی اور افس کے نمبر لی کرنے لگی۔

شہر و زامہ اسپیکنگ۔ ”دوسری بیل پر ریسپور اُٹھنے کے ساتھ ہی اُن کی آواز سنائی دی۔  
 ”میں۔ ربیع۔ فوراً وہ یہی کہہ سکی۔  
 ”جی فرمائیے۔“  
 ”زمانہ نہیں عرض کرنا ہے۔ پہلے یہ بتائیے آپ مصروف تو نہیں؟“

”نہیں۔ آپ اطمینان سے بات کریں۔“  
 ”کوئی بھی چوڑی بات نہیں ہے۔ بس یہ کہ اہی کہہ رہی ہیں آپ شام میں دراجلدی آجائے گا۔“  
 ”اہی کا نام لے دیا۔  
 ”کیوں؟“ وہ شاید اُس سے بات کرنے کے موڈ میں تھے، اس لیے پوچھ گئے ورنہ پہلے تو ہی نہیں پوچھا تھا۔ ”او کے“ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا کرتے تھے۔

”ہو گا کوئی کام جب ہی بلایا ہے۔“  
 ”اہی کو بلاتیں، میں اُن سے پوچھ لیتا ہوں، کیا کام ہے؟“  
 ”ارے نہیں۔ اُن سے نہیں پوچھنا ہے۔“ وہ گھبرائی اور اُس کی گھبراہٹ محسوس کر کے اُنہوں نے ماضی ہنس کو مشکل روکا۔  
 ”اہی سے نہیں پوچھنا، تو پھر کس سے پوچھنا ہے؟“  
 ”مجھ سے۔“ وہ صبر اختیار کر رہی تھی۔

”کیا ابھی تو آپ نے لاعلمی ظاہر کی تھی کہ انہیں کوئی کام ہو گا، جب ہی بلایا ہے۔“  
 ”افو۔ آپ جرح بہت کرنے لگے ہیں۔ میں فون رکھ رہی ہوں۔“ وہ رہائی نہ پا کر مجبوراً بولی۔  
 ”غیر در۔“ اُنہوں نے رعب سے کہا۔ پہلے بتائیے کیا کام ہے؟۔  
 ”مجھے بڑی شادی کے سلسلے میں کچھ شاپنگ کرنی ہے۔“ وہ کچھ جھجک سی گئی۔  
 ”کس کے لیے؟“

”اپنا خیال آگیا آپ کو؟“  
 ”مجھے اپنا خیال تھا لیکن انتظار میں تھی کہ کوئی اور خیال کرے۔“  
 ”اور کون؟“ اُنہوں نے حیران کر دیا۔  
 ”تم۔ تم۔ تم۔“ دھڑکنوں نے شور مچا دیا اور اُنہوں نے یہی ایک لفظ سننے کے لیے اپنا سانس روک لیا۔ کہیں کوئی آواز نہ ہو، کوئی آہٹ نہ ہو۔ فقط ایک لفظ اُس کے ہونٹوں سے چھوکر ہی فضا میں گیت بن کر بکھر جائے۔  
 ”تم۔ تم۔ تم۔“

”کتنے چپ چاپ رہ کر گئے۔ اُن کے کان منتظر تھے اور وہ بزدل لڑکی اپنے اندر اتنی ہمت باز کر سکی کہ دھڑکنوں میں اُٹھتے شور کو زبان دے سکتی۔ بہت آہستگی سے ریسپور رکھ کر اپنے رے میں لگ گئی۔

اور کہیں جانا ہے۔ وہ گاڑی احتیاط سے نکال کر مین روڈ پر لاتے ہوئے پوچھنے لگے۔  
 نہیں آپ سیدھا گھر ملیں۔ انہوں نے ایک نظر اسے دیکھا پھر کہنے لگے۔  
 میں نے سنا تھا خواتین شاپنگ کرتے ہوئے بہت خوش نظر آتی ہیں لیکن آپ کا موڈ مسلسل خراب

ہا۔ آپ سے کس نے کہا کہ میرا موڈ خراب رہا؟  
 میرا خیال ہے میں دیکھ سکتا ہوں اور محسوس بھی کر سکتا ہوں۔

اچھا۔ وہ ہلکے سے ہنسی۔  
 آپ کی ہنسی میری بات کا جواب نہیں۔  
 موت سی بات ہے؟ وہ انجان بنی۔  
 یہی کہ آپ کا موڈ خراب رہا۔

آپ کا وہم ہے ورنہ ایسی کوئی بات نہیں تھی؟  
 بچے مان لیتا ہوں۔ قہر سے توقف کے بعد کہنے لگے۔ صبح فون پر آپ نے کہا تھا کہ آپ کو  
 اپنا خیال تھا لیکن اس انتظار میں تھیں کہ کوئی اور خیال کرے۔ کوئی اور کی نشاندہی کریں گی؟  
 کاش وہ نشاندہی کر سکتی۔ لیکن یہ خیال زیادہ زور آور تھا کہ وہ اس کے بارے میں کوئی اچھی رائے  
 قائم نہیں کریں گے، اس لیے نہیں، مگر کمر شیشے سے باہر دیکھنے لگی تھی۔ اور پھر انہوں نے بھی مزید کوئی  
 بات نہیں کی۔ وہ سفر جسے وہ طویل کرنا چاہتے تھے۔ اسپید بڑھا کر منٹوں میں طے کر لیا۔ گھر کے سامنے  
 گاڑی روکی تو وہ ان سے پہلے اتر کر اندر آ گئی۔

اس کی زندگی میں بڑا عجیب سا موڑ آ گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کیا کرے۔ شہر و زاحمد کے اتفاقات  
 کو وہ کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔ کبھی سوچتی شاید وہ اسی کے انداز میں سوچتے ہوئے بقیہ زندگی  
 اس کی ہر اہم میں گزارنے کے متمنی ہیں۔ اور کبھی خیال آتا، سب دھوکا ہے۔ محض اس خیال سے  
 کتنی کے سامنے جوابدہ نہ ہونا پڑے۔ اس کا اتنا خیال رکھنے لگے ہیں۔ بہر حال ان کے دل کا حال نہیں  
 جانتی تھی۔ لیکن اپنے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ اب ہمیشہ یہیں رہنا چاہتی ہے اور یہ بھی جانتی  
 تھی کہ اس کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ کیونکہ خود اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار  
 اس کے پاس نہیں تھا۔ اور نہ ہی وہ اختیار چھیننے کا حوصلہ رکھتی تھی۔  
 کاش کوئی تو ہو۔ وہ اکثر سوچنے لگتی تھی۔ جو مجھے اس بچہ منبہار سے نکال لے۔ کوئی ہو  
 جس سے میں اپنا احوال کہہ سکوں۔ اور کوئی نہیں تھا۔

ایک بار شہر و زاحمد نے کہا تھا کہ انسان کو ہر دور میں کسی دوست، نمکسار اور ہر اہم کی ضرورت رہتی  
 ہے اور اپنے لئے تو ریمینڈ اپنے آپ کو متنا کر لیا ہے۔  
 ٹھیک کہا تھا انہوں نے، اور پھر انہوں نے اس کے ساتھ کئی دوستی کی تھی کہ آئندہ وہ انہیں اپنی  
 بڑائی سے اور کوئی بھی مسئلہ ہوگا تو کہہ سنا لے گی اور وہ انہیں جانے بھی لگی تھی لیکن اب جو مسئلہ اسے  
 لاحق تھا، وہ کچھ دوستی کے باوجود ان سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ خود اپنے منہ سے کہہ دیتی کہ۔  
 شہر و زاحمد۔ ہمارے درمیان جو رشتہ کچھ دھاگے سے بندھا ہے۔ اسے مضبوط ڈوری سے باندھ  
 دو۔ میں تم سے دور جانا نہیں چاہتی۔ مجھے یہیں رہنے دو اپنے پاس۔

خود داری بھی کوئی چیز ہے۔ دل لاکھ تر پٹیا چلتا رہے وہ خواہشات کے آگے بند تو باندھ سکتی  
 تھی۔ انہیں بدل کے اندر دفن بھی کر سکتی تھی لیکن خود داری کا جنازہ نکالنا بہت مشکل بلکہ ناممکن تھا۔

اس وقت وہ گھر میں بالکل اکیلی تھی۔ اتنی کسی عزیز کی عیادت کے لیے گئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے

میرے خدا۔ یہ میں کن راہوں پر چلنے لگی ہوں۔ اگر شہر و زاحمد کو خبر ہو جائے تو یہاں  
 سوچیں۔ بقید سارا دن وہ اسی قسم کی باتیں سوچتے ہوئے اپنے آپ کو سرزنش کرتی رہے  
 شہر و زاحمد آئے اس وقت سہ پہر ابھی پوری طرح نہیں ٹھہلی تھی۔ انہوں نے آتے ہی  
 ہونے کے لیے کہا اور خود اسی کے پاس جا بیٹھے۔ کچھ دیر بعد جب وہ آئی تو اسے دیکھتے  
 ہو گئے۔ اتنی سے اجازت لے کر اس کے ساتھ باہر آئے تو وہ کہنے لگی۔  
 آپ کچھ دیر آرام کر لیتے۔

نہیں بس ٹھیک ہے۔ اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ پھر دوسری طرف سے  
 سیٹ سنبھالی۔



دھیمے دھیمے تروٹی کے تاروں کو جھپٹنے لگے تھے۔ کوئی خوبصورت سا گیت چنانچہ انہوں  
 لگا رہا تھا۔ یا خاص طور پر اس کے لیے۔ وہ سمجھ نہیں سکی۔ بہر حال دونوں صورتوں میں ایک  
 فلتان دل میں جا گئے تھے۔

کے کاش۔ انہی خواہشات گھبراہٹ کرنے لگیں۔ یہ سفر یونہی جاری رہے۔ کہیں ایک  
 لیے بھی ڈر کے۔ زندگی کی گاڑی کی طرح یہ گاڑی بھی یونہی ہمیشہ چلتی رہے۔ ماہ و سال بیت جا رہے  
 پھر صدیاں۔ کبھی جو مسافروں کی تمکین آتارنے کے لیے پل بھر کو کہیں رکیں تو کوئی بھی منزل  
 کی نوید دے کہ روح تک میں آتری ساری تھکن پل میں اتر جائے۔  
 گاڑی ایک جھلکے سے رکی تو وہ چونک کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ پھر اپنی طرف کا شیشہ  
 نیچے اتر آئی۔ وہ گاڑی لاک کر کے اس کے پاس آئے تو کہنے لگے۔

آپ پوچھ سکتا ہوں، آپ کو کیا لیتا ہے؟ ہونٹوں پر مسکراہٹ مچ رہی تھی اور آنکھوں  
 فکر مت کیجیے اپنی حیثیت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں لوں گی۔ اس کے ساتھ ہی وہ قہر  
 بڑھا گئی۔

ربیع۔ وہ اس کے ہم قدم ہوتے ہوتے سنبھلنے لگے۔ اپنی حیثیت کا تعین یہ  
 اپنے تعلق کو سامنے رکھ کر کیجیے گا۔ اس وقت آپ ربیع اکرام علی نہیں، ربیع شہر و زاحمد ہیں۔  
 ہونٹ دانوں میں دھاک دوسری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں الجھن دیکھ کر وہ کہنے لگے  
 اگر آپ کو میری پسند پر اعتراض نہ ہو تو آپ کی شاپنگ میں اپنی مرضی سے کر لوں۔  
 اس نے سوچا، اچھا ہے وہ خود سے کچھ کہنے سے بچ جائے گی۔ اثبات میں سر ہلا کر  
 ساتھ چل پڑی۔ پھر سارا وقت انہوں نے اس سے کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے اس کا موڈ  
 یا وہ جھنجھلائے۔ خود ہی کبھی سوٹ پسند کرتے کبھی ساری۔ اور پیک کر لےنے سے پہلے  
 پوچھتے ٹھیک ہے، اور وہ سر ہلا دیتی۔ شام سے رات ہو گئی۔ وہ ان کے ساتھ چلتے چلتے  
 اور ان کا واپسی کا کوئی ارادہ ہی نہیں لگ رہا تھا۔ گتا تھا جیسے ہوا بازار خرید ڈالیں گے۔  
 بس اب واپس چلیں۔ وہ قدم روک کر کھڑی ہو گئی۔

ابھی سے۔؟  
 میرے خدا۔ چار گھنٹے ہو گئے ہیں اور آپ کہہ رہے ہیں ابھی سے۔ بس اب چلیں،  
 گئی ہوں۔  
 سوچ لیں، کوئی چیز تو نہیں گئی؟

نہیں۔  
 چلیں پھر۔ انہوں نے اپنی گاڑی کی تلاش میں ادھر ادھر نظر پڑوڑیں پھر ایک طرف  
 چل پڑے۔

اسے بھی چلنے کے لیے کہا تھا لیکن وہ مرد کی وجہ سے نہیں جاسکتی تھی۔ اسی نے جاتے جاتے اسے کی تھی کہ وہ آرام کرے اور وہ اس وقت سے اپنے کمرے میں لیٹی اپنے ساتھ ہونے والے حالات کو سوچ رہی تھی۔ دروازہ ہلکی سی دستک کے بعد کھلا تو اس کی سوچیں منتشر ہو گئیں۔ اسے والی تھی۔ وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”بی بی! ثاقب صاحب کا فون آیا ہے۔“ ملازمہ نے کہا تو فوری طور پر وہ سمجھ نہیں سکی، پوچھ کر مومن ثاقب؟“

”پتا نہیں جی، وہ اپنا نام ہی بتا رہے ہیں۔ ثاقب حسن۔“ ملازمہ نے سوچتے ہوئے لیا تو وہ چونک گئی۔

”تم نے کیا کہا ان سے؟“

”میں نے انہیں بتایا ہے کہ گھر میں صرف آپ ہی ہیں۔“

”پھر۔؟“ وہ ملازمہ سے استفسار کر رہی تھی۔ بلا سوچے اور سمجھے۔

”وہ کہنے لگے۔ بڑا ضروری پیغام دینا ہے، آپ ہی سن لیں۔“

”اچھا۔ تم فون یہیں اٹھا لاؤ۔“ ملازمہ کے سامنے اس نے سرسری انداز اختیار کیا جب کہ

اندر ڈرنے لگی تھی۔ پھر اس نے سوچا، یہ اچھا موقع ہے۔ کوئی ہے بھی نہیں، وہ ثاقب حسن۔

صاف بات کرنے کے بعد منع کر دے کہ آئندہ اسے فون نہ کرے وہ اس سے کوئی تعلق نہ

چاہتی۔

ملازمہ آئی تو اس نے فون لے کر اسے جانے کے لیے کہا۔ اور جب وہ کمرے سے نکل گئی

اس نے ریسپورکان سے لگا کر ہلکی آواز میں کہا۔

”ہیلو کون۔؟“

”میں ہوں ربیعہ۔ ثاقب۔“

”کیسے ہو؟“ بلا ارادہ اس کے منہ سے نکل گیا۔

”تمہارے اس سوال کا ایک ہی جواب ہوا کرتا ہے میرے پاس کہ تم بن آدھورا ہوں۔“

اس کے خاموش رہتے پر کہنے لگا۔

”ابھی ملازمہ نے بتایا تھا کہ گھر میں اس وقت صرف تم ہی ہو۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ

تفصیلی بات ہو سکے گی۔“

وہ تھوکر نکل کر کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ بول پڑا۔

”اس سے پہلے میں نے کئی بار فون کیا لیکن بات نہ ہو سکی بلکہ تم نے خود ہی کہہ دیا تھا کہ

کر سکتی اور تمہارے اس جواب نے مجھے بہت ڈسٹرب کیا۔ ہیلو ربیعہ۔ تم سن رہی ہونا۔“

”ہاں۔“ ان کی صورت اس کے سینے میں بی سانس ہونٹوں کی قید سے آزاد ہوئی۔

”تم بولتی کیوں نہیں؟ تمہاری خاموشی میرے اندر جہنم لینے والے خدشات کو سبب ثابت کرنے لگی

پہلے یہ بتاؤ، تم کسی پریشانی کا شکار تو نہیں۔ کوئی مسئلہ یا پھر کوئی ایسی بات جو۔ آگے

بولنے سے رک گیا۔

”کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ اس کی بات کا ٹک گئی۔

”اگر کوئی بات نہیں ہے تو پھر تم نے اپنا رقبہ کیوں بدل لیا ہے؟ میرا مطلب ہے میر

کچھ دیر کر کہ اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ شاید وہ تردید کرے۔ کہہ دے تمہارا

لیکن وہ خاموش تھی۔ تب طویل سانس لیتے ہوئے بولا۔

”تو میرے خدشات صحیح ہیں کہ تم نے میری جگہ شہر و زامہ کو دے دی ہے۔ مجھے جبا

بتایا کہ تم نہ صرف یہ کہ گئے دنوں سے مکمل طور پر ناتواں ہو چکی ہو بلکہ اب بے حد خوش بھی ہو

اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا لیکن۔“ لمحہ بھر کر کہنے لگا۔ ”بہر حال میں ان ساری باتوں کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا لیکن تم سن لو کہ تمہارا اور میرا سوچا آسانوں پر کھلا ہے۔ میں نے یہ بن باس صرف تمہارے لیے قبول کیا تھا کہ جلد سے جلد تمہیں پاسکوں اور کیا تمہیں یا نہیں ہے کہ میں نے تمہارا ہاتھ تمام کرو دیا تھا کہ یہ ہاتھ کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہیں جانے دوں گا۔ اور میں اپنے وعدے کا پکا ہوں۔“

”ثاقب حسن۔“ اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی اور وہ کہہ رہا تھا۔

”میرے دل میں تمہاری محبت اب بھی اسی شدت سے زندہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کی

آپ تم تک بھی ضرور پہنچتی ہوگی۔ پھر تم ربیعہ سراب کے پیچھے کیوں بھاگنے لگی ہو۔ شہر و زامہ سراب

ہی تھیں۔ یاد رکھو شہر و زامہ کے نزدیک تمہاری حیثیت کسی خوبصورت کھلونے سے زیادہ ہرگز نہیں

ہوگی۔ وہ کچھ وقت تمہارے ساتھ گزار تو سکتے ہیں لیکن ایک عمری رفاقت کبھی نہیں دے سکتے۔ اس

لیے کہ وہ چلتے ہیں تمہارے دل کی منتی پر میرا نام لکھ چکا ہے اور دھڑکنیں اسے شمار بھی کرتی ہیں۔

تمہاری آنکھیں بار بار میرے خواب سجا چکی ہیں۔ اور تم اپنے ہونٹوں سے اقرار محبت کے ساتھ یہاں بھی

باندھ چکی ہو اور کوئی مرد اشنا جی دار نہیں ہوتا۔ جو یہ ساری باتیں جاننے کے بعد بھی سائبانی میسر کرے۔“

قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

”میں تمہیں حقیقت بتا رہا ہوں۔ مرد بہت کم ظرف ہوتا ہے خود جو مرضی کرتا پھرے لیکن تم ربیعہ

حیات کے بابے میں اس کا تصور ہمیشہ اُن دیکھی ان چھوٹی کھلی کا ہوتا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو

ناں۔ اگر شہر و زامہ نے تمہیں کوئی خواب دکھانے کی کوشش کی ہے تو آنکھیں بند کر کے ان کا یقین

مت کر لینا۔ پہلے یہ ساری باتیں ضرور سناؤ۔ کب تک وہ تمہارے ماضی سے نظریں چڑائیں گے۔ سال

دو سال، اس کے بعد۔“

”پلیز ثاقب حسن۔“ اس نے ٹوک دیا۔

”کیوں؟ کیا میری باتیں بہت بری لگ رہی ہیں۔؟“ وہ طنز پر لہجے میں بولا۔

”ہاں۔ اس لیے کہ تم نے ساری باتیں خود سے فرض کر لی ہیں ورنہ یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”کام طلب؟“

”تم خواب دکھانے یا سنانے کی بات کرتے ہو جب کہ شہر و زامہ نے تو کبھی اس حد کو بچھلا گئے

کی کوشش نہیں کی جو اول روز سے اُن کے اور میرے درمیان قائم ہوئی تھی؟“

”پھر تمہارا رویہ مجھ سے اتنا اکھڑا اکھڑا سا کیوں ہے؟“

”یہ میری مجبوری ہے۔“

”کیسی مجبوری؟“

”تم خود سمجھ سکتے ہو اور تمہیں سمجھنا چاہیے کہ اس نام نہاد بندھن کے متعلق صرف شہر و زامہ ہی جانتے

ہیں۔ اُن کے علاوہ کسی کے علم میں یہ بات نہیں ہے۔ اور میں چاہتی بھی نہیں کہ کسی کو معلوم ہو۔ ایسے

حالات میں تم ہی بتاؤ جب گھر کے دوسرے افراد کے سامنے تمہارا فون آئے تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”تو کیا؟“

”ناں بس اتفاق تھا کہ جب بھی تمہارا فون آیا، کوئی نہ کوئی میرے پاس موجود تھا۔“

”اس لیے میں نے کہہ دیا تھا کہ میں بات نہیں کر سکتی۔“ اس نے جھوٹ بولا۔

”اور جو انیلا نے تمہارے بارے میں بتایا ہے۔ وہ مکمل اطمینان چاہتا تھا۔“

”ہاں انیلا سے میں نے ایسی ہی باتیں کی تھیں جو اس نے تم تک پہنچائیں کیونکہ یہ خیال تھا مجھے ایسی

ہی باتیں کرنی چاہئیں۔“

”تمہارا خیال تھا۔ تم نے یہ نہیں سوچا کہ میں کتنا پریشان ہو جاؤں گا۔“

”تمہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے ثاقب حسن؟“ وہ اندر کی ملتی کو شکل لہجے میں اترنے



سے روک سکی۔

”پیشانی کی بات تو تھی؟“

”نہیں، ثاقب حسن۔“ اس نے مزید اپنے آپ کو کچھ کہنے سے باز رکھنے کی خاطر غلاہٹ ڈالنے میں دبا دیا اور دل تو چاہ رہا تھا صاف کہہ دے، ”تم میرے گرد اتنا مضبوط جال بن گئے ہو کہ جس میں سے میں خود نکل سکتی ہوں اور نہ کوئی مجھے نکال سکتا ہے۔“

”آئی ایم سوری ربیعہ۔“ اس کے پیچھے میں مذاق سمٹ آئی تھیں۔ ”میں نے تم پر شک کیا۔ مجھے معاف کر دینا پلیز۔ اصل میں تم سے دوسری نے مجھے بہت وہی بنا دیا ہے۔ ہر وقت یہ خدشہ رہتا ہے کہیں ایسا نہ ہو جائے اور ویسا نہ ہو جائے۔ بہر حال تم نے میرے سارے خدشات دور کر دیے ہیں اور میں وعدہ کرتا ہوں آئندہ کسی خدشے کو دل میں جگہ نہیں دوں گا۔“

وہ خاموش رہی۔

”سنو۔ تم خفا تو نہیں ہونا؟“

”نہیں۔ تم جانتے ہو، مجھے روٹھنا نہیں آتا۔“

”جاننا ہوں لیکن مجھ سے روٹھ سکتی ہو مگر ابھی نہیں جب تمہارے سامنے آؤں تب تاکہ منانے میں آسانی ہو۔“ وہ خوشدلی سے بولا۔

”نہیں۔ مجھے روٹھنے نہ دینا۔ کیونکہ اپنے بارے میں مجھے یقین ہے کہ اگر ایک بار روٹھ گئی تو پھر نہیں مانوں گی۔“

”میں تمہارا یقین غلط ثابت کر دوں گا۔ اچھا اب اجازت دو۔“ اور وہ جیسے انتظار میں تھی۔ فوراً غماخفاظ، کپڑے ریسور رکھ دیا۔ ایک دم ہر طرف جیسے خاموشی چھا گئی۔ کتنی دیر گزر گئی۔ اور پھر خاموشی میں ابھری اس کی آواز کی بازگشت۔

”یاد رکھو ربیعہ۔ شہر و زامد کے نزدیک تمہاری حیثیت کسی خوبصورت کھلونے سے زیادہ ہرگز نہیں ہوگی۔ وہ کچھ وقت تمہارے ساتھ گزارا تو سکتے ہیں لیکن ایک عرصے کی رفاقت کبھی نہیں دے سکتے۔“

”میرے خدا۔“ اس نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

”کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ تمہارے دل کی تختی پر میل نام کھا ہے اور کوئی مرد اتنا جی دار نہیں ہوتا جو ساری باتیں جاننے کے باوجود بھی سائبا نی میٹر کرے۔“

اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی جمع ہو گیا۔ اور پھر روکتے روکتے بھی ہلکوں سے نیچے جھکنے لگا تھا۔ کچھ وقت پہلے وہ سوچ رہی تھی۔ کوئی تو ہو جس سے وہ اپنا احوال کہہ سکے جو اسے بچ بچا ہوا سے نکال لے۔ کوئی ہمدرد۔ غمگسار، کوئی ہمارا ملکہ کوئی نہیں تھا۔

لیکن نہیں شاید وہ بھول گئی تھی، ایک ہمارا ثاقب حسن۔ جس نے ابھی ابھی اسے آئینہ دکھایا تھا۔ وہ ساری باتیں جنہیں یا تو اس نے سوچا نہیں تھا یا پھر جان بوجھ کر نظر انداز کر رہی تھی بہر حال حقیقت وہی تھی جو ابھی ثاقب حسن نے کہی تھی کہ کوئی مرد اتنا جی دار نہیں ہو سکتا۔

”ثاقب حسن تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کتنے بہت سارے دن بیت گئے۔ خواب سجانے تو وہ عرصہ ہوا چھوڑ ہی چکی تھی اور اب سرباب کے پیچھے بھاگنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ شہر و زامد اس کے لیے کس انداز سے سوچے ہیں اور یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ جی داروں کی فہرست میں سب سے اوپر شہر و زامد اپنا نام لکھ چکے ہیں۔ اس نے ثاقب حسن کی کہی بات کو حقیقت جان کر یہ بھی تسلیم کر لیا کہ اس کی حیثیت شہر و زامد کے نزدیک خوبصورت کھلونے سے بڑھ کر نہیں ہوگی اور سچ تو یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو غصلا نہیں سکی تھی۔ جبھی تو اپنے گرد بٹے جال اور اس کی مضبوطی کو اپنی شدت سے محسوس کرنے لگی تھی کہ اگر اس

کے دل میں اس جال سے نکلنے کی کوئی خواہش تھی تو دم توڑ گئی تھی۔ اور ایک بار پھر وہ اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑتے ہوئے دوبارہ اسی پرانے حصار میں مقید ہو گئی۔ جہاں اس کے سارے احساسات پر برف کی تہیں جم گئیں۔ جسے شہر و زامد کی نگاہوں کی تیش بھی نہ پگھلا سکی۔ وہی نکتہ، وہی جھجک اور وہی ہر بات میں دامن بچا لینا۔ یہاں تک کہ گھر میں شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔

دوسرے شہروں میں رہنے والے عزیز رشتہ دار شادی میں شرکت کے لیے آئے تو ظاہر ہے ان کے لیے رہنے کا انتظام گھر میں ہی کیا گیا۔ کچھ دن پہلے سے ہی گھر میں مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اور گھر ایک دم بھر اچھا لگنے لگا تھا۔ یہاں ایک بار پھر شہر و زامد کو بار بار وہی جگہ بولنے پڑے جو ابتدائی دنوں میں کہا کرتے تھے۔

”کیا ہو گیا ہے آپ کو؟“

”اتنی لا تعلقی سی کیوں ہیں؟“

”اب لوگ آپ کے بارے میں کیا سوچیں گے؟“ وہ وغیرہ اور اسے پتا نہیں پروا نہیں تھی کرب اس کے بارے میں کیا سوچیں گے یا احساس نہیں تھا جو وہ شہر و زامد کے جھنجھلاہٹ اور خفا ہونے کے باوجود اپنے آپ کو ان سب میں شامل نہ کر سکی۔ رات میں نوکیلاں ڈھولک پر گیت گاتیں تو وہ الگ تھگ سی بیٹھی بس انہیں دیکھتی رہتی۔ یہ خیال بھی آتا کہ ایسا ہی ہنگامہ اتناں کے گھر بھی ہوگا۔

کتنا ارمان تھا اسے جھوٹی آپا کی شادی کا اور اس نے سوچا تھا کہ ان کی شادی میں بھرپور خوشی ملے گی لیکن اب اتفاق ایسا تھا کہ جھوٹی آپا کی شادی اسی گھر میں ہو رہی تھی اور اس گھر کی بڑی بہو ہونے کے نالے اسے یہیں سے شرکت کرنی تھی۔ ایک بار اس نے دے لفظوں میں شہر و زامد سے کہا بھی کہ وہ اتناں کے گھر چلی جاتی ہے لیکن انہوں نے نرمی سے سمجھا دیا کہ اس گھر میں اس کی ضرورت زیادہ ہے۔

جھوٹی آپا کی ہندی لے کر جب وہ سب کے ساتھ اتناں کے گھر گئی تو ایک دم سے ساری مصلحتیں بالائے طاقت رکھ کر وہ صحت جھوٹی آپا کی بہن بن گئی۔ اور اس وقت تو شہر و زامد کی نر زخیران رہ گئیں، جب وہ نکشوم اور ہما کے ساتھ مل کر گانے کے ساتھ ساتھ ان سب پر ہونگ کرنے لگی تھی۔ واپسی میں سب نے اس کا گھر آؤ کر لیا۔

”واہ بھابی! آپ تو جیسی رستم نکلیں۔“

”کمال ہے۔ میں تو سمجھی تھی، آپ کو گانا بالکل نہیں آتا ہوگا، جیسی ہمارا ساتھ نہیں دیتیں۔“

”اب پتہ چلا، آپ کو دودھ سے زیادہ بہن کا خیال تھا۔“

سب اس کے گرد گھیرا بنائے اپنا اپنا خیال ظاہر کر رہی تھیں۔ اور وہ نروس ہو کر راہ فرار ڈھونڈ رہی تھی۔ شوگر کر شہر و زامد اس طرف آئے اور اسے لڑکیوں کے گھیرے میں پریشان کھڑے دیکھ کر پوچھنے لگے۔

”خیریت۔؟“

”بالکل خیریت ہیں ہے۔ وہ بھی آپ کی ربیعہ کی۔“ ان کی چپا زاد خانے شوخی سے کہا تو وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”کیا بات ہے ربیعہ؟“

”ان سے نہیں، ہم سے پوچھیں۔“ شبلا انہیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہوئی بولی۔ ہم اتنے دنوں سے بھائی سے اصرار کر رہے تھے کہ ہمارے ساتھ گائیں لیکن انہوں نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ بوں پوز کرتی رہیں، جیسے انہیں گانا آتا ہی نہ ہو۔ لیکن اپنے گھر جاتے ہی یہ جین چھوڑ کر اپنی بہنوں کے ساتھ مل گئیں۔ اور نہ صرف لگنے لگائے بلکہ ہم پر ہونگ بھی کی۔“

”اچھا۔“ انہوں نے خیرت کا مظاہرہ کیا۔ ”پھر اب آپ سب ان سے کیا چاہتی ہیں؟“

”ہم ان سے کانا سنیں گے۔“ سب کورس کے انداز میں بولیں۔

نہا اپنے آپ پر رشک کرتی۔ پھر میں اتنی آزدہ کیوں ہو رہی ہوں؟ کیوں نہیں بڑھ کر اپنے دامن میں ساری خوشیاں سمیٹ لیتی۔ کون جانے پھر کبھی ایسے لمحات زندگی میں آئیں گے بھی کہ نہیں؟ اس نے ٹروٹ بدل کر اندھیرے میں دروازے پر نظریں جمادیں۔ رشک روم سے سب کے باتیں کرنے ورنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اسے لگا جیسے وہ سب بے حرمتیت کرنے والے اچانک اس پر ہنسنے لگے۔ اس کے گرد ونبے جال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چہ میگوئیاں، سرگوشیاں اور پھر اونچے دہکے مٹکتے۔ ”میرے خدا۔“ وہ تکیے پر بے بسی سے سر پٹختے ہوئے اپنے اندر اٹھتی وردی لہروں سے معمور ہونے کی کوشش کرنے لگی۔

پھر لگے دو دن بے حد مصروفیت میں گزرے۔ وہ بہت خاموشی سے گھر کے اندر کے چھوٹے موٹے کام کرتی رہی۔ بہانوں کا خیال رکھنا، اپنی نگراں میں ان کے کمروں کی صفائی اور پھر کچن میں کھانا۔ کسی لذت پسند لڑکیاں اسے اپنے پاس بٹھاتیں بھی تو وہ بس کچھ دیر کو ان کا ساتھ دیتی پھر کسی کام کا بہانہ کر کے بھاگتی۔

اس کا وجود گہری خاموشیوں کی زد میں تھا۔ بظاہر بہت پرسکون نظر آتی تھی لیکن اگر کوئی اس کے اندر نہا کر دیکھتا تو جانتا کہ وہ کتنے طوفانوں میں گھری ہے اور کسی کو اتنی فرصت ہی نہیں تھی۔ سب اپنے آپ میں مگن اور مصروف۔ شام میں کیا پہننا ہے؟ کون سے پارلر جانا ہے؟ ہر ایک کو یہی فکر تھی۔ وہ ماری افراتفری۔ لڑکیوں کا ایک کمرے سے دوسرے کمرے کی طرف بھاگنا دیکھتی رہی۔ کسی وقت کوئی اس کے قریب رک کر پوچھتی۔

”بھائی۔ آپ شام میں کیا پہنیں گی؟“ اور اس کا جواب سنے بغیر غائب۔ جیسے پوچھنا فرض تھا۔ بواب سے کوئی غرض نہیں۔

اور ان بہت سارے لوگوں میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو۔ بے پناہ مصروفیت کے باوجود اس سے باغیر تھا۔ اس کے ہر پل سے آگاہ۔ جیسی تو بارات جانے سے کوئی دو گھنٹے پہلے وہ اپنا ہر کام پورا کر اس کے پاس چلے آئے۔ وہ اس وقت شہلا کے بال بنا رہی تھی۔

”زیچہ۔ میرے ساتھ آئیں۔“ انہوں نے تھکنا بے چین کہا۔ ”ابھی آتی ہوں۔“ وہ جلدی جلدی شہلا کے بالوں میں پھنس گئی۔ انہوں نے وہیں کھڑے ہو کر اس کا انتظار کیا پھر اسے ساتھ لے کر اپنے کمرے میں آئے۔

دوسروں کا بہت خیال ہے آپ کو؟ ”کمرے میں آتے ہی کہنے لگے۔ ”جی۔“ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

اسی طیلے میں بارات کے ساتھ جائیں گی؟ ”وہ شہادت کی انگلی اٹھا کر اس کے سر پر لے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

”نہیں تو۔“ وہ بوکھلا کر فوراً کہہ گئی۔

”پھر اب تک تیار کیوں نہیں ہوئیں؟“

”ابھی تو بہت وقت ہے۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔

”صرف دو گھنٹے۔“ انہوں نے کلائی پر بندھی گھڑی اس کے سامنے کی۔ اور کیا اتنا وقت آپ کو تیاری کے لیے نہیں چاہیے؟“

”میرا خیال ہے، میں جلدی تیار ہو جاتی ہوں۔ یعنی بہت کم وقت میں۔“

”جی ہاں۔“ آپ کی کم وقت کی تیاری میں دیکھ چکا ہوں۔ اور اس وقت آپ شاپنگ کے لیے نہیں جا رہیں بلکہ۔“

”آؤ۔ آپ میری فکر کیوں کرتے ہیں؟“ وہ خوانخواہ جھنجھلا گئی۔ وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتے

مہر۔ پھر ٹھہرے ہوئے بیچ میں بولے۔

”لیکن مجھے گانا نہیں آتا۔“ وہ بے بسی اور مدد طلب نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”واقعی ریچہ کو گانا نہیں آتا۔“ انہوں نے کہا تو سب ان کے پیچھے پڑ گئیں۔

”جی ہاں، آپ ان کا ساتھ نہیں دیں گے تو کون دے گا۔“ چلے اب آپ گلے میں بھی ان کا سہارا

دیکھیے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب آپ سمجھتے ہیں۔ جلسے بیٹھیں۔“ وہیں قالمیں پر انہیں بٹھا کر باقی سب بھی دائرے کی شکل

بیمہ گئیں۔ اور پکے پکے تالیاں بجانے لگیں۔ تالیاں کی آوازیں کمرہ در کمرہ اپنے کمرے میں پچاڑا اور مومن

بھائیوں کے ساتھ بیٹھا تھا، سب کو لے کر نکل آیا۔ اور وہ جو اپنے آپ کو تیار کر رہی تھی، ان سب لوگوں

کو دیکھ کر پھر ہمت ہار بیٹھی۔

”میں نہیں گاؤں گی۔“ سرگوشی میں وہ بولی۔

”گانا تو پڑے گا۔ ورنہ یہ سب چھوڑیں گے نہیں۔“ انہوں نے بھی سرگوشی میں کہا۔

”یہ آپ دونوں کیا سازش کر رہے ہیں؟ جلدی سے شروع کریں۔“ شہلا انہیں سرگوشیوں میں

باتیں کرتے دیکھ کر زور سے بولی۔ تو وہ ہنسکرتے ہوئے سیدھے ہو بیٹھے۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے

انہوں نے ہی شروع کیا۔

”زندگی کی نہ ٹوٹے لڑی، پیار کر لیں گھڑی دو گھڑی

اس کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھوں سے اسے گلے کا اشارہ کیا۔ لیکن وہ اتنی نزوس ہو رہی تھی

ہونٹ کاٹتے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگی۔

”پیار کر لیں گھڑی دو گھڑی

پھر اسے اشارہ کیا تو اپنی بے بسی پر اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

”آن آنکھوں کا ہنسنا بھی کیا، جن آنکھوں میں پانی نہ ہو

شہلا کے کہتی مارتے پر وہ ان کا ساتھ دینے پر مجبور ہوئی۔

وہ جوانی، جوانی نہیں، جس کی کوئی کہانی نہ ہو

میں مرنے کی کس کو ڈی پیار کر لیں گھڑی دو گھڑی

پیار کر لیں گھڑی دو گھڑی

آج سے اپنا وعدہ رہا، ہم ملیں گے ہر اک موڑ پر

دل کی دنیا بسائیں گے ہم غم کی دنیا کا در چھوڑ کر

ٹوٹ جلتے گی ہر تھکڑی پیار کر لیں گھڑی دو گھڑی

پیار کر لیں گھڑی دو گھڑی

بے تحاشا تالیاں کے ساتھ واہ واہ ہونے لگی اور وہ موقع غنیمت جان کر اٹھ کر اپنے کمرے میں

دل پھر حقائق سے نظریں ڈرا کر اگلے راستوں پر چلنے کی ترغیب دے رہا تھا۔ لیکن وہ بار بار دل کا ہانپنا

مان سکتی تھی۔ اس کے سر پہ چھپنے چھپنے کے باوجود اپنے حصار سے نہیں لٹکی۔

چار دن کی چاندنی سے اپنے میں اجالا کرنے سے کیا فائدہ جب کہ آگے وہی اندھیری راتیں

اس نے سوچا اور لڑاٹ آف کرنے کی لٹ گئی۔ اسے یاد آیا ایک بار شہر و زاحمد، چھوٹی آپا سے کہہ رہے تھے

”خوشیاں معتد سے ملنا کرتی ہیں اور جب کوئی خوشی دروازے پر دھک دے تو دروازہ بند نہیں

چاہیے۔“

”میں کیوں دروازہ بند کر رہی ہوں؟“ اس نے سوچا۔ ”باہر ایک نہیں دھیروں خوشیاں میری منتظر

ہیں۔ سب لوگوں کی بے حد حساب محبتیں اور مجھے خاص اہمیت دینا۔ میری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی

”پتھ کہیں، کیا آپ کے اندر یہ خواہش نہیں تھی کہ کوئی آپ کی فکر کرے۔“  
 اس کے اندر آتے سارے طوفان جو یقیناً اس کی ہستی کو مکمل طور پر توڑ دینے کے درپے  
 اچانک ٹھہر گئے۔ اور وہ پوری آنکھیں کھولے بے خیالی میں ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”مجھے آپ کی فکر ہے۔“ وہ کہنے لگے۔ ”اور آپ صرف ایک بات کا خیال رکھ لیں کہ آج  
 آپ کو صرف میرے حوالے سے دیکھیں گے تو بلیز مہر وز کی شادی پر مسٹر شہروز احمد کو جیسا نظر  
 چاہیے، آپ۔“ وہ بات پوری کیے بغیر کرے سے نکل گئے۔ اس نے بہت خاموشی  
 انہیں جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کے بعد بھی وہ کتنی دیر تک وہیں کھڑی رہی تھی۔

پھر جب باہر جلدی جلدی کا شور مچنے لگا، تب وہ پوری سچ دھج کے ساتھ کمرے سے نکل  
 اس وقت اپنے چچا جان کے ساتھ مل کر مہر وز کو سہرا باندھ رہے تھے، اسے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔  
 اول روز وہ اسی روپ میں انہیں اپنے بیڈ روم میں نظر آئی تھی۔ اور اس وقت کیونکہ دل میں  
 یہی خیال تھا کہ وہ ان کے دوست کی امانت ہے، اس لیے بہت بربری انداز میں اسے دیکھا تھا  
 اب اگر دوست کا خیال تھا بھی تو اس سے کہیں زیادہ اپنی خواہشات تھیں جنہوں نے دوسرے ہر شے  
 پس منظر میں دھکیل دیا تھا دل کے اس پاس گھنٹیاں بجنے لگیں تو وہ اپنا کام چھوڑ کر بے اختیار  
 کی طرف نپکے۔

”تھینک یو۔“ اس کے قریب پہنچ کر سرگوشی میں بولے اور وہ ہمیشہ کی طرح زور نہیں ہوا  
 مسکرا کر ان کا شکریہ قبول کیا۔ اصل میں تیار ہوتے ہوئے وہ مسلسل اپنے گرد کھینچا حصار توڑ  
 کی کوشش کرتی رہی تھی، سوچا۔

یہ جو کچھ وقت میری دسترس میں ہے، کیوں نہ اسے امر کروں۔ ایک بے ضرر سی خواہش  
 ہے شہروز احمد کی کہ مجھے پتہ چلے کہ ان کی سمنظر آنا چاہیے۔ اور یہ کوئی ایسی مشکل بات بھی نہیں ہے  
 جو میں مان نہ سکوں۔ آخر وہ بھی تو مجھے برداشت کر رہے ہیں۔ یہی سب سوچتے ہوئے اس نے  
 اپنے گرد کھینچا حصار بالآخر توڑ ہی ڈالا۔ اور کمرے سے نکلنے سے پہلے یہ تہیہ بھی کیا تھا کہ کسی قدر  
 ڈلگائے گی نہیں، جیسی اب ان کے تھینک یو کہنے اور دہانہ نظروں سے دیکھنے پر ہلکے سے مسکرا  
 ”ایک بار پھر شکریہ اور اب آگے بڑھ کر مہر وز سے اپنا نیگ وصول کریں جیسے آپ اور  
 کر رہی ہیں۔“ وہ اسی طرح مسکراتی ہوئی سب کے درمیان میں سے راستہ بنا تی ہوئی آپنی اور ند  
 کے ساتھ شامل ہو گئی۔

پھر اگلے تین چار دن میں اس نے خوب انجوائے کیا۔ چھوٹی آپا اماں کے گھر سے واپس  
 کر بیان آگئیں۔ اگلے دن دینے کی تقریب ایک فائو اسٹار ہوٹل میں تھی، جہاں سے نماز نخت ہو کر  
 مسرال سدھاری۔ یوں اپنے والد کے بعد سے جو تہہ داریاں شہروز احمد کے کندھوں پر آ رہی  
 ان سے وہ بہت احسن طریقے سے عہدہ برا ہو گئے۔ کچھ دن تک گھر میں مہمانوں کا آنا جانا لگا رہا  
 جب زندگی معمول پر آئی تو ایک نئی آنکھیں اس کی منتظر تھی۔ جسے وہ شادی کے ہنگاموں اور مہمانوں  
 کی آمد و رفت کی وجہ سے محسوس نہیں کر سکی تھی۔ اور اب جب فراغت ملی تو اس نے نہ صرف محسوس  
 کیا بلکہ خاص طور پر کئی دن تک نوٹ بھی کرتی رہی۔ کہ

مہر وز کچھ بچھا بچھا سا اور چھوٹی آپا کھڑی اکھڑی سی ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ابتدائی  
 میں دونوں کے درمیان کیا رنجش ہو گئی ہے جب کہ یہ دن تو ہر فکر سے آزاد ہو کر بننے بنانے  
 کے ہیں اور پھر مہر وز کے خراج میں تو ویسے بھی بہت شوخی ہے، وہ کیوں اتنا سنجیدہ ہو رہا ہے  
 اس نے سوچا چھوٹی آپا سے بات کرے لیکن پھر اپنی سوچ کی نفی کر دی۔ ہو سکتا ہے کہ  
 اس کی مداخلت پسند نہ کریں۔ ویسے بھی ان دونوں کا آپس کا معاملہ ہے۔ آج ایک دوسرے  
 سے خفا ہیں تو کل مان بھی جائیں گے۔ اس نے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن

اس وقت نہ صرف یہ کہ اس کی کوشش ناکام رہی بلکہ اسے شرمندگی کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ جب  
 چوٹی آپا کا مناسب رویہ سب پر ظاہر ہو گیا۔  
 چھٹی کا دن تھا۔ ناشتے کے بعد سب ہسٹنگ روم میں آکر بیٹھے ہی تھے کہ اسی مہر وز کو ناٹک  
 کر کے کہنے لگیں۔

”بیٹا۔ میں اس انتظار میں تھی کہ تم دونوں کا دعوتوں کا سلسلہ ختم ہو اور اب میرا خیال ہے  
 بلکہ میں چاہتی ہوں تم دونوں کہیں گھوم پھراؤ شان کا اشارہ ہنی مون کی طرف تھا۔  
 بالکل یہی تمہارے آزادی سے گھومنے پھرنے کے دن ہیں۔“ شہروز کہنے لگے۔ ”کہیں باہر  
 جانا چاہتو میں اس کا انتظام بھی کر دیتا ہوں اور اپنے ملک میں بھی پرنسزا اور خوبصورت مقامات  
 کی کمی نہیں ہے جیسے تم دونوں پسند کرو۔“

”صوفیہ سے پوچھ لیں۔ یہ کہاں جانا پسند کریں گی۔“ مہر وز نے بات صوفیہ پر ڈال دی اور  
 شہروز کے سوالیہ نظروں سے دیکھنے پر وہ ناگوار سے بولیں۔

”مجھے کہیں نہیں جانا۔“  
 ”کیوں بیٹا؟“ اسی کے شفیق لہجے کے باوجود وہ بدتمیزی سے بولیں۔  
 ”بس نہیں جانا۔“  
 ”لیکن بیٹا۔“

”میں نے کہا ناں، مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔“ وہ تیز لہجے میں کہتی ہوئی اٹھ کر اپنے کمرے  
 میں چلی گئیں۔

کچھ دیر تک تو سب اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہے۔ شاید حیران بھی تھے اور حیرت کی بات  
 تو تھی ہی کہ گذشتہ دو سالوں میں اس نے کبھی کسی کو اس لہجے میں بات کرتے نہیں سنا تھا۔ اپنے  
 آپ میں بے حد نرمی محسوس کرتے ہوئے لکھنویوں سے باری باری سب کو دیکھا۔ مہر وز سر جھکائے  
 بیٹھا تھا۔ شہروز کی نظریں صوفیہ کے پیچھے بند دروازے پر جمی تھیں اور اسی مہر وز کے جھکے ہوئے  
 سر پر نظریں جمائے جیسے صورتحال سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

اس کا خیال تھا ابھی صوفیہ کی بابت اس سے سوال کیے جائیں گے لیکن سامنے اتنی تھیں۔  
 جہانیدہ خاتون۔ وہ صوفیہ کے غیر مناسب رویے کا قہر دار اسے نہیں ٹھہرا سکتی تھیں۔ ہاں اگر ان کی  
 جگہ کوئی اور رواجی ساس ہوتی تو وہ پہلے اسے ہی لتاڑتی لیکن اتنی نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں  
 مہر وز سے کہنے لگیں۔

”مہر وز۔ تم نے صوفیہ سے کیا کہا ہے؟“ وہ جھکے ہوئے سر کو نفی میں ہلانے لگا۔

”پھر وہ خوش کیوں نہیں ہے؟“ میں پہلے دن سے اسے اکھڑا اکھڑا محسوس کر رہی ہوں۔“

”آپ اسی سے پوچھیں۔“ مہر وز آہستہ آواز میں بولا۔

”اس سے نہیں۔ میں تم سے پوچھوں گی یقیناً تم نے کوئی ایسی بات کی ہوگی؟“

”نہیں اتنی۔“ وہ فوراً بول پڑا۔ ”میں خود نہیں سمجھ پا رہا۔ وہ ایسا کیوں بیہوش کر رہی ہیں۔“

”بیٹا۔ کوئی وجہ تو ہوگی ناں۔“ اسی نرم پڑتے ہوئے بولیں۔

”یقیناً ہوگی۔“ اور بخدا میں نہیں جانتا کہ کیا وجہ ہے ان کا رویہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہے آپ

ان سے پوچھ لیں۔ اگر میری طرف سے کوئی تکلیف پہنچی ہو تو آپ کو اختیار ہے جو چاہے منرا سے  
 لیجے گا۔“

اتنی خاموش رہ کر جانے کیا سوچنے لگیں کہ وہ کہنے لگا۔  
 ”آپ ربیعہ بھالی سے پوچھیں۔ ہو سکتا ہے۔“  
 ربیعہ سے کیوں پوچھوں؟“ اتنی نے فوراً ٹوک دیا۔ ”ربیعہ کا تمہارے معاملے سے کیا تعلق ہے۔“

صوفیہ تمہاری بیوی ہے اور اس کے بارے میں میں تم سے سوال کروں گی۔

”آئی ایم سوری اتنی۔ میرا مطلب ہے۔“

تمہارا مطلب جو بھی ہو، ایک بات یاد رکھو۔ آئندہ اپنے کسی معاملے میں ربیعہ کو گھسیٹنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ اگر صوفیہ کی بہن ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم صوفیہ کی بابت اس سے سوال یا الزام دو۔“

”آئی ایم سوری اگین۔“ وہ بے حد تادم نظر آ رہا تھا۔

”میرے خدا۔ میں اس قابل تو نہیں ہوں۔ پھر یہ سب کیوں مجھے اہمیت دے کر اتنا معتبر دیتے ہیں۔“ اس نے سوچا اور ڈرتے ڈرتے شہروز احمد کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا تب وہ اپنے اندر بہت پیدا کرتی ہوئی امی سے کہنے لگی۔

”اتنی۔ آپ نے مہر زکی بات تو ہی نہیں سنی۔ اس کا مطلب ہے ہوسکتا ہے میں بہن ہونے کے ناتے صوفیہ بی بی کے رویے کے بارے میں کچھ قیاس کر سکوں۔“

”یقیناً مہر زکی بھی کہنا چاہتا تھا۔“ شہروز نے اس کی تائید کی، پھر کہنے لگے۔ ”بہر حال آپ پریشان نہ ہوں۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ ویسے بھی کسی لڑکی کو نئے گھر میں ایڈجسٹ ہونے کے لیے کچھ وقت تو لگنا پڑتا ہے۔ اور پھر ماحول کو خوشگوار کرنے کی غرض سے ہوئے۔“

”اور مہروز۔ تم یوں سر جھکا کر مت بیٹھو۔ جلنے کی تیاری کرو صوفیہ کو ہم راضی کریں گے۔“

”نہیں بہن! جان۔ میں ایسی تفریح نہیں چاہتا جس میں وہ زبردستی میرا ساتھ دینے پر مجبور کی گئی ہو! اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر چلتے جاتے بولا تھا۔

”آئی ایم سوری۔ میں شاید زندگی میں پہلی بار آپ کی کسی بات کو ریکارڈ کر رہا ہوں۔“

اس کا خیال تھا شاید یوں سے فارغ ہونے کے بعد جب زندگی معمول پر آجائے گی، تب وہ کچھ دنوں کے لیے اماں کے گھر چلی جائے گی لیکن چھوٹی آپا کے رویے نے گھر کے ماحول میں جوتاؤ پیدا کر دیا تھا، اس نے اپنا جانا نکلنا تو کر دیا۔ حالانکہ وہ تو فرار کی راہیں ڈھونڈنے میں ماسٹر تھی لیکن یہاں کوشش کے باوجود وہ فرار کی راہ اختیار نہ کر سکی گوکہ چھوٹی آپا کے نامناسب رویے کی ذمہ دار وہ نہیں تھی، پھر بھی وہ گلیٹ فیل کرتی۔

کئی بار چھوٹی آپا سے اس سلسلے میں بات کرنے کی کوشش کی کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہیں لیکن انہوں نے اس کی بات کا جواب ہی نہیں دیا۔ کبھی ٹال جاتیں اور کبھی ڈانٹ دیتیں۔ وہ پریشان رہنے لگی۔ اکثر سوچتی، چھوٹی آپا خوش نصیب ہیں جنہیں اتنا اچھا سسرال ملا۔ اگر کوئی مجھے یہ یقین بخش دے کہ میں ہمیشہ رہیں گی تو بخدا میں اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھنے لگوں۔“

اس روز وہ ایک دن کے لیے اماں کے گھر آئی تو کچھ بغیر رہ نہ سکی۔

”اماں چھوٹی آپا اچھا نہیں کر رہیں۔“

”کیا؟ کیا کر رہی ہیں؟“ اماں اچنبھے سے پوچھنے لگیں۔

”اُن کا رویہ مہروز کے ساتھ انتہائی غیر مناسب ہے۔ اور کسی کسی وقت تو اتنی کے سامنے بھی بدتمیزی کر جاتی ہیں۔“

”اور مہروز اس کے ساتھ کیسا ہے؟“ اماں فوراً چھوٹی آپا کو الزام دینے کے بجائے مہروز کے بارے میں پوچھنے لگیں۔

”مہروز بہت اچھا ہے اماں۔ یہ اس کی شرافت ہے کہ چھوٹی آپا کی ہر بات اور ہر زیادتی برداشت کر رہا ہے ورنہ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو۔“ وہ خاموش ہو گئی تو اماں کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

”میں نے بھی محسوس کیا ہے اور تمہارے ابا میاں نے بھی۔ کبھی جب دونوں ساتھ آتے ہیں۔ تو

لڑی اٹھ کر سی نظر آتی ہے۔ میرا خیال تھا مہروز ٹھیک نہیں ہے لیکن اب جو تم مہروز کی تعریف ہو تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟“

”بات تو ہماری سمجھ میں نہیں آتی اماں۔“

”نہ صوفیہ سے پوچھا نہیں۔“

”اب تو پوچھنے کی کوشش کی لیکن یا تو ٹال جاتی ہیں یا ڈانٹ دیتی ہیں اور اماں اُن کے اس رویے پر بڑی شرمندگی ہوتی ہے۔“

”مندی کی بات تو ہے۔ کیا سوچتے ہوں گے تمہارے سسرال والے کہ ایک بہن کیسی ہے اور لڑکی“ ”خدا سے توقع کے بعد کہنے لگیں۔“ شروع ہی سے الگ مزاج ہے اس کا، میرے ساتھ بھی درازی کر جاتی تھی۔“

”بن اماں، آپ انہیں سمجھائیں تو سہی۔“

”ہی کہاں مانتی ہے، تمہارے ابا میاں سے کہوں گی، وہی سمجھائیں گے۔ مہروز تو ٹھیک ہے بلکہ ساتھ ہے، اماں پھر مہروز کے بارے میں پوچھنے لگیں۔

”لیکن اگر ان کا یہی رویہ رہا تو۔“ وہ پھر اپنے خدشات کو زبان پر آنے سے روک گئی تھی۔

”میں شہروز آئے تو وہ اُن کے ساتھ واپس آگئی حالانکہ انہوں نے چلنے کے لیے نہیں کہا تھا۔“

”ایسا کہ انہیں ابھی کسی کام کے سلسلے میں کہیں اور جانا ہے۔ وہ پھر بھی ساتھ چل پڑی۔ اسے بروہ باہر ہی سے چلے گئے تھے۔“

”ای ڈی لاؤنچ میں اکیلی بیٹھی تھیں۔ وہ انہیں سلام کرتی ہوئی اُن کے پاس آ بیٹھی۔“

”خیال تھا، آج تم وہیں رہو گی؟“

”وہ تو تھا لیکن آپ کی تنہائی کے خیال سے چلی آئی۔“

”تی رہو۔“ اُنہی اس کے جواب سے خوش ہوئیں، پھر کہنے لگیں۔ ”میں تنہا تو نہیں تھی، صوفیہ اپنے کمرے سے کب نکلتی ہیں؟“

”اس گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگنے کی تو میرے پاس بھی بیٹھی ہے۔“

”حیران ہوئی اُنہی کو اب بھی اس سے شکایت نہیں تھی کچھ کہنا چاہتی تھی کہ مہروز خاصا غصے بن کر سے نکلا اور باہر کی طرف جلتے ہوئے کہنے لگا۔

”میں ایک کام سے جا رہا ہوں۔ رات میں دیر سے آؤں گا۔“

”بات تم اپنی بیوی کو بتاؤ۔“ اُنہی نے رمان سے کہا۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں دیر سے آؤں یا آؤں ہی ناں۔“

”مکے ساتھ ہی وہ نیز تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کی نظروں نے دروازے تک اس کا کیا۔ پھر طویل سانس لے کر وہ سر جھکا گئی۔

”مہروز کہاں رہ گیا؟“ اُنہی اسے سوچتے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

”ی کام سے گئے ہیں۔“

”عام جا کر کچن دیکھو۔ میں جب تک نماز پڑھ لوں۔“ وہ چپ چاپ اُٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ پھر اُٹھا صرف اس نے اور اُنہی نے کھایا۔ چھوٹی آپا بلانے کے باوجود نہیں آئیں اور شہروز اور پھر پتا نہیں تھا۔ کب آتے ہیں؟“

”ماتے کے بعد وہ کچھ دیر اُنہی کے پاس بیٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ ہر طرف خاموشی کی چادر تھی، ہونے لگی۔ ساتھ ہی نامعلوم آداسی پر پھسلنے چلی آئی۔

”ہی! بلکہ مقصد کمرے میں ادھر ادھر جگر لگانے کے بعد وہ کھڑکی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ تاریکی

جھوٹ کہتی ہوں۔ اگر ایسی بات ہوتی تو تم پہلے ہی مجھے بتاتیں؟  
 پہلے مجھے خود معلوم نہیں تھا۔ یہ تو ابھی تین چار روز پہلے شہر ورنے بتایا ہے کہ جس روز مہروز  
 نے ان کے گھر سے لینے آیا تھا، اسی روز اس نے آپ کا نام لے دیا تھا اور جب اسی نے اس کی  
 شادی کی بات چھوٹی تو اس نے آپ کا نام لے دیا تھا۔  
 چھوٹی آپ اب بھی غیر یقینی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتی  
 ہوئی بولی۔  
 اگر میرا یقین نہیں ہے تو شہروز سے یا پھر مہروز سے پوچھ لیں۔ چھوٹی آپا نے اُسی کا یقین کر لیا۔  
 دیر رونے لگیں۔

ارے۔ اب کیا ہوا؟  
 میں بہت بڑی ہوں ربیعہ۔ مہروزی محبت کو دکھاوا اور ترس سمجھ کر مسلسل اُن سے لڑتی اور  
 ان کی بات ریجکٹ کر کے انہیں خفا کرتی رہی ہوں۔ لیکن میں خود بھی کبھی چین سے نہیں رہی۔ ہر  
 بار احساس رہتا ہے کہ میں اچھا نہیں کر رہی، پھر بھی پتا نہیں کیوں؟  
 آپ کا اتنا قصور نہیں ہے چھوٹی آپا۔ اصل میں ہمیں اور خاص کر آپ کو جن حالات کا سامنا رہا اور  
 جسے لوگوں سے واسطہ پڑا، اس میں کسی کی محبت کا یقین مشکل ہی سے آتا ہے۔ پھر منفی سوچوں نے  
 ہمیں آپ کی زندگی کو تلخ بنا دیا اور اپنے ساتھ ساتھ آپ نے پورے گھر کو اپنی لپٹ میں لے لیا۔  
 ہر حال ابھی بہت زیادہ وقت نہیں گزرا۔ آپ تلافی کر سکتی ہیں۔  
 مجھے تو یہ سوچ سوچ کر شرمندگی ہو رہی ہے کہ سب لوگ میرے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے؟  
 چھوٹی آپا واقعی نامادہ ہو رہی تھیں۔  
 کسی نے کوئی غلط بات کبھی نہیں سوچی ہوگی۔ یہ سب بہت بڑا ظرف رکھتے ہیں۔ اُن کے دلوں  
 میں بے پناہ وسعتیں ہیں۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ آپ کے اکھڑے رویے کو محسوس کرنے کے  
 باوجود کبھی کسی نے آپ پر جتا یا نہیں۔ آپ کو ٹوٹا نہیں بلکہ اسی تو مہروز کو ڈانٹتی ہیں کہ اُسی نے  
 بھگہا ہوگا۔ جبھی آپ اکھڑی اکھڑی سی رہتی ہیں۔  
 اب میں کیا کروں؟ چھوٹی آپا پر سوچ انداز میں پوچھنے لگیں۔  
 آپ کو زیادہ تردد نہیں کرنا پڑے گا۔ بس اپنے رویے پر شرمندگی کا اظہار ہی سب کے دلوں  
 میں آپ کا ایک خاص مقام بنا دے گا۔ ویسے بھی سب آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ بس  
 آپ نے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ آپ سمجھنے لگیں گی تو دیکھیں گے، اس گھر کے درو دیوار تک میں محبتوں  
 کی لہر رچی بس ہے۔  
 مہروز بہت غصے میں گئے ہیں۔ چھوٹی آپا کو مہروز کا خیال آنے لگا۔  
 ہاں۔ اب آپ تو آپ اُن سے معافی مانگنے کے ساتھ یہ یقین بھی دلا دیجیے گا کہ اُنہ  
 آپ ان کی کسی بات کو رد نہیں کریں گی اور صرف یہی نہیں مہروز کو آپ کی محبت کا یقین بھی ملنا چاہیے۔  
 آپ تو خوش قسمت ہیں چھوٹی آپا۔ اتنے چاہنے والے لوگ ہر کسی کو نہیں ملتے۔  
 صرف میں نہیں تم بھی۔  
 ہاں۔ میں بھی۔ وہ افسردگی سے مسکرائی۔ پھر اٹھتے ہوئے بولی۔ چلیں آپ منہ ہاتھ دھو لیں۔  
 چھوٹی آپا آٹھ کر ہاتھ روم میں چلی گئیں۔ اور جب منہ ہاتھ دھو کر تولیے سے صاف کرتی ہوئی واپس  
 گھر آئیں تو اسی وقت شہروز آگئے۔ چھوٹی آپا پر نظر پڑی اور اُن کی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر  
 شہر بہت۔  
 جی۔ چھوٹی آپا آہستہ سے جی کہہ کر کمرے سے نکلنے لگیں کہ انہوں نے نہ کھانا کھایا۔

نے باہر کے ماحول کو کچھ ترسارنا دیا تھا۔ وہ طویل سانس لے کر آسمان پر نظر میں دوڑانے لگی۔  
 ستارے جو بلیک جینے ہوئے گہرے بادلوں میں اپنے ساتھیوں کو تلاش کر رہے تھے۔ اُس نے  
 ٹھنڈی گرل پر پیشانی رکھا کر آنکھیں بند کی ہی تھیں کہ دروازے پر آہٹ سن کر فوراً پلٹ کر  
 لگی۔ دروازے پر چھوٹی آپا کھڑی تھیں کچھ پریشان سی۔ آنکھوں کی سرخی اُن کے روتے رہنے  
 چٹکی کھا رہی تھی۔  
 آئیے چھوٹی آپا۔ وہ انہیں پریشان دیکھ کر لپک کر اُن کے پاس آئی اور اُن کا ہاتھ پکڑ کر  
 بیڈ پر بٹھاتی ہوئی خود بھی اُن کے پاس بیٹھ گئی۔  
 کیا بات ہے؟ ایک دم اُن سے بڑی بن گئی۔ نرمی سے اُن کا ہاتھ دبا کر پوچھا۔  
 وہ۔ وہ۔ مہروز۔ وہ اسی قدر کہہ کر خاموش ہو گئیں۔  
 کیا ہوا مہروز کو؟  
 وہ ابھی تک نہیں آئے۔  
 کسی کام سے گئے ہیں؟ وہ انجان بن کر پوچھنے لگی۔  
 نہیں۔  
 پھر۔؟  
 غصے میں گئے ہیں۔ مجھ سے خفا ہو کر۔  
 آپ کیوں انہیں غصہ دلاتی ہیں؟ کیوں خفا کرتی ہیں انہیں؟  
 میں کیا کروں ربیعہ۔ مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہتا۔ اس کے ساتھ ہی چھوٹی آپا  
 میں چہرہ چھپا کر رونے لگیں۔ وہ اُن کے رونے سے پریشان تو ہوئی لیکن فوراً چپ نہیں کرایا  
 دیکھ اُن کی مسکریاں سنتی رہی۔ پھر ہلکے ہلکے اُن کا کندھا تھمتھیلانے لگی  
 بس کریں چھوٹی آپا۔ اس طرح نہ روئیں۔ مجھے بتائیں، مہروزیوں خفا ہو کر گئے ہیں۔  
 انہوں نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا تھا۔ لیکن میں نے منع کر دیا۔ چھوٹی آپا  
 ہوئے بولیں۔

میرا خیال ہے آپ تو اکثر ہی اُن کے ساتھ کہیں بھی جلتے سے انکار کر دیتی ہیں؟  
 ہاں۔ اس لیے کہ میں اُن کے ساتھ نہیں چل سکتی۔ اور یہ بات میں نے شادی سے پہلے ہی  
 واضح کر دی تھی۔ قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔ مجھے اُن کے ساتھ چلتے ہوئے آپا  
 بڑا عجیب سا لگتا ہے۔ بہت کمتر۔ اور لوگوں کی نظر میں جس انداز سے اُن پر سے ہوتی ہوئی  
 ٹھہرتی ہیں، وہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتیں۔  
 آپ لوگوں کی پروا کیوں کرتی ہیں؟ صرف مہروز کی پروا کریں۔ انہوں نے تو آپ سے کبھی کچھ  
 کہا ناں۔ بلکہ وہ تو آپ کے رویے سے اتنے پریشان رہنے لگے ہیں۔  
 صرف میرے رویے سے نہیں ربیعہ۔ مجھے لگتا ہے میرا ساتھ بھی اُن کے لیے پریشانی کا باعث  
 ہے۔  
 آپ کا ساتھ؟  
 ہاں۔ زبردستی جو مسئلہ کی گئی ہوں اُن پر۔ میرا خیال ہے شہروز بھائی نے مجھ پر ترس لگا کر  
 نہیں چھوٹی آپا۔ اُس نے فوراً ٹوک دیا۔ آپ کا خیال غلط ہے۔ کسی ناپ پر ترس نہیں کا  
 خود مہروز نے پہلے آپ کو پسند کیا۔ اُس کے بعد اُن کو اپنی پسند سے آگاہ کر کے آپ کے رشتے  
 لیے ہمارے گھر بھیجا تھا۔  
 کیا۔؟ چھوٹی آپا اکیدم سر اٹھا کر اُس کی طرف دیکھنے لگیں۔  
 ہاں چھوٹی آپا۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ وہ بہت یقین سے بولی۔

صوفیہ۔ یہاں آئیں۔ وہ پلٹ کر ان کی طرف دیکھنے لگیں۔  
یہاں آکر بیٹھیں۔ انہوں نے کہا تو وہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی، ان کے پاس آ بیٹھیں۔  
روٹی ہی ہیں؟ انہوں نے نرمی سے پوچھا۔ اور ایک یہی شخص جس کے سامنے بات بٹاتا  
یا جھوٹ بولنا انتہائی مشکل کام تھا۔ سر جھکا کر اعتراف کیا۔  
”کیوں؟“

”بس یونہی۔“  
”یونہی نہیں۔“ وہ فوراً بول پڑی۔ ”مہر وز خفا ہو کر گیا تھا۔ یہ اسی لیے رو رہی تھیں۔“  
”یہ خوب ہے۔“ پہلے اسے خفا کرتی ہیں، پھر روتی ہیں۔“  
”میں اب انہیں خفا نہیں کروں گی۔“ چھوٹی آپا زعم سے بولیں۔  
”واقعی۔“ وہ بغور ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولے اور ان کے اثبات میں سر ہلانے پر کہنے لگا  
”چلیے وہ تالاق میرے ساتھ آیا ہے جا کر یہ بات اس سے بھی کہہ دیں۔“  
”وہ بہت زیادہ غصے میں تو نہیں ہیں۔“ چھوٹی آپا نے سہم کر پوچھا۔ ”تو وہ مسکراہٹ دبا کر بولے  
”بہت زیادہ غصے میں ہے۔“  
”عجیب ہیں آپ۔“ خواہ مخواہ انہیں ڈرا رہے ہیں۔ وہ آگے بڑھ آئی۔ آپ جائیں چھوٹی آپا کہ  
نہیں ہوگا۔“

”تم میرے ساتھ چلو۔“ چھوٹی آپا اس کا ہاتھ کپڑ کر لیتی گئیں۔  
اپنے کمرے میں داخل ہوئیں تو مہر وز جوتوں سمیت صوفے پر نیم دراز تھا۔ اگر وہ اکیلی ہوتیں تو شاید  
وہ اسی طرح لیٹا رہتا لیکن ساتھ رہیے کو دیکھ کر فوراً اٹھ بیٹھا۔

”آئیے بھائی، بیٹھیں۔“  
”میں بیٹھنے نہیں آئی۔“ یہ تمہاری زوجہ محترمہ یہاں آنے سے ڈر رہی تھیں۔ انہیں چھوڑنے آئی ہوں  
”کیوں؟“ میں آدم خور ہوں کیا؟“

”پتا نہیں۔“ ویسے شہر ہونے ان سے یہی کہا ہے کہ تم آدم خور بن چکے ہو۔“  
”اچھا۔“ وہ ہنسا۔ ”ان سے کہہ دیں، اگر میں آدم خور ہوا بھی تو انہیں کچھ نہیں کہوں گا؟“  
”یہ بات تم خردان سے کہہ دو۔“ اس نے چھوٹی آپا کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور طرے سے  
باہر نکل آئی۔ اپنے کمرے میں آئی تو شہر وز اسٹڈی میں جا چکے تھے۔ اس نے کچھ دیر تک کر ان کے  
بند دروازے کو دیکھا۔ پھر بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی اپنے بید پر آ گئی۔

اس رات کی صبح بڑی خوشگوار تھی۔ وہ کمرے سے نکلی تو مہر وز اور چھوٹی آپا پہلے ہی سے اٹھ کر  
پاس موجود تھے۔ اور چھوٹی آپا کے چہرے پر اتنی دھنگ رنگوں کی برسات دیکھ کر وہ جان گئی کہ اس  
کی وہ بہن جس کے لیے وہ اپنے دل میں درد رکھتی تھی اور چاہتی تھی ان کے سارے دلہن ریت  
قدرت نے بڑی نیا نیا سی سے انہیں محبتوں کی دولت سے مالا مال کر دیا تھا۔ وہ طمانیت کا احساس  
ان سب کے درمیان آ بیٹھی۔ چھوٹی آپا کہہ رہی تھیں۔

”اُمی۔ آپ نے مجھے تو کایوں نہیں؟“ مجھے سرنش کیوں نہیں کی؟“  
”میں چاہتی تھی تمہیں خود احساس ہو اور خود سے جو احساس جاگے، وہ زیادہ دیر پا ہوتا ہے۔“  
”نہایت دوسروں کے احساس دلانے سے۔“  
”آپ نے مجھے معاف تو کر دیا ناں؟“

”میری جان، مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ پھر بھی اگر تمہارا اطمینان میرے ہاں کہنے سے ہوگا  
تو ہاں میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ اُمی شفقت سے مسکرائیں۔ اسی وقت شہر وز صبح کی چہل قدمی کے

بعد اندر آئے تو ماحول کا جائزہ لینے کے بعد مسکراتے ہوئے بولے۔  
”ہاں بھئی مہر وز۔ اب بہن مون کا کیا پروگرام ہے؟“  
”صوفیہ سے پوچھیں۔“ اس نے پھر بات صوفیہ پر ڈال دی اور شہر وز کے سوالیہ نظروں سے  
بچنے پر وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔  
”ہم کہیں نہیں جائیں گے۔“

”کیوں؟“  
”بس یہیں رہیں گے اُمی کے پاس؟“  
”بھائی میرے پاس تو تمہیں رہنا ہی ہے۔ اچھا ہے کچھ دنوں کے لیے گھوم بھر آؤ۔“ اُمی نے کہا تو  
شہر وز فوراً ان کی تاکید کرنے لگا۔  
”بالکل۔ بالکل، زیادہ نہیں، بس دو تین مہینے۔“ سب کے ہنسنے پر سر کھجاتا ہوا بولا۔ ”نہیں شاید  
بچہ غلط کہہ گیا۔“  
”زیادہ بول کھلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جا کر تیاری کرو۔“ شہر وز کے کہنے پر وہ دونوں ایک دوسرے  
واشارہ کرتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے۔

”میرا خیال ہے، میں ذرا ناشتے کا انتظام دیکھ لوں۔“ وہ اٹھ کر کچن میں آ گئی۔ بہت دنوں سے جو  
چھوٹی آپا کے رقبے کی وجہ سے دل پر بوجھ سا اٹھ رہا تھا۔ وہ ہٹ گیا تو وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا بھلکا  
سوس کرنے لگی۔ دل میں ہلکا سا بھی خوشی اور طمانیت کا احساس جاگے تو ہر شے نکھری ہوئی لگنے  
لگتی ہے۔ وہ بھی خوش تھی اور ناشتے کی ٹیبل سجاتے ہوئے ہلکے ہلکے گنگنا بھی رہی تھی۔

پھر شام میں وہ بہن مون کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہ شہر وز کے ساتھ انہیں چھوڑنے اٹھ پورٹ آئی  
تھی مہر وز کی شوخیاں اپنے عروج پر تھیں۔ اور چھوٹی آپا کا وہ ایک نیاروپ دیکھ رہی تھی۔ ایک ہی دن  
بن کتنی بدل گئی تھیں۔ آنکھوں میں جیسے کسی نے ستارے بھر دیے ہوں۔ انہیں خلافاظت کہتے ہوئے  
نہنے دل ہی دل میں ان کے لیے بے شمار دعائیں مانگ ڈالیں۔  
”کہیں اور چلنا ہے؟“ والپسی میں شہر وز اس سے پوچھنے لگے۔

”نہیں۔ اُمی اکیلی ہوں گی۔ ہمیں اب گھر چلنا چاہیے۔“ انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ جسے  
سوس کے بغیر وہ سیدھ کی پشت سے سر ٹکا کر ہوئی بولی۔  
”پتا ہے شہر وز۔ آج میں بہت مطمئن اور خوش ہوں۔“  
”کیوں؟“

”چھوٹی آپا کو مطمئن اور خوش دیکھ کر۔ آپ شاید اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں ان کی طرف سے کتنی پریشان  
تھی۔ ہر وقت ایک دھڑکا سا لگا رہتا تھا۔ ایسا نہ ہو کوئی طوفان اٹھ کھڑا ہو۔ اور۔“  
”الہ ریہے ریہے بیگم۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر کہنے لگے کہ آپ کے سارے احساسات دوسروں کے  
لیے بدلے ہوئے ہیں۔ کوئی خوش تو آپ بھی خوش، کوئی پریشان تو آپ اس سے زیادہ پریشان۔ کسی  
لڑکائی میں طوفان آنے والا ہے تو دھڑکا آپ کو گنتا ہے۔ منندیں حرام ہو جاتی ہیں آپ کی میں پوچھتا  
ہوں خود اپنے لیے آپ کے احساسات کیوں نہیں جاگتے؟ آپ کو اپنا خیال کیوں نہیں آتا۔ کبھی یہ  
سوچا کہ خود آپ کی زندگی میں کتنا بڑا طوفان آنے والا ہے؟“  
”شہر وز احمد۔“ ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ اس نے پکوں کے دبند کر لیے۔

شہر وز اور احمد کچھ دیر تک انتظار کرتے رہے کہ وہ کچھ کہے گی لیکن وہ کچھ نہیں بولی۔ تب انہوں  
نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، وہ آنکھیں بند کر کے چپ چاپ بیٹھی تھی۔  
ملنے پر ہر کسی قسم کا کوئی تاثر نہیں تھا جیسی وہ جان نہیں سکے کہ وہ مضبوط کی جانے کن منٹروں

سے گزر رہی ہے۔  
 ”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ وہ دوبارہ ونڈ اسکرین پر نظر میں جماتے ہوئے  
 مخاطب کرتے ہوئے بولے تو وہ آنکھیں کھول کر کچھ دیر تک سامنے دیکھتی رہی۔  
 پھر کہنے لگی۔

”میں جانتی ہوں، مجھے کتنے بڑے طوفان کا سامنا کرنا ہے۔“  
 ”اچھا۔“ وہ یوں ہنسنے لگی کہ اس کا مذاق اڑا رہے ہوں اور وہ پروا نہ کرتی ہوئی بولی۔  
 ”میرے لیے اگر خوشیوں کے دروازے بند ہو گئے ہیں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ  
 کی خوشیوں میں بھی شریک نہ ہوں۔“  
 ”یہ آپ سے کس نے کہا کہ آپ کے لیے خوشیوں کے دروازے بند ہو گئے ہیں؟“  
 ”کون کہے گا؟ میں خود سمجھتی ہوں۔“ وہ زہر خند سی بولی۔  
 ”غلط سمجھتی ہیں آپ۔“ وہ بڑے جرم کو بولے تھے۔  
 ”میں اس وقت بحث نہیں کروں گی اور پلینز آپ بھی اس وقت میری ذات کو موضوع بننا  
 وہ بات ختم کرتی ہوئی بولی۔

”کیوں ڈرتی ہیں آپ؟“  
 ”نہیں۔ بلکہ چھوٹی آپا کے حوالے سے جو خوشی ملی ہے، میں اسے دیر تک محسوس کرنا چاہتی  
 ”ایک بات کہوں؟“ وہ موضوع بدلتے ہوئے بولے۔ ”آپ صوفیہ کو چھوٹی آپا کہنا چھوڑ  
 ”کیوں؟“ وہ گردن موڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔  
 ”کیونکہ مہروز آپ کا دیور ہے اور اس رشتے سے آپ کو صوفیہ کا نام لینا چاہیے۔“  
 ”آپ بھول رہے ہیں، چھوٹی آپا سے میرا رشتہ اڑوٹ ہے اور اس حوالے سے میں مہروز کو  
 بھائی کہہ سکتی لیکن۔“ وہ خاموش ہو گئی اور اس کا مطلب سمجھ کر انہوں نے بھی ہنٹ ہنٹ  
 ”بڑے سنگدل ہو شہرہ زاحرا۔“ رات میں وہ سوچ رہی تھی جب بھی میں اپنی ذات سے نظریں  
 دوسروں کی خوشیوں میں خوش ہونے کی کوشش کرتی ہوں۔ تم مجھے میرا احساس دلاتے ہوئے تھے  
 سامنے لا کر میری خوشی چھین لیتے ہو۔ تم سے میری ذرا سی خوشی بھی برداشت کیوں نہیں ہوتی؟“  
 ”نہیں ربیعہ۔“ وہ جیسے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ ”میں تمہارا دامن میں دوسروں کی نہیں، تم  
 خوشیاں دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم اپنے لیے خوش ہو، اپنے لیے مطمئن۔“  
 ”اپنے لیے۔“ اس نے دکھ سے سوچا۔ ”اپنے لیے خوش ہو سکتی تھی اگر جو تم درمیان میں  
 یا پھر اب ناقص مسن کا خیال نہ ہوتا، جس نے میرے حصول کو مقصد حیات بنا لیا ہے۔“  
 ”میرے خدا۔“ اس نے آن تیخ سوچوں سے فرار کی خاطر تکیہ سر کے نیچے سے کھینچ کر منہ پر

بہت بو کر دینے والے دنوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ گھر میں سارا دن بس وہ اور اتنی ہوتیں اور  
 بھی وہ کتنی باتیں کر سکتی تھی۔ کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر اڑھ جاتی۔ کام کرنے کے لیے ملازم  
 وہ بے کار ادھر سے ادھر پھرتی رہتی۔ کسی کسی دن ندا اور سلمان آجاتے تو کچھ رونق ہوتی  
 پھر وہی خاموشی۔ اماں کے گھر بھی وہ محض اتنی کے اکیلے ہونے کے خیال سے نہیں جا پا رہی تھی  
 تھا کہ ان دنوں شہروز بھی بہت مصروف تھے۔ رات کو اتنی دیر سے آتے کہ بس چند سی باتیں  
 ساتھ کر سکتے، پھر سونے چلے جاتے اور وہ جو صرف بوریٹ سے بچنے کی خاطر دوپہر میں لمبی نیب  
 ہوتی، رات میں دیر تک جاگتی رہتی تھی۔  
 کتنے بہت سارے دن اسی طرح گزر گئے۔ اور اب تو وہ چھوٹی آپا اور مہروز کی شدت

کہ انکے اس جان لیوا تہائی سے چھٹکارا ملے اور وہ دونوں پورے ڈیڑھ مہینے بعد آئے۔  
 وہ چھوٹی آپا کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ان کی سفید رنگت سرخی مائل ہو کر ان میں مزید گھار پیدا کر رہی تھی۔ ہونٹوں  
 یں مسلسل پختی ہوئیں اور ذرا سی بات پر بے ساختہ ہنسی جلتی ہوئی بجا دیتی۔ چاہنے کا خوش گوار  
 ن اور چاہے جانے کا زعم ان کی آنکھوں میں بخار بن کر اترتا تھا۔

دوپہر میں اس نے اتنی کے کپڑے پر شہروز کو فون کر کے ان دونوں کے آنے کا بتایا، جبھی وہ شام  
 باہر آ گئے۔  
 ”آئی کی اطلاع کیوں نہیں دی؟“ ان دونوں سے مل کر بیٹھے تو کہنے لگے۔  
 بس صوفیہ نے کہا، اچانک سب کے سامنے جا کھڑے ہوں گے۔ ”مہروز والہانہ نظروں سے صوفیہ  
 ن دیکھتا ہوا بولا۔ ”تو وہ پھیرنے کی غرض سے کہنے لگے۔  
 ”اور تم صوفیہ کی بات مان لی؟“

کیا کروں بڑے بھائی، جان پیاری ہے۔“ اس نے ذومعنی بات کی تو شہروز بے ساختہ ہنس  
 اچھلایا۔ تم لوگ آگئے، ربیعہ بہت بور ہو رہی تھیں۔“  
 آپ کے ہوتے ہوئے؟“ اب مہروز نے انہیں چھیڑا۔  
 یار میں بہت مصروف رہا۔“ وہ سادگی سے بولے۔ ”آج تمہارے آنے کا سن کر جلدی آگیا  
 تو گیارہ بج جاتے ہیں۔“  
 غیریت؟“

ہاں۔ وہ جو نابا پرو جیٹ شروع کیلئے، اس کی وجہ سے۔ پھر ادھر جی ایم بھی والدہ کی غلامت  
 ج سے چھٹی پر چلا گیا۔ وہ دونوں بڑنس کی باتیں کرنے لگے۔ تو وہ چھوٹی آپا کے ساتھ اٹھ کر ان  
 رہے میں چلی آئی۔

پھر جہاں مہروز کے آنے سے شہروز پر کام کا پریشر کم ہوا وہاں چھوٹی آپا کے آنے سے اس کی بوریٹ  
 نڈ ہو گئی۔ بلکہ گھر کی خاموش فضاؤں میں بھی ارتعاش پیدا ہو گیا۔ چھوٹی آپا کا ہر انداز اس سے مختلف  
 تھا۔ ہرے ان کے اندر نہ کوئی ڈرتی تھی نہ خوف اور نہ ہی وہ اس کی طرح بیاں مہمان تھیں۔ یہ ان کا اپنا  
 غنا، اس لیے نہ تکلف، نہ جھجک۔ بہت بے تکلفی اور آزادی سے ہر جگہ اٹھتی بیٹھتیں۔ نہ بے ساختہ  
 ہا کو لگام دیتیں۔ اور نہ اونچی آواز میں اپنے آپ کو بولنے سے روکتیں۔ اور ان کی آواز سے ہی  
 ان کی کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔

اتنی کے پاس بیٹھتی، تو ڈھیروں باتیں کیے چلی جاتیں۔ ندا کی، آپا کی، مہروز اور شہروز کی، سب  
 بچوں کے قصے اور پتا نہیں کیا کیا۔ اتنا تو وہ دوسالوں میں کسی کے بارے میں نہیں جان سکتی تھی  
 چھوٹی آپا دو مہینوں میں جان گئی تھیں۔

ایک دن اتنی کہنے لگیں۔ ”تم دونوں بہنیں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہو۔ ربیعہ کے ٹھہرے  
 نے مزاج اور خاموشی نے اس گھر کے ماحول کو پُر سکون رکھا اور تم نے۔“

”میں نے کیا کیا؟“ چھوٹی آپا فوراً پوچھنے لگی تھیں۔  
 ”تم نے خوشگوار سی ہنسی چلا دی اور بچ پوچھو بیٹا تو مجھے تمہاری بھائی ہوئی ہنسی اچھی لگ رہی ہے۔“  
 ”ہاں؟“ چھوٹی آپا نے خوشی کا اظہار اتنی کے گلے میں بازو ڈال کر کیا تھا۔

میں جب شہروز آفس جا رہے تھے اس وقت اس نے ان سے کہہ دیا تھا کہ وہ شام میں اماں  
 کو ملے گی۔ اور کچھ دن وہیں رہے گی۔ وہ کیونکہ جلدی میں تھے، اس لیے کوئی تبصرہ نہیں کیا

تھا۔ اُن کے جانے کے بعد اُس نے اپنی سے بھی اجازت لے لی اور اسی وقت اپنا بیگ تیار کیا، تم اپنے میکے جا رہی ہو؟“ چھوٹی آیا اُس کے کمرے میں آتی ہوئی بولیں تو وہ اپنے نہیں۔ آپ کے میکے جا رہی ہوں، وہ بھی مذاق کے موڈ میں آگئی۔  
”میکے کیوں؟“

”بس آپ کی اماں اور بہنوں سے ملنے کو دل چاہ رہا ہے۔“  
”اچھا۔“ چھوٹی آیا ہنستی ہوئی اُس کے بیڈ پر اوندھی لیٹ گئیں۔ پھر اس کا بیگ دیکھا لگیں۔ زیادہ دن رہ گئی۔  
”ہاں، کم از کم ایک ہفتہ تو رہوں گی۔“

”پنج میرا بھی بڑا دل چاہتا ہے۔ دو ایک دن اماں کے پاس رہ آؤں۔“  
”میں ہو کر آ جاؤں پھر چلی جائیے گا۔“ اُس نے جیسے اُن کی مشکل آسان کی۔  
”چلی تو جاؤں گی لیکن رہنا مشکل ہے۔“  
”کیوں؟“ وہ حیران ہوئی۔

”مہروز اجازت نہیں دیتے۔ کہتے ہیں بے شک روز چلی جاؤ لیکن وہاں رہنے کی بات نہ اچھا۔“ وہ مسکرائی۔ ”آپ کے بغیر انہیں نیند نہیں آتی ہوگی۔“  
”یہی کہتے ہیں۔ میں پوچھتی ہوں تب میں نہیں تھی تب؟“ کہتے ہیں تب کی بات اور آپ اٹھلائیں، پھر کہنے لگیں۔

”سنو، تمہیں کیسے شہروز بھائی اتنے دن رہنے کی اجازت دے دیتے ہیں؟“  
وہ جواب سے بچنے کی خاطر اُن کی بات اُن سنی کرتی ہوئی الماری کی طرف بڑھ گئی۔ چھوٹی اپنی بات دہرانے جا رہی تھیں کہ روف کی بیل سن کر مہروز کا فون ہوگا، کہتی ہوئی اٹھ کر چلی گئیں نے شک کیا اور جو بلا مقصد الماری کھول کر کھڑی تھی، اُسے بند کر کے واپس پلٹی اور سوچنے لگیں چیز بیگ میں رکھتی ہے۔ ابھی اسی طرح کھڑی تھی کہ چھوٹی آیا دوبارہ آگئیں، اُس سے کچھ فلا کر خاموشی سے اس کی طرف دیکھ گئیں۔ اس نے پہلے سر سری انداز سے اُن کی طرف دیکھا لیکن گئی۔ اُن کی آنکھوں میں کچھ آنکھیں تھیں، کچھ غیر یقینی اور کچھ ملامت بھی۔  
”کیا بات ہے چھوٹی آیا۔ خیر تو ہے ناں؟“ وہ اُن کی خاموشی سے گھبرا کر پوچھنے لگی، جواب نہیں دیا۔

”مہروز کا فون تھا؟“ کیا کہہ رہے تھے؟“ وہ اُن کے قریب جا کر پوچھنے لگی۔  
”مہروز کا فون نہیں تھا۔“ چھوٹی آیا اُس پر نظریں جمائے ہوئے بولیں۔  
”پھر۔۔۔“

”ثاقب حسن تھا۔“ ٹھہرا ہوا کاٹ دار لہجہ اُس کے پورے وجود کو ہلا گیا۔  
”کیا؟“ اُس کی رنگت ایک دم زرد پڑ گئی۔ فوری طور پر کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو اُن کی طرف موڑتی ہوئی بولی۔  
”میں کسی ثاقب حسن کو نہیں جانتی۔“

”یہ بات تم اُس سے کہو جو جانتا نہ ہو اور تم بھی طرح جانتی ہو کہ کبھی میں اس معاملہ پر ہمارا رہی ہوں۔“  
”یہ کبھی کی بات ہے۔ اب میرا اُس سے کیا واسطہ؟“ وہ بظاہر بے نیازی بولی۔  
”کاش ایسا ہی ہوتا ربیعہ۔ لیکن ثاقب حسن کا لہجہ بتا رہا تھا کہ تم دونوں نے اس پر لے لیا تھا۔ قائم رکھا ہوا ہے۔“

”نہیں۔“ وہ بے بسی سے سر کو نفی میں ہلانے لگی۔  
”تم جھٹلا نہیں سکتیں۔ اور میں خود چاہنے کے باوجود نہیں جھٹلا پا رہی کیونکہ میری آواز پر تمہارا گمان کر کے وہ بے تابی سے کہہ رہا تھا۔“

”سنو ربیعہ۔ یہ میں ہوں ثاقب حسن۔ تمہارے لیے بہت اچھی خبر ہے کہ میں بہت جلد واپس آنے والا ہوں۔ اور کہہ رہا تھا کہ ہماری منزل اب بہت قریب آگئی ہے۔“  
وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

”انسو بہا کر سمجھتی ہو اپنے گناہوں پر پردہ ڈال لوگی۔ یہی بات ایک بار اماں نے ہی تھی۔ اُس وقت جب انیلا اپنی والدہ کو لے کر آئی تھی ثاقب حسن کا بروپزل لے کر اور اب چھوٹی آپا کہہ رہی تھیں، ان کا بھی اماں سے مختلف نہیں تھا۔ رگوں میں خون منجمد کرتا ہوا۔“

”ایک گناہ عظیم ہی ہے ربیعہ کہ تم اپنے شریف اور عزت دار شوہر کو دھوکا دے رہی ہو۔ اسی کے گھر میں رہ کر برائی محبت کو زندہ رکھتے ہوئے تمہیں شرم نہ آتی۔ میں پوچھتی ہوں کیا کمی دی ہے تمہیں شہروز بھائی نے یا خود اُن میں کیا کمی ہے جو کہ اُن پر ثاقب حسن کو فوقیت دے رہی ہو۔ ارے ان کا نہیں تو کم از کم اپنے بوڑھے باپ کا یہی خیال کر لیا ہوتا۔“  
”بس کریں چھوٹی آیا۔“ وہ اور شدت سے رونے لگی۔

”کیا بس کروں؟“ مجھے تو حسرت ہو رہی ہے۔ دیکھنے میں کس قدر معصوم اور سیدھی سا دی گئی ہو۔ بڑا کوئی اور اگر ایسی بات کرتا تو میں یقین بھی نہ کرتی لیکن اپنے کانوں سے سنی جھٹلا نہیں سکتی۔  
”کہہ دیا خاموش رہنے کے بعد کہنے لگیں۔“

”یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ ان دو سالوں میں کسی اور کو معلوم نہیں ہوا ورنہ تم یہاں نظر نہ آتیں۔ اور اب تو مجھے تمہارے ساتھ ساتھ اپنا مستقبل بھی خطرے میں نظر آنے لگا ہے کیونکہ ایسی باتیں ہر لمحہ نہیں رہ سکتیں۔ جس روز کسی دوسرے کے علم میں یہ بات آئی، اُس روز ایک طوفان اُٹھے گا۔“  
”اور پھر تم سوچ سکتی ہو کہ کیا ہوگا۔ جس عزت سے ہم اس گھر میں لائے گئے ہیں، اس سے کہیں زیادہ ذات سے ڈھٹکارے جائیں گے۔ ہاں جھٹلا ایسی لڑکیوں کو کون اپنے گھر میں رکھے گا؟“  
”چھوٹی آیا کا گلا زلزلہ کیا۔ اُن کے لہجے میں ڈھک اور تاسف اور جانے کیا کچھ تھا۔ وہ تڑپ گئی لیکن اُن کی طرف دیکھنے کی بہت نہ کر سکی۔ اپنی بے گناہی کا ثبوت اور اپنی صفائی میں کہنے کو بہت کچھ تھا لیکن وہ کہہ نہیں سکتی تھی۔ چھوٹی آیا اگر یقین کر بھی لیتیں تو کیا فرق پڑ جاتا۔ قصور وار تو پھر بھی ٹھہرائی جاتی اور پھر زندگی تو داؤ پر لگ ہی چکی تھی۔“

”دو سال کہ نہیں ہوتے۔ اس تمام عرصے میں وہ ہر گھڑی کسی ہمدرد، غمگسار کی ضرورت محسوس کرتی رہی تھی۔ کوئی تو ہو جو میرا ہاتھ تھام کر مزاج منجھارے نکال لے اور کوئی نہیں تھا یا پھر وہ اتنی خوفزدہ تھی کہ کسی پر اعتماد ہی نہیں کیا۔ اپنے آپ کو تنہائیوں کے حصار میں مقید کر کے شاید کسی مجبورے کی منتظر رہی۔ اور معجزہ تو نہیں ہوا، لیکن وہ ہو گیا جس سے وہ خوفزدہ تھی۔ چھوٹی آیا کی نظریں اس کے پورے وجود کو گھسیٹ کر رہی تھیں۔ اُسے اپنے پیروں پر کھڑا رہنا دشوار ہو گیا تو وہیں ہلنگ پر ڈھکے گئی۔  
”وہ کیوں ہو؟“ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ اب وہ آ رہا ہے جس کے ساتھ پتا نہیں کیا کیا منصوبے بنائے رہی ہو اور جس نے منزل قریب ہونے کی نوید دی ہے۔“

”اُس نے پشیمانی بیٹی کی پٹی پر لٹکائی تو چھوٹی آیا زور سے پیر پٹتی ہوئی بکمرے سے نکل گئیں۔ کچھ دیر تک منہ پر ہاتھ رکھے سسکیوں کو اندر ہی اندر دبا کر روئی رہی، پھر سر اٹھا کر دیکھا اور چھوٹی آیا کو زوردار پکار کر جلدی سے اُٹھ کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔  
پھر نہ سسکیاں نہ کس ڈانسو۔ وہ شاید اس طرح کبھی نہیں روئی تھی، جس طرح اب رو رہی تھی۔“



چھوٹی آپا نے تو اسے خود اپنی نظروں سے گرا دیا تھا۔ اس کا ذہن بالکل ماؤف ہو گیا۔ کوئی بات نہ مگنی۔ بس ایک خیال کہ اچھا نہیں ہوا۔ اسے زلاتا گیا۔ یونہی روتے روتے اسے نیند آگئی۔ حالانکہ سونے کا وقت نہیں تھا۔ لیکن شاید نیند کو اس کی بے بسی پر رحم آ گیا تھا۔ جو یوں بے وقت مہربان مگنی۔ دوپہر کے کھانے پر پتا نہیں رہی تھی۔ اسے آٹھ یا انیس یا بند دروازے کو پٹا گیا، اسے باخبر نہیں ہوئی۔ جب سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ تب خود سے آنکھ کھلی۔ سر بھاری ہو رہا تھا اور اس کے پوٹے بے حد بوجھل تھے۔ کچھ دیر تک تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ آدھ کھلی آنکھوں سے سامنے وہ کو دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ ذہن بیدار ہوا تو صبح کی باتیں یاد آنے لگیں۔

چھوٹی آپا کی چھٹی ہوئی نظر میں ان کا چھٹی کر دینے والا بچہ اور بائیں، کیا کیا نہ کہا تھا انہوں نے۔ اگر کچھ بھرا کر بات نہ کرتیں تو تین لفظ کہہ دیتیں۔ آوارہ۔ بد چلن۔ بد کردار۔

اس کی آنکھوں میں پھر اپنی جمع ہونے لگا۔ تو وہ آٹھ کر بیٹھ گئی۔ اپنے بیگ پر نظر پڑی تو یاد آیا اسے اماں کے گھر جانا ہے۔ کوئی اور بات ہوتی تو شاید وہ اپنا جانا ملتوی کر دیتی لیکن اب چھوٹی آپا فرار کی خاطر وہ جلدی سے اٹھی اور اپنے کپڑے لے کر ہاتھ روم میں گھس گئی۔ نہا کر نکلی تو دروازے کی آواز پر ٹھٹھک گئی۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے بڑھ کر دروازہ کے سامنے ٹھہر کر کھڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر وہ پٹی اور سیڑھی ڈرینگ روم میں چلی گئی۔ بالوں میں ہاتھ کرتے ہوئے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو حیران رہ گئی۔ اتنے سے وقت میں برسوں کی بیاہٹ لگی تھی۔ چہرہ زرد اور آنکھیں سرخ اور سوجھی ہوئی تھیں۔

اپنے آپ کو نارمل پوز کرنے کے لیے میک اپ کا سہارا لیا۔ چہرے کو تو کسی حد تک نارمل میں کامیاب ہو گئی لیکن آنکھوں کی سرخی نہ چھپا سکی۔ ویسے بھی اس کی یہ کوشش فضول تھی۔ شہر دارا ایک نظر میں ہی جان گئے تھے کہ وہ کسی قیامت سے گزر چکی ہے۔

اور ایک قیامت تو خود ان پر بھی گزر رہی تھی کہ صبح آفس میں فون پر شاقب حسن نے انہیں اطلاع دی تھی کہ وہ بہت جلد آنے والا ہے۔ ساتھ ہی یہ یاد دہانی بھی کرائی کہ اس کی ایک امانت ان کے پاس ہے۔ وہ بہت ڈر کر ہو گئے تھے۔ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا کریں۔ حالانکہ یہ تو اوال روز سے تھا کہ شاقب حسن کو آنا ہے، لیکن وہ غیر ارادی طور پر کسی اور بات کے منتظر تھے اور بہت سا باتیں انہوں نے سوچ بھی لی تھیں۔

لیکن ہمیشہ وہ نہیں ہوتا جو ہم چاہتے ہیں اور زندگی کے اس موڑ پر وہ بے حد حیران تھے جس انہیں انتہائی بے بس اور مجبور بنا دیا تھا۔ دن میں کئی بار سوچا کہ وہ ربیعہ لے کر کہیں دور چلے جا کسی ایسی جگہ جہاں تک شاقب حسن کبھی بھی رسائی حاصل نہ کر سکے۔ لیکن کیا ربیعہ ان کا ساتھ دے گی یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ انہوں نے ان گزرے دوپہر کا ہر پل سوچ ڈالا لیکن کوئی ایسا لمحہ گرفت میں نہیں آیا۔ جب ربیعہ نے ہمیشہ ان کے ساتھ رہنے خواہش کا اظہار کیا ہو۔ اس کے برعکس وہ لائق سی رہی، اپنے خول میں بند۔ کبھی انہوں نے احسا دلایا تو کچھ وقت کے لیے خول سے باہر نکل آئی۔ اس کے بعد پھر اپنی پرانی ڈگر پر چلنے لگی۔

یوں لگتا تھا جیسے وہ وقت گزار رہی ہو اور منتظر ہو اس وقت کی جب اسے اس زندگی سے نجات ملے اور اب اسے اس زندگی سے نجات ملنے والی تھی۔ آفس سے گھر آتے ہوئے انہوں نے ہاتھ کے وہ آٹھ شاقب حسن کی آمد کے بارے میں بتاتے ہوئے بغور اس کا جائزہ لیں گے اور اس کے تاز سے ہی جلتے کی کوشش کریں گے کہ وہ خوش محسوس کرتی ہے یا اس کے برعکس کوئی تاثر اس کے چہرے پر ابھر رہا ہے۔

جب اس نے کمرے کا دروازہ کھولا تو ایک نظر اسے دیکھ کر ہی وہ ٹھٹھک گئے تھے۔ زردی

کے ساتھ چہرہ آترا ہوا اور بے تحاشہ سرخ آنکھیں اس کی شدت گریہ کی چٹکی کھا رہی تھیں۔ حالانکہ وہ فوراً ہی لٹ کر ڈرینگ روم میں چل گئی اور کتنی دیر تک وہیں رہی۔ اس دوران وہ قیاس کرتے رہے کہ اس کے رونے کا سبب کیا ہو گا؟

”ہو سکتا ہے شاقب حسن نے اسے بھی فون پر اپنے آنے کے بارے میں بتایا ہو اور وہ بھی ان کی طرح ڈر کر بھاگتی ہوئی ہو۔“ اس آخری خیال نے ان کے لیے سوچوں کے نئے درکھول دیے۔ اور ابھی وہ بی سوچوں میں اپنے لیے کوئی راستہ تلاش کر رہی تھی کہ وہ آگئی۔

”کیا پوچھنا ہے؟“ وہ اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”میں نے صبح آپ سے کہا تھا ناں کہ میں انہاں کے گھر جاؤں گی۔“ اس کی آواز بھی بدلی ہوئی تھی۔

”ہاں۔“ وہ سگریٹ ایلیٹ ٹرے میں کھینچے ہوئے بوئے بولے۔ ”چلیں۔“

”آپ چلے وغیرہ پتہ چاہیں تو؟“

”نہیں نہیں۔“ وہ آٹھ کھڑے ہوئے۔ ”آپ نے امی سے کہہ دیا ہے؟“

”جی۔ ابھی جاتے ہوئے پھر کہہ دوں گی۔“

”چلیں پھر۔“

وہ بیگ اٹھا کر ان کے پیچھے چل پڑی۔ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ چھوٹی آپا سے سامنا نہ ہو۔ اور ان کے کمرے کا دروازہ بند دیکھ کر شکر کیا۔ پھر امی سے کہہ کر ان کے ساتھ باہر آگئی۔

”کوئی غیر معمولی بات ہوئی؟“ گھر کے راستوں سے نکل کر گاڑی میں روڈ پر آئی تو اس سے پوچھنے لگی۔ اس کے اندر ٹوٹ چھوٹ ہونے لگی یہ شخص کیسے جان لیتا ہے کہ کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔

”دے گا کوئی نا انگلی پر لپیٹے ہوئے بولی۔“

”نہیں تو۔“

”پھر آپ روئیں کیوں؟“

”اگر میں کہوں کہ میں نہیں روئی۔“

”تو میں جان جاؤں گا کہ کوئی بات ایسی ہے جو آپ مجھے بتانا نہیں چاہ رہیں۔ اور جسے چھپانے کے لیے آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔ ”وجہ نہ بتائیں لیکن اعتراف تو کر لیں۔“

”اعتراف بھی کرتی ہوں۔ اور وجہ بھی بتا دیتی ہوں۔“

”آج شاقب حسن کا فون آیا تھا۔“ وہ اس سے آگے بھی بتانا چاہتی تھی۔ ساری بات لیکن کچھ کہا ہی نہیں گیا۔ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتے ہوئے پچھلے دنوں کی باتوں میں ڈالیا۔ انہوں نے سوچا، وہ بھی بتا دیں کہ شاقب کا فون ان کے پاس بھی آیا تھا۔ لیکن پھر خاموش رہے کہ پہلے اس کی بات سن لینی چاہیے اور وہ بس ایک جملہ کہہ کر خاموش ہو گئی تھی۔ بالآخر انہیں پوچھنا پڑا۔

”کیا روئے کی وجہ شاقب حسن کا فون ہے یا اس نے کوئی ایسی بات کی جو؟“

”نہیں شہر و زاجر۔“ وہ گہرا سانس لے کر بولی۔ ”یہ صحیح ہے کہ اس کا فون مجھے پریشان کر دیتا ہے اور پھر میں سنبھل بھی جاتی ہوں لیکن آج تو وہ انجانے میں مجھے پاگل میں دھکیل گیا ہے۔ جس سے میں کبھی نہیں نکل سکتی۔“ کچھ دیر تک کہنے لگی۔ ”پتا ہے آج اس کا فون چھوٹی آپا نے ریسیو کیا تھا اور وہ چھوٹی آپا کی آواز پر میرا کمان کر کے پتا نہیں کیا کیا کہہ گیا۔“

”میرے خدا۔“ ایک آخری اس بھی ٹوٹ گئی۔ ”انہوں نے سوچا۔ ابھی ایک پل میں انہوں نے کیا کچھ نہ سنا ڈالا تھا کہ وہ اس کے آنے کا سن کر پریشان ہوگی اور کہے گی، اسے نہیں آنا چاہیے۔ اور اگر وہ آپا اب اسے تو مجھے کہیں اور لے چلو۔ کہیں دور جہاں تک اس کی رسائی ممکن نہ ہو لیکن وہ اس کے آنے سے

نہیں، اس بات سے پریشان تھی کہ صوفیہ تک بات پہنچ گئی تھی اور یقیناً رسولی کا خوف اسے زلاتبار تھا۔ صوفیہ نے کیا کہا؟ کیا وہ ثاقب کے بارے میں جانتی ہیں؟ وہ پوچھنے لگے۔ ہاں۔ میں نے بہت پہلے انہیں اس کے بارے میں بتایا تھا۔ لیکن بعد کے حالات نہیں جانتیں۔ یہ تو واقعی بہت برا ہوا۔ پھر کیا کہا انہوں نے؟ بہن ہونے کے نلتے بہت کچھ۔ بہت ملامت کی اور ایسی باتیں جنہوں نے مجھے میری ہی نظروں میں گرادیائیں۔

”آپ نے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہا؟“  
”کیا کہتی؟“ اور پھر اچانک ہی ایسی صورت حال ہو گئی تھی کہ میں کچھ کہتی بھی تو وہ یقین نہ کرتیں۔ صاف کہہ دیتیں کہ آپ کسی ثاقب حسن کو نہیں جانتیں۔  
”میں نے یہی کہا تھا لیکن۔“ وہ ہونٹ بھینچ کر سر کوٹنی میں ہلانے لگی۔  
انہوں نے گھر کے سامنے گاڑی روکی پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔  
”میں وعدہ تو نہیں کرتا لیکن کوشش کروں گا کہ کسی طرح صوفیہ کے سامنے آپ کی پوزیشن صاف کر دوں۔“

”مشکل ہے۔“ وہ پرسوج انداز میں سر ہلاتی ہوئی بولی۔  
”نامکن تو نہیں۔ بہر حال آپ زیادہ پریشان نہ ہوں اور رونا بادل نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اوکے؟“ انہوں نے مسکرا کر حوصلہ دیا تو وہ طویل سانس لیتی ہوئی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اترا۔ پھر وہ اس کے ساتھ اندر آئے تو ایک کپ چائے پینے تک ہی بیٹھے اور اسے پھر کرنے کا کہہ کر چلے گئے۔

اس کی پریشانی صرف اتنی نہیں تھی کہ چھوٹی آیا کچھ جان گئی تھیں بلکہ اس سے زیادہ تو وہ اس بات سے پریشان تھی کہ ثاقب حسن آنے والا تھا۔

”اپنی جلدی دو سال بیت گئے۔“ رات میں وہ سونے کے لیے لیٹی تو سوچنے لگی حالانکہ جب جلتے ہوئے ثاقب حسن نے اس سے کہا تھا کہ دو سال تک بھیکے میں گزر جائیں گے تو وہ اس سے ابھی پڑی تھی۔ کہ وہ اتنے بہت سارے دن کیسے گزارے گی۔ وہ بھی کسی دوسرے کے گھر میں اور اب جبکہ ان دو سالوں میں وہ اس گھر اور اس کے کمپنوں سے مانوس ہو کر ان کی محبتوں میں ہار گئی تھی اور چاہتی تھی کہ ہمیشہ یہیں رہے تو گھر رہا تھا جیسے دو سال تک بھیکے میں گزر گئے ہوں۔

”تو کیا اب واقعی میں اس گھر میں چند دن کی ہمان ہوں؟“ اس خیال نے اسے بے حد آزرہ کر دیا۔  
”میرے خدا۔ کس قدر کمشن مراحل میرے منتظر ہیں۔“ وہ سوچنے لگی۔ جب ثاقب حسن کے کہنے پر شہرِ ہزار احمد میرے ہاتھوں میں آزادی کا پروانہ تھا میں گے۔ تو میں کس طرح سب کا سامنا کر سکاں گی۔ اور کیا جواز پیش کروں گی اور اب جب کہ چھوٹی آیا ثاقب حسن کے آنے کے بارے میں جان گئی ہیں تو میں کسی طرح بھی اپنی بے گناہی ثابت نہیں کر سکیں گی۔

صرف میں ہی نہیں۔ اماں اور آیا میاں بھی لوگوں کی باتوں کا نشانہ بنیں گے۔ کس کس کا منہ بند کریں گی اماں اور کیا جواب دیں گی یہ سب باتیں سوچتے ہوئے اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اس نے کبھی اپنی ذات سے کسی کو تکلیف پہنچانے کا سوچا بھی نہیں تھا۔ پھر اب کیوں وہ سب کے لیے تکلیف کا باعث بننے جا رہی تھی۔

”تم نے سوچا میرے ماتھے پر طلاق کا لیل لگتے ہی لوگ کیسی کیسی باتیں کرنے لگیں گے؟ اس نے ثاقب حسن سے کہا تھا۔

”صرف چند دن۔ پھر جب ہم دونوں خوشگوار زندگی گزاریں گے تو وہی لوگ ہم پر رشک کیا کریں

گے۔ ثاقب حسن نے بڑے اطمینان سے کہتے ہوئے اسے آنے والے دنوں کے خواب دکھائے تھے۔ اس وقت وہ یقیناً بھل گئی تھی کیونکہ اس کا دل اور دماغ اس کی گرفت میں تھا لیکن اب وہ اس کی نفرت سے آزاد تھی۔ گئے دنوں سے مکمل طور پر نانا توڑ کر طے کر چکی تھی کہ دوبارہ ان راہوں پر کبھی نہیں چلے گی۔ خواہ ثاقب حسن اس کے راستے پر اپنا دل نکال کر کیوں نہ رکھ دے۔ اس نے ایک بار پھر اپنا خاصہ لہجہ اس کے دل کو ٹھونک کر دیکھا لیکن وہ کہیں نہیں ملا۔ اس کی ہلکی سی پرچھائیں تک نہیں تھیں۔ اس کے ہنس وہ شخص اپنی ذات کی تمام تراچھائیوں سمیت اس کے دل کے ہر خطنے میں موجود تھا، جس نے سال تک پوری ایمانداری سے اس کی پاسبانی کی تھی۔

”شہرِ ہزار احمد۔“ اس کے دل میں ہلکا ہلکا درد جاگنے لگا۔ ”میں تم سے کچھ نہیں مانگوں گی۔ محبت بھی ہیں۔ بس مجھے اپنی پاسبانی میں رہنے دو۔“  
”یاد رکھو ربیع۔ شہرِ ہزار احمد کے نزدیک تمہاری حیثیت کسی خوبصورت کھلونے سے بڑھ کر ہرگز نہیں ہوگی۔ ثاقب حسن جیسے سامنے آن کھڑا ہوا، نہایت سفاکی سے کہتا ہوا۔  
”وہ کچھ وقت تمہارے ساتھ گزار تو سکتے ہیں لیکن ایک عمر کی رفاقت کبھی نہیں دے سکتے۔ آخر تک ہم تمہارے ماضی سے نظریں چرائیں گے۔“

وہ پریشان ہو گئی۔ تلخ حقائق کو سوچنا نہیں چاہتی تھی لیکن دامن نہیں چا سکی۔ تھک گئی تو تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

پھر جتنے دن اماں کے گھر رہی یوں ہی چپ چاپ گم صم سی ہر وقت سوچوں کے بھنور میں پھنسی اپنے آپ سے الجھتی رہی۔ کسی بات کا ہوش نہیں رہا تھا۔ نہ کھانے پینے کا، نہ کمپڑے بدلنے کا۔ جہاں بھی، کتنی کتنی دیر تک وہیں بیٹھی رہتی۔ اماں، کلثوم یا ہما میں سے کوئی اسے مخاطب کرتا تو بس ہوں ان کے خاموش ہو جاتی۔ خود سے بات کرنا تو جیسے بھول گئی تھی۔ بس ایک دھڑکا جو ہر غیر مانوس اہٹ یا دھک پر اسے چونکا دیتا۔ کبیں میری قسمت کا فیصلہ تو نہیں ہو گیا۔ حالانکہ شہرِ ہزار احمد روزِ شام میں پھر دیر کے لیے آتے تھے۔ پھر بھی وہ خوفزدہ رہی اور اندر کے خوف نے اسے ذہنی طور پر بالکل مفلوج کر دیا۔ وہ کچھ سوچنے کے قابل ہی نہ رہی۔

”ایسا تو ہونا ہی تھا۔“ آخری بار اس نے سوچا تھا۔ میری زندگی میں یہ موڑ تو دو سال قبل ہی کھل گیا تھا۔ اور جس کے بارے میں مجھے باخبر بھی کر دیا گیا تھا۔ پھر میں اپنے آپ کو تیار کیوں نہ کر سکی؟ کیوں نہ اسے مقدر جان کر قبول کر لیا؟“

”کیوں اس حقیقت سے نظریں چرا کر ایک بار پھر غلطی کر بیٹھی؟“  
”کیوں نہ؟ راستوں پر قدم رکھے جو کسی منزل کا پتا نہیں دیتے؟“  
”ربیعہ اکرم علی! سہراؤں کے پیچھے بھاگنے والوں کا یہی انجام ہوا کرتا ہے اور اب اپنی غلطیوں کا فیادہ تو ہمیں بھگتنا ہی ہے۔“ دل و دماغ نے فیصلہ دے دیا۔ اور وہ بے بسی کی تصویر بن گئی۔ یوں لگاں پر زندہ لاش کا گمان ہونے لگا۔ سارے احساسات ایک ایک کر کے گہری نیند سو گئے۔

نرسوا بیوں کا ڈر رہا، نہ ملا متوں کا خوف۔  
نکھو دینے کا غم، نہ پالنے کا کوئی احساس۔

نردھنوں میں سرگوشیاں، نہ سماعتیں کسی اہٹ کی منتظر۔

لوں پر کبھی نہیں۔ بس ایک ستانا اندر باہر ہر طرف۔ دشت کی سی ویرانی آنکھوں میں آتری تو ٹھہر گئی۔  
اپنا گانا تو غالی غولی نظروں سے دیکھ جاتی۔ کوئی بلاتا تو کسی رو بوٹ کی طرح پاس جا کھڑی ہوتی۔

اپنا کوئی سوچ نہیں، کوئی مرضی نہیں۔ جس نے جو کہہ دیا، کر لیا، مان لیا۔  
تین دن سے اس کی یہی حالت تھی۔ اماں پریشان ہو گئیں۔ اسے جھنبھوڑ ڈالا۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“  
 ”کیا ہوا ہے مجھے؟“ انا ان ہی سے پوچھنے لگی۔  
 ”شہروز تو تمہیں اچھا بھلا یہاں چھوڑ گئے تھے۔ پھر یہ تمہاری کیا حالت ہو گئی ہے۔ نہ ٹھیک نہ کھانا پیتی ہو، نہ ناولی ہو، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“  
 ”پتا نہیں۔“ (خود اپنی خبر نہیں؟)  
 ”سنو۔“ انا قریب ہو کر سرگوشی میں بولیں۔ کوئی خوشی کی خبر تو نہیں؟  
 ”خوشی کی خبر۔؟“ وہ ہلکے سے بڑبڑائی۔ اور سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔  
 ”میرا مطلب ہے، نئے مہان کی آمد؟“ انا نے مسکرا کر کہا۔ اور اگر کوئی احساس زندہ ہوتا تو اس کا دل دھڑکھڑکے لگتا۔ لیکن وہ سارے احساس کھو چکی تھی۔ انا کی بات پر چپ چاپ اُن کی لڑا دیکھنے لگی۔  
 ”دو سال بھی تو ہو گئے ہیں تمہاری شادی کو۔ میں تو ہر وقت دعا کرتی ہوں، اللہ تعالیٰ تمہاری گود باری کرے۔“ انا کہنے لگیں۔ یہ بھی اللہ کا شکر ہے۔ سسرال والے اچھے ہیں، کوئی لٹنے نہیں دیتے۔  
 ”اُس نے بو بھی سہجھا لیا۔“  
 ”آج شہروز آئے تو اس سے کہتی ہوں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔ دیکھو تو رنگت بھی کتنی زور پر ہے۔“  
 انا کی باتوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔  
 ”شام میں شہروز آئے۔ آتے ہی آسے چلنے کے لیے کہا۔ ویسے بھی آسے یہاں آئے ہوئے اُن کا دن ہو گئے تھے، وہ جس طرح کھڑی تھی، اسی طرح بیگ اٹھا کر لے آئی۔ انہوں نے سسر پاپاس کا جائزہ لیا، پھر کہنے لگے۔  
 ”جائے۔ پہلے اپنا حلیہ ٹھیک کر کے آئیں۔“ وہ اسی طرح بیگ لیے ہوئے واپس اندر چلی گئی۔  
 ”دیر بعد ڈیس پیج کر کے آئی تو وہ انا سے اجازت لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔  
 ”بیٹا۔ اسے کسی ڈاکٹر کو دکھا دو۔ بہت کمزور لگ رہی ہے۔“ انا شہروز کو مخاطب کر کے کہنے لگیں۔ انہوں نے جی بہتر کہا۔ پھر سب کو خطا حافظ کہتے ہوئے اسے لے کر باہر آ گئے۔  
 راستے میں کئی بار انہوں نے اسے مخاطب بھی کیا۔ کوئی بات بھی کی لیکن وہ نہ تو متوجہ ہوئی، نہ اُن کی بات کا جواب دیا۔ اُس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا، اُن کی آواز سن ہی نہ سکی تھی۔ گھر میں اُن کی ہوتی تو سب سے پہلے ہی وی لاؤنچ میں چھوٹی کپاسے سا مٹا ہو گیا۔ اسے دیکھ کر چھوٹی کپاسے نے ناگوار سے منہ پھیر لیا۔ عام حالات میں یقیناً اس کے دل کو دھچکا لگتا لیکن اس وقت کیونکہ وہ ہر احساس سے عائد تھی اس لیے اُن کی اس حرکت کو خاموشی سے دیکھا جب کہ شہروز احمد موسس کر گئے تھے، اس کے کندھے ہاتھ رکھ کر اپنے کمرے میں لے آئے۔ آسے جھاکر خود سامنے بیٹھے تو کہنے لگے۔  
 ”کیا بات ہے؟“ کچھ پریشان ہیں؟“  
 ”اُس نے نفی میں سر ہلادیا۔  
 ”صوفیہ نے اچھا نہیں کیا سیکن۔“  
 ”کیا کیا انہوں نے؟“ وہ سادگی سے پوچھنے لگی تو وہ کچھ دیر تک اُس کی طرف دیکھتے رہے، پھر اُٹھتے ہوئے بولے۔  
 ”اچھا ہوا، آپ نے دیکھا نہیں۔ بہر حال اگر آپ مسوس بھی کریں تو نظر انداز کر دیں۔ میں نہیں چاہتا اس آخری وقت میں یہاں آپ کی دل آزاری ہو۔“  
 اُس کے جھکے ہوئے سر سے ہوتی ہوئی اُن کی نظریں اُس کے ہاتھوں پر جا پھریں وہ شہادت کی انگلی

”ہائیں تھیلی پر آدھی دیر بھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ طویل سانس لیتے ہوئے بولے۔  
 ”آپ کو شاید یاد ہو۔ میں نے بار بار آپ سے وعدہ کیا تھا کہ اس گھر کی چار دیواری میں آپ پر کبھی کوئی راز نہیں آئے دوں گا۔ اور آخری بار تو میں نے یہاں تک کہا تھا کہ خواہ ثاقب حسن ہی کیوں نہ یہاں تک چلا آئے۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔  
 ”عجب اتفاق ہے۔“ بکرمالیہ کہنا چاہتے تھے کہ جب سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا تو اس آخری وقت میں ثاقب حسن غلطی کر گیا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس میں ثاقب حسن کا بھی قصور نہیں ہے۔ صوفیہ اور آپ کی آواز اتنی ملتی ہے کہ بعض اوقات تو میں بھی دھوکا کھا جاتا ہوں۔ بہر حال آپ پریشان نہ ہوں۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔“ اُن کے خیال میں اُس کی پریشانی، خاموشی اور گم حتم ہو جانا صرف اسی بات کی وجہ سے منت تھی کہ صوفیہ نے ثاقب حسن کا فون ریسرو کر لیا تھا۔  
 ”چلیے اُنی سے مل لیں۔ انہوں نے صبح کئی بار مجھے تاکید کی تھی کہ آج میں آپ کو ضرور لے آؤں۔“ وہ خاموشی سے اُٹھ کر اُن کے ساتھ چل پڑی۔  
 ”اتی اور اُن کے ساتھ چھوٹی آیا اور مہر وز بھی لاؤنچ میں موجود تھے۔ وہ سلام کرتی ہوئی اُتی کے پاس بیٹھ گئی۔  
 ”میں رہو بیٹا۔ خوش رہو۔“ اُتی نے ہمیشہ کی طرح محنت سے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیا تو وہ ہنک نہیں۔ زرد رنگت، آتر ہوا چہرہ اور سیاہ حلقوں کے درمیان آنکھیں بے حد بیان سی۔ اُتی تشویش سے پوچھنے لگیں۔  
 ”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“  
 ”جی۔“  
 ”تیار رہی ہو کیا؟“  
 ”نہیں۔“  
 ”پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“ اُتی نے اُس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں کو اپنی انگلیوں سے چھوا۔  
 ”کیا ہوا ہے مجھے؟“ وہ اُن سے پوچھنے لگی۔  
 ”بشا۔ صحت کی طرف سے لا پرواہی اچھی نہیں ہوتی۔ دیکھو تو کتنی کمزور ہو رہی ہو۔“ پھر شہروز کو مخاطب کر کے کہنے لگیں۔ ”شہروز! تم ریمیہ کا خیال نہیں رکھ رہے۔ صبح ہی جا کر ڈاکٹر سے چیک آپ کراؤ۔“  
 ”خوابدہ احساسات پر مجبوتوں کی پھوڑا برتنے لگی اور اس سے پہلے کہ کوئی احساس بیدار ہوتا، وہ غفلت سے کہنے لگے۔  
 ”یہ خود بہت لا پرواہ ہیں۔“  
 ”یہ لا پرواہ نہیں ہے۔“ اُتی نے اُس کی طرف داری کی تو وہ کہنے لگے۔  
 ”آپ نہیں جانتیں۔ ابھی کچھ دن پہلے میرے عزیز دوست ثاقب حسن کا فون آیا تھا۔ انہوں نے اُنکے سے اُس کی بات ہی نہیں سنی۔ بس۔“ اُن بند کر دیا حالانکہ میں انہیں خاص طور سے بتا کر گیا تھا کہ کسی بھی وقت اُس کا فون آئے گا۔“ اُن کی بات پر وہ قہر چوہ کی ہی، چھوٹی کپاسے بھی چوہ کر دیکھنے لگی تھیں۔  
 ”کوئی کام ہو گا اسے جیسی فون بند کر دیا ہو گا۔ ورنہ یہ اتنی غیر ذمہ دار نہیں ہے۔“ اُتی نے پھر اُس کی حمایت کی تو وہ جھنجھلا کر بولے۔  
 ”مزید کیا کہوں؟“ آپ ان کا قصور مانیں گی ہی نہیں۔“  
 بالکل۔ اُتی اس کا کندھا ٹھیک کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ پھر جلتے جاتے کہنے لگیں۔ ”بہر حال تم صبح اسے ڈاکٹر کے پاس ضرور لے جانا۔“

”اور آپ نے مجھے ثاقب حسن کے فون کے بارے میں بتایا بھی نہیں تھا۔“ اسی کے جانے بعد وہ اسے مخاطب کر کے قدرے اونچی آواز میں کہنے لگے۔ مقصد چھوٹی آپا کو سنانا تھا۔ بالکل نہیں سمجھی کہ وہ اس طرح علی الاعلان ثاقب حسن کے بارے میں گفتگو کیوں کر رہے ہیں۔ کہنے لگے۔

”آج آفس میں اس کا فون آیا تھا۔ بہر حال اچھی خبر یہ ہے کہ آپ کے کہنے پر نادیر کے اس کی شادی ثاقب سے کرنے پر تیار ہو گئے ہیں اور وہ جلد واپس آنے والا ہے۔“ کچھ کہنے کے لیے اس کے ہونٹ نیم ہوا ہوئے تھے کہ وہ آنکھوں سے اسے خاموش رہنے اشارہ کرتے ہوئے پہننے لگے۔

”وہ فون پر آپ کو یہی بتانا چاہتا تھا کہ اب اس کی منزل قریب ہے اور ساتھ میں شکریہ بھی چاہتا تھا۔ لیکن آپ نے اس کی بات ہی نہیں سنی۔“

وہ کچھ کچھ سمجھتے ہوئے کنکھوں سے چھوٹی آپا کی طرف دیکھنے لگی۔ جو شہرہ زکی بات پوری توجہ سن رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر الجھن کے آثار واضح طور پر نظر آرہے تھے۔

”خیر اب آئے گا تو آپ اس سے معذرت کر لیجیے گا۔“ اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑے، اس نے انہیں کمرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا پھر خود بھی اٹھ کر ان کے پیچھے چل پڑی۔ کمرے آئی تو وہ کہنے لگے۔

”میرا خیال ہے میں نے صوفیہ کو شش و پنج میں ڈال دیا ہے۔ اب وہ آپ سے دوبارہ ثاقب کے بارے میں ضرور پوچھے گی تو پلیر آپ اپنے ذہن کو ذرا حاضر رکھ کر اسے کوئی فرضی کہانی سنا گا۔ وہ خاموشی سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”کوئی کہانی بھی میں ہی گھڑ کر بتاؤں۔“

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے تو وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

”پھر اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں؟“

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا، آپ کا شکریہ کس طرح ادا کروں؟“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے وعدہ کیا تھا آپ پر کوئی الزام نہیں آنے دوں گا۔ اور میں اپنا وعدہ نبھایا ہے۔“

”پھر بھی شہرہ زاحمد۔“ وہ سر جھکا گئی۔ ”میں تو شاید کبھی بھی چھوٹی آپا کو۔“

”آپ نے شاید اس بات کا بہت زیادہ اثر لے لیا ہے۔“ وہ اس کی بات کا ٹک کر کہنے لگے۔ آپ کو دیکھیں، کیا حال کر لیا ہے۔ اسی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی ضرورت ہے۔“

”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ افسردگی سے مسکرائی۔

”بالکل ٹھیک نہیں ہیں۔ اور پلیر چھوٹی چھوٹی باتوں کا اثر لینا چھوڑ دیں ورنہ حالات کا مقابلہ کیے گی۔ زندگی میں تو بڑے بڑے امتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ فرار حاصل کرنے یا آنکھیں بند کر لینے امتحان یا آزمائشیں ٹل نہیں جاتیں۔ بلکہ اور دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہاں اگر بندہ ہمت اور حوصلہ کرے تو ان آزمائشوں سے آسانی سے تو نہیں، پھر بھی گزرا جاسکتا ہے۔“ قدرے توقف کے

کہنے لگے۔ ”ان دو سالوں میں میں نے بہت کوشش کی کہ آپ کو اتنا پر اعتماد بنا دوں کہ آپ جوانی سے حالات کا مقابلہ کرنا سیکھ جائیں۔ لیکن آپ نے شروع دن سے جو حصار اپنے گرد کھینچ لیا اس سے نکلنے کو تیار ہی نہیں ہوتیں۔“

”اپنے گرد حصار کھینچنا اور اس میں مقید رہنا میری مجبوری تھی۔“ وہ سر جھکائے ہوئے بولی۔

”میں جانتا ہوں آپ کس قدر مجبور تھیں اور ہیں اس لیے میں آپ کو قصور وار نہیں سمجھتا۔“ شت سے سر جھکا کر اس پر نظر پڑ جاتے ہوئے بولے۔ ”بہر حال اب جب وقت گزر رہی چکا ہے۔“

”یہ کہیں مجھ اس تمام عرصے میں اگر میری کوئی بات آپ کو بُری لگی ہو تو۔“

”نہیں شہرہ زاحمد۔“ وہ خدا بول پڑی۔ ”آپ نے تو اکثر مجھے مایوسیوں کی انتہا گہرائیوں سے نکالا ہے۔ جب بھی اپنے آپ کو انتہائی بے بس محسوس کرتے ہوئے اندھیروں میں پھٹنے لگی تو روشنی کی کرن ہی کی طرف سے آئی۔ اور میں جو زندہ سلامت نظر آ رہی ہوں تو آپ ہی کی وجہ سے میں تو گرتی ہوئی

رہی۔ آپ نے بہت حوصلہ اور سہارا دیا ورنہ کب کی ڈھکے گئی ہوتی۔“

وہ اس کی طرف دیکھنے لگے۔ سر جھکائے اپنے ناخنوں کو چھٹی رہی بہت عام سے بچے میں کر رہی تھی جیسے وقت رخصت کوئی بھی اس طرح کی رسمی باتیں کرتا ہے۔

”نہیں ربیعہ۔“ اس کے خاموش ہونے پر سینے میں دبی سانس ہونٹوں کی قید سے آزاد کرتے ہوئے لے۔ ”میں سمجھتا ہوں، میں نے آپ کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔“ اول روز جس طرح آپ مجھے نظر

تھیں، ابھی بھی بالکل ویسی میرے سامنے بیٹھی ہیں۔ گزرتے ماہ و سال نے آپ کا کچھ بھی نہیں ڈالا۔ دی ہجہ، اول روز والا۔ کچھ سوچتا، کچھ اٹھتا ہوا۔ جیسے آپ سمجھ نہیں پا رہیں کہ آپ کے ساتھ ہوا ہے۔“

”یا اگر سمجھ رہی ہیں تو یقین نہیں کر رہیں۔“

وہ ذرا سا سر اونچا کر کے، ان کی طرف دیکھنے لگی۔ اگر کوئی احساس زندہ ہوتا تو دل میں ضرور درد ماکہ یہ شخص جو رگ جال سے قریب تر ہے، اس سے جدائی کے خیال سے کس قدر آزرہ نظر آ

تھا۔

”میرا خیال ہے آپ نے میری بساط اور تصور سے بڑھ کر میرے لیے کیا۔ یہی کیا کم ہے کہ دو لکے عرصے میں مجھے آپ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ جب کہ میں نے بارہا آپ کو شکایت

ماتلق فراہم کیے۔ کبھی اپنے رویے سے، اور بھی اپنی باتوں سے۔ اور رہا یہ سوال کہ میں اول روز ہی نظر آئی تھی، اب بھی ویسی ہی نظر آ رہی ہوں، تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ جب میں یہاں آئی

تو میرے دل میں نہ کوئی خواہش تھی، نہ آئینہ، نہ سفر کا کوئی نیا احساس نہیں جاگا تھا۔ اور نہ ہی رنگوں نے کوئی راگ الاپے تھے۔ اس کے برعکس کھودینے کا احساس حاوی تھا اور اب بھی

ہاں ہے۔“

وہ چونک کر سیدھے ہو بیٹھے۔

”کیا اب بھی کھودینے کا احساس ہے؟“

”ہاں۔“ وہ سادگی سے اعتراف کرتے ہوئے وضاحت کرنے لگی۔ ”اس گھر میں مجھے بے نیاز نہیں ملتی ہیں۔ اتنی، آبی، مہروز اور نرا (ان کا نام نہیں لیا) سب نے بہت خلوص سے چاہا ہے۔“

”یہ چاہتیں کھودینے کا احساس ہر بات پر حاوی ہے۔“

”یہ چاہتیں آپ کا حق تھیں۔ اس لیے کہ ایک تو آپ شہرہ زاحمد کے حوالے سے یہاں آئیں دوسرے آپ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو۔“

”لہذا زے پر دستک کی آواز سے ان کی بات وہیں رہ گئی۔“

”کون ہے؟“ آجائو۔ انہوں نے کہا تو مہروز ذرا سادہ روزہ کھول کر سر اندر کرتا ہوا بولا۔

”آپ لوگوں نے کھانا نہیں کھانا۔؟“

”کیوں نہیں۔“

”تو پھر کیسے۔“

”علی گاربیعہ۔“ انہوں نے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

ایک؟ وہ انجان بن گئی۔

ایک شام۔ جب تم پر خفا بھی ہو رہے تھے۔  
ہاں وہ۔ وہ جیسے یاد کرتی ہوئی بولی۔ شاقب حسن کے بارے میں بات کر رہے تھے۔  
کون شاقب حسن؟

ان کا ایک دوست ہے اور چھوٹی آپا اس نام کا صرف ایک ہی شخص نہیں ہے اس پوری دنیا

ہاں لیکن۔

لیکن کیا؟ وہ چھوٹی آپا کو اچھے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

وہ فون پر اس روز اتنی بے تکلفی سے تمہارا نام لے رہا تھا کہ۔

اگر آپ کو اس پر اسی کا گمان ہوا۔ وہ فوراً بولی۔ تو چھوٹی آپا اپنی جگہ جو رسی بن گئیں۔

و آئی ایم سوری ربیعہ۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں بہت غلط قسم کی باتیں کہہ دی تھیں

لیں۔

جانے دس چھوٹی آپا۔ وہ ان کی بات کاٹ کر کہنے لگی۔ محض غلط فہمی کی بنا پر یہ سب ہوا

آپ کی جگہ اگر میں ہوتی تو یقیناً ایسی ہی باتیں کہہ جاتی۔

تمہیں دکھ تو ہوا ہو گا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر بولیں۔

ہاں دکھ تو ہوا۔ لیکن خیر چھوڑیں اس قصے کو۔ وہ موضوع بدلتی ہوئی بولی۔ یہ بتائیں میرے

پڑا تو نہیں آئی۔

نہیں۔ کیونکہ کوئی خاص بات ہے؟

نہیں بس ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔ بہت دنوں سے آئی نہیں۔ پھر اٹھتے ہوئے بولی۔

نی کے پاس چلیں۔ وہ اکیلی بیٹھی ہوں گی۔

اتنی کلام پاک کی تلاوت کر رہی ہیں، تم بیٹھو۔ چھوٹی آپا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھا دیا۔

کہنے لگیں۔ یہ بتاؤ، تم نے مجھے معاف کیا یا نہیں؟

چھوٹی آپا۔ اب چھوڑیں اس بات کو۔ میرے دل میں آپ کی طرف سے کوئی میل نہیں۔

نہیں کہہ رہی ہوں؟

ہاں۔ وہ ہلکے سے مسکراتی تو چھوٹی آپا نے اس کے گلے میں بازو ڈال دیے۔

تم بہت اچھی ہو ربیعہ۔ نہ خود خفا ہوتی ہو نہ کسی کو خفا دیکھ سکتی ہو۔

اس وقت لاؤنج سے باتوں کی آواز آنے لگی تو چھوٹی آپا خاموش ہو کر منہ کی کوشش کرنے لگیں۔

میرا خیال ہے ندا آئی ہے۔ وہ کہنے لگی۔

اے ہاں۔ اسی کی آواز ہے۔ چلو ابھی تم اسے یاد بھی کر رہی تھیں۔

وہ چھوٹی آپا کے ساتھ اٹھ کر کمرے سے نکلی تو ندا اسی طرف آ رہی تھی۔ اس نے بے اختیار

بچے بازو پھیلا دیے۔ ندا اس کے سینے سے لگی تو وہ کہنے لگی۔

ابھی ابھی میں نے تمہیں یاد کیا تھا۔

آپ نے یاد کیا اور میں آگئی۔ ندا کھلکھلا کر ہنسی پھر چھوٹی آپا کے گلے لگتی ہوئی بولی۔

آپ کیسی ہیں صوفیہ بھائی؟

ایک دم فرسٹ کلاس۔ البتہ ربیعہ کچھ بیمار ہے۔

اسے کیا ہوا بھائی؟ ندا اسے دیکھتے ہوئے پریشانی سے پوچھنے لگی۔ آپ تو واقعی بہت

لاڈل رہی ہیں۔ خیر تو ہے؟

رات اپنے سفر پر رواں دواں تھی۔ ابتدائی پہر میں ادھر ادھر سے کوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔  
پھر رفتہ رفتہ ساری آوازیں جیسے تھک کر سو گئیں۔ وہ بھی تھک گئی تھی۔ سونے کی بہت  
کی لیکن نیند کسی طرح مہرمان نہ ہوئی۔ حالانکہ ذہن بالکل خالی تھا۔ نہ کوئی سوچ، نہ کوئی خیال  
ایک بے قراری سی تھی۔ کروٹیں بدلتے بدلتے تھک گئی تو اٹھ بیٹھی۔ تھکے آؤنگ کر کے اس کے  
کمرے لگاتے ہوئے اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ کوئی چیز واضح نہیں نظر آ رہی تھی۔ نہ  
بڑی کی پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ باہر سے کہیں زیادہ تاریکی اس کی پلکوں کے اندر آ رہی تھی  
اسے لگا جیسے وہ اندھیری راہوں میں بھٹک گئی ہو۔ کبھی ادھر، کبھی ادھر۔ اور کوئی نہیں تھا  
میں ایک چراغ ہی رکھ دے، جس کی مدد کم میں وہ اپنا راستہ پالے۔  
اس گہری خاموشی میں اچانک ہلکا ہلکا شور سنائی دینے لگا تو اس نے چونک کر آنکھیں  
دیں۔ فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ کیسا شور ہے؟ جب غور کیا، تب جاننا کہ اس پاس کب  
ریکاؤڈنگ رہا تھا گو کہ آواز بہت آہستہ تھی جیسے سننے والے نے صرف اپنے لیے ان کی آواز بولی  
تنبہائی اور گہری خاموشی کے سبب وہ صاف سن سکتی تھی۔

ہ ہیں کوئی غم نہیں تھا، غم عاشقی سے پہلے

نہ تھی دشمنی کسی سے تیری دوستی سے پہلے

کون ہے؟ وہ خاموشیوں سے پتا پوچھ رہی تھی۔

ہ ہے یہ میری بدنصیبی تیرا کیا قصور اس میں

تیرے غم نے مار ڈالا مجھے زندگی سے پہلے

بہت آہستگی سے بڑے نیچے آتے آئی اور دبے پاؤں آکر کھڑکی سے پردے ہٹا کر

بادلوں کے ساتھ آنکھ پھولی تھکنا چاند ایک دم نظروں کی زد میں آ گیا۔

ہ میرا پیار چل رہا ہے اسے چاند آج چھپ جا !

کبھی پیار تھا ہمیں بھی تیری چاندنی سے پہلے

میں کبھی نہ مسکراتا، جو مجھے یہ علم ہوتا !

کہ ہزاروں غم ملیں گے مجھے اک خوشی سے پہلے

ارے۔ وہ ایک بار پھر چونکی۔ یہ آواز تو شہروز احمد کے کمرے سے آ رہی ہے۔

آہستہ روی سے چلتی ہوئی اسٹڈی روم کے دروازے کے پاس آکھڑی ہوئی۔ کچھ دیر تک

رہی۔ اس کے بعد ایک اور غزل تھی۔ پھر ٹپ بند کرنے کی آواز آئی تو وہ آنکھ پھولی دوبارہ

پڑا گئی۔

صبح آفس جاتے ہوئے شہروز اس سے کہہ گئے تھے کہ وہ کچھ ضروری کام دیکھ کر دو گھنٹے

واپس آجائیں گے۔ پھر اسے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے۔ اس نے بس ان کی بات سن لی

اور ان کے جانے کے کچھ دیر بعد چھوٹی آپا اس کے پاس آگئیں۔ انہیں دیکھتے ہی وہ سمجھ گئی

اس سے کیا بات کریں گی۔

اماں کے گھر سب ٹھیک ہیں؟ چھوٹی آپا بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

ہاں۔ اماں آپ کو بہت یاد کر رہی تھیں۔ کسی وقت ہو آئیے ان کے پاس۔

ہاں جاؤں گی۔ چھوٹی آپا اپنی کلائی میں بڑے کٹھن کو چھوٹے ہوئے بولیں۔ ان کا

ہوا تھا۔ کچھ دیر تک اسی طرح بیٹھی رہیں۔ ان کا انداز بتا رہا تھا جیسے بات کرنے کے

دھونڈ رہی ہیں۔

سنو۔ کافی دیر بعد بولیں۔ شہروز بھائی اپنے کسی دوست کا ذکر کر رہے تھے۔

”میں ٹھیک ہوں بھئی۔ تم سب کو تو پوچھ ہی وہم ہو گیا ہے۔“ پھر بات بدلتے ہوئے  
”اکیلی آئی ہو؟۔ سلمان نہیں آئے تمہارے ساتھ؟۔“  
”وہ مجھے باہر ہی چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔“  
”کیوں؟“

”وہ کسی ضروری کام سے جا رہے تھے۔ شام میں اطمینان سے آئیں گے۔“  
”اچھا۔ تم بیٹھو تو۔ اس وقت سے کھڑی ہو اور یہ اتنی کہاں ہیں؟۔“ وہ اُسے مہر  
ہوئی اتنی کے کمرے کی طرف دیکھنے لگی۔

”اتنی ابھی آ رہی ہیں۔ میں ان سے مل چکی ہوں۔“ ندانے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے باپ  
اسی وقت فون کی بیل بجی تو چھوٹی آ یا اٹھ کر چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد واپس آئی، تو کہنے  
”ربیعہ۔ شہزادہ جانی کا فون ہے۔ تمہیں بلا رہے ہیں۔“  
وہ بڑا سے ابھی آتی ہوں کہہ کر فون سننے چلی گئی۔

”ربیعہ۔“ اُس کے ہیلو کہنے پر انہوں نے شاید اپنے اطمینان کے لیے اس کا نام لیا۔  
”جی میں ہوں۔“

”کیا کر رہی تھیں؟“  
”کچھ نہیں۔ ابھی نڈا آئی ہے۔ اُس کے پاس بیٹھی تھی۔“

”اچھا۔“ وہ اچھا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ کتنی دیر گزر گئی۔ وہ اُن کے بولنے کی منتظر  
وہ پتا نہیں یونہی خاموش تھے یا کسی کام میں مصروف ہو گئے تھے۔

”ہیلو۔“ وہ کڑیل پر ہاتھ مار کر بولی۔ ”آپ خاموش کیوں ہو گئے؟۔“  
”وہ ایسا ہے ربیعہ کہ۔“ پھر خاموشی۔ اور وہ اُٹھنے لگی۔

”شاید آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس وقت نہیں آسکتے اور یہ کہ میں ڈاکٹر کے پاس  
ساتھ چلی جاؤں یا آپ شام میں آئیں گے، تب ملے جائیں گے۔“

”نہیں، یہ بات نہیں ہے۔“ وہ اُس کی پوری بات سننے کے بعد بولے۔  
”پھر؟۔“ اُن کے خاموش رہنے پر کہنے لگی۔ ”پلیز شہزادہ احمد جو بھی بات ہے،  
میں بہت اچھن محسوس کر رہی ہوں۔“

”بات یہ ہے ربیعہ۔ کہ شاقب حسن یہاں آچکا ہے۔ اور وہ ابھی ابھی میرے پاس۔“  
”کیا ہے۔“

”کچھ دن پہلے اگر وہ یہ اطلاع دیتے تو یقیناً وہ زلزلوں کی زد میں آجاتی۔ اور اب جب کہ  
احساسات گہری نیند سوچکے تھے۔ تو نہ دل کسی خوف سے دھڑکا اور نہ سائبان چین جلا۔

خیال آیا۔ اندر کہیں شاید آزدگی سمٹی تھی، وہ بھی لہجے میں نہیں اتنی زہجی سہولت سے  
”پھر؟۔“

”اُس کے پھر کہنے سے شہزادہ احمد واقعی بوکھلا گئے۔ ان کے خیال میں اگر وہ اور کچھ نہ  
تو خاموشی ضرور اختیار کر لے لیکن وہ تو ایک لفظ کہہ کر اب اُن کے بولنے کی منتظر تھی۔

”آپ جانتی ہیں۔“ وہ کہنے لگے۔ ”دو سال پہلے، اُس نے مجھے آپ سے شادی کر  
لیے کہا اور مجھ سے یہ وعدہ لیا کہ جب وہ واپس آئے گا تو میں آپ کو چھوڑ دوں گا۔ ایک  
اُس نے اپنی امانت کے طور پر آپ کو۔“

”میں یہ ساری باتیں جانتی ہوں۔“ وہ اُن کی بات کاٹ کر بولی۔  
”ابھی وہ اسی سلسلے میں آتا تھا۔“ کچھ دیر تک کہنے لگے۔ ”اور میں کیونکہ وعدے کی ذرا

”ابھی وہ اسی سلسلے میں آتا تھا۔“ کچھ دیر تک کہنے لگے۔ ”اور میں کیونکہ وعدے کی ذرا

”ابھی وہ اسی سلسلے میں آتا تھا۔“ کچھ دیر تک کہنے لگے۔ ”اور میں کیونکہ وعدے کی ذرا

”ابھی وہ اسی سلسلے میں آتا تھا۔“ کچھ دیر تک کہنے لگے۔ ”اور میں کیونکہ وعدے کی ذرا

”ابھی وہ اسی سلسلے میں آتا تھا۔“ کچھ دیر تک کہنے لگے۔ ”اور میں کیونکہ وعدے کی ذرا

”ابھی وہ اسی سلسلے میں آتا تھا۔“ کچھ دیر تک کہنے لگے۔ ”اور میں کیونکہ وعدے کی ذرا

”ابھی وہ اسی سلسلے میں آتا تھا۔“ کچھ دیر تک کہنے لگے۔ ”اور میں کیونکہ وعدے کی ذرا

”ابھی وہ اسی سلسلے میں آتا تھا۔“ کچھ دیر تک کہنے لگے۔ ”اور میں کیونکہ وعدے کی ذرا

”ابھی وہ اسی سلسلے میں آتا تھا۔“ کچھ دیر تک کہنے لگے۔ ”اور میں کیونکہ وعدے کی ذرا

”ابھی وہ اسی سلسلے میں آتا تھا۔“ کچھ دیر تک کہنے لگے۔ ”اور میں کیونکہ وعدے کی ذرا

”ابھی وہ اسی سلسلے میں آتا تھا۔“ کچھ دیر تک کہنے لگے۔ ”اور میں کیونکہ وعدے کی ذرا

”ابھی وہ اسی سلسلے میں آتا تھا۔“ کچھ دیر تک کہنے لگے۔ ”اور میں کیونکہ وعدے کی ذرا

”ابھی وہ اسی سلسلے میں آتا تھا۔“ کچھ دیر تک کہنے لگے۔ ”اور میں کیونکہ وعدے کی ذرا

”ابھی وہ اسی سلسلے میں آتا تھا۔“ کچھ دیر تک کہنے لگے۔ ”اور میں کیونکہ وعدے کی ذرا

”ابھی وہ اسی سلسلے میں آتا تھا۔“ کچھ دیر تک کہنے لگے۔ ”اور میں کیونکہ وعدے کی ذرا

”ابھی وہ اسی سلسلے میں آتا تھا۔“ کچھ دیر تک کہنے لگے۔ ”اور میں کیونکہ وعدے کی ذرا

”ابھی وہ اسی سلسلے میں آتا تھا۔“ کچھ دیر تک کہنے لگے۔ ”اور میں کیونکہ وعدے کی ذرا

”ابھی وہ اسی سلسلے میں آتا تھا۔“ کچھ دیر تک کہنے لگے۔ ”اور میں کیونکہ وعدے کی ذرا

”ابھی وہ اسی سلسلے میں آتا تھا۔“ کچھ دیر تک کہنے لگے۔ ”اور میں کیونکہ وعدے کی ذرا

”ابھی وہ اسی سلسلے میں آتا تھا۔“ کچھ دیر تک کہنے لگے۔ ”اور میں کیونکہ وعدے کی ذرا

کے ساتھ چھوٹی آیا بھی چنچ پڑیں۔

انہیں شہروز بھائی - خدا کے لیے۔

اور شاید ہی قیامت کی گھڑی ہے۔ درو دیوار لرزتے ہوئے پیروں کے نیچے زمین زور زور سے کھاتی ہوئی اور چھت ابھی اس کے سر پر آگے گی۔

ابھی شاید صور پھونکنے کی آواز آئے گی اور پھر کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ کچھ بھی۔

ماؤنڈ ذہن کے ساتھ اس نے ہر شے کو اپنی جگہ سے کھسکتے دیکھا۔

لیکن نہیں۔ ہر شے تو اپنی جگہ پر موجود تھی۔ زلزلوں کی زمیں تو وہ خود تھی کہ آخری بار جیسے۔

بح صور پھونکا گیا۔

ہیں۔ تمہیں۔ طلاق۔ دیتا ہوں۔ ربیعہ۔



آخری بار طلاق کے الفاظ کہہ کر وہ ثاقب حسن جیسے لوگوں کی قطار سے نکل کر گویا سرخرو ہو گئے۔

ان اس کی طرف دیکھنے کی بہت دکر سکے۔ وہ جو روز ازل سے ان کے لیے شہر ممنوعہ بنا دی گئی تھی۔

تو پنج شہر ممنوعہ ہو گئی تھی۔

اتنی۔ ندا۔ اور چھوٹی آیا ہمیشہ پچھلی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں اور ان سب نظروں سے بچنے

کا ہنر وہ پلٹے اور قدم بڑھانا جانتے تھے کہ اتنی کی آواز۔

شہروز احمد۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ گرتی ہوئی نظر آئیں۔ انہوں نے بھاگ کر انہیں بازوؤں

پر تھام لیا۔

تو میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ شہروز احمد میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ اتنی ان کے

تھوڑے کھانے پر بیٹھ گئیں۔ تو انہوں نے ندا کو اشارہ کیا جو بھاگ کر پانی لے آئی اور گلاس

کی لے ہوٹوں سے لگا دیا۔

ربیعہ۔ میری بچی۔ اتنی کے حواس بھال ہوئے تو اسے پکارا اور وہ کم صم سی گھڑی تھی، اس

ساری طرح جس کا تمام مال و متاع رانستے میں ہی لوٹ لیا گیا ہو۔ اس کی خالی خالی نظریں دل میں ترازو ہو

رہ گئیں۔

میری بچی۔ میرے پاس آؤ۔ اتنی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو وہ کٹھ ہوئی شاخ کی

لہر ڈھلے تھی۔ تب اتنی اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر رو پڑیں۔

شہروز احمد۔ اس بے زبان بچی پر تم نے جو ظلم کیا ہے، اس کے لیے تو خدا بھی تمہیں معاف

نہیں کرے گا۔ ارے کوئی شکایت تھی تو مجھ سے کہتے، یوں کھڑے کھڑے فیصلہ سنا دیا۔

جے بناؤ کیا منہ دکھاؤں گی۔ اس کے ماں باپ کو؟

شہروز بھائی۔ ربیعہ بھائی یہاں سے نہیں جائیں گی۔ میں انہیں نہیں جانے دوں گی۔ ندا بھی

دوڑے گی۔ اور چھوٹی آیا حیران کھڑی تھیں۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک جو کچھ ہوا ہے، یہ

حقیقت ہے یا وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہیں۔

شہروز ان کی کیفیت سمجھ رہے تھے۔ بڑھ کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک کر ان کی

طرف دیکھنے لگیں۔ سارے ناتے توڑ کر خود بھی آزدہ کھڑے تھے۔ ایک لمحے کو چھوٹی آیا کو ان پر

دم آیا لیکن پھر بہن کی محبت حاوی ہو گئی۔ بہت آہستگی سے اپنے کندھے سے ان کا ہاتھ ہٹا

کر ربیعہ کی طرف بڑھ گئیں۔ اس کی کلائی تھام کر اٹھایا۔ پھر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں کے پیلے میں

لے لیا۔ اس کی ویران آنکھوں کے سمندر خشک ہو گئے تھے کہ زندگی کے اتنے بڑے ایسے پر کوئی بوند

خود سے نہ ملی۔ سوکھے ہوئے ایک دوسرے میں مدغم جیسے اب بھی جلد نہ ہوں گے۔ چھوٹی

”اس کا مطلب ہے کہ وہ مجھے اور ثاقب حسن کو ایک ہی قطار میں کھڑا کرتی ہے۔ زندہ بارے میں اس کا نظریہ غالباً یہ ہے کہ مژدہ تو جاتی ہے، کسی نہ کسی طرح گزر ہی جائے گی کے ساتھ میں ہوں یا ثاقب حسن۔“ ان کے اندر ایک دم ڈھیر ساری تلخی بھر گئی۔

”ربیعہ اکرام علی۔“ دل ہی دل میں اسے مخاطب کر کے کہنے لگی۔ تمہارے نزدیک

کی شخصیت خواہ کتنی ہی قدر آور کیوں نہ ہو، میں اپنے آپ کو اس قطار میں کھڑا نہیں

میرے نزدیک وہ ایک مرد، متمیز شخص ہے جو اپنی محنت و ان رکھنے میں کوئی غار بنی ہو

وہ ایک پل میں فیصلہ کر کے اٹھنے اور آگے سے نکل آئے۔ تمام راستہ وہ یہ سوچتے

ایسا فیصلہ ایک دم سے کیسے سنا سکیں گے۔ گھر میں داخل ہوئے تو صور حال انہیں اپنے جنم

صانع آفس جاتے ہوئے وہ اس سے کہہ کر گئے تھے کہ اس وقت آکر اسے ڈکھائے پاس

گے اور اتنی کے علم میں بھی یہ بات تھی اور اس کی اطلاع اسے اس وقت تیار ہونا چاہیے

وہ صبح والے حلیے میں بیٹھی تھی۔ ان کے اندر ٹوٹ پھوٹ تو تھی ہی، اسے دیکھ کر شدت

سے چہرہ بھی سرخ ہو گیا۔

”ربیعہ۔“ اتنی آؤنجی آواز میں پکارا کہ وہ تو سہم کر کھڑی ہوئی ہی، ندا اور چھوٹی آیا بھی اٹھ

میں صبح آپ سے کہہ کر گیا تھا کہ میں اس وقت آؤں گا اور میں اپنے بہت سے

چھوڑ کر آیا ہوں۔“

اس کے سر جھکاتے پر اور آؤنجی آواز میں کہنے لگی۔

”ایک دفعہ کی کہی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آتی۔ آپ کو ہر بات بار بار کہنی پڑتی ہے

اتنا فالتو شخص نہیں ہوں کہ اپنی ساری زندگی آپ کو ذرا ذرا سی بات سمجھانے میں گزارا

ان کی آؤنجی آواز سن کر اتنی اپنے کمرے سے نکل آئیں اور وہ ان کا خیال کیے بغیر کہنے

”حد ہوتی ہے برداشت کی اور میں نے دو سال تک آپ کی یہ لاپرواہیاں برداشت

اس امید پر کہ شاید آپ سنبھل جائیں۔ اپنی ذمہ داریاں سمجھیں، میرے وقت کا احساس

لیکن آپ کو کسی بات کا کوئی احساس نہیں۔ اور میں مزید برداشت نہیں کر سکتا۔“

فرام ہوئی۔

”شہروز۔“ اتنی نے آگے بڑھتے ہوئے تمہیں لہجہ میں پکارا۔

لیکن وہ فیصلہ کر چکے تھے۔ اس سے زیادہ آؤنجی آواز میں بولے۔

”گیت لاسٹ ربیعہ۔ میں آپ کو دیکھنا نہیں چاہتا۔“

اس کے ساتھ ساتھ اس گھر کے درو دیوار بھی حیران تھے جنہوں نے کبھی شہروز احمد

آواز میں بولتے نہیں سنا تھا

”شہروز بٹیا آرام سے۔“ اتنی نے انہیں غصے پر قابو پانے کے لیے کہا لیکن غصہ کہا

یہ تو وہ وقت تھا جس کے تصور سے گذشتہ دو برسوں میں بارہا وہ اندر تک لرزے

”آپ ان کی طرف داری نہ کریں اتنی۔ میں مزید برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لیے“

طلاق دیتا ہوں۔“

”شہروز احمد۔“ اتنی کی چیخ نما آواز ان سے کہیں آؤنجی ہو گئی۔ ”روک لو اپنی آواز کو۔“

”اور اسے کاش آؤ پر والا وقت گویا ہی چھین لے ہمیشہ کے لیے۔“ انہوں نے سوچا

ربیعہ اکرام علی ضرور توند گویا ہی سے محروم ہو گئی تھی کہ چلبھنے اور کوشش کے باوجود

”میں۔ تمہیں۔ طلاق دیتا ہوں ربیعہ۔“ اتنی کے منع کرنے کے باوجود دوسری بار

آپ کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ اُس کا ہاتھ تھام کر پٹٹیں اور کہنے لگیں۔  
”اتی۔ اب ربیعہ کے لیے کیا حکم ہے؟“

اور اتی نے دوپٹے میں منہ چھپا لیا۔  
اس نے اس مہربان عورت کو روٹے ہوئے خاموشی سے دیکھا جو قصور وار نہیں تھیں، پھر اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہی تھیں۔ اور قصور وار تو کوئی بھی نہیں تھا، خود وہ بھی نہیں، پھر بھی پرچھٹائی گئی۔

”میرے کمرے میں چلو۔“ چھوٹی آپا نے اُس کا کندھا ہلا کر کہا تو آہستہ سے نفی میں سر ہلاتے اپنا ہاتھ ان کی گرفت سے چھڑا کر وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔  
”میں جا رہی ہوں۔ اور مجھے تو جانا ہی تھا۔“ الفاظ ہونٹوں سے ٹوٹنے لگے۔  
”نہیں بھائی۔ آپ کہیں نہیں جائیں گی۔“ یذرا روتے ہوئے بولی۔ اُتی بھائی جان خدا کے انہیں روکیں۔“

”کس ناتے؟“ ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ انہوں نے سر جھکالیا۔  
اور اُس نے آخری نظر ان درو دیوار پر ڈالی جن میں محبتوں کی چاشنی رچی بسی تھی۔ پھر اپنا رخ لیا۔ اُن کے قریب سے گزرنے لگی تو کچھ مہر کو ٹھہر گئی۔

”شہر و زاحمد۔ جب فیصلہ خود ہی کرنا تھا تو فیصلے کا اختیار مجھے سوپ کر کچھ وقت کا اطمینان کیوں بڑا انہوں نے ایک دم سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اور وہ آگے بڑھ گئی۔  
”کیسے جاؤ گی؟“ چھوٹی آپا سمجھے سے پکار کر کہنے لگیں۔ وہ اُن سنی کر کے آگے بڑھتی رہی۔  
”ربیعہ۔“ اُتی نے ٹیکار اُتو اُس کے بڑھتے قدم رُک گئے۔ لیکن پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ”رُک جاؤ۔ اس طرح مت جاؤ۔ اور تم کیوں جا رہی ہو؟ یہ گھر تمہارا ہے۔“

”بیگم صاحبہ۔ فرار حاصل کرنے یا آنکھیں بند کر لینے سے حقیقت بدلتی نہیں ہے اور نہ ہی یہ سکتی ہے۔ وہ پلٹ کر بولی۔ وہی باتیں جو گذشتہ دو برسوں میں شہر و زاحمد نے بار بار اس سے کہی تھیں۔  
”لیکن بیٹا، اس طرح تو مت جاؤ۔“

”پھر۔؟“  
”بہیں الزام دو، گالیاں دو اور میں تمہیں شہر و زاحمد کے گریبان میں ہاتھ ڈالنے کی اجازت بھی دتا ہوں۔“

”اپنی حرمان نصیبی کا الزام میں آپ کو کیوں دوں؟۔ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ آپ سب اُ محبتیں یاد رہیں گی۔“ خدا حافظ۔“

وہ تھکے تھکے قدموں سے باہر نکل گئی۔ اور شہر و زاحمد اپنی پوری زندگی میں کبھی اتنے مجبور اور بے نہ ہوئے تھے، جتنا وہ اب اپنے آپ کو محسوس کر رہے تھے۔ اُن کی اولین محبت اُن کی زندگی اُن کے سامنے دوڑ جا رہی تھی اور وہ اُسے روکنے پر قادر نہیں تھے۔ گلاس ڈور سے باہر نظریں دوڑائیں۔ حرمان نصیب لڑکی گیٹ سے نکل رہی تھی۔

دو سال قبل وہ اُن کے ساتھ اُن کے وجود کا سہارا لیے ہوئے اس گھر میں داخل ہوئی تھی۔ بار بار میں اس کے لیے پھولوں کا فرش بچھا گیا تھا۔ اور بے شمار پھولوں کی پتیاں اس پر پھیلا کر کی گئی تھیں پھر اس تمام عرصے میں کوئی تعلق نہ ہونے کے باوجود وہ اُن کے ساتھ ساتھ چلی تھی۔ کبھی کوئی دن نہیں تھا، جو وہ اُن کے بغیر کہیں گئی ہو۔ ہمیشہ اُن کے قدم سے قدم ملا کر اس گھر کی دہلیز پار کی او اب تنہا جا رہی تھی۔ وہ بھی ہمیشہ کے لیے۔ پتا نہیں راستوں سے آشنا تھی بھی کہ نہیں۔ اس

بے رسولمانی کا خیال آیا تو کہنے لگے۔

”موصوفہ۔ ڈرائیور سے کہیں اُسے چھوڑ آئے۔“

اور چھوٹی آپا اس تمام عرصے میں پہلی بار ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔  
”بھائی۔“ بڑا خود رو نا بھول کر اُن کی طرف پڑھی۔ اور اُتی کی نظر میں شہر و زاحمد پر جاٹھریں۔ جو قصور وار نہیں تھے لیکن سارا الزام اپنے سر کر کے مجرم بنے کھڑے تھے۔ اُتی کو بے حد خاموش نظروں سے اپنی طرف دیکھتے یا کر اُن کا سر مزید جھک گیا۔

”اس طرح سر مت جھکا و شہر و زاحمد۔“ اُتی کا ٹھہرا ہوا سر دلچسپی میں ترازو ہو گیا۔ اس پہلے میں اُسی وقت بات کیا کرتی تھیں، جب کوئی بات انہیں بہت دکھ پہنچاتی تھی۔  
”مرد ہو اور مدد مانگی کے زعم میں ایک کمزور لڑکی پر جو ظلم کیا ہے، اس پر سر اٹھا کر فخر یہ اعلان کرو۔“  
”اُتی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

”اُتی پلینر۔“ انہوں نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں پھنسا لیں تو ہتھیلیوں سے آنکھیں۔

”نیک تمہیں۔“  
”تمت کہو مجھے اُتی اور اس سے پہلے کہ میں تمہارے سر سے ہمیشہ کے لیے دستِ شفقت کھینچ لوں“

یہ نظروں سے دور ہو جاؤ۔“  
انہوں نے سوچا، اُس وقت ان کا یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے اور اپنی سوچ پر فوراً عمل کرتے ہوئے، وہ تیز تیز قدم اٹھاتے۔ کمرے سے اور پھر گھر سے بھی نکل آئے۔

گاڑی میں بیٹھ کر کچھ دیر سوچتے رہے کہ کہاں جانا چاہیے۔ اس حال میں اُن س نہیں جانا چاہتے تھے۔ یہی دوست تھے بھی تو یہ ایسا وقت تھا کہ سب اپنے اُن میں مصروف ہوں گے۔ پھر کسی خاص بلکہ تعین کیے بغیر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ گھر کے سامنے والی روڈ سے نکل کر دائیں طرف گڑے تو وہ انہیں دور سے نظر آگئی۔ تیز چلنے کی کوشش میں اس کی چال متوازن نہیں رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بہت مشکل سے اپنے آپ کو سہارا دیے ہوئے ہو۔ حالانکہ ان کا اس کے پیچھے چلنے کا ٹوٹی راہ وہ نہیں تھا۔ بلکہ ابھی تو انہیں اس کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ لیکن اب جب وہ نظر آگئی تھی تو وہ اپنے آپ کو نہ روک سکے۔ بے اختیار اسپید بڑھا کر گاڑی اُس کے قریب لے جا کر روک دی۔ اور وہاں سے خیال میں چل رہی تھی۔ گاڑی کی آواز پر رُک گئی۔ اُن پر نظر پڑی تو خاموشی سے دیکھ گئی۔  
”بہے پر کوئی تاثر نہیں آجھرا۔ البتہ آنکھیں شکوہ کنان تھیں۔“  
”آئیے۔ آپ کو چھوڑ دوں۔“ آواز کے بوجھل پن کو چھپانے کے۔

اور اب جب کہ وہ نام نہاد بندھن بھی نہیں رہا تھا تو وہ نہیں چاہتی تھی کہ اپنا اندر اُن پر عیاں ہونے لے۔ آخر کار وہ اجنبی ہی تو ہو گئے تھے، پھر کیوں دل کی کوئی بات، کوئی جذبہ اُن تک پہنچے۔  
”فراموش ہو کر چل دی تو کسی جذبے کا اظہار ہو جاتا۔ اور بولتی تو آواز میں شکستگی سمٹ آتی۔ اس لیے دونوں باتوں سے گریز کیا۔ اسی طرح کھڑی رہی، بس پھلوں کو جھکالیا تھا۔“

”آئیے ربیعہ۔“ اصرار میں اسرار پوشیدہ تھا اب پلینر یہ مت کہہ دیجیے گا کہ کس ناتے؟۔ کوئی نانا، کوئی

غلط تو پہلے بھی ہمارے درمیان نہیں رہا۔ پھر بھی ہم ساتھ ساتھ چلے ہیں۔ یہ آخری سفر اور سی۔“  
”ہاں۔ ایک آخری سفر اور سی۔“ انتہائی دکھ سے سوچتے ہوئے اس راستے کی طرف دیکھنے لگی جس پر اسے چلنا تھا۔ اسے شش و پنج میں دیکھ کر انہوں نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ اور پھر اسے بیٹھنے کے لیے کہا تو وہ یونہی خاموشی سے سر جھکائے ہوئے بیٹھ گئی۔ تمام راستہ پھرنے کے سارے کوئی بات نہیں کی اور وہ تو تھی ہی خاموش جب کہ کہنے کو دونوں کے پاس بہت کچھ تھا۔ وہ ساری باتیں جو دو برسوں میں ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہوئے کہی نہ جاسکیں، وہ باتیں کہنے کو دل



میل رہے تھے۔ لیکن اب دسترس میں نہ وقت تھا، نہ اختیار، نہ کوئی فائدہ۔ اس لیے تمام راستہ مڑ کر چلتے دل کو سنبھالنے میں کٹ گیا۔ اس کے گھر کے سامنے گاڑی روکی اور اس کے اُترنے کا انتظار کرنے لگے جب کہ وہ اس طرح بیٹھی تھی جیسے اُترنے کا کوئی ارادہ نہ ہو۔

”آپ کا گھر آگیا ہے۔“ اس کی طرف دیکھ کر بغیر کہا تو اس نے ذرا سا سر اوجھا کر کے اپنے گھر بند دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے ہاتھوں پر نظر پڑ جاتی ہوئی بولی۔

”گذشتہ دو برسوں میں شہر وافر آمد، آپ نے ہر مقام پر مجھے پرکھ دیا۔ مجھ پر کوئی اثر نہیں آ رہا۔ اب اتنا بتا دیں، میں اپنے والدین سے کیا کہوں؟“

”آپ سارا الزام مجھ پر رکھ سکتی ہیں؟“ اس کی ویران آنکھیں جو اس تمام عرصے میں ایک ایک پوز کو ترستی رہی تھیں۔ ایک دم دھیر سارے پانی سے بھر گئیں۔ کنارے، پلکیں اور پھر زخاں پچھلے گئے۔

”میں نہیں جانتی اب اس مقام پر آپ کے احساسات کیا ہیں؟ آپ خوش ہیں یا ناخوش۔ اپنے بارے میں میں کہوں گی کہ میرے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ میری زندگی کے ساتھ یہ بھیسا گیا کھانا کھیلنے اور میری قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق نہ تھا۔ صحت کو تھا اور نہ آپ کو۔“

”آپ جو چاہیں کہہ سکتی ہیں۔ میں آپ کا مجرم ہوں کیونکہ ثاقب صحت کی بات مانتے ہوئے مجھے کہ کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ اس وقت میرا خیال تھا، میں ایک شخص کی زندگی بچانے کے لیے اس کے ساتھ نیکی کر رہا ہوں۔ نہیں جانتا تھا کہ میری یہ نیکی دوسری طرف کسی کی زندگی پر کس طرح اثر ہوگی۔ یوں ہی ذرا سی گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے بے تحاشا بہتے آنسوؤں نے دل میں ہلچا مچا دی۔ اور محض اسے حوصلہ دینے کی غرض سے کہنے لگے۔

”آپ خانواہ اندیشوں میں گھر رہی ہیں۔ اب جب ثاقب صحت آگیا ہے تو۔“  
”انہیں اپنی بات روکنی پڑی کیونکہ اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا، پھر دروازہ کھول کر نیچے آ کر گئی اور جب تک ان کی گاڑی اشارت ہونے کی آواز نہیں سنئی۔ ان کے دروازہ پر دستک نہیں دی۔

دروازہ آنا ہی نے کھولا تھا۔ اس پر سرسری سی نظر ڈال کر اس کے پیچھے دیکھنے لگیں۔ ان کے خیال میں شہر واز ہوں گے۔ لیکن باہر دور دور تک کوئی نظر نہیں آیا۔ تو تعجب سے پوچھنے لگیں۔  
”کیلی آئی ہو؟“

”ہاں اماں۔“ اس نے وہیں کھڑے کھڑے جواب دیا۔

”خیر تو ہے؟۔ کون چھوڑ کر گیا ہے؟“  
”کوئی نہیں اماں۔ میں خود سب چھوڑ آئی ہوں۔ وہ گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئی ہوں۔“  
”کیا کہہ رہی ہے؟۔“ اماں آواز دبا کر بولیں۔ اور اسے کلانی سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ پھر دروازہ بند کر کے اسے تقریباً کھینچتے ہوئے اندر لے آئیں۔

”اب بتا، کیا کہہ رہی تھی؟“  
”کیا بتاؤں اماں؟۔ وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر چھوٹ چھوٹ کر رونے لگی۔ اور اماں کو اس کے رونے سے زیادہ اس کی بات پریشان کر رہی تھی۔ اسے چارپائی پر دھکیلتی ہوئی بولیں۔  
”آخر بتا تو، ہو کیا؟“

”شہر واز نے مجھے طلاق —“ آنسوؤں کے درمیان بس اس قدر کہہ سکی۔ اور اماں نے اپنے سینہ پیٹ لیا۔

”کیوں۔ کیوں؟۔“ اس لفظ کی سنگ باری تو اس پر ہونی ہی تھی۔ وہ اور شدت سے رونا لگی۔ تو اماں اس کے بالوں میں ہاتھ ڈال کر سر اوجھا کر تے ہوئے بولیں۔

”کیا کیا ہے تو نے؟“ گویا انہیں یقین تھا کہ اسی نے کچھ کیا ہے۔

”اماں۔“ وہ بے بسی کی تصویر بن گئی۔

”بول کیا کیا ہے جو اس نے یوں دھتکار دیا۔“

”میں نے کچھ نہیں کیا۔“ اس نے چہرہ دونوں بازوؤں میں چھپا لیا۔

”پھر کیا اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ میں ابھی جا کر تو چھیتی ہوں شہر واز اور اس کی ماں سے۔“

”خدا کے لیے اماں۔“ اس نے اماں کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”آپ وہاں نہ جائیں۔ کسی سے کچھ نہ پوچھیں۔“

”کیوں؟۔ کیوں نہ پوچھوں؟ میری ایک اور بیٹی وہاں بیٹھی ہے۔ کل کو اسے بھی یوں تین کپڑوں میں چھوڑ گئے تو؟“

”نہیں اماں۔ جھوٹی آپا کے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔“

”پھر تیرے ساتھ کیوں ہوا؟“

”میری قسمت خراب ہے۔“

”قیمت کو الزام مت دو رجہ۔ سچ سچ بتاؤ، کیا بات ہوئی تھی؟“

”میں آپ کو کیا بتاؤں اماں؟۔ کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ کوئی جھگڑا بھی نہیں۔ بس ذرا سی بات پر شہر واز غصے میں آ گئے۔“

”وہ شہر واز پر کوئی الزام نہیں رکھتا چاہتی تھی اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنا دامن کیسے بچائے۔“

”ذرا سی بات پر اتنی بڑی باتیں اور اتنے بڑے فیصلے نہیں ہوا کرتے۔ ضرور کوئی اور بات ہو گی۔“ پھر اماں پر سوچ انداز میں کہنے لگیں۔

”ابھی کل ہی تو تو یہاں سے گئی ہے۔ اس وقت تو شہر واز ٹھیک ٹھاک تھے۔ ہاں البتہ تو۔“

”میں۔۔۔“ وہ اپنی طرف اشارہ کیے اماں کو دیکھنے لگی۔

”ہاں۔ تم ٹھیک نہیں تھیں۔ تم ہفتہ بھر یہاں رہیں۔ اور میں نے محسوس کیا تم بہت کچھ بھیجی اور پریشان سی تھیں۔“

”میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اور اماں، آپ میرے منہ سے کیا سننا چاہتی ہیں؟۔ جب کوئی بات نہیں ہے تو میں کیسے آپ کو کوئی من گھڑت کہانی سنادوں؟“ اس نے سسکتے ہوئے ٹھوڑی گھٹنوں پر رکالی۔

”کتنا دل چاہ رہا تھا اماں ہر بات سے نظر میں چڑا کر صرف اس کا دکھ محسوس کریں۔ اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی کو بعد میں سوچیں۔ پہلے اسے سمجھیں۔ کسی بھی سچی کی طرح اسے اپنی آغوش میں بھر لیں۔ تو وہ اپنے سارے دکھ آنسوؤں میں بہا دے لیکن اماں کتنی سنگدل نظر آ رہی تھیں، اسے ٹھوڑی ہوئی نظروں سے یوں دیکھ رہی تھیں، جیسے وہ جھوٹ بول رہی ہو۔ اسی وقت کلثوم اور ہما کا کالج سے لوٹیں۔ اسے دیکھ کر وہ دونوں خوشی کا اظہار کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن جب اس کی شرح آنکھوں اور جھگڑے چہرے پر نظر پڑی تو دونوں ٹھٹھک کر نہ گئیں۔ اشارے سے اماں سے پوچھا کہ کیا ہوا؟۔

”جواب میں اماں نے ایسی تیز نظروں سے گھورا کہ دونوں گھبرا کر اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں۔“

”کیا ہوا آپ کی؟“ کلثوم نے سرگرمی میں پوچھا تو اس کی آنکھیں پھر چمک پڑیں۔

”آپنی پینز۔ روئیں تو نہیں۔“ ہما اس کے گلے میں بازو ڈالتی ہوئی بولی۔

”رونے کیسے نہیں۔ رونا تو اب اس کے مقدر میں لکھا ہے۔“ اماں بڑبڑاتی ہوئی سر ہکا کر،

”دوسری چارپائی پر بٹھے گئیں۔ اس نے ذرا سی پلکیں اٹھا کر اماں کی طرف دیکھا۔ پھر ہما کی آغوش میں گھس گئی حسرت لیے، وہاں سے اٹھ کر چھوٹے کمرے میں آئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

اب وہ تقدیر کی منتظر یعنی پر رونے کو تنہا تھی۔ کوئی روکنے اور چپ کرنے والا نہ تھا، اس لیے وہ خوب روئی، یہاں تک کہ آنکھیں خشک ہو گئیں۔ تڑپتا چلتا دل، ایک درد سے تانا جوڑ کر پھٹ گیا۔ کھردری چارپائی پر لیٹی تو سردرد سے چٹھا جا رہا تھا جیسی کوئی بات سوچی ہی نہ گئی۔ کچھ دیر تک درد لپٹے ہاتھوں سے بردبار رہی، پھر کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔

دوپہر میں تھانے دروازے پر دستک دے کر اسے کھانا کھانے کے لیے کہا۔ وہ جاگ رہی تھی لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔ ویسے بھی نہ بھوک تھی اور نہ کچھ کھانے کی خواہش۔ اور وہ اتنا کام سنا بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ہمارا کلثوم نے وقفے وقفے سے دستک دے کر اسے لپکا اور پھر اس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر شاید انہوں نے اسے سوتا سمجھ لیا تھا۔ جب کہ وہ مینڈک کو آوازیں دے رہی تھی کہ وہی مہربان ہو جائے جو وہ غافل ہو سکے۔ ہر دُکھ، ہر پریشانی سے اور خود اپنے آپ سے لیکن سب کی طرح شاید نیند بھی خفا تھی کہ مہربان ہو کے نہ دی۔

دوپہر ڈھلی اور پھر سہ پہر نے بھی شام کے دھندلوں میں پناہیں ڈھونڈ لیں۔ کمرے میں پہلی ہی اجالا برائے نام تھا۔ اور اب شام کے بڑھتے سایوں نے اسے بھی اپنی آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔ ایک بار اس نے سوچا کہ اٹھ کر لائٹ جلا دے لیکن اٹھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ کمرے سے باہر کمرے میں سے کسی کسی وقت اتناں کی آواز سنائی دے جاتی۔ اس کے بعد پھر خاموشی۔ پتا نہیں تھا اور کلثوم کہاں تھیں، جن کی کوئی آواز، کوئی آہستہ سنائی نہیں دی۔ اور اپنے آپ میں مگن رہنے والی ان لڑکیوں کی جلتی ہوئی ہنسی بھی خاموش تھی۔ کتنی دیر گزری، وہ اندھیرے میں کبھی دیوار پر نظر پڑ جاتی اور بھی جھٹ پڑ۔

”ربیعہ اگر ام علی“ اس کے اندر کی لڑکی دھیرے دھیرے پکارنے لگی۔  
 ”ایسا تو ہونا ہی تھا۔ اور تم جانتی بھی تھیں کہ تمہیں ان دشوار گزار راستوں سے گزرنا ہے پھر تم نے اپنے آپ کو پہلے سے ان راستوں سے گزرنے کے لیے تیار کیوں نہیں کیا؟“  
 ”میں شاید کسی مجبے کی منتظر تھی۔“ اس نے سوچا۔

”بیوقوف لڑکی۔“ مجبے کہاں ہوتے ہیں بھلا۔ انسان اپنے زور بازو یا پھر قوت ارادی سے حالات بدلنا ہے۔ اور تم تو سدا کی بزدل ہو۔“  
 ”ہاں۔ نہ صرف بزدل بلکہ وہ اپنے بارے میں اعتراف کرنے جا رہی تھی کہ دروازے پر ہوتی دستک نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ اس نے کچھ غور فرمایا کہ دروازے کی طرف دیکھا۔  
 ”بیمعہ بیٹا۔ دروازہ کھولو۔“ آبامیاں کا نرم لہجہ اس کے تن میں نئی روح چھونک گیا۔ پھر بھی وہ فوراً اٹھ نہ سکی۔

”ربیعہ۔ میری بچی۔ دروازہ کھولو۔“ آبامیاں کی آواز میں اس کے دُکھ کا احساس تھا اور وہ مڑی جسے وہ اتناں کے لہجے میں ڈھونڈ رہی تھی۔ بہت آہستگی سے چارپائی سے اٹھی اور بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی دروازے کے پاس آکھڑی ہوئی۔

بیٹا۔ کیا میری بات بھی نہیں مانو گی؟“ آبامیاں دُکھ سے بولے تو اس نے تڑپ کر دروازہ کھول دیا۔ چپن سے بڑے کمرے کی روشنی اس کے پیروں میں بچھ گئی یوں جیسے تاریک راہوں میں کوئی چراغ جل اٹھے۔

بیٹا۔ اندھیرے میں کیوں بیٹھی تھیں؟“  
 ”ہر طرف اندھیرے ہی میں آبامیاں۔“ اس نے کہا اور پٹ کر دوبارہ چارپائی پر جا بیٹھی۔  
 ”لو۔ میں روشنی کیے دیتا ہوں۔“ آبامیاں نے بٹن آن کیا پھر اس کے سامنے آ بیٹھے۔ سرخ آنکھوں پر بھاری پونٹے چہرہ زرد اور آتر ہوا۔ ان کا دل دُکھ سے بھر گیا۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے قریب کیا۔ پھر اس کا سر سینے سے لگاتے ہوئے اس کے گرد دونوں بازوؤں کا حلقہ

بنالیا۔  
 ”میں ساری عمر یہ سمجھتا رہا کہ تمہاری ماں ایک عقلمند عورت ہے لیکن آج معلوم ہوا کہ میں کتنا غلط سمجھا۔ اس جیسا کہ عقل اور بیوقوف شاید ہی کوئی ہو۔“

اسے حیرت ہوئی کہ آبامیاں اس سے کوئی سوال کرنے کے بجائے اتناں کی بات کر رہے تھے۔  
 ”نیک نیت جانتی بھی ہے کہ ہر انسان کا مقدر اوپر والا خود رقم کرتا ہے۔ پھر بھی نہ بننے کیوں اس حقیقت سے نظر میں چرا جاتی ہے۔“ اس کا سر آہستہ آہستہ ہٹکتے ہوئے کپٹے گئے۔

”میں جانتا ہوں آج اس نے تمہارے زخموں پر ہر دم رکھنے کے بجائے تمک چھڑکا ہوگا۔  
 ”دہن آبامیاں۔“ وہ ہشکل اپنے آپ کو بولنے پر آمادہ کر سکی۔ ”اتناں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ یہ تمہاری سعادت مندی ہے بیشک کہ تم اب بھی ماں کی طرف داری کر رہی ہو ورنہ وہ خود اعتراف کر چکی ہے کہ اس نے تمہارے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔“  
 ”آن کار و عمل فطری تھا۔“

”یقیناً فطری ہوگا لیکن پہلے اسے ضبط سے کام لے کر تم پر گزرنے والی قیامت کا احساس کرنا چاہیے تھا۔ باقی ساری باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی تھیں۔“  
 ”آبامیاں۔“ وہ سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ ”آپ مجھ سے پوچھیں گے نہیں کہ یہ سب کیسے ہوا؟“

”میری جان۔“ آبامیاں نے اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیلے میں لے لیا۔ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، اس سے بڑا المیہ اس رونے زمین پر اور کوئی نہیں ہوگا۔ میں نے آج جانا کہ تمہاری ماں بیٹیوں کی پیدائش پر آدرہ کیوں ہو جایا کرتی تھی۔“ آبامیاں کا لہجہ بھینکا اور پھر آنکھیں اس کی پیشانی پر ہونٹ رکھے تو شفاف نظر سے اس کے بالوں میں گرنے لگی۔

”بیٹا۔ میں تم سے نہ کوئی سوال کروں گا، نہ الزام دوں گا اور الزام تو میں شہ و زاحم کو بھی نہیں دے سکتا کہ میں نے اسے ہر مقام پر بہت اچھا پایا ہے۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔  
 ”شاید اوپر والے کو ہماری آزمائش مطلوب ہے اور بیٹا میں تم سے یہی کہوں گا کہ اس آزمائش میں مہربان کا دامن تھامے رکھنا۔“

”آبامیاں۔“ وہ روٹھی۔ ”میرے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔“  
 ”میں جانتا ہوں۔ یہ زخم گہرا ہے، پھر بھی یہ سوچ لو کہ ہو سکتا ہے اسی میں کوئی مصلحت ہو۔ پھر اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ”رو مت۔ مجھے بے حد تکلیف ہوئی ہے۔ چلاؤ اٹھ کر منہ ہاتھ دھوؤ، پھر ہم ساتھ کھانا کھا لیں گے۔“

”بچہ اتناں سے ڈر گتا ہے۔“ وہ سر جھٹکا کر بولی تو آبامیاں ہنس پڑے۔  
 ”وہ تمہاری ماں ہے بیٹا۔ اور پھر ابھی تم نے خود کہا تھا کہ ان کا رد عمل فطری تھا۔ چلو اٹھو، اب وہ کھانے پر تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔“

”کچھ ڈرتی ہوئی اٹھ کر آبامیاں کے ساتھ کمرے سے نکلی۔ بڑے کمرے میں اتناں واقعی دسترخوان پر بیٹھی، دونوں باپ بیٹی کا انتظار کر رہی تھیں۔ اس نے کنگھیوں سے انہیں دیکھا اور منہ ہاتھ دھونے کی ٹٹ سے باہر نکل آئی۔ کلثوم اور ہاچین میں سر جوڑے بیٹھی تھیں۔ اسے دیکھ کر دونوں کھڑی ہو گئیں اور جب وہ منہ دھو کر آئی تو وہ دونوں اس کے ساتھ اندر آئیں۔

دن بھر وہ یونہی بلا مقصد سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے رہے تھے جب شام آترنے لگی تو کھٹن برواق ایک ریڈیو گزرت میں جا بیٹھے۔ اس وقت انہیں اپنا آپ کسی آواز پر بھیجی کی مانند لگ رہا تھا جس کا اشیانہ کی لگاؤ پرندے کی مکاری کی نذر ہو گیا ہو اور وہ ٹھکانے کی تلاش میں ادھر ادھر مارا پھر رہا ہو۔ زندگی

میں بہت سارے مقام یا موڑ ایسے آئے تھے، جب انہوں نے اپنے آپ کو بہت کمزور محسوس کیا۔ اور سوچا تھا کہ وہ حالات کو کبھی بھی شکست نہیں دے سکیں گے۔ لیکن ہمیشہ ہی ایسے مقام پر آتی تھیں کہ وہ حوصلہ دیا۔ اس طرح کہ وہ حالات کو شکست دینے کے قابل ہو سکیں اور آج جو زندگی میں موڑ آیا تھا، اس نے تو انہیں بالکل ہی توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اور ستم یہ کہ حوصلہ دینے والی ہستی بھی ان سے خفا تھی۔ دن بھر پریشانیوں اور لاشتناہی سوچوں نے ان کے ذہن کو بھجکا دیا تھا اور پھر سارا دن کچھ کیا یا بھی نہیں تھا۔ اس وقت بھی بھوک کے باوجود کچھ کھانے کو دل نہیں چاہا۔ ویشٹ کے آنے پر اسے مزہ چائے لانے کے لیے کہا۔ اور پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر شیٹوں سے باہر دیکھنے لگے۔ نیلے پانیوں سے آٹھٹی شوریدہ سرسہرے ایک دو مہرے کے تعاقب میں بھاگتی ہوئی بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر تک اس منظر کو سرسری نظر سے دیکھتے رہے، پھر اچانک یوں لگا جیسے کوئی حائل نصیب لڑکی ان لہروں کے تعاقب میں زور تک چلی جا رہی ہو۔

”ربیعہ۔“ بے اختیار نگار بیٹھے پھر فوراً مستقبل کو پہلے اپنے اطراف دیکھا پھر دوبارہ اس منظر کی طرف متوجہ ہوئے لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا۔

”میرے خدا۔“ غلیل سانس لیتے ہوئے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں پھنسا لیں۔

”میں یقیناً اپنے حواس کھو رہا ہوں۔“ انہوں نے سوچا اور چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ پھر ایک کے بعد دوسرا کپ، پھر تیسرا۔ وہ مسلسل وقفہ وقفہ سے چائے منگوا کر پیتے رہے اور جب رات کی سیاہی نے ہر طرف اپنے پر پھیلا دیے، اس وقت وہ چائے کے ساتھ سگریٹ کا پورا پیکٹ خالی کر چکے تھے۔ گھڑی میں وقت دیکھا، نو بج رہے تھے۔ ویشٹ کو بلا کر بل پے کیا اور اپنے وجود میں بے پناہ تنہائی لے باہر نکل آئے۔ کچھ دیر بعد ان کی گاڑی پھر شفاف سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ وہ گھر جانا چاہتے تھے۔

دل چاہا، ہاتھ، کچھ وقت کے لیے ہر بات بھلا کر چپ چاپ سو جائیں، لیکن اتنی کامسانا کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس لیے خواہش کے باوجود وہ فوراً گھر نہ جاسکے۔ دو گھنٹے ٹریفک کا ٹکڑا دوڑتے رہے اور جب یہ یقین ہو گیا کہ اتنی سوچیں ہوں گی۔ تب گھر کی راہ لی۔ ان کا یقین غلط نہیں تھا۔ اتنی اور شاید مہرور اور صوفیہ بھی سوچیں تھیں۔ کیونکہ لاؤنچ کے علاوہ باقی تمام لاشیں ان کی تھیں۔ وہ دبے پاؤں اپنے کمرے میں چلے آئے۔ دروازہ بند کر کے لائٹ آن کی پھر صوفے پر نیم دراز ہو کر کھین بند کر لیں۔ کتنے لمبے پونجی چپ چاپ بہر کمرے گئے۔ لاشعوری طور پر شاید منتظر تھے کہ کوئی کسی بھی جگہ کوئی آواز مبرا کرے کہ انہیں متوجہ کرے گا۔ جیسے کہ وہ لڑکی ربیعہ اکرام علی کسی پہلے اپنی موجودگی کا احساس دلایا کرتی تھی اور پھر وہ آٹھ کراسڈی میں چلے جایا کرتے۔

انہیں اپنے قریب آہٹ کا احساس ہوا تو انہیں کھین کھول کر دیکھنے لگے۔ سامنے صوفیہ کھڑی تھیں۔ انہیں حیرت تو ہوئی لیکن اظہار نہیں کیا، آٹھ کر بیٹھے ہوئے کہنے لگے۔

”آپ سوئیں نہیں؟“ کوئی جواب نہیں آیا تو اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

”میں جانتا ہوں، سب مجھ سے خفا ہوں گے لیکن۔“

”آپ کے لیے کھانا لاؤں؟“ صوفیہ ان کی بات کا تھی ہوئی بولیں۔

”ارے۔“ وہ ایک دم سر اٹھا کر دیکھنے لگے۔ آپ اب تک صرف اس لیے جاگ رہی ہیں کہ مجھ سے کھانے کا پوچھ سکیں؟“

”کیا کچھ اور بھی پوچھ سکتی ہوں؟“ صوفیہ نے برا راست ان کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ نظریں پڑاتے ہوئے بولے۔

”ابھی نہیں۔ ابھی میں خود بہت ڈسٹرب ہوں۔“

”صرف ایک بات بتا دیں شہر و زبانی۔ یہ سب اچانک ہوا یا آپ پہلے سے کوئی فیصلہ کر چکے تھے؟“

”صوفیہ بلینز۔ میں نے کہا ناں ابھی اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کر سکیں گا۔“ پھر بھجک کر شہزادہ آتے ہوئے۔

”اور کھانا۔“

”کھانا نہیں کھاؤں گا۔ یہ بتائیں اتنی کیس ہیں؟“

”اتنی ٹھیک نہیں ہیں۔ وہ شدید شک میں ہیں۔“ صوفیہ نے کہا۔ تو وہ کچھ دیر تک سر جھکائے بیٹھے

چہ پھر اٹھتے ہوئے بولے۔

”اوکے۔ میں اب سوؤں گا۔“ صوفیہ نے بس لمحہ بھر کو ان کے چہرے پر کرب کے آثار دیکھے پھر انہیں بے خبر کبھی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔ انہوں نے بڑھ کر دروازہ اندر سے لاک کر دیا۔ پھر الماری میں اپنے کپڑے نکال کر ہاتھ روم میں چلے گئے۔ ڈریس چینجر کے نکلے تو بے خیالی میں سیدھے اسٹڈی میں داخل ہو گئے۔ لیکن فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا کہ اب بھلا یہاں آنے کی کیا ضرورت ہے؟ دوبارہ کمرے میں آتے ہوئے ایک نیا ڈھکے ساتھ تھا۔ کتنی دیر تک کھڑے خالی بیڈ کو دیکھتے رہے۔

پھر اگر جب اس پر لیٹے تو اس کی بہک روح کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئی۔

صبح جب معمول ان کی آنکھ کھل گئی۔ سر پہ حد بھاری ہود ہاتھ اور جلیبی ہوئی آنکھیں بنا کر ہاتھ صبح صبح معمول ان کی آنکھ کھل گئی۔ سر پہ حد بھاری ہود ہاتھ اور جلیبی ہوئی آنکھیں بنا کر ہاتھ صبح صبح معمول ان کی آنکھ کھل گئی۔ سر پہ حد بھاری ہود ہاتھ اور جلیبی ہوئی آنکھیں بنا کر ہاتھ

”آپ کی طبیعت۔“ اتنا کہا تھا کہ اتنی بول پڑیں۔

”مہر و اس سے کہو میرے کمرے سے چلا جائے۔“

”آپ کی خشکی بجا اتی۔ لیکن میری بات تو سنیں۔“

”مجھے کوئی بات نہیں سننی۔“

”آپ نہیں سنیں گی تو کون سنے گا؟“ وہ بیڈ کے پاس نیچے گھٹنے ٹیک کر بیٹھے اور ان کے پیروں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگے۔

”میں یقیناً قصور وار ہوں۔ آپ جو چاہیں سزا دے لیں لیکن اس طرح منہ نہ موڑیں۔ میں بہت ڈسٹرب ہوں اتنی۔ اپنے آپ کو کمزور محسوس کر رہا ہوں۔ اور آپ نے تو ہمیشہ مجھے سہارا دے کر کمزور ہونے سے بچایا ہے۔ اس وقت بھی مجھے آپ کا سہارا چاہیے۔ بس ایک بار میرے کندھے پر ہاتھ رکھ لیا۔“

”بہت خوب۔“ اتنی کے لہجے میں طنز سمٹ آیا، گویا شاباش دوں تمہیں۔ بڑا کارنامہ انجام دیا ہے تم نے۔“

”شاباش نہیں اتنی۔“ اس آونچے پورے توانا مرد نے اتنی کے پیروں پر سر رکھ دیا، مجھے ٹوٹنے سے بچالیں۔ میں اندر سے ریزہ ریزہ ہو رہا ہوں۔ اگر آپ نے نہ سمیٹا تو بالکل ہی بکھر جاؤں گا۔“

اور اتنی ماں تھیں۔ اولاد بہزار غلطیاں کرے پھر بھی ماں نہ صرف چشم پوشی کرتی ہے بلکہ فرخ سینے میں بھی چھپا لیتی ہے اور یہاں تو شہر و زاحمد تھے جن کی سعادت مندی اور نیک سیرت پر انہیں ہمیشہ فخر تھا۔ لیکن اب ستم یہ تھا کہ وہ اگر خطا کا رشتہ، قصور وار تھے تو ان کے نہیں بلکہ اس لڑکی کے جس کے بارے میں انہیں یقین تھا کہ اس جیسا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

”شہر و زاحمد۔“ اتنی نے سیدھے بیٹھے ہوئے اپنے پیروں پر سر رکھے ہوئے ان کے سر پر اپنا ہاتھ

رکھ دیا۔ ”مجھے کم از کم تم سے ایسی کسی بات کی توقع ہرگز نہیں تھی۔“

”مجھے معاف کر دیں اُمی۔ میں یقیناً غصے میں پاگل ہو گیا تھا۔“

”میں کیا معاف کروں بیٹا۔ معافی اُس سے مانگو، جس کے ماتھے پر داغ لگا کر تم نے اسے جینے کا حق چھین لیا ہے۔“

اُمی کی آواز جھرا گئی۔ تو انہوں نے اُن کا ہاتھ اپنی جلتی آنکھوں پر رکھ لیا۔ کاش وہ بتا سکتے کہ انہوں نے اُس کے ساتھ کوئی ظلم نہیں کیا۔ ظلم تو خود اُن پر ہوا ہے۔ زندگی اُن کی تباہ ہوئی ہے۔ جو عزیز تر ہو گئی تھی۔ کبھی اُن کے جذبات کو جان ہی نہ سکی۔ مجبی تو بنا احتجاج کیے چپ چاپ چلائی

”شہر وز۔“ اُمی نے پرسوج انداز میں پکارا۔ تو وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

”بیٹا۔ جو کچھ ہوا ہے، کیا تم اُس پر نام نہ ہو۔؟“ انہوں نے سر جھکا لیا تو کہنے لگیں۔

”بیٹا۔ اگر ایسا ہے تو پھر کوئی راستہ تلاش کرو۔“

”کیسا راستہ؟“ وہ بالکل نہیں سمجھے۔

”ربیعہ کی واپسی کا راستہ۔ ہاں بیٹا، معلوم کرو اس کی واپسی کس طرح ممکن ہو سکتی ہے؟“

”یہ ممکن نہیں ہے اُمی۔“ وہ نظریں چراتے ہوئے بولے۔

”کیوں ممکن نہیں ہے؟ اگر تم چاہو تو۔“

”صرف میرے چاہنے سے کیا ہوگا؟“ وہ بے اختیار کہہ گئے۔ پھر فوراً سنبھلتے ہوئے بولے۔

”میرا مطلب ہے اُمی جب تک دونوں فریق نہ چاہیں، یہ کیسے ممکن ہے؟۔ اور میرا خیال ہے ربیعہ دوبارہ یہاں آنے پر آمادہ نہیں ہوں گی۔“

”آپ کا خیال غلط بھی ہو سکتا ہے۔“ مہروز جواب تک خاموش بیٹھا تھا، کہنے لگا: ”میں سمجھتا ہوں اگر ربیعہ بھابی اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ نہ بنائیں تو مصالحت کی کوئی راہ نکل سکتی ہے۔“

”مصالحت کی صرف ایک راہ ہے اور وہ ہم سب جانتے ہیں۔“ انہوں نے کہا اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔

”شہروز احمد۔“ وہ جانے لگے تو اُمی نے پکار لیا: ”غلطیوں کا خمیازہ تو بھگتنا ہی پڑتا ہے بیٹا۔ میں جانتی ہوں، تم اُس کے بغیر خوش نہیں رہ سکتے۔ اور جو غلطی تم نے کی ہے خواہ غصے میں یا جذبات

میں، وہ تمہیں ایک عمر سکون سے نہیں رہنے دے گی۔ تو پھر کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم اپنا طرف بڑا کرو؟“

”آپ ماں ہیں۔ اور آپ سے زیادہ مجھے کون جان سکے گا بھلا۔ پھر بھی اگر میرے منہ سے سنا چاہتی ہیں تو میں یہی کہوں گا۔ پہلے ربیعہ سے معلوم کروالیں۔ میں اپنا طرف بڑا رکھوں گا۔“ انہوں نے کہا اور پھر رُکے نہیں۔ تیز قدموں سے کمرے سے نکل گئے۔ اُمی نے انہیں جاتے ہوئے دیکھا پھر ہر جھکا کر جانے کیا سوچنے لگیں۔ مہروز کچھ دیر تک اُن کے بولنے کا انتظار کرتا رہا لیکن جب وہ اسی طرح پیچھی رہیں تو پوچھنے لگا۔

”آپ کیا سوچنے لگیں؟“

”میں اسی مسئلے پر سوچ رہی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا، یہ سب کیا ہو گیا ہے؟۔ چنانچہ یہ ہماری آزمائش ہے یا کسی گناہ کی سزا۔“

”آپ پریشان نہ ہوں اُمی۔“ مہروز نے اُن کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ ”اب جب کہ بھائی جان نے آدائی ظاہر کر دی ہے تو باقی معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں پہلے صوفیہ کے ذریعے ربیعہ بھابی کا خیال معلوم کروالوں پھر اس کے بعد مل کر کوئی حل تلاش کریں گے۔“

”یہ صوفیہ ہے کہاں؟“

”میرا خیال ہے، لیکن میں ہوں گی۔ میں دیکھتا ہوں۔“

مہروز اُن کے پاس سے اُٹھ کر ڈائنگ روم میں آیا تو صوفیہ ٹیبل پر ناشتا لگا تی ہوئی نظر آئیں۔ اُسے دیکھتے ہی کہنے لگیں۔

”ناشتا تیار ہے۔ اُمی اور شہروز بھائی کو بلا لیں۔“ پھر خود ہی کہنے لگیں۔ ”میرا خیال ہے اُمی کو ان کے کمرے میں پہنچا دیتی ہوں۔“

ان کے کمرے میں ٹھیک ہے۔ تم اُمی کا ناشتا اُن کے کمرے میں لے جاؤ، میں شہروز بھائی کو دیکھتا ہوں۔“

انہوں نے پلٹ گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو وہ اُمی کے لیے ناشتا لے کر جا رہی تھی۔

یہاں شہروز بھائی نے بڑے رگڑ کر پوچھنے لگی۔

”میں نے تو رات بھی کچھ نہیں کھایا۔“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں، تم خود نوچھ لینا لیکن پلینر پہلے میرے ساتھ آکر ناشتا کرو۔“ وہ سر ہلاتی ہوئی چلی

اُمی کو ناشتا دے کر واپس آئی تو مہروز اپنی جگہ پر بیٹھ چکا تھا۔

”تم نے شہروز بھائی سے ناشتے کے لیے اصرار نہیں کیا؟“ وہ بیٹھے ہوئے پوچھنے لگی۔

”اصر کیا ہے، لیکن انہوں نے سختی سے منع کر دیا۔“

”جیب آؤی ہیں۔“ وہ پکے سے بڑبڑاتی پھر اپنی پلٹ پر جھک گئی۔

”پتا ہے صوفیہ؟“ وہ اپنے کپ میں چائے ڈالتا ہوا بولا۔ ”شہروز بھائی اپنے کیے پر بہت

”اب ان کی مذمت کس کام کی؟“ وہ ہاتھ کلتے ہوئے انداز میں بولیں۔

”میری بات سمجھ کر سے سنو۔“ وہ کہنے لگا۔ ”شہروز بھائی نہ صرف نام نہیں بلکہ اس بات کے لیے

یاد ہیں کہ ربیعہ بھابی کو دوبارہ اس گھر میں لے آئیں۔“

”کیا ایسا ممکن ہے؟“ وہ فوراً پوچھنے لگی۔

”ہاں۔ کچھ دشواریاں تو ہیں لیکن بہر حال ممکن ہو سکتا ہے۔“

”بھئی جو راستہ باطرلقہ ہمارے مذہب نے بتایا ہے اس طریقے سے کہ پہلے ربیعہ بھابی کا کسی

”لگے لگاں ہو اور وہاں کچھ عرصہ رہنے کے بعد علیحدگی اور پھر۔“

”تم اُسے بہت آسان سمجھ رہے ہو؟“ وہ بات کاٹ کر بابوسی سے بولی۔

”میں نے آسانی کا لفظ استعمال ہی نہیں کیا، پہلے ہی کہا ہے کہ کچھ دشواریاں ہیں۔“

”کچھ نہیں مہروز بہت دشواریاں ہیں۔ فرض کرو اگر ربیعہ دوسری شادی کر بھی لے تو اس کی کب

”ناہے کہ وہ دوسرا شخص اُسے چھوڑ دے گا؟“

”یہ ساری باتیں بددی ہیں، پہلے تم ایک کام کرو۔“

”کیا۔؟“ وہ پوری طرح متوجہ ہو گئی۔

”پھر سے پوچھو، کیا وہ میرے بھائی کی خطا معاف کر کے دوبارہ اُسے قبول کرنے کو تیار ہے؟“

”یہ فوراً کچھ نہیں ہو سکتی۔ بس خاموشی سے اُس کی طرف دیکھتے گئی تو وہ کہنے لگا۔

”کیا یہ بہت مشکل کام ہے؟“

”ربیعہ سے معلوم کرنا مشکل تو نہیں ہے لیکن فوری طور پر ممکن بھی نہیں ہے۔“ قدرے توقف کے

”نہ لگی۔“ بتا ہے مہروز، میں رات بھر نہ صرف ربیعہ بلکہ اماں اور آبا میاں کے بارے میں سوچتی

”ون۔ چنانچہ، ان سب پر کیا گوری ہوگی؟۔ میرا دل چاہ رہا ہے۔ میں وہاں جاؤں اور ان سب کے

”دونوں شریک ہوں لیکن۔“

”کیا کیا؟“

”گھر میں ابھی وہاں نہیں جاسکتی۔ گو کہ وہ میرے ماں باپ کا گھر ہے۔ پھر بھی اس گھر کی فرد ہونے

”اُسے میں تم سب کی طرح کچھ فیمل کر رہی ہوں۔ جیسے میں قصور وار ہوں۔ میں اپنے اندر اتناں کی

سوالیہ اور کھوجتی نظروں کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں پاتی۔ اور اگر میں بہت کچھ بھی لوں تو کیا کہوں گی؟ یہ سب کیسے ہوا؟۔ اس کی آواز مقرر آئی۔ آنکھوں میں پانی اتر آیا تو ٹیبل پر پیشانی رکھتے ہوئے بولی۔ یہ سب اچھا نہیں ہوا مہروز۔ کم از کم ربیعہ کے ساتھ تو ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ بہت بڑا دلدار ہے۔ کبھی بھی حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔“

”صوفیہ پلیئر“ مہروز اس کے رونے سے پریشان ہوا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آیا اور اس کے کندھے سے تھمتا ہوا بولا۔

”رؤومت۔ تمہارے رونے سے ہمارے اندر جرم کا احساس سوا ہو جاتا ہے۔“

”میں کسی کو الزام تو نہیں دے رہی۔ وہ روتے ہوئے بولی۔

”تم بیٹوں کی یہی بات تو ہمیں مارے ڈال رہی ہے۔ سنا ہے ربیعہ بھابی بھی کچھ کہے بہا چلا کر کیا کہتی وہ؟“

”کچھ بھی۔ کم از کم احتجاج تو کرتیں۔“

”وہ شروع سے ایسی رہی ہے۔ اپنے حق کے لیے بھی کبھی زبان نہیں کھولی۔“

”چلو ان کے حق کے لیے ہم لڑیں گے۔“ وہ اسے اٹھاتا ہوا بولا۔ ”منہ ہاتھ دھو کرائی گئی پاس ہاؤ“

”میرا خیال ہے، میں پہلے شہروز بھائی کو چائے دے دوں۔“ اس نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں اور چہرہ صاف کیا پھر کپ میں چائے بنانے لگی۔

”سنو، شہروز بھائی نے مجھے تو سختی سے ڈانٹ دیا تھا۔ اگر تم سے بھی سختی لے لیے میں بات کر دوں۔“

”بڑا مت سنانا۔“ مہروز نے کہا تو وہ افسردگی سے مسکرائی اور چائے کا ایک کپ اٹھا کر اسے ابھی آ

ہوں“ کہہ کر ڈانٹنگ روہ سے نکل آئی۔

”ان کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ آنکھوں پر بازو رکھے لیٹے تھے۔ اس نے انہیں متوجہ کرنے کے لیے دروازے پر دستک دی۔ اور جب انہوں نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر دیکھا تو وہ آگے بڑھ آئی۔“

”میں آپ کے لیے چائے لائی ہوں۔“ انہوں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ بار پڑی۔

”میں انکار نہیں سنوں گی۔ اٹھ کر چائے پیئیں۔ میں آپ کے لیے ناشتا بھی لارہی ہوں۔“

”نہیں صوفیہ۔“ انہوں نے روک دیا۔ پھر اٹھتے ہوئے بولے۔ ”چائے میں پانی لیتا ہوں بلکہ ناشتے کا تکلف نہیں دےں مجھے بالکل خواہش نہیں ہے۔“

”بہت ساری باتیں خواہش کے برعکس کرنی پڑتی ہیں شہروز بھائی“ وہ ان کے ہاتھ میں کپ تھما کر بولی۔

”ہاں۔ لیکن ایسا اس وقت ہوتا ہے جب بندہ بالکل بے بس وجہ اختیار ہو۔ خیر چھوڑیں یہ بات اتنی نے ناشتا کر لیا۔“

”جی۔“

”اور آپ نے۔؟“

”میں اور مہروز بھی اس کام سے فارغ ہو چکے ہیں۔“

”اچھی بات ہے۔ اب مہروز سے کہیں اس کے جانے تو پہلے سائٹ کا چکر لگالے۔“ پھر فال

کپ اسے تھمتے ہوئے بولے۔ ”اب میں سو رہا ہوں، کوئی مجھے ڈسٹرٹ نہ کرے۔“

”ٹھیک ہے۔ لیکن دوپہر کے کھانے کے لیے میں آپ کو ضرور اٹھاؤں گی۔“ پھر ان کا جواب بغیر کمرے سے نکل گئی۔

اس رات کی سحر جب ہوئی تو اسے اپنا ہوش نہیں تھا۔ اماں جب اسے اٹھانے آئیں تو دونوں

میں جلنے کیا بڑا ڈر رہی تھی۔

”بی بی۔“ اماں نے کتنی آوازیں دے ڈالیں۔ اور جب اس کی پیشانی کو چھوا تو وہ بخار

ہی تھی۔ اماں پریشان ہو گئیں۔ ”اوپنی آواز میں آبا میاں کو پکارا۔“

”معلیٰ۔ دیکھو تو ربیعہ کی کیا حالت ہو رہی ہے؟“ آبا میاں بھگائے آئے۔

”ہوا؟“

”میں جل رہی ہے۔“

”تم سے کام لو نیک جنت۔ تم اس کے پاس بیٹھو، میں کسی ڈاکٹر کو دیکھتا ہوں“ آبا میاں نے

شانسی چھو کر دیکھی، پھر ان ہی پیروں سے باہر نکل گئے۔ جب کہ اماں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے

”اٹھ کر اپنی گود میں رکھ لیا۔

”اللہ۔ یہ میری بچی کے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔؟“ اماں کو اس تمام عرصے میں پہلی بار

اس پر دم آیا بلکہ اس کے دل کا احساس بھی ہوا۔ کبھی اس کی پیشانی چومتیں اور کبھی اس کے

دھوکو اپنی آغوش میں بھرنے کی کوشش۔ بار بار منتظر نظروں سے دروازے کی طرف بھی

”تھیں۔ آبا میاں کافی دیر بعد آئے۔ وہ بھی بغیر ڈاکٹر کے۔

”وقت کوئی ڈاکٹر نہیں ملا۔“ مایوسی سے بولے اور کچھ کہنے کی کوشش میں اماں کا منہ بس

”لیا۔

”صبر کرو۔ ڈاکٹر اپنے وقت پر ہی آئیں گے۔ پھر میں کسی کو لے آؤں گا۔“

”ن اکرام علی۔ اس کی حالت تو دیکھو۔“ اماں پرچ بہت پریشان ہو گئی تھیں۔ اور پریشان تو

بھی تھے لیکن وہ اظہار کے اماں کی پریشانی میں اضافہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

”دک بات نہیں ہے۔ ٹھیک ہو جائے گی۔“ پھر کٹھنم تو بلا کر کہنے لگے۔ ”بیٹا، ٹھنڈا پانی اور

”الے آؤ۔“

”نم یہ دونوں چیزیں لے کر آئی تو آبا میاں پانی میں کپڑا بھگو بھگو کر اس کی پیشانی پر رکھنے لگے۔ اسی

”ی آبا جیسے رحمت کافر شہ بن کر آئیں۔

”بھائی ہو؟“ اماں انہیں دیکھتے ہی پوچھنے لگیں۔

”م کے ساتھ۔“

”مطلب ہے، گاڑی ہے تمہاری پاس؟“

”۔“ بڑی آپاکی نظر ربیعہ پر پڑی تو چونک کر پوچھنے لگیں۔ ”اماں! ربیعہ کو کیا ہوا؟“

”لے کے لیے پریشان ہو رہی ہوں۔ جاؤ عاصم سے کہو، ذرا رے، ہم ربیعہ کو کسی ڈاکٹر کے پاس

”لے گئے۔“

”م اندر ہی آرہے ہیں۔ لیکن اسے ہوا کیا؟۔ یہ تو برسوں کی بیمار لگ رہی ہے۔“ اماں نے

”ت کا جواب نہیں دیا۔ ربیعہ کا سر اپنی گود سے ہٹا کر تکیے پر رکھا، پھر چار پائی سے اتر

”بان کی مدد سے اسے اٹھانے کی کوشش کرنے لگیں۔ ساتھ ساتھ اسے پکارتی بھی جا

”یا۔

”یہ میری بچی۔ ہوش میں آؤ۔“

”پا ہیں اماں۔“ میں اسے سہارا دیتی ہوں۔“ بڑی آپا نے بچہ کٹھنم کی گود میں دے دیا۔ پھر

”ہا کر انہوں نے ربیعہ کو چار پائی سے نیچے کھڑا کیا اور اپنے سہارے باہر تک لے آئیں۔

”ریت۔“ عاصم جو گاڑی لا کر آئے تھے۔ ان سب کو دیکھ کر قدرے پریشانی سے

”بیو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے۔ آپ پلیز جلدی سے

گاڑی کھولیں۔ بڑی آیا نے کہا تو عاصم بھائی نے فوراً لاک کھول کر ان کے لیے دروازہ کھول دیا۔ ربیعہ کو لے کر بیٹھ گئے اور اماں جلدی جلدی کلثوم کو کچھ ہدایات دے کر ان کے پاس آجی میں جب کہ بڑی آیا چکر کاٹ کر اگلی سٹپ پر جا بیٹھیں۔

”کہاں چلیں؟“ عاصم اسٹیشن تک سنبھالتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”بیٹا۔ میں تو یہاں کے تمام کلینک دیکھ کے آیا ہوں، سب بند ہیں۔“ اماں نے بتایا۔

”میرا خیال ہے عاصم ڈاکٹر شہر یار کے کلینک چلتے ہیں۔ وہاں کوئی نہ کوئی مل جائے گا۔“ عاصم بھائی نے سر ہلاتے ہوئے گاڑی اٹھارت کر دی۔

”اماں۔ یہ ربیعہ کب سے آپ کے پاس ہے؟ اور اس کی یہ حالت۔“ بڑی آیا گرون ہوا کر پیچھے دیکھتی ہوئی پوچھنے لگیں۔

”کوئی ہفتہ بھر سے میرے پاس ہے اور رات تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔“ اماں نے صفا بات بنائی۔

”پھر یہ اچانک کیا ہو گیا ہے؟“ بڑی آیا کو تشویش ہوئی۔

”چنانچہ میں پھر اماں معص بڑی آپا کے سوالوں سے بچنے کی خاطر ان کی طرف سے رخ موڑ کر کو آوازیں دینے لگیں۔

”اماں۔“ ان کی اتنی آوازوں کے جواب میں اس نے صرف ایک بار انھیں نگار پھر بالکل خام ہو گئی تھی۔

ڈاکٹر شہر یار اس وقت خود کسی سیریس کیس کے سلسلے میں موجود تھے اور وہ کیونکہ عاصم کے دوستوں میں سے تھے، اس لیے فوراً ان کی طوط جتوجہ ہوئے تھے۔

”یہ میری سسٹر ہے شہر یار۔“ وہ جب ربیعہ کا چیک اپ کر رہے تھے، تو عاصم بھائی آ کر ربیعہ کے بارے میں بتانے لگے۔

”کوئی شاک لگا ہے انہیں۔“ ڈاکٹر شہر یار سیدھے کھڑے ہوئے تو سرسری انداز میں بولا۔

پھر سسٹر کو اسے انکشاف لگانے کے لیے کہا۔ اور خود کاغذ پر میڈیٹن لکھنے لگے۔

”کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے۔“ بڑی آیا پوچھنے لگیں۔

”نہیں۔“ انہوں نے تسلی دی پھر میڈیٹن والی پریچری عاصم بھائی کو دیتے ہوئے انہیں میڈیٹن لانے کے لیے کہا اور جانے لگے تو عاصم بھائی بھی ان کے ساتھ باہر نکل گئے۔

”کیا خیال ہے اماں۔ میں یہاں سے شہر و کو فون نہ کر دوں؟“ بڑی آیا لاعلمی کی بنا پر پوچھنے لگیں۔

”کیوں؟“ اسے فون کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“ اماں تلخی سے بولیں۔

”اماں انہیں معلوم تو ہو کہ ان کی بیوی ہسپتال میں ہے۔“ اماں کوئی سخت بات کہنا چاہتا تھا کہ اماں نے روک دیا اور خود ہی آواز دیا کہ کہنے لگے۔

”بیٹا۔ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“ بڑی آیا کچھ نہ سمجھتے ہوئے کبھی اماں اور کبھی اماں کی طرف دیکھنے لگیں۔

”شہر و نے اسے طلاق دے دی ہے۔“

اماں نے گویا دھماکا کر دیا تھا کہ کتنی دیر تک بڑی آیا بے حس و حرکت کھڑی پڑی تھی انکھوتا

اماں کو دیکھتی رہی تھیں۔

کافی دیر بعد جب بڑی آیا اپنے آپ کو سنبھال کر کچھ سمجھنے کے قابل ہوئیں تو انہوں نے دیکھا،

بہرین، پھر اماں پرچم گئیں۔ اماں اچانک بہر آنے والے آنسوؤں کو دوپٹے میں جذب کر رہی تھیں۔

”بڑی آیا کو ایک بار پھر دھچکا سا لگا۔“ انہوں نے تو ہمیشہ اماں کو حالات سے مراد وار مقابلہ کرتے دیکھا

چراغ کیون نہ سنا تھا، کیسے حالات تھے جنہوں نے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔؟

اماں۔ بڑی آیا میڈک کے گرد چکر کاٹ کر ان کے پاس آکھڑی ہوئیں اور ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر

”یہ سب کیسے ہوا اماں؟“ کیوں ہوا؟ کیا قصور تھا ربیعہ کا؟“

”یہ کیا بتاؤں بیٹا؟“ اماں گلو گیسر لہجے میں بولیں۔ یہ تو کہتی ہے، کوئی جھگڑا انہیں ہوا تھا۔ بس معمولی

ت پر۔ تم ہی بتاؤ، کیا معمولی سی بات پر اتنی بڑی باتیں ہوتی ہیں۔؟“

بڑی پانی میں سر ہلاتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

ب ہوا یہ سب؟“

”ا۔ کل دن میں آئی ہے۔“ پھر تفصیل بتاتے ہوئے کہنے لگیں۔“ اور اس سے پہلے یہ ایک ہفتہ

ہیں رہ کر گئی ہے۔ پیرس شام میں شہر و زخو آسے لیے آئے تھے۔ اس وقت بھی ایسی کوئی بات

وہ تھی جس سے میں سمجھتی کہ دونوں میں کچھ رنجش ہے۔ بہت خوشی سے اسے لے کر گئے تھے۔

اگر بچے پھر میرے کمرے میں موجود تھی۔ اکیلی تین کپڑوں میں۔“

اپنے کسی سے تصدیق بھی کی یا جو اس نے کہا یقین کر لیا۔؟“ بڑی آیا پر سوچ انداز میں پوچھنے

ہیں کہ ہی اس کے سسرال جانا چاہتی تھی تاکہ ان سے اس کا قصور پوچھ سکوں لیکن اس نے منع

مندی بھی نہیں رکھی؟“

”ہاں۔ اور اب تو مجھے اس کی طرف سے بھی دھڑکا لگا ہوا ہے۔“

نہ اس کی طرف سے تو آپ فکر مند نہ ہوں؟“ بڑی آیا اندر ہی اندر خود پریشان ہونے کے باوجود اماں

دے لگیں۔

لیے فکر مند ہوں؟“ جب اس کے ساتھ وہ لوگ ایسا سلوک کر سکتے ہیں تو پھر صوفیہ تو الگ نراج

۔ ذرا سی بات پر ہنسنے سے اکھڑ جاتی ہے۔ اور وہ لوگ کہاں برداشت کریں گے؟“

نہ۔ اب ایسا اندھی بھی نہیں ہے۔ آپ دل پر زیادہ بوجھ نہ ڈالیں۔ اور ہاں ابھی عاصم کے

ربیعہ سے متعلق کوئی بات مت کیجیے گا؟“

نہ۔ ابھی کروں تو کب تک چپچی رہے گی؟“ ایسی باتیں کہاں چھپی رہتی ہیں بھلا۔“ اماں پھر

نہ۔ آپ روئیں تو نہیں۔“

پھر کیا کروں؟“ اماں بے بسی سے بولیں۔

عاصم سے کام لیں۔ اماں اور عاصم کو جانے دیں، پھر میں یہیں سے صوفیہ کو فون کر کے

بات معلوم کر لوں گی۔“ پھر محض اماں کو تسلی دینے کی غرض سے کہنے لگیں۔

وہ کہتا ہے ربیعہ کے سنسنے میں غلطی ہوئی ہو۔ اور ایسی کوئی بات نہ ہو؟“

نہ کرے۔ ایسا ہی ہو۔“ اماں کو اندھیروں میں ہلکی سی کرن نظر آئی تو وہ آنسو پونچھ کر بڑی آیا

کے روتی میں سے سرے سے سوچنے لگیں۔



دی آیا۔ میں کیا بتاؤں آپ کو؟ وہ رونے لگی، سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ ہم سب دیکھتے رہے اور جہاں تک خطا کی بات ہے تو میں تو خود اس وقت سے سوچ رہی ہوں کہ اس سے کیا خطا ہوئی۔ شہر و زے نہیں پوچھا تم نے؟

پوچھا تھا۔ لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کہنے لگے، ابھی وہ اس سلسلے میں کوئی بات رکھتے۔ "قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔ مجھے تو لگتا ہے بڑی آپا، وہ خود بھی پھٹتا ہیں۔"

بونہ پچھتا رہے ہیں۔ "بڑی آبادانت پیس کر بولیں۔ مض دھوکا اور دکھاوا۔ مجھے تو حیرت ہے۔ دیکھنے میں تو ایسے نہیں لگتے۔ اچھے خاصے میچور لگتے ہیں۔"

خیر چھوڑیں۔ مجھے ربیعہ کے بارے میں بتائیں کیا ہوا ہے اسے؟ میرا مطلب ہے اس کی تشویش کیا تو نہیں ہے؟ "صوفیہ نے دانستہ اس پہلو سے گریز چاہا۔

اپنے ہوش ہے ابھی تک؟

فی الحال تو کمزوری بتاتی ہے۔ میرا خیال ہے اس کے ہوش میں آنے کے بعد ہی کچھ بتا سکیں گے۔ اماں اور آبا میاں تو بہت پریشان ہوں گے۔

ظاہر ہے تم خود سوچ سکتی ہو۔ بڑی آپا نے کہا۔

بڑی آپا، اب اس کا کیا ہوگا؟ چھوٹی آپا آنے والے حالات سے خوفزدہ تھیں۔

یہ تو بدمذہب بات ہے، اس وقت تو دعا کرو۔ وہ جلدی سے اچھی ہو جائے۔ بالکل زرد ہو رہی۔ اچھا میں پھر بات کروں گی۔

بڑی آپا نے سلسلہ منقطع کر دیا تو وہ کچھ دیر تک خالی خالی نظروں سے ریسو کو دیکھتی رہی، پھر کڑیل کر جیسے ہی پلٹی ٹھٹھک گئی۔

ابھی کچھ دیر پہلے جہاں وہ بیٹھی تھی، اب وہاں شہر وز احمد بیٹھے تھے۔ پہلے اس نے سوچا چپ چاپ کمرے میں چلی جائے۔ لیکن پھر اپنی سوچ کی نفی کرتی ہوئی ان کے سامنے جا بیٹھی۔

اس کا فون تھا؟ "صوفیہ کی پشت سے سر ہٹا کر نظر میں اس پر جاتے ہوئے وہ پوچھنے لگی۔

بڑی آپا کا۔ "وہ براہ راست ان کی آنکھوں میں دیکھ کر بات کرتا جانتی تھی، لیکن اس پوری دنیا میں ابھی تو تھے، جن کے انداز اور لہجے میں اس نے ہمیشہ بڑے بھائی کی شفقت اور رعب پایا تھا۔

ناکے سامنے ہمیشہ ہی وہ بے بس ہو جاتا کرتی تھی۔ اب بھی چاہنے کے باوجود ان کی آنکھوں میں نہ ملے۔ سر ہٹا کر ناخنوں سے کھیلتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

کیا کہہ رہی تھیں؟

کوئی خاص بات نہیں۔

اچھا۔ "وہ افسروگی سے مسکرائے۔ حیرت ہے کہ آپ کے لیے یہ بہت عام سی بات ہے کہ آپ اس وقت ہسپتال میں جانے کس حال میں ہیں؟

شہر وز بھال۔ "وہ ایک دم سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ آپ کیسے جانتے ہیں؟

بات یہ ہے صوفیہ بی بی کہ میں آپ کی چیخ نما آواز سن کر اپنے کمرے سے نکلا تھا اور اس وقت یہیں موجود ہوں۔

جب آپ نے ساری باتیں سن لی ہیں تو۔

صرت آپ کی۔ "وہ اس کی بات کا ٹکڑا کر بولے۔ دوسری طرف کون کیا کہہ رہا تھا

آپ کے لیے جاننا ضروری بھی نہیں ہے۔ "وہ تمنی سے بولی۔

وہ تو اکثر ہی اماں کے گھر چلی جایا کرتی تھی۔ ہفتہ دس دن وہیں رہتی، پھر آجاتی۔ اور اب کے گھر گئی تھی۔ اگر یہ یقین ہوتا کہ ہمیشہ کی طرح ہفتہ دس دن کے بعد آجائے گی تو گھر کا نظام اور چلتا رہتا۔ لیکن المیہ تو یہ تھا کہ یقین تو دور کی بات بلکہ سا آسرا بھی نہیں تھا۔ جب ہی تو گھر کے ٹک نے جیسے مائی لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ اتنی اپنے کمرے سے نکلی ہی نہیں تھیں۔ اسی طرح شہر وز کمرے میں بند تھے۔ مہروز البتہ آفس جا چکا تھا۔ اور اب صوفیہ اکیلی تھی۔ درود یار سے چپکٹی رڈ درمیان، ادھر سے ادھر مچراتی ہوئی۔

گھو کہ مہروز جلتے ہوئے اسے خاصا حوصلہ دے گیا تھا اور کچھ نئے راستوں کی نشاندہی بھی جس پر چل کر ربیعہ دوبارہ بہانے آسکتی تھی۔ اور مہروز کے سلسلے تو وہ خاصی بہل بھی گئی تھی، لیکن ہر میں سوچنے بیٹھی تو اسے ہر بات ناگہن نظر آئی۔ ربیعہ سے اگر اس کا ناتا صرف اس گھر کے خوراک ہوتا تو شاید وہ صرف انسانیت کے نالے اس کا دکھ محسوس کرتی اور ہو سکتا ہے، کچھ دن کے بھی جاتی لیکن اس سے ناتا ازل سے تھا۔ ایسا رشتہ جسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں توڑ سکتی تھی۔ لوگ لاکھ اس سے ناتا توڑیں، وہ اس سے جڑی ہوئی تھی۔

ربیعہ اس سے بہت چھوٹی نہیں تھی۔ صرف سال ڈیڑھ سال کا فرق تھا۔ پھر بھی اسے کبھی تھی اور چھوٹی کے ساتھ آپا کے اٹلنے نے ہی اسے معتبر کیا تھا۔ کہ ہمیشہ ہر مقام پر وہ ہوا کا خیال رکھتی تھی جیسے وہ اس کے سلسلے کوئی نفی مٹی سی بچی ہوا اور پھر وہ سب بہنوں میں تقو انتہائی ڈر پوک اور بزدلی سی کبھی اپنے جائز حق کے لیے بھی زبان نہ کھولی تھی۔ یہ بھی صوفیہ کو عزیز رہی۔ اسے یاد آئے بچپن کے وہ دن جو ان دونوں نے ساتھ گزارے تھے۔

"کس قدر معصوم ہوا کرتی تھی وہ؟" اس نے سوچتے ہوئے صوفیہ کے پشت سے سرٹا آنکھیں بند کی ہی تھیں کہ پیٹے سارے موسم نگاہوں میں آسائے۔

بچپن اور سنی کے گھر وندے۔

رڈ کپن اور گڑیا کی شادی۔

جوانی۔ اور۔ اور۔ ایک نام ذہن میں آیا ہی تھا کہ فون کی بیل نے سوچوں کو منتشر کر دیا۔ چونک کر آنکھیں کھولیں اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ شاید کوئی آکر فون اٹینڈ کر لے لیکن کوئی نہیں

ناچار خود ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ریسپورکان سے لگایا تو بڑی آپا کی آواز سنائی دی۔

"بڑی آپا۔ یہ آپ ہیں؟۔ سب ٹھیک تو ہے نا؟ وہ انجانے اندیشوں میں گھر کر پوچھ "کیا ٹھیک ہے؟۔ بڑی آپا ان اس سے پوچھنے لگیں۔

"آپ کہاں سے بول رہی ہیں؟ اس نے سوچا ہو سکتا ہے۔ بڑی آپا اس سارے قفسے ہوں اور یہ ہی فون کیا ہو، اس لیے پوچھنے لگی۔

"ہاسپتال سے۔"

پتا نہیں بڑی آپا کا جواب۔ متوقع تھا یا غیر متوقع۔ وہ پریشان ہوئی۔

"خیریت؟ کون ہے ہاسپتال میں؟"

"ربیعہ۔"

"ربیعہ۔؟" اس نے دہرایا۔ پھر چیخ پڑی۔ کیا ہوا اسے؟

تم مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ اسے کیا ہوا ہے؟ بڑی آپا نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

بڑی آپا آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟

مجھے بتاؤ صوفیہ، اس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ کیا خطا ہوئی ہے اس سے جس کی اتنی ڈرے والی شہر وز احمد نے؟

”ٹھیک کہتی ہیں آپ۔ وہ وہ طویل سانس لے کر کھڑے ہو گئے پھر جاتے جاتے کہنے لگے پریشان نہ ہوں، وہ جلد ٹھیک ہو جائے گی۔“  
اور وہ پریشان کیے نہ ہوتی۔ اب تو اسے کسی بلی قرار نہیں تھا۔ دل چاہ رہا تھا، ابھی اسی وقت کے پاس چلی جائے لیکن مصلحت کا تقاضا اس کے برعکس تھا کہ اب وہ صرف ربیعہ کی بہن بن کر نہیں رہ سکتی تھی۔ اس گھر کی بہو ہونے کے ناستے کچھ حد بدیاں اس پر لاگو تھیں، جس کی پاسداری اس کا فرض تھا اور فرض سے غفلت کا انجام وہ دیکھ ہی چکی تھی۔ فی الحال تو وہ یہی جانتی تھی کہ شہر و زعماء ان کے بات سے غفلت کی پنا پر یہ سزا ربیعہ کا مقدر ٹھہری ہے۔

تین دن بعد جب وہ ہسپتال سے گھر آئی تو زندہ لاش کی مانند ہو چکی تھی۔ زرد رنگت کے ساتھ کچھ کے گرد گہرے سیاہ حلقے اور پیڑی زدہ ہونٹ ایک دوسرے سے یوں لگے ملے کہ خدا ہونا بھول کر پستانہیں ذہن بیدار تھا یا نہیں۔ شاید نہیں تھا جی تو چپ چاپ ایک ایک کو دیکھتی رہتی، اماں بارے کر تیں تب۔ کلثوم اور ہما کچھ کہتی تب۔ اور ابامیاں بولتے تب بھی بس چپ چاپ سنتی رہتی۔ اگر کسی وقت زیادہ دیر تک پلکیں نہ بھیجی کاتی تو اماں دہل کر اسے جھنجھوڑ ڈالتیں۔  
”ربیعہ۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کیوں اس طرح بیٹھی ہو؟“ وہ حیران ہوتی اور کچھ کہے بغیر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیتی۔

کوئی بیٹھے پھر بعد صوفیہ آئی تو اماں نے اسے گھیر لیا۔ سوال پر سوال اور ان کے سارے سوالا کے جواب میں اس نے آنکھوں دیکھا احوال کہہ کر سنایا۔ آخر میں کہنے لگی۔  
”اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتی اماں۔ شہر و بھائی کچھ بتاتے ہی نہیں۔ ہاں اگر ربیعہ نے کچھ کو بتایا ہو تو۔“

”وہ کچھ بتانے کے قابل ہوتا تب ناں۔ ایک دم دم صدم ہو کر رہ گئی ہے۔ ڈاکٹر نے بھی ابھی ننگا کیا کہ اسے کسی بات پر مہمور کر دیں۔“  
”ہے کہاں وہ؟“ صوفیہ ادھر ادھر دیکھتی ہوئی پوچھنے لگی۔

”اندر چھوٹے کمرے میں ہے۔“  
”میں بل لوں اس سے۔“ صوفیہ اٹھ کھڑی ہوئی۔  
”کوئی ایسی ویسی بات مت کرنا اس سے۔“ اماں نے کہا تو وہ سر ہلائی ہوئی اندر چلی گئی۔  
”ربیعہ۔“ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے پکارا۔ اور اس کے قریب جا کر بیٹھی تو دکھ کی شدید لہر اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی۔

یہ وہ ربیعہ تو نہیں تھی۔ ان چند دنوں میں کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پانی جمع ہونے لگا تھا۔ اپنے آپ پر قابو پا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتی ہوئی بولی۔  
”کیسی ہو ربیعہ؟“

”یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے۔؟“ صوفیہ نے اس کے منگے کپڑوں اور اچھے بالوں کی طرف اشارہ کیا۔  
”چلو اٹھ کر نہالو۔ میں تمہارے لیے کپڑے نکالتی ہوں۔“

”نہیں۔“ اس کے ہونٹوں سے کسی کی صورت نہیں نکلا۔  
”کیا نہیں۔؟“ اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے صوفیہ نے پیار سے پوچھا تو وہ پھر ہونٹ چما کر رہ گئی۔ کچھ دیر تک تو صوفیہ اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی۔ پھر جب اسے بولنے پر آمادہ نہیں دیکھا تو کہنے لگی۔

”میں جانتی ہوں ربیعہ۔ تم اس وقت شدید شاک میں ہو۔ وہ بات جس کا کبھی گمان بھی نہ ہوا اچانک

لے تو کرب سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ تم پر حرقیامت تو ٹوٹی ہے اور جس کرب سے تم گزر رہی ہو، اس کے کو احساس ہے۔“  
اس نے آنکھوں میں پہلے ڈھیر سا راپانی جمع ہوا، پھر چلا اور پھر ہلکوں کی منڈیروں سے چھٹک کر رخساروں نے لگتا۔ صوفیہ نے اسے رونے سے منع نہیں کیا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔  
”یہ تو تمہارا نہیں، ہم سب کا دکھ ہے۔ تم اپنے آپ کو تنہا مت سمجھو۔ ایسا کرو گی تو یہ دکھ ناسور بن جائے گا۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ دکھ کا یہ سمندر تنہا پار کرو گی؟۔ نہیں میری جان، تم بہت کمزور ہو گئے ہاتھ پاؤں کی، بالآخر تھک جاؤ گی۔ اور تھکنے کی صورت میں جانتی ہو کیا ہو گا؟“

”جانتی ہوں۔“ آنسوؤں کی آمیزش آواز میں بھی تھی۔  
”کیا ہو گا؟“  
”دکھوں کا دکھنا الاؤ مجھے جلا کر راکھ کر دے گا۔“  
”نہیں میری بہن۔“ صوفیہ نے اس کا ہاتھ اپنی گود میں رکھ لیا۔ ”اس طرح ہمت نہ ہارو۔ زندگی ہمیں پر ہیں ہو جاتی۔ اور بہت سے رستے ہیں۔ کچھ دیر کو اپنی ذات سے ہٹ کر سوچو۔ اماں، آبا اور بہن ہر قدر پریشان ہیں تمہارے لیے۔“

”دکھ تو اسی بات کا ہے چھوٹی آپا کہ میں نے تو کبھی کسی کو پریشان نہیں کیا۔ کسی کو دکھ دینے کے بارے سوچا نہیں اب میری ہی ذات سب کے لیے پریشانی کا باعث بن گئی ہے۔“  
”تمہاری ذات نہیں، تمہاری حالت۔“ صوفیہ نے فوراً ٹوکا۔ ”اپنے آپ کو سنبھالو، زندگی کی طرف آؤ۔ ہاں بہت سارے امتحان ہمارے منتظر رہتے ہیں۔ اور عقلمندی اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دینے نہیں ہے بلکہ ان کا سامنا کرنے اور مقابلہ کرنے میں ہے۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

”تم اگر اسی طرح اس واقعے کو مسلسل اپنے آپ پر جاری کر کے بیٹھی رہو گی تو کبھی بھی نارمل نہیں ہو سکو۔ میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ بقول جاؤ سب کچھ۔ کیونکہ فوری طور پر یہ ممکن نہیں ہے۔ ہاں، یہ ضرور کہوں کہ بھلانے کی کوشش کرو۔ اور اس کوشش میں کامیابی اسی صورت ممکن ہے کہ تم اپنے ذہن کو دوسرے دن میں مصروف رکھو۔“ صوفیہ نے اسے رمان سے سمجھایا۔

”میں کیا کروں چھوٹی آپا؟“ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔“ وہ بہت بے بس نظر آ رہی تھی۔  
”ذہنی کام تو کبھی تم تم مل کر کیا کرتے تھے بلکہ اکثر تم میرے حصے کا کام بھی کر لیا کرتی تھیں؟ صوفیہ گئے۔  
”کیا یاد کر کے مسکرائی۔ پھر اس کے بالوں میں انگلیاں پھنساتے ہوئے کہنے لگی۔

”اس کمرے سے باہر نکل کر نہ کہ بہت کچھ نظر آئے گا۔ گھر کے کام کم تو نہیں ہوتے۔ کلثوم اور کالج چل جاتی ہیں تو اماں بے چاری۔“

”مجھے احساس ہے۔“ وہ فوراً بولی۔ ”لیکن میں کیا کروں چھوٹی آپا کہ میں اپنے اندر بالکل ہمت نہیں لے کر اسی گھر کی ہوتی ہوں تو آنکھوں سلنے اندھیرا اچھانے لگتا ہے۔ ہاتھ پاؤں انگ سٹن ہو جاتے ہیں۔“  
”کمزوری کی وجہ سے۔ تم دوا پا بندی سے استعمال کرو۔ اور ہاں، اماں بتا رہی تھیں تم ڈھنگ سے نالائق بن چکی ہو۔ اس طرح تو اور کمزور ہو جاؤ گی۔“ صوفیہ نے اسے پیار سے سمجھایا۔

”کیا کروں، کچھ کیا جا ہی نہیں جاتا۔ وہ بے بسی سے بولی۔  
”بے دسترخوان پر سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کی عادت ہو، وہ اکیلا کچھ نہیں کھا سکتا۔ چلو اٹھ کر نہاؤ دھو لو۔ پھر سب ساتھ مل کر کھانا کھائیں گے۔“

”مجھے سب کا سامنا کرتے ہوئے بہت عجیب سا لگتا ہے چھوٹی آپا، اندر یہ اندر یہ احساس چوکے کے ہے کہ میں اس گھر کی پریشانیوں میں اضافہ کرنے والی آئی ہوں۔ اماں کی آپاں، کلثوم اور ہما کچھ بڑا کریک دم خاموش ہو جانا اور اباجان کی تھکی کر۔“



ایسا سب تمہاری حالت کے پیش نظر ہے۔ وہ سب سمجھتے ہیں کہ شاید تمہیں ان کا ہنسنا اور انہیں لگے گا۔ اس لیے تمہیں دیکھ کر سب خاموش ہو جاتے ہیں۔ اگر تم ان سب کے ساتھ شریک بنو گے تو ان میں اٹھو بیٹھو، تب تمہیں احساس ہوگا کہ اس پوری دنیا میں تمہارے لیے سب سے بڑھ کر ہمدردی غم خوار اسی گھر کے لوگ ہیں۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگی۔

”ماں باپ کا دل اور دامن بہت وسیع ہوتا ہے ربیعہ، شاید اس پوری کائنات سے زیادہ وسیع کبھی اولاد کی خوشیاں مانگنے کے لیے پھیلتا ہے اور کبھی ان کے دکھ سمیٹنے کے لیے۔ تم ان کے لیے یا بامیاں سے کہہ دیکھو۔ اپنے دل کی ساری باتیں پھر دیکھنا وہ تمہارے دکھ کیسے سمیٹتے ہیں۔ تم انہیں ہور ربیعہ، اگر خطا وار ہوتی تب بھی اتنا ابا نے ہی تمہیں گلے لگنا تھا۔ وہ خاموش رہی تو صرف اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھا دیا۔

”چلو کھانا پک چکا ہوگا۔ تم جب تک منہ ہاتھ دھولو، میں دسترخوان لگاتی ہوں۔“

پھر اسے شش و پنج میں مبتلا دیکھ کر صوفیہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ ہی کمرے سے باہر لے آئی۔

ثنا تب حسن اپنے منصوبے کی کامیابی پر بے حد خوش تھا۔ دو سال پہلے اس نے ربیعہ کو اپنے جو منصوبہ بنایا تھا۔ اس وقت اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ سب کچھ اتنی آسانی اور بغیر کسی پریشانی سامنا کیے، ہو جائے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شہر و زاحمد کی شرافت سے فائدہ اٹھاتے وقت بھی خاصا غیر یقین تھا۔ ایک طرح سے اس نے رسک ہی لیا تھا۔

کامیابی یا ناکامی؟ اس نے سوچا تھا۔

کامیابی کی صورت میں واہ واہ۔

اور۔

ناکامی کی صورت میں ربیعہ کو حاصل کرنے کے لیے گزشتہ دو سالوں کے دوران اور بہت سے طر سوچ چکا تھا۔ لیکن شاید اس کی قسمت اچھی تھی کہ اسے ان طریقوں پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں پڑی یہاں اسے اپنی کامیابی پر خوشی کے ساتھ ساتھ شہر و زاحمد پر حیرت بھی ہو رہی تھی کہ انہوں نے بغیر کسی تر صرف اس کے کہنے پر ربیعہ کو چھوڑ بھی دیا۔

”دو سال کم نہیں ہوتے۔“ وہ سوچنے لگا۔ اور حیرت ہے کہ اتنا عرصہ ایک ہی گھر میں رہتے ہو شہر و زاحمد، ربیعہ کو نظر انداز کرتے رہے جب کہ۔“

”بھائی۔“ انیلا نے اس کے کمرے میں جھانک کر پکارا تو اس کی سوچیں منتشر ہو گئیں۔ ناگوار اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

”کیا ہے؟“

”کھانا لگ چکا ہے۔ آجائے۔“

”اچھا۔“ وہ طویل سانس لے کر اٹھا۔ اور انیلا کے ساتھ ہی ڈائننگ روم میں آگیا۔ ایک نظر اٹھائیں ٹیبل پر ڈالی، پھر ابا کی کرسی خالی دیکھ کر پوچھنے لگا۔

”ابا کھانا نہیں کھاؤں گے کیا؟“

”نہیں۔ کہہ رہے ہیں تھوک نہیں ہے۔“ اتنا نے سالن کا ڈونگا اس کے سامنے رکھتے ہو ”خیریت؟“ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں ان کی۔“ اس کے لہجے میں تشویش در آئی۔

”ہاں، ٹھیک ہیں۔ اب تم تو شروع کرو یا یونہی سوال جواب کیے جاؤ گے؟“

”گتا ہے، آپ کو بھوک زیادہ لگی ہے۔“ وہ ہنس کر بولا۔ پھر اپنی پلیٹ میں سالن کا لٹکا لٹکا

”اتناں کو بھوک زیادہ نہیں لگی بلکہ انہیں غصہ آ رہا ہے۔“ انیلا نے کچھ ڈرتے ڈرتے اتناں کی طرف بڑھتے ہوئے اسے مخاطب کر کے کہا۔

”بس بات پر؟ کیا ابا سے لڑائی ہو گئی ہے؟“ وہ پوچھنے لگا۔

”لڑائی تو نہیں، شام میں خوب گرم گرم بحث ہوئی ہے۔“

”انیلا۔“ اتناں نے ٹوکنے کے ساتھ اسے گھور کر بھی دیکھا تو وہ مدد کے لیے اس کی طرف دیکھنے

”اسے مت ٹوکے اتناں۔ چلیے آپ ہی بتائیے کیا بات ہے؟“ واقعی ابا غصے کی وجہ سے کھانا بن کھا رہے ہیں۔ وہ کھانا چھوڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

”مجھے نہیں پتا۔“

”اتناں کچھ بتانے پر آمادہ نظر نہیں آئیں تو وہ پھر انیلا کی طرف دیکھنے لگا۔

”چلو انیلا۔ تم بتاؤ، کیا بات ہوئی؟“

”بات تو بڑے خوشگوار انداز میں شروع ہوئی تھی بھائی۔“ وہ اتناں کے گھورنے کے باوجود مزے لے لے رہا تھا۔ یعنی آپ کی شادی کی بات ہو رہی تھی اور جب ابا نے اپنی بھتیجی کا نام لیا تو اتناں کو اپنی بانی یاد آگئی۔ بس دونوں میں بحث شروع ہو گئی جو کسی بھی نتیجے پر پہنچنے بغیر یوں ختم ہوئی کہ ابا منہ سر پٹ کر پڑ گئے اور اتناں آپ کے سامنے موجود ہیں۔“

”ہوں۔“ اس نے کھانے سے ہاتھ کھینچ کر پانی کا گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں پینے کے برقی گلاس کو قدرے زوردار آواز کے ساتھ ٹیبل پر رکھتا ہوا، اتناں کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

”بھئی کی بھانجی، نہ کسی کی بھتیجی، شادی میں اپنی پسند سے کروں گا۔“

”کیا ہے تمہاری پسند؟“ میرا مطلب ہے کون ہے؟“ اتناں فوراً پوچھنے لگیں۔

”یہ بعد کی بات ہے۔ پہلے انیلا سے فارغ ہوں۔“ اس نے فی الحال ٹالنے کی غرض سے،

”انیلا کی آڈلی۔“

”ہم انیلا اور تمہاری شادی ایک ساتھ کرنا چاہتے ہیں تاکہ گھر ایک دم خالی نہ ہو جائے۔“ اتناں نے اپنی رائے

”نیطرت انداز میں سنائی۔

”ٹھیک ہے اگر آپ ایسا چاہتے ہیں تو ایسا ہی ہو جائے گا۔ پھر بھی انیلا کی کہیں بات تو طے ہونی

”ہیں۔“

”انیلا کی بات طے سمجھو۔“

”کہاں؟“ اس کی لاعلمی بجا تھی۔ کہ وہ دو سالوں میں گھر سے باہر صرف ذاتی غرض کے لیے ہی پریشان رہا تھا۔

”منصور کے ساتھ۔ اس کے گھر والے اصرار بھی بہت کر رہے ہیں۔ اور میرا خیال ہے، وہ اچھا لڑکا

”ہے۔“

”ہاں۔“ وہ پھر سوچ انداز میں سر ہلانے لگا۔ ”بے تو واقعی اچھا لڑکا، لیکن آپ نے پہلے مجھ سے ذکر

”ہی کیا کیجی؟“

”کو، کہاں رہتے ہو تم؟“ کتنی بار تو تمہیں بتایا ہے۔ پتا نہیں کن کاموں میں کبھی رہتے ہو کہ ڈھنگ

”سے بات بھی نہیں سنتے۔“

”آپ کو پتا تو ہے۔ اپنا بزنس سیٹ کرنے میں لگا ہوا ہوں۔ اس طرف سے مطمئن ہوں گا، تب

”کی اور طرف دھیان دے سکوں گا۔“

”تو ہے۔“ اتناں نے فوراً اپنا چہرہ تبدیل کر لیا۔ پھر اسی طرح نرمی سے کہنے لگیں۔ ”بہر حال اب

یاد رکھنا، ہم منصور کے گھروالوں کو ہاں کہہ رہے ہیں۔ اور میں چاہتی ہوں تمہاری بھی کہیں بات طے پا جائے تو۔“  
 ”آخر تان وہیں آکر ٹوٹی یعنی بھانجی یا بھتیجی۔؟“ چھوٹے بھائی عاقبت نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے شرارت سے کہا۔ تو وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔  
 ”ان دونوں میں سے کوئی نہیں۔“

”بھائی۔ تو پھر جلدی سے اپنی پسند بتائیے۔“ انیلا اُس کی پسند جاننے کو بے چین تھی۔ اور وہ ابھی اس موضوع کو چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اور نہ ہی ربیعہ کا نام لینا چاہتا تھا۔ لیکن پھر اُس نے جوابات کل کرنی ہے، وہ آج ہی کیوں نہ کرے؟۔ سب اصرار بھی کر رہے ہیں۔  
 ”تم جانتی ہو اُسے۔ بلکہ اُمّان بھی جانتی ہیں۔“ وہ اسی طرح سنجیدگی سے بولا۔  
 ”کون؟“ انیلا ذہن پر زور دینے لگی۔

”ربیعہ۔“ وہ اطمینان سے کہہ کر لاہر وادانظر آنے کی بھرپور کوشش کرنے لگا۔  
 ”ربیعہ؟“ انیلا نے دہرایا۔ پھر اُس کی دماغی حالت پر شبہ کرتی ہوئی کہنے لگی۔ ”لیکن بھائی، اُس تو شادی ہو چکی ہے۔ اور یہ بات آپ بھی جانتے ہیں؟“  
 ”کون؟“ وہ لڑکی جس کے ہاں ہم ثابت کے باہر جانے سے پہلے گئے تھے؟“ اُمّان یاد رکھتا ہوئی پوچھنے لگیں۔

”ہاں وہی ربیعہ۔“ اُس کا اطمینان ابھی تک برقرار تھا۔ ”میں جانتا ہوں کہ اُس کی شادی ہو گئی ہے لیکن آپ لوگ نہیں جانتے کہ اُسے طلاق ہو چکی ہے۔“  
 ”کب؟“ انیلا کی چیز نما آواز میں تاسف تھا۔ جب کہ اُمّان ناگواری سے کہنے لگیں۔  
 ”تو تم اُس طلاق سے شادی کرو گے؟“

”جی۔“  
 ”ہرگز نہیں۔ میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گی۔ ایک بار جس کے گھر سے خالی ہاتھ لو۔ دوبارہ وہاں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“  
 ”لیکن اُمّان۔ اب آپ وہاں سے خالی ہاتھ نہیں لوٹیں گی۔“  
 ”میں جانتی ہوں۔ اب میرا بیٹا بڑا آدمی جو بن گیا ہے، اب کوئی خالی ہاتھ کیوں لوٹائے گا۔ کیا سن لو کہ میں وہاں ہرگز نہیں جاؤں گی۔“  
 ”تھیک ہے۔ مت جائیے گا۔ لیکن پھر آپ کو کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“  
 ”میں ربیعہ سے شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ اور وہ نہیں تو پھر کوئی بھی نہیں۔“ وہ فیصلہ کن انداز کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر کرسی کو پاؤں کی زوردار ٹھوک سے دھکیل کر ڈائمنگ روم سے نکل آیا۔  
 ”انیلا کو اُس کے غصے کا اندازہ تھا، اس کے باوجود اس کے پیچھے چلی آئی۔  
 ”تم کیوں آئی ہو؟“ وہ اُسے اپنے پیچھے کرے میں داخل ہوتے دیکھ کر کڑے تیوروں سے پوچھا۔

”یونہی۔“  
 ”یونہی یا ربیعہ کے بارے میں پوچھنے۔؟“  
 ”جب آپ کو پتا ہے کہ اُس کے بارے میں جانے بغیر مجھے چین نہیں آئے گا تو پھر اس طرح کیوں کر رہے ہیں؟“  
 ”کیا جانتا چاہتی ہو؟“  
 ”اُسے نرم پڑتے دیکھ کر انیلا فوراً کرسی پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ پھر پوچھنے لگی۔

”آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ ربیعہ کو طلاق ہو گئی ہے؟“  
 ”میں اسی شہر میں رہتا ہوں۔“  
 ”اسی شہر میں تو ہم بھی رہتے ہیں۔ ہمیں تو نہیں معلوم ہوا۔ بہر حال یہ بتائیے کب اور کیوں؟“  
 ”کب اور کیوں کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ اب تم جاؤ یہاں سے۔“  
 ”اپنے ہی چلی جاؤں؟“ وہ بھی ڈھیٹ بن گئی۔

”پھر مزید کیا معلوم کرنا چاہتی ہو؟“  
 ”مزید یہ معلوم کرنا ہے کہ کیا واقعی آپ اس کے لیے سنجیدہ ہیں۔“  
 ”تمہارا کیا مطلب ہے؟“ میں مذاق کر رہا ہوں؟“

”پھر بھی بھائی۔ اب حالات وہ نہیں ہیں۔ اور پھر میرا خیال ہے اُمّان تو کسی صورت نہیں مانیں گی۔ اُمّان کو ماننا پڑے گا۔ کیونکہ میں اس کے علاوہ اور کسی سے شادی نہیں کروں گا۔ یہ بات تم بھی

”اُمّان کو اچھی طرح سمجھا دینا۔“  
 ”وہ تو میں سمجھا دوں گی۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب کیسے ہوا؟ کیونکہ وہ تو اپنے گھر میں بہت خوش تھی۔“ اُس کے سامنے ربیعہ سے آخری ملاقات کی جیسے فلم چلنے لگی کہ ربیعہ تو اپنے شوہر کے ساتھ بہت خوش و خرم تھی۔ پھر اب!

”نہیں یہ سب سمجھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟“ چلو اب جاؤ یہاں سے، مجھے نیند آ رہی ہے۔“  
 ”وہ کچھ دیر تک اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اسی طرح اُلجھتی ہوئی اس کے کمرے سے نکل گئی۔ اور وہ جب تہا ہوا تو پھر اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ جو کبھی رگ جاں سے قریب بھی اور جس کے حصول کی پہلے خواہش تھی، پھر مقصد اور اب ضد۔

”اُس کے بارے میں سوچتے ہوئے پھر شہر و زاحمد کا خیال آیا تو اُس نے سوچا کہ جب سے انہوں نے اُسے فون پر ربیعہ کو چھوڑ دینے کا بتایا۔ اس کے بعد سے وہ اُن کے پاس گیا ہی نہیں؟“  
 ”کیا سوچتے ہوں گے شہر و زاحمد۔“ وہ سوچنے لگا۔ ”اپنا کام نکل گیا۔ تو پھر شکل ہی نہیں دکھائی۔ کم از کم مجھے خود جا کر ان کا شکریہ تو ادا کرنا ہی چاہیے تھا۔ آخر انہوں نے؟“ وہ پتا نہیں کیوں ہنسا۔ پھر اگلے دن اُن کے پاس جانے کا پروگرام بناتا ہوا سو گیا۔

صوفیہ کے سمجھانے کا اس پر اتنا اثر ضرور ہوا کہ وہ کسی کسی وقت کمرے سے نکلنے لگی تھی شروع میں ایک فرمانہ احساس کے ساتھ جھپک سی تھی۔ انتظار میں رہتی کہ اُمّان ادھر ادھر ہو جائیں تاکہ کمرے سے نکلے ہوئے اُن سے سامنا نہ ہو۔ لیکن ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے ہر بار ایسا ممکن نہیں تھا۔ اپنے طور پر وہ بہت احتیاط کرتی، کمرے سے نکلتی تو کچن میں، کچن سے فارغ ہوتی تو باتھ روم۔ اور اُمّان نادان نہیں تھیں۔ اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے پہلے خود ہی اس کے راستے سے ہٹ جاتیں۔ پھر ہستہ ہستہ اُس کے قریب آئے گئیں۔ زیادہ کوشش ہی تھی کہ وہ اپنے آپ کو اس گھر میں پہلے جیسا محسوس کرنے لگے۔

”ربیعہ۔ یہ چاول چن دو۔“

”بیٹا۔ اگر تمہاری طبیعت اچھی ہو تو روٹی ڈال دو۔“

لازمرہ کے عام سے جملے بولتے بولتے ایک دن اُسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

”بیٹا۔ بیٹیاں پرانی ضرور ہو جاتی ہیں لیکن ان کے دکھ شکہ پرانے نہیں ہوتے۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ مجھ سے نہیں کہو گی، سونگی تو کس سے کہو گی؟۔ اور پھر تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود سمجھتی ہوں۔“ قدرے توقف کے بعد آہ بھر کر بولیں۔

”سنا ہے، اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ پتا نہیں اس میں کیا مصلحت ہے؟۔ بہر حال

یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ اسی طرح جس طرح کلثوم اور تمہا کا ہے۔ تم اپنے آپ کو اجنبی کیوں سمجھ رہے ہو؟ اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا تو کہنے لگیں۔

”میں جانتی ہوں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ اور اگر تم قصور وار ہو، تب بھی اس گھر کے دلائل تم پر بند تو نہیں ہو سکتے تھے۔ بیٹیوں کے لیے کبھی دروازے بند نہیں ہوتے۔“

”میرے ساتھ اچھا نہیں ہوا اماں۔“ اس نے پہلی بار لب کشائی کی ساتھ آسمو بھی بہہ نکل۔ ”کیا اچھا کیا بُرا، یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں اور ہم تقدیر سے نہیں لڑ سکتے۔ تم زیادہ دل برد بوجھ مت ڈالو۔ ہو سکتا ہے، آگے اچھا ہی اچھا ہو۔“ اماں نے اس کے آسمو اپنے روپٹے سے صاف کیے، پھر اس کی پیشانی چوم کر بولیں۔

”تم تو میری بڑی صابر بیٹی ہو۔“

اس نے سینے میں کروٹیں لیتے دروازے پر چہن ہو کر اماں کی گود میں سر رکھ لیا تو ایک دم جیسے پتا ہوں میں آگئی۔

پھر اسی روز خود اپنا محاسبہ کرتے ہوئے اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ وہ اپنے روپٹے سے گم والوں کو مزید پریشان کر رہی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ ان حالات سے جن کا کہ اسے پہلے سے علم تھا سمجھوتا نہیں کر پاری، لیکن اماں اور آتامیاں کی خاطر اسے اپنے آپ کو ضرور سنبھال لینا چاہئے۔ ان خیال کے تحت اپنے آپ کو معمول پر لانے کی کوشش کی تو لگا جیسے اپنی ہستی کے پرچے اڑ جائیں گے بھلا یہ بھی ممکن ہے کہ۔

پیروں تلے پتی ریت ہو اور جسم و جاں جلنے سے محفوظ رہیں۔

دل میں سمندر چلتا ہو اور آنکھوں میں بوند نہ اترے۔

یادوں کے دریچوں پر مسلسل دستک ہوتی رہے۔ اور وہ ہر بار بہری بن جائے۔

کب تک اور کہاں تک وہ سماعتوں پر پیرے بٹھائے اور کون کون سا دریچہ بند کرے۔ ایک دریچہ بند کرتی ہے تو دوسرا کھل جاتا ہے۔

مرگوشیوں کی گھمبیر تباہی اور وہ ہے۔ کس قدر زور آور ہے وہ شخص کہ دور ہو کر بھی کس قدر قریب کہ ہر دم ہر بل ساتھ ساتھ محسوس ہوتا ہے۔ اسی آنگن کے اسی دروازے سے نکلے ہوئے تو اس نے کہا تھا۔

”جب تک کچھ حق رکھتا ہوں، اسے استعمال بھی کروں گا۔“

”شہر و زامند“ گہرے دکھ کے احساس میں گھر کر اس نے سوچا۔ کاش تم سچ پر اپنا حق استعمال کرتے۔ تو کوئی تیسرا شخص ہمارے راستے آگے کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن تمہارے لیے میری ذات میں شاید کوئی کشش نہیں تھی۔ جیسی تو اتنی آسانی سے اپنے حقوق سے دستبردار ہوئے اور میرے حقوق کو بے دردی سے پامال کیا۔“

”زیو۔“

اپنے نام پر سوچوں کے بھنور سے نکلے ہوئے اس نے چونک کر دیکھا اس کے سامنے انیلا اپنی اماں کے ساتھ کھڑی تھی۔ پہلے اسے شبہ ہوا کہ شاید وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ لیکن جب انیلا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کے برابر بیٹھی تو حقیقت کا احساس جاگا۔

”تم؟“ ناگوار کی تین لہر اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی۔ جسے محسوس کیے بغیر انیلا خوشی سے بولی۔

”ہاں۔ میں اور دیکھو اماں بھی آئی ہیں۔“

اس نے سرسری سی نظر اس کی اماں پر ڈالی اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔ بڑے کمرے میں کلثوم نظر آئی تو اس سے کہنے لگی۔

”مندی میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں لیٹنے جا رہی ہوں۔ تم پلیز کسی کو میرے پاس مت آنے دینا۔“

”میں آپ کا سر دبا دوں آئی،“ کلثوم نے ہمدردانہ پیشگی کی۔ ”وہ جلدی سے کہہ کر چھوٹے کمرے میں آگئی۔ دروازہ بند کر کے چارپائی پر بیٹھی تو فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا۔ نہ کوئی سوج، نہ کوئی خیال۔ بس اندر ہی اندر بے حد کشش کا احساس ہونے لگا۔

”ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں پھنسائی ہوئی ہلکے سے بڑبڑائی۔

”یہ ایسا کیوں آئی ہے؟“ اور اپنے آپ سے کیے گئے اس سوال کے ساتھ ہی ذہن بہت ساری تک اچانک رسائی حاصل کر گیا۔

”ابھی بچے بنتے ہی تو اس کی عدت کے دن ختم ہوئے تھے۔ تو کیا ناقب حسن نے سچ بچ کسی خاص مقصد کے لیے انیلا اور اپنی اماں کو بھیجا ہے؟“

”نہیں۔“ اس کا سر آہستہ آہستہ نفی میں ہلنے لگا۔ اور آنکھوں میں وحشت اُتر آئی۔

”کبھی نہیں ہو سکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہونا چاہیے۔“ اس کا دل چاہا چھوٹی آپا کی طرح سارے لحاظ بھلا کر لہریں بھلا گئی ہوئی ناقب حسن کی والدہ کے سامنے جا کھڑی ہو اور صاف لفظوں میں کہہ دے۔

”میں بھی آپ کے بیٹے کو قبول نہیں کروں گی۔“

اور اتنی باتوں کے ساتھ تو وہ کبھی بھی نہ تھی۔ کتنی بار دروازے تک جا کر پلٹ آئی۔ بالآخر اپنے آپ کو انتہائی بے محسوس کرتے ہوئے ہاتھوں میں چہرا چھپا کر رونے لگی۔

”میں بہت۔ بہت بزدل ہوں۔“

”اور میں آپ کو بزدل نہیں دیکھنا چاہتا۔ کبھی بھی کسی بھی مقام پر۔“ قریب ہی جیسے کوئی سرگوشی کرنے توہ چونکی اور ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی

”شہر و زامند۔“

”زندگی میں بہت ساری باتیں ہماری مرضی کے خلاف ہو جاتی ہیں۔ آوازوں کی بازگشت نے اسے گرفت میں لیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم ان پر گڑھتے رہیں یا فرار کے طریقے سوچتے رہیں۔ اس

نے برعکس ہمیں جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کا سامنا کرنا چاہیے۔“

”میں کیسے سامنا کروں؟ اتنی جرأت مند نہیں ہوں میں۔“ کاش وہ چیخ چیخ کر رو سکتی۔ لیکن منہ پر ہاتھ رکھ

اس نے اپنی چیخوں کو دبایا تھا۔

کافی دیر بعد کلثوم نے دروازے پر دستک دینے کے ساتھ اسے نکارا تو اس نے جلدی سے ٹیلیوں سے اپنی آنکھیں گرد ڈالیں۔ پھر کچھ جھپکے ہوئے دروازہ کھولا تو کلثوم اس کے لیے چائے لیے لڑی تھی۔

”آئی ام سوری آئی۔ مجھے چائے لانے میں کچھ دیر ہو گئی۔ اصل میں مہمانوں کو۔“ وہ پتا نہیں کیوں کہ کتنے خاموش ہو گئی۔ اس نے بھی کوئی سوال نہیں کیا۔ چپ چاپ اس کے ہاتھ سے چائے

ایک لے کر پلٹی اور وہ بارہ اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔

”آپنی کوئی اسپرین وغیرہ لیں گی؟“ کلثوم پوچھنے لگی۔

”نہیں۔“ اور سنو آتامیاں آگئے کیا؟“

”نہیں۔ ابھی تو نہیں آئے۔“

”اچھا۔“ وہ خاموش ہو کر پتا نہیں کیا سوچنے لگی۔

کلثوم کچھ دیر تک کھڑی اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی،

الٹے دو تین روز تک وہ انتظار کرتی رہی کہ اماں کسی بہانے اس کے سامنے انیلا کا ذکر چھیڑیں گی۔

اس کی والدہ کی آمد کا مقصد بھی بتائیں گی۔ اس دوران وہ مسلسل ان کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔ بیٹھے

نہیں۔ پریشان نہیں ہوں۔“ وہ مٹھیاں بھیج کر ادھر ادھر یوں دیکھنے لگا جیسے کسی بھی چیز اٹھا کر بیچ دینے کا ارادہ ہو۔  
”سیر سے کام لیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ انیلانے کہا اور اٹھ کر جانے لگی کہ وہ روک کر  
چھ لگا۔

”ربیع کے بارے میں تو بتاؤ۔ اس سے تمہاری کیا باتیں ہوئیں؟“  
”کوئی بات نہیں ہوئی کیونکہ وہ ہیں دیکھتے ہی اٹھ کر اندر چلی گئی تھی اور پھر آخر وقت تک باہر نہیں نکلی۔  
”تہیں دیکھ کر اس کے تاثرات کیا تھے؟“ وہ ہر بات جانتا چاہتا تھا۔  
”پتا نہیں، میں بالکل نہیں سمجھ سکی وہ خوش تھی یا ناخوش۔“ قدرے توقف کے بعد وہ کہنے لگی ”ویسے  
”بیارنگ رہی تھی۔“ مکرور اور دوسری۔  
”بیارنگ رہی تھی۔“ وہ انیلانے کو جاتے دیکھ کر بڑبڑایا اور پھر لیٹا تو مسلسل اُسی کے بارے میں سوچنے  
”بہت ساری باتیں۔ جنہیں خود ہی فرض کرتا اور خود ہی جھٹلاتا رہا تھا۔ آخر میں اُس نے سوچا، وہ کس  
”ربیع کے بارے میں معلوم کرے۔ اور اس کے ساتھ ہی شہر و زعم کا خیال آیا کہ ہوسکتا ہے، وہ  
”جالتے ہوں۔  
”اس روز بھی وہ اُن کے پاس جانے کا صرف پروگرام ہی بنا سکا تھا۔ اور اپنی مصروفیت کی وجہ سے  
”نہیں سکا تھا۔

”لے روزانہ کا شکریہ ادا کرنے کے بہانے اُن کے آئس جا پہنچا۔  
”سجید کی کے حصار میں مقید شہر و زعم اپنی گریس فل شخصیت کے ساتھ بے حد خاموش نظروں سے  
”ن کی طرف دیکھنے لگے اور اگرچہ وہ دیدہ ور ہوتا تو جان لیتا کہ متاعِ عزیز لڑا کر وہ شخص کس قدر تنہا تھا  
”ہا تھا لیکن اس وقت ثاقب حسن صرف اپنی کامیابی کے نشے میں مرشار تھا۔  
”بیٹھو۔“ اس کی آمد پر کوئی مسکراہٹ اُن کے ہونٹوں پر نہیں چلی۔ اسی طرح سجید کی سے سلنے  
”ال لڑکی کی طرف اشارہ کیا تو وہ بیٹھ گیا۔  
”کیسے آنا ہوا؟“ وہ پوچھنے لگے۔

”میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔“ وہ اُن کی سجید کی سے مرعوب ہو کر بولا۔  
”کس بات کا؟“ وہ اپنی توجہ سلنے نکلی فانی پر مرکوز کرتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھنے لگے۔  
”جوامانت میں نے آپ کو سونپی تھی، وہ آپ نے بخوش لوٹا دی۔“  
”بخوش؟“ انہوں نے سوچا اور اس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔  
”وہ کچھ دیر تک انتظار کرتا رہا، جب وہ بالکل بھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تو کہنے لگا۔  
”آپ جانتے ہیں کہ ربیع۔“

”ثاقب حسن۔“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر سمعتی سے اُسے ٹوک دیا۔ ”میں اس لڑکی ربیعہ اکرام علی سے  
”معلق نہ کوئی بات سنوں گا اور نہ ہی کرنا چاہتا ہوں۔“  
”ثاقب حسن ایک نظر ان کی طرف دیکھ کر سر جھکا لیا۔ اور کسی اور موضوع پر بات کرنے کی سوچ ہی  
”ہاتھ کر وہ کہنے لگے۔

”میں آئندہ کبھی تم سے ملنا نہیں چاہوں گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ بروہ راستہ مھول جاؤ جو میری  
”لڑت آتا ہے۔“ اس کے ساتھ ہی انہوں نے باہر جانے والے دروازے کی طرف اشارہ کر دیا۔ ان کے  
”ہونٹ بھیچنے لگے تھے جب کہ ہانڈا لپکا لپکا کر کہہ رہا تھا۔  
”گیٹ لاسٹ فرام ہیئر ثاقب حسن۔“

”وہ اس وقت کچن میں پڑھی پڑھی چاول چن رہی تھی، جب صوفیہ آئی۔ پہلے اندر جا کر آٹا سے ملی۔

”میٹھے سوچوں میں گم ہو جاتیں۔ تو کبھی اُن کا سر اثبات میں ملنے لگتا اور کبھی نفی میں یوں جیسے وہ کوئی نہ  
”نکر پار ہی ہوں۔ پھر اچانک چونک کر اس کی طرف بھی دیکھنے لگتی تھیں۔ ایسے میں وہ پوری طرح اُن کی  
”متوجہ ہو جاتی کہ شاید کچھ کہیں کی لیکن تین چار روز تک انہوں نے خود سے کچھ نہیں کہا۔ تب وہ  
”ہمت کر گئی۔

”اماں۔ انیلانے کیوں آئی تھی؟“ اُس نے پوچھ کر سر جھکا لیا تو اماں لکٹی دیر تک اُسے دیکھ کر رہ  
”پھر کہنے لگیں۔  
”بیٹا۔ بات ہے تو قبل از وقت۔ لیکن ایک نہ ایک دن تو ایسا ہونا ہی ہے۔“ قدرے توقف  
”بولیں۔“ وہ ایک بار پھر تمہارے لیے سوالی بن کر آئی تھیں۔“  
”یہ جواب اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔ پھر بھی وہ یوں دیکھنے لگی جیسے اماں نے کوئی انہونی  
”دی ہو۔

”آپ نے کیا جواب دیا؟“ خدشوں میں گھر کر اُس نے پوچھا۔  
”ابھی تو میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔“  
”اماں۔“ وہ اُن کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر منت سے بولی۔ ”میری ایک بات مانیں اماں، آپ  
”صاف جواب دے دیں۔“  
”کیوں بیٹا؟“  
”بس اماں۔ اب میرا دل اس بات پر آمادہ نہیں ہوتا۔ آپ میرے بارے میں نہ سوچیں۔ کو  
”ن کریں۔ میں یہیں رہوں گی۔ ہمیشہ آپ کے پاس۔“ اماں اس کی کیفیت سمجھتی تھیں، اس لیے فوراً  
”پر اُسے سمجھانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ بس ہلکے ہلکے اُس کے ہاتھ تھپکنے لگی تھیں۔

”ثاقب حسن کا خیال تھا کہ اسے ربیعہ کو شہر و زعم سے آزاد کرنے میں دشواری کا سامنا ہوگا لیکن  
”وہ مرحلہ بہت آسانی سے طے ہو گیا تو اُس نے سوچا کہ اب آئندہ تو اُس کے لیے آسانیاں ہی آسان  
”ہوں گی۔ وہ ربیعہ کی عدت کے دن پورے ہوتے ہی اپنی اماں کو اس کے ہاں بھیجے گا، جہاں  
”اماں اپنی طلاق یافتہ بیٹی کے لیے بہت فکر مند ہوں گی۔ اور بغیر کوئی سوال جواب کیے فوراً ہائی پھر لیں  
”لیکن جب اُس کی اماں نے ربیعہ کے ہاں سے واپسی پر بتایا کہ انہوں نے ابھی کوئی جواب نہیں  
”اور یہ کہ سوچنے کے بعد ہی وہ کوئی فیصلہ کریں گے۔“ تو اُسے خاصی حیرت ہوئی۔ اماں کے سلنے  
”کچھ نہیں بولا۔ لیکن موقع ملنے ہی انیلانے کو اپنے کمرے میں لے گیا۔

”سنو انہوں نے سوچنے کو وقت کیوں مانگا ہے؟“ خاصی تشویش سے پوچھنے لگا۔  
”ظاہر ہے بھائی وہ بیٹی والے ہیں۔ سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کریں گے۔“ انیلانے اپنے  
”پتے کی بات کی لیکن وہ جھنجھلا گیا۔

”تم نے غالباً ان پر میری حیثیت واضح نہیں کی ہوگی۔“  
”کیوں نہیں۔ اماں نے سب کچھ بتایا۔“  
”کیا۔ کیا بتایا؟“

”میری کہ آپ دو سال باہر رہ کر آئے ہیں۔ اور اب ماشاء اللہ مالی طور پر اتنے مستحکم ہو چکے  
”وہ بیچ پانے پر اپنا بزنس سیٹ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔“

”پھر انہوں نے اعتراض کیوں کیا؟“  
”اعتراض تو کوئی نہیں کیا۔“ پھر وہ مشکوک نظروں سے اُس کی طرف دیکھتی ہوئی پوچھنے لگی  
”ویسے آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟“

پھر اس کے پاس چلی آئی۔ بے خیالی میں وہ اسے دیکھ گئی جب کہ ذہن کہاں سے کہاں بھٹک گیا کہ اسی طرح وہ خود آیا کرتی تھی اور چھوٹی آیا اکثر اسے اسی پیڑھی پر بیٹھی ملتی تھیں۔ کس قدر عجیب بات؟ کہ سب کچھ ویسا ہی تھا، بس دونوں کی جگہیں بدل گئی تھیں۔

یوں کیا دیکھ رہی ہو؟“ صوفیہ وہیں چوکتھ پر بیٹھی ہوئی پیار سے پوچھنے لگی۔  
”آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔ اس لیے نظر جم کر رہ گئی۔“ اس نے بروقت اپنے آپ کو سنبھالا۔  
”اور یہ آپ یہاں کیوں بیٹھ گئیں؟ اندر چلن ناں؟“

”بس یہیں ٹھیک ہوں۔ ویسے بھی اماں کے پاس پڑوس والی خالہ بیٹھی ہیں۔“  
”پھر یہ پڑھی لے لیجیے۔“ وہ اپنے نیچے سے پیڑھی نکالنے لگی کہ اس نے روک دیا۔  
”بیٹھی رہو تم۔ میں آرام سے بیٹھی ہوں۔ اور یہ تم کیا پکانے جا رہی ہو؟“

”چاول چٹھا رہی تھی۔ آپ کیا کھا سکیں گی؟“  
”کچھ بھی بلکہ جو تم پکا رہی ہو، وہی کھاؤں گی۔“  
”اس نے آخری نظر چاولوں پر ڈالی پھر انہیں دھونے میں لگ گئی۔ اس کا منہ سے فارغ ہو کر دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتی ہوئی جیسے ہی پٹی صوفیہ ایک لفافہ اس کی طرف بڑھا کر بولی۔

”سنو۔ یہ تیار لے لیے۔“  
”کیا ہے اس میں؟“ پتا نہیں اس کا دل کیوں اتنی زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔  
”پتا نہیں۔ اسے تمہاری امانت کہہ کر دیا گیا ہے، اگر میں کھول کر دیکھ لیتی تو خیانت ہو جاتی؟“  
”کس نے دیا ہے؟“ اسے اپنا یہ سوال انتہائی فضول لگا۔  
”شہر و بھائی نے۔“ شہر و کا نام لیتے ہوئے صوفیہ خاموش نظر میں چرا گئی۔

”پتا نہیں چھوٹی آیا۔ مجھے یہ لینا بھی چاہیے یا نہیں۔“ وہ آہستہ لگی۔ آپ پہلے اماں سے پوچھ لیں۔“  
”موقوف ہو تم۔ ہو سکتا ہے اس میں ایسی کوئی چیز ہو جسے تم اماں تو کیا مجھ سے بھی چھ چاہو۔“ صوفیہ نے زبردستی لفافہ اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ پھر کہنے لگی۔ ”پہلے تم خود اسے دیکھ لے۔ پھر اگر مناسب سمجھو تو۔“

”صوفیہ۔ اماں اندر سے آواز دے رہی تھیں۔ صوفیہ اس کا ہاتھ تھپکتی ہوئی اٹھ کر اماں کے چلی گئی تو وہ کچھ دیر تک یونہی غم کھڑی بند لفافے کو دیکھتی رہی۔ پہلے خیال آیا وہ اسے اسی طرح رکھے اور فراغت کے وقت اطمینان سے دیکھے لیکن جس غالب آگیا۔ اور وہ وہیں بیٹھ کر لفافہ نکلی۔

سب سے پہلے اس کے ہاتھ میں ایک چمک آیا جس کے بارے میں فوری طور پر وہ سمجھ نہیں کہ آیا یہ کیا چیز ہے اور اسے سمجھنے کے بجائے اس نے دوسرا کاغذ نکالا۔ تہہ شدہ کاغذ جیسے ہی کھولا تو اس میں سے ایک تصویر اس کی گود میں آگری۔ اس نے بس سرسری نظر تصویر پر ڈالی، پھر تیز تحریر پر نظر پر دوڑنے لگی۔

”میری زندگی کا سب سے بڑا سچ یہ ہے کہ میں نے آج تک کسی کو خط نہیں لکھا اور عجیب اتفاق یا شاید المیہ یہ ہے کہ آج پہلی بار جسے لکھ رہا ہوں، اس کے بارے میں یہ یقین بھی نہیں ہے کہ وہ اسے پڑھنا گوارا بھی کرے گی یا نہیں۔“

اس کے بعد باقاعدہ خط کا آغاز یوں تھا جیسے سوچتے اور آہستہ ہوتے لکھا گیا ہو۔  
”القاب کیا لکھوں؟“  
میرا مقصد آپ کو گزری کوئی بات یاد دلانا ہرگز نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے آپ نے گذشتہ

دو برسوں کو کسی بھساک خواب سے تعبیر کیا ہو اور اب اپنے آپ کو آنکھ کھلنے کا بہلاؤ دے رہی ہو؟ لیکن میں اپنے آپ کو ایسا کوئی بہلاؤ انہیں دے سکتا۔ میری زندگی میں یہ دو برس اصل حقیقت کی طرح موجود ہیں۔ جس کا ہر پہلو، ہر لمحہ شاید اس لیے میرے دل اور ذہن پر نقش ہوا تاکہ بقیہ تمام عمر مجھے یہ احساس دلانا رہے کہ میں دنیا کا احمق ترین انسان ہوں جو اپنے ہاتھ اپنی متاع عزیز لٹا بیٹھا۔

بہر حال اپنی ذات سے قطع نظر مجھے کہنا یہ ہے کہ آپ سے نکاح کے وقت مہر کی جو رقم سوا لاکھ مقرر ہوئی تھی، میں اس کا چیک بھیج رہا ہوں۔ یہ آپ کا حق ہے جسے ادا کرنا میرا فرض تھا اور آپ جانتی ہیں، میں اپنے فرائض سے کم ہی غافل ہوتا ہوں۔ اس کے علاوہ ایک گھر کے کاغذات ہیں جو میں نے آپ کے لیے آپ ہی کے نام سے بنوایا تھا۔ اور آپ کے لیے ایک خوبصورت گھر بنانے کا ارادہ میں نے اسی روز کر لیا تھا جس روز آپ برف کا گھونڈا بنا کر اس میں اپنے خوابوں کی تعبیر تلاش کر رہی تھیں۔ اس وقت آپ کی آنکھوں میں جو رنگ اترے تھے، وہ میں کبھی فراموش نہیں کر پایا اگر یقین نہ ہو تو یہ تصویر دیکھ لیجیے۔

مزید کیا لکھوں؟۔ بس آپ سے اتنا پوچھنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ آپ خود تو چلی گئیں۔ لیکن اپنے وجود کی مہک کو ہمارے اس پاس کیوں چھوڑ گئیں؟ اسے بھی ساتھ لے جائیں کہ شاید اس طرح زندگی کچھ بہل ہو جاتی۔

شہر و زاحمد

اس نے بے حد ستائشوں میں گھر کر خط تہہ کر کے دوبارہ لفافے میں رکھا اور گود سے تصویر اُٹھا رکھنا چاہتی تھی کہ دل میں چلتا سمندر اس تیزی سے آنکھوں میں سما گیا کہ ہر طرف دھند ہی دھند بن گئی۔



”میلے خدا۔“ اس نے پلکوں کو بار بار جھپکا تو آنسو ایک تو اتر سے بہنے لگے۔ دھند کے بعد ایک سیسے موسلا دھار بارش ہونے لگی تھی۔ بے خیالی میں وہ آنکھوں کے بجائے بار بار تصویر پر ہاتھ برکرات صاف کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”بہو۔“ کافی دیر بعد صوفیہ اسے پکارتی ہوئی آئی اور اسے بوں زار و قطار روتے دیکھ کر پہلے لگی، پھر اس کے پاس بیٹھتی ہوئی قدرے پریشانی سے پوچھنے لگی۔  
”کیا بات ہے؟۔ اس طرح کیوں رو رہی ہو؟“

”میں رو رہی ہوں۔“ وہ اسے شاید اپنی آنکھوں سے برستی برسات کی خود خبر نہیں تھی۔ صوفیہ کے ہنسنے پر ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھوا تو حیران ہو کر بے بسی سے بولی۔  
”پتا نہیں چھوٹی آیا۔ میں کیوں رو رہی ہوں؟“

”چلی چلو آٹھو یہاں سے۔“  
”نہیں! آئی۔ ابھی تو میں نے چاول بھی نہیں چڑھائے۔“  
”بڑھ جائیں گے چاول بھی۔ تم اندر چلو۔“ صوفیہ زبردستی اسے اٹھا کر اندر لے گئی۔ اپنے رومال پر لکھا چہرہ صاف کیا۔ تب اس نے بہت خاموشی سے ہاتھ میں پکڑی تصویر اس کی طرف بڑھا دی۔

”کیا ہے؟“  
”ہرگز زاحمد نے یہ تصویر بھیجی ہے اور یہ چیک۔“ اس نے لفافے میں سے نکال کر چیک بھی اس کے ہاتھ بڑھایا۔ البتہ خط اور مکان کے کاغذات چھپا گئی۔

”تصویر تو اچھی ہے۔“ صوفیہ نے تصویر پر سرسری نظر ڈالی۔ پھر چپک دیکھتے ہوئے پوچھا: ”یہ چپک کیسا ہے؟“  
 ”نہر کی رقم ہے۔ یہ آپ اماں کو دے دیجیے۔ اور ان سے کہیے، یہ شہر و زاحمد کو واپس کر دیں۔“  
 ”میں سمجھتی ہوں، اس پر میرا کوئی حق نہیں۔ ویسے بھی میں یا ہم میں سے کوئی ان پیسوں کو لے گا۔ بہتر ہے انہیں شکریہ کے ساتھ واپس کر دیں۔“  
 ”اور اگر شہر و زاحمد نے واپس نہ لیے تب۔۔۔؟“

”تب میں کچھ نہیں جانتی۔“ وہ صوفیہ کو وہیں چھوڑ کر کمرے سے نکل گئی۔  
 دل کی نڈی پیٹتے اُس نے بڑی دقتوں سے پرسکون کیا تھا۔ اس میں شہر و زاحمد نے بڑی غا سے ایک کنکرا اچھال کر یوں پھیل چادی تھی کہ اگلے کئی دن تک وہ بے حد مضطرب رہی۔  
 اس دوران انیلا ایک بار پھر اپنی اماں کے ساتھ آئی تھی۔ لیکن وہ ان دنوں ذہنی طور پر کچھ مفقود ہو رہی تھی۔ کہ نئی صورت حال کے بارے میں سوچ ہی نہ سکی۔ اُس کی سوچوں کا مرکز کھانے کی طرف سے بھیجے گئے۔ مکان کے کاغذات اور مہر کا چپک تھا۔ وہ یہ دونوں چیزیں انہیں لوٹاؤ تھی لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کیسے ان تک پہنچائے۔ صوفیہ کے ذریعے یہ کام ہو سکتا تھا یا نہیں چاہتی تھی کہ صوفیہ ان دونوں کے درمیان پیامبر بن کر رہ جائے۔ وہ کوئی ایسا طریقہ سوچ تھی جس سے یہ بات ہمیشہ کے لیے ہمیں ختم ہو جائے۔  
 مہر کی رقم کا چپک اُس نے صوفیہ کے ذریعے اماں کو دے دیا تھا۔ اور اماں نے ابامیاں دکھایا تو انہوں نے اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا تھا۔

”یہ تمہارا ہے، ہم اسے اپنے لیے حرام سمجھتے ہیں۔ تم اسے جیسے چاہو تصرف میں لے آؤ اور وہ کیا کرتی۔ پہلے ہی اس شخص کی اتنی مفروض تھی جس نے ان دو برسوں میں پتا نہیں ہر اپنی اتنی کے سامنے جو اب یہی سے بچنے کی خاطر اس کے لیے اتنا کچھ کیا تھا یا کسی اور جذبے کے بہر حال وہ اپنے آپ کو حقدار ہرگز نہیں سمجھتی تھی۔“  
 ”دو برس کم نہیں ہوتے۔“ وہ سوچتی۔ ”اور اتنا عرصہ میں اس شخص کے گھر بہت آرام سے رہ میری بساط سے بڑھ کر مجھے ہر شے ملی۔ لوگ تو بہانداری بھی دوپٹے سے زیادہ نہیں نکھالتے۔ ہم اُس نے دو سال تک مجھے برداشت کیا۔ اور ان دو سالوں میں جتنا مجھ پر خرچ ہوا، اس کا اگر حساب بیٹھوں تو مہر کی رقم سے کہیں زیادہ وہ مجھ پر لٹا چکا ہے۔“  
 ”بہت سوچنے کے بعد اُس نے چپک اور گھر کے کاغذات انہیں آفس کے پتے پر بھجوا دیے ساتھ میں ایک اضافی کاغذ جس پر اُس نے لکھا تھا۔“

”شہر و زاحمد!“  
 جب نالتے توڑے جاٹیں، وہ بھی اس طرح کہ درمیان میں ”شہر منو“ کا لفظ آجائے تو پھر کوئی بھی ربط نہیں رہنا چاہیے۔ یہ بات اگر آپ بھی سوچ لیتے تو یقیناً مجھے یہ چیزیں نہ بھجواتے۔ بہر حال آپ نے انہیں میرا حق قرار دیا ہے اور میں اپنے آپ کو کسی طرح بھی غدار نہیں سمجھتی۔ اس لیے واپس کر رہی ہوں۔ سنبھال کر لکھیے، شاید کہیں اور کام آجائے لیکن نہیں شہر و زاحمد، زندگی میں پھر کبھی کوئی ثاقب حسن ایسی کوئی خواہش ہے کہ آئے تو اُس کی بات ماننے سے پہلے ایک بار مجھے ضرور سوچ لیجیے گا۔ مجھے یعنی ربیعہ اکرام علی کو جس نے ایک صرف زندگی نہیں ہاری۔ کہ یہ اختیار میں نہیں ورنہ اور سب تو۔۔۔“

ربیعہ

”اب بوجھ، سا آتا کروہ مطمئن ہونے جا رہی تھی کہ نئی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔ یعنی بات اس بوجھ کی تھی کہ اس روز اماں، ابامیاں، بڑی آپا اور عاصم بھائی، ثاقب حسن کے گھر جا رہے۔ وہ چلے اپنی بے خبری پر حیران ہوئی، پھر بے طرح پریشان۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کو بھائی کی گاڑی میں جلتے دیکھا، پھر کلثوم کو پکڑ لیا۔“  
 ”سنو۔ یہ سب کہاں جا رہے ہیں؟۔“  
 ”آپ کی دوست انیلا کے گھر۔“ کلثوم نے دائرہ ثاقب حسن کا نام نہیں لیا۔  
 ”کیوں؟۔“ وہ سب سمجھتے ہوئے بھی کچھ نہیں سمجھ رہی تھی۔

”آپ۔ آپ اس قدر پریشان کیوں ہو رہی ہیں؟۔ سیدھی سی بات ہے، اس روز انیلا اور ان والہ، اماں کو اپنے گھر آئے کی دعوت دے گئی تھیں۔ اسی لیے آج سب گئے ہیں۔“ کلثوم اس چھٹی تھی۔ پھر بھی یوں بات کی جیسے بہت بڑی ہو۔  
 ”لیکن اماں کو نہیں جانا چاہیے تھا۔“ وہ پرسوج انداز میں آہستہ سے بولی۔  
 ”کیوں؟۔“

”میں نے منع کیا تھا انہیں۔ پھر وہ کیوں گئی ہیں؟۔ وہ میری بات کیوں نہیں سمجھتی؟ کیا اب بھی میرے ساتھ پہلے والا سلوک کریں گی۔ لیکن اب میں وہ نوعمر لڑکی نہیں ہوں کہ اماں جب، جہاں جس ساتھ چاہیں، مجھے رخصت کر دیں۔“ وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی لڑکا کر دینے کو ہو گئی۔  
 ”آپ پریشان نہ ہوں آپ۔“ اماں آپ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کہیں گی، ”کلثوم اس کے کندھے اٹھ کر اس کی آزدگی کم کرنے کی غرض سے کہنے لگی: ”ابھی تو سب لوگ بیوی ہن ان کے بلانے پر آئے ہیں۔ کوئی بھی بات آپ سے پوچھے بغیر تو طے نہیں ہوگی ناں۔“ اُس نے خاموش اور سر و نظروں سے اُن کو دیکھا۔ پھر کچھ کہے بغیر اٹھ کر اندر چلی گئی۔

یہ صبح ہے کہ اُس نے ثاقب حسن سے محبت کی تھی لیکن یہ دو سال پہلے کی بات تھی۔ اُس وقت اس زندگی اس گھر کی چار دیواری تک محدود تھی۔ اور اس چار دیواری سے باہر اگر اُس نے کچھ دیکھا تھا تو اموگول پھر کالج، اس سے ہٹ کر وہ نہیں جانتی تھی کہ دنیا میں اور کیا کچھ ہے۔ بچپن سے زندگی کو ایک ہی میں دیکھتے دیکھتے شاید وہ اتنا چل تھی۔ جیسی تو وہ ثاقب حسن کے متوجہ کرنے پر فوراً اُس کی طرف پھٹی۔  
 ”ن۔ کئی عرصہ اور کچھ دن جس پر بہت جلدی ثاقب حسن نے اپنا رنگ چھایا۔ کہ وہ صرف اسی کے بارے میں اپنے لگی۔ اگر درمیان میں یہ دو سال اس طرح نہ آئے ہوتے تو یقیناً وہ اب بھی اسے ہی سوچتی۔ لیکن دو سالوں نے اسے بہت کچھ سمجھایا اور سکھا دیا تھا۔

ابتداءً عرصے میں اس نے بہت نادانی سے سوچا تھا کہ دو سال بعد وہ بڑے آرام سے ثاقب حسن کی جلتے گی۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ وہ ثاقب حسن سے متنفر ہوتی گئی۔ وہ اسے انتہائی خود غرض مان نظر آیا۔ جو اپنی خواہشات کے حصول کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اور پھر شہر و زاحمد بھی اُس کے لئے رہے تھے۔ جن کی اگر کس قدر اور قدر اور شخصیت مقابل کو تمام محاذوں پر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرتی تھی۔  
 ”مقابل تو وہ تھی ربیعہ اکرام علی جو کسی معمولی سی شے میں، معمولی سی خوبصورتی دیکھ کر بھی متاثر ہوتی تھی۔ اور ہر زاحمد تو خود معمولی تھے۔ اور نہ ان کی شخصیت عام سی، پھر وہ کیسے نہ متاثر ہوتی؟۔“

کتنے عرصہ اس شخص کو سوچتی رہی، جو نظروں سے دور تھا، اس کے برعکس ہر سوچ پر وہ حاوی اور قابض اور نظر کے سلسلے تھا اور اُس نے اسی شخص کے ساتھ زندگی تمام ہونے کے بے شمار دعوائیں مانگی تھیں۔ ان پتانہیں اتنی شدت سے مانگی گئی دعوائیں مستجاب کیوں نہیں ہوئیں؟۔ بہر حال شہر و زاحمد کے گھر سے لٹے ہوئے اُس نے یہ بھی سوچا تھا کہ اس گھر میں گزرے دو سال کا ہر پل اس کے لیے زاوہا ہے۔ لہذا اپنا آئندہ زندگی میں کبھی کسی مرد کو داخل نہیں ہونے دے گی۔ لیکن اس سوچ پر قائم رہنا اس کے

اختیار میں نہیں تھا۔ جسے جیسے وقت گزرا، آماں اور آبامیاں کی پریشانیوں کو دیکھتے ہوئے اسے اپنی سوچوں کا انداز بدلنا پڑا۔ وہ سوچتی۔

”پتانیہیں، زندگی کتنی طویل ہے اور طویل عرصے تک وہ آماں کے گھر بیٹھی نہیں رہ سکتی۔ آج نہ تو کل آماں

وہ بہت زیادہ عرصہ تک آماں کو باؤس بھی نہیں کر سکے گی۔ کیونکہ آبامیاں کی ذمہ داریاں اسی پر ختم نہیں ہوں گی اور اس کے بعد کلثوم اور میر ہما بھی ہے۔“ اس انداز سے سوچتے ہوئے اگر کبھی ثاقب حسن کا خیال آتا تو وہ فوراً سر جھٹک دیتی تھی کیونکہ اس کا خیال بلکہ اسے یقین تھا کہ کسی اور جگہ تو شاید وہ سمجھوتہ کر کے لے لیکن ثاقب حسن کے ساتھ وہ کبھی بھی سمجھوتہ نہیں کر سکے گی۔ اس کے ساتھ خوش رہنا تو دور کی بات آماں وغیرہ رات آٹھ بجے کے بعد واپس آئیں۔ اس کے بعد بڑی آپا اور عامر بھائی کے ساتھ بہت دیر تک شاید مشورہ وغیرہ کرتی رہیں۔ اس دوران وہ اپنے چھوٹے کمرے سے نکلی ہی نہیں بلکہ بڑی آپا کے جانے کے بعد بھی وہ باہر نہیں نکلی۔ البتہ صبح جب آبامیاں آفس چلے گئے، وہ پہلی فرصت میں آماں کے پاس آ بیٹھی۔

”آماں میں نے آپ سے کہا تھا، انلا کی والدہ کو صاف جواب دے دیں۔ پھر آپ ان کے گھر گئیں؟“ وہ سہولت سے آماں سے پوچھنے لگی کیونکہ اب وہ پہلے والی ربیعہ نہیں تھی۔ حالات نے اس کے ماتھے پر پہلے شادی شدہ اور پھر طلاق یافتہ کا لیبل لگا کر اور کچھ نہیں تو خود اپنے بارے میں سہولت سے پوچھنے کا حق تو دے ہی دیا تھا۔

”بہن! آماں اس کی بات سن کر کہنے لگیں۔“ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے ہم تم سے ضرور پوچھیں گے۔“

وہ تو جھٹک رہی تھی لیکن آپ کو اتنی جلدی کیا ہے؟“

”اب یہ مت کہہ دینا کہ تم ہم پر پوچھ رہی ہو۔“

”میں ایسا نہیں کہہ رہی۔ لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ پہلے کلثوم اور ہما کے بارے میں سوچیں بلکہ پتا ان دونوں کے فرض سے سکدوش ہوں، میرا کیا ہے، میں تو اپنے نصیب کی خوشیاں وصول کر چکی ہوں۔“

”تو کیا جانے ابھی تیرے نصیب میں اور کتنی خوشیاں ہیں۔“ آماں نے اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا، پھر کہنے لگیں۔

”کلثوم اور ہما کے بارے میں بھی سوچیں گے لیکن بیٹا یہ تو نہیں ہو سکتا ناں کہ پیام تمہارے لیے آئے اور بات ہم ان کی کروں۔ ویسے بھی میں سمجھتی ہوں کہ اللہ کی مہربانی ہے جو اتنی جلدی دو بارہا بن رہی ہے۔ ورد آج کل تو کنواری لڑکیوں کے رشتے مشکل سے ملتے ہیں۔ کہاں۔“ انلا وارنہ خاموش ہو گئیں۔ اور ان کی بات سمجھ کر اس کے اندر جیسے الاؤ دینے لگا۔

”ویسے بھی تمہاری آماں کو اپنی طلاق یافتہ بیٹی کے لیے رشتے کی تلاش ہوگی، کس قدر تکاری سے ثاقب حسن نے کہا تھا۔“

”واقعی داد دینی پڑے گی۔ کتنا مشکل پلان بنایا تھا ثاقب حسن نے۔“ اس نے سوچا، پھر آماں کے ہاتھ تھام کر کہنے لگی۔

”آماں۔ میرا جواب ابھی سن لیجیے۔ میں ثاقب حسن سے شادی نہیں کروں گی۔“

”آخر کیوں؟“ آماں اُلجھ کر بولیں۔

”آپ خود سوچیں، پہلے تو آپ انہیں انکار کر چکی ہیں۔ اور اب ہاں بھی دے دیں گی۔“

”پہلے حالات اور تھے۔“ آماں نے دانستہ اپنی بات کی اہمیت بتائی۔

”کس کے، ہمارے یا ان کے؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجہ میں طنز سمٹ آیا۔

”دونوں کے۔“ خود کلامی کے انداز میں کہتی ہوئی آماں اس کے پاس سے اٹھ کر چلی گئی تھیں۔ پھر زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ کہ ثاقب حسن کی والدہ شاید جواب لینے آ گئیں۔ اور وہ کیونکہ اس کے سامنے مسلسل انکار کر رہی تھی۔ اس لیے آماں انہیں کوئی مثبت جواب نہ دے سکیں اور ہاں صاف لفظوں میں انکار کر دیا۔ سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا اور اگلے ہی دن صوفیہ کو بلوا بھیجا۔

شاید وہ ربیعہ کو سمجھا سکے۔

حسب عادت شہزاد احمد صبح لان میں چہل قدمی کے بعد وہیں لان چیمبر پر بیٹھ کر اخبار دیکھنے لگے تھے۔ موسم بہار کی آمد آ رہی تھی۔ چاروں طرف لگے مختلف اقسام کے پودوں پر کلیاں پھلنے کو بے تاب تھیں۔ اور یاد صبا کے نرم جھونکے احساسات کو نرمی سے چھو رہے تھے۔

انہوں نے بے دلی سے روزمرہ والی خبروں پر نظریں دوڑائیں۔ پھر اخبار رول کر کے دوسری پیر پر پھینکا اور پیر چیلوں سے نکال کر سامنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے یونہی ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ اس وقت وہ بالکل خالی الذہن تھے۔ کوئی خیال، کوئی سوچ نہیں، لیکن جب سامنے ادھ بلی کی پر نظریں ٹھہریں تو جانے کیسے بہت ساری سوچیں ذہن کے درجوں سے جھانکنے لگیں۔

میں چاہتی ہوں کوئی اور میرا خیال کرے۔“ کتنے مان سے اس نے کہا تھا۔ انہیں یاد آنے لگا، ہر روز شادی میں اپنے گرد کھینچے جھار سے نکل کر وہ کتنی اپنی اپنی سی گئے گی تھی۔ کبھی تھکی تھکی سی کبھی ایک دم فریض ہو کر اپنی ہنسی سے جلتے رنگ بجاتی ہوئی۔

”تھک گئی ہیں؟“ انہیں اپنا پوچھنا یاد آیا۔

”ہاں۔“ اس کا اعتراف۔ ”دل چاہ رہا ہے، چپ چاپ سو جاؤں اور ایک طویل مدت تک مجھے کوئی نہ چھیڑے۔ کوئی نہ اٹھائے۔“

”فرار چاہتی ہیں۔“

”ہاں۔“

”فرار کا یہ راستہ بزدلانہ ہے۔“

”اور میں بزدل ہوں۔“

”تم واقعی بزدل تھیں ربیعہ اکرام علی۔“ سینے میں دبی سانس ہونٹوں کی قید سے آزاد کرتے ہوئے انہوں نے اندر ہی اندر اسے مخاطب کیا تو وہ جیسے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

”خود اپنے بارے میں کیا خیال ہے شہزاد احمد؟“

”میں۔“ ان کا ہاتھ بے اختیار اپنے سینے پر چلا گیا۔ اور ابھی اپنی صفائی میں کہنے کو الفاظ ڈھونڈ رہے تھے کہ چلنے کی آواز پر چونک گئے۔ گردن موڑ کر دیکھا، صوفیہ چائے کے لیے قریب ہی کھڑی تھی۔

”آپ کیا سوچ رہے تھے؟“ وہ چائے کا کپ انہیں تھماتے ہوئے پوچھنے لگی۔ پھر قریب کھی

”میرا کچھ بھی اور کسی کو بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ یہ بتائیں، آج آپ اتنی صبح کیسے اٹھ گئیں؟“ انہوں نے

”میں صبح کی بات کا رخ اس کی طرف موڑ دیا۔“

”آپ مجھے جانتا ہے اس لیے۔“

”کہاں؟“

”آماں کے گھر۔ پتانیہیں کیوں بلوایا ہے انہوں نے؟“ وہ پرسوج انداز میں بولی۔

”کافی دنوں سے آپ گئی نہیں ہیں، اسی لیے بلوایا ہوگا۔“

”میرا خیال ہے کوئی اور بات بھی ہوگی۔ کیونکہ اماں نے کہا ہے، کچھ دن رہنے کے لیے آؤ لیکن وہ خاموش ہو کر سوچ میں پڑ گئی۔“

”لیکن کیا۔؟“ انہیں پوچھنا پڑا۔

”مہر و زاجازت نہیں دے رہے۔ کہتے ہیں شام میں واپس آجانا۔“

”آپ کیا چاہتی ہیں؟“

”اگر واقعی اماں نے کسی کام سے بلایا ہے تو مجھے رکنا چاہیے۔ ورنہ پھر شام میں واپس پر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

”اچھی بات ہے۔ میں مہر و زکو سمجھا دوں گا۔ وہ منع نہیں کرے گا۔ ویسے بھی اسے آپ کو اتنا پتا نہیں کرنا چاہیے۔“

”تصنیک یو شہر وز بھائی۔ لیکن پلیز مہر و زکو شہ نہ ہو کہ میں نے آپ سے کہا ہے۔“

”اوکے۔“ وہ کھل کر مسکرائے، پھر بقیہ چائے ایک ہی گھونٹ میں پی کر خالی پلے آسے تھا دیا وہ اٹھنے لگی تھی کہ اچانک پتا نہیں کیا خیال آیا، پوچھنے لگی۔

”ایک سیکیوزی شہر وز بھائی۔ کیا میں آپ سے ربیعہ کے متعلق کوئی بات کر سکتی ہوں؟“

”نہیں۔“ سختی سے کہہ کر انہوں نے ہونٹ بھیجنے لیے۔ تو وہ کچھ دیر تک سر جھٹکائے بیٹھی رہی پھر اپنے اندر ہمت پیدا کرتی ہوئی کہنے لگی۔

”ایک بات کہنے سے میں اپنے آپ کو نہیں روک سکتی شہر وز بھائی، پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے جیسے آپ دونوں کے درمیان کوئی تیسرا شخص بھی رہا ہے۔“

”انہوں نے یکدم چونک کر ربیعہ کو دیکھا تو وہ کہنے لگی۔

”کیا آپ اس کی نشاندہی کریں گے، کون ہے وہ؟“ وہ اُن کے انداز کو نظر انداز کرتی ہوئی بولی

”یہ سراسر آپ کا وہم ہے صوفیہ بی بی ورنہ۔“ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور

سے پہلے کہ وہ مزید کوئی سوال کرتی، تیز قدموں سے اندر چلے گئے جب کہ وہ پتا نہیں کیوں اُلجھنے لگی؟

آبائیاں آفس چلے گئے۔ کینٹون اور ہما کالج اور اماں ابھی دوپہر کے لیے سبزی گوشت وغیرہ لانے

لیے نکلنے ہی والی تھیں کہ صوفیہ آگئی۔ فوری طور پر اماں جانے کا خیال چھوڑ کر صوفیہ کے پاس بیٹھ گئیں

”ربیعہ کہاں ہے؟“ وہ بیٹھتے ہی پوچھنے لگی۔

”صفائی میں لگی ہے۔“

”میں پہلے اس سے مل لوں۔“ وہ اٹھنے لگی کہ اماں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”ابھی آجائے گی وہ، تم بیٹھو۔“ پھر سرگوشی اور رازداری سے کہنے لگیں۔ ”میں نے تمہیں اسی

پہلے کی بات اور تھی، روکا کما تا نہیں تھا۔ اور سر پر ذمہ داریاں بھی بہت تھیں، اس لیے میں نے

انکار کر دیا تھا۔ لیکن اب ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ روکا دو سال باہر رہ کر اچھا خاصا کمال پایا ہے یہاں

اپنا پریس شروع کیا ہے۔ بڑی بہنوں کی شادیاں کر چکا ہے۔ ایک بیس انیلارہ گئی ہے، اُس کی شادی بھی

اُس کے ساتھ ہی ہو چکی ہے۔“

”پھر۔؟“ اماں کی آغوش تفصیل پر وہ بیس اسی قدر کہہ سکی۔

”پھر یہ کہ مجھے اور تمہارے ابا میاں کو بلکہ بڑی اور عاصم کو بھی کوئی اعتراض نہیں لیکن ربیعہ نہیں

مان رہی۔“

”کیا کہتی ہے؟“

”یہ تم ہی اس سے پوچھو، بلکہ اُسے سمجھاؤ۔ میں نے اسی لیے تمہیں بلایا ہے۔“

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ربیعہ کو اتنے دیکھ کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

”آپ کب آئیں چھوٹی آپا؟“ ربیعہ ہاتھ سے جھاڑو پھینک کر اس کے گلے لگ گئی۔

”بیس ابھی آئی ہوں۔ تم سناؤ کیسی ہو؟“

”ٹھیک ہوں۔ آپ بیٹھیں، میں ہاتھ منہ دھو کر آتی ہوں۔“

وہ تیز قدموں سے ہاتھ روم کی طرف چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو اماں اٹھتے ہوئے بولیں۔

”اچھا۔ تم دونوں بیٹھو، میں ذرا سودا سلف لے آؤں۔“

”جلدی آجلیے گا اماں۔“ اُس نے اماں کے پیچھے جا کر دروازہ بند کیا، پھر واپس آکر صوفیہ کے

پاس بیٹھی اور پوچھنے لگی۔

”بیس کے ساتھ آئی ہیں؟“

”مہر و زجو ڈر گئے ہیں۔“ صوفیہ نے پتا نہیں کیا جاننے کی کوشش میں مہر و زکا نام لیتے ہوئے نظریں

اس پر جمی رہنے دیں۔ اور ربیعہ اکرم علی نے اس تمام عرصے میں صرف اپنے جذبات کی پردہ پوشی ہی تو

کی تھی۔ بے حد عام سے لہجے میں بولی۔



”مناسب ہے موصوف نے پھر پروپوزل بھیجا ہے؟“

”آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ وہ حیرانگی سے بولی۔“

”بھئی جیسے بھی معلوم ہوا ہو، تم میری بات کا جواب دو۔“

”ہاں۔“ ہاں کی صورت اس نے سینے میں دبی سانس خارج کی، پھر کہنے لگی۔ ”ٹھیک مسئلہ ہے۔“

”میرا خیال ہے لگن سچی ہے اس کی اور اس تمام عرصے میں وہ تمہارے ملن کی دعائیں ملگرا رہا ہے جب ہی یہ سب۔“ نہ جانے طنز تھا یا کیا تھا۔

”چھوٹی آیا۔ پلینر۔“ اس نے نوک دیا۔ ”مت ایسی باتیں کریں۔ میں اس کا نام بھی نہیں سنا چاہتی۔ اور آپ آٹاں کو سمجھائیں کہ وہ کم از کم ثاقب حسن کے بارے میں نہ سوچیں۔“

”کیوں؟“

”آپ خود سوچیں، کیا یہ بات مناسب ہے کہ جو شخص پہلی بار اس گھر سے ریجیکٹ کیا گیا، دوبارہ بارگاہ پذیرائی ملے۔“

”مناسب اور نامناسب کی بات چھوڑو ربیعہ۔ یہ سوچو کہ آٹاں نے تمہیں ساری زندگی تو اس گھر میں نہیں بٹھائے رکھنا۔ کہیں نہ کہیں تو تمہاری بات کرنی ہے۔ پھر ثاقب حسن میں کیا برائی ہے؟“

”برائی۔“ اس کے اندر کی تلخی ایک دم ہونٹوں پر سمٹ آئی تھی جسے روکنے کی خاطر وہ خاموش ہو کر سر کو نفی میں ہلانے لگی۔

”دیکھو ربیعہ، یہاں سے کوئی اُسے بلانے نہیں گیا۔ بلکہ وہ خود خواہش مند ہے۔“

”پھر بھی چھوٹی آیا، مجھے منظور نہیں۔ اول تو میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتی۔ لیکن اگر آٹاں کی ہی مرضی ہے تو پھر ان سے کہہ دیجیے۔ وہ اور جہاں بھی کہیں گی، میں اُن کی بات مان لوں گی لیکن ثاقب حسن سے نہیں۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔“

”گھنٹوں پر ٹھوڑی لگاتے ہوئے آخری الفاظ وہ بلا ارادہ کہہ گئی تھی۔ صوفیہ کچھ دیر تک خاموشی سے اسے دیکھتی رہی، پھر بے حد سنجیدگی سے کہنے لگی۔“

”اس نفرت کی وجہ پوچھ سکتی ہوں؟“

”ہیں؟“ اس نے چونک کر سر اٹھایا تو صوفیہ براہ راست اُس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔

”جس وقت تمہاری شادی ہوئی بلکہ اس کے کچھ عرصہ بعد تک تم ثاقب حسن ہی کو سوچتی تھیں، پھر یہ نفرت کیسے اور کب وجود میں آئی؟“

”چنانچہ۔“ وہ راہ فرار ڈھونڈنے لگی۔

”نہیں ربیعہ، یوں دامن مت بچاؤ۔ مجھے بتاؤ، اصل بات کیا ہے یا پھر جو میں سمجھی ہوں وہ سنو۔“

”کیا سمجھیں آپ۔؟“ وہ اندر ہی اندر ڈرنے لگی۔

”اس تمام عرصے میں ربیعہ، میں نے تمہارے اور شہر وز بھائی کے بارے میں بہت سوچا ہے یہ بھی کہ غلطی کس سے ہوئی؟۔ لیکن اپنے اپنے مقام پر تم دونوں ہی مجھے بے تصور نظر آتے۔“

صوفیہ سوچ سوچ کر بولنے لگی۔

”جب تم دونوں بے قصور تھے تو قصور وار کون تھا؟ یہ سوال اکثر میرے ذہن میں اٹھنے لگا اور اس نہج پر سوچتے ہوئے مجھے گمان ہوا کہ کوئی تیسرا شخص تم دونوں کے درمیان موجود رہا۔ شروع دن سے اور وہ تیسرا شخص ثاقب حسن کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا کیونکہ جب میں کڑی سے کوئی ملاقاتی ہوں تو وہی سامنے آتا ہے۔“ وہ سانس روکے صوفیہ کی طرف دیکھ رہی تھی اور صوفیہ مزید تفصیل میں جاتی ہوئی کہنے لگی۔

”شادی سے پہلے وہی تمہاری زندگی میں آیا اور مجھے تمہارا اس کے لیے تڑپ تڑپ کر دینا یاد ہے شادی کے بعد بھی تم اُسے نہیں بھولی تھی۔ شاید تمہیں یاد ہو، ایک بار میں نے تمہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ پھر ایک دفعہ اتفاق سے میں نے اُس کا فون ریسو کیا تھا اور میری آواز پر تمہارا

نار کے اُس نے تمہیں واپسی کی نوید دی تھی۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

”مزید سننے کا حوصلہ رکھتی ہو تو سنو، اب بھی سب سے پہلے اسی کا پروپوزل آیا ہے۔ کیوں؟ اُسے معلوم ہوا کہ شہر وز بھائی نے تمہیں چھوڑ دیا ہے؟۔ یہ ساری باتیں شاہد ہیں کہ تمہارا اس سے رابطہ کبھی نہیں ٹوٹا۔“ وہ جھٹلانا چاہتی تھی لیکن آواز حلق تک آکر ساتھ چھوڑ گئی۔

”اعتراض کر لو ربیعہ کہ تم نے ثاقب حسن کے ساتھ مل کر شہر وز احمد کو دھوکا دیا ہے۔؟“

نفی میں سر ہلاتے ہوئے اُس کی آنکھیں چمک پڑیں۔ لیکن صوفیہ پر اُس کے آنسوؤں کا کوئی اثر نہ ہوا، کہنے لگی۔

”جب اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر چکی ہو تو پھر کیوں روتی ہو؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ لیکن میں نہیں آتا کہ اب تم ثاقب حسن کے پروپوزل سے انکار کر کے کسے دھوکا دینا چاہتی ہو۔“

”آپ کو یا ہم سب کو۔“ کچھ دیر خاموش رہ کر تانسف بھرے لہجے میں کہنے لگی۔

”معاذ کرنا ربیعہ۔ مجھے شروع سے تم پر رحم آیا کرتا تھا کہ تم کس قدر بے وقوف اور بزدل ہی ہو۔ نہیں زندگی میں آنے والی دشواریوں اور امتحانوں کا سامنا کیسے کر سکو گی؟۔ لیکن تم نے تو کمال کر

اس خوبصورتی سے ساری دشواریاں اور سارے امتحان شہر وز احمد کے راستے میں ڈال کر خود ات نکل آئیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ قابلِ رحم تم نہیں، وہ شخص شہر وز احمد ہے جواب بھی

ادری پر وہ پوچھ کر رہا ہے۔ ورنہ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو سارے شہر میں تمہارا اشتہار لگوا دیتا۔ یہ

میں شرافت ہے کہ خاموشی سے تمہیں الگ کر دیا۔“ صوفیہ تلخی سے بولتی چلی گئی۔

”چھوٹی آیا۔“ وہ بڑی دقتوں سے بول پائی۔ ”آپ کی باتوں میں ذرا بھی صداقت نہیں ہے۔“

”یہی سچ ہے جو میں کہہ رہی ہوں۔“ صوفیہ چٹانیں کیسے اتنی کٹھور بن گئی۔ ”تم میری کون کون

بات بھٹلاؤ گی۔؟“

”میں آپ کی کوئی بات نہیں بھٹلاؤں گی لیکن میں نے ایسا کبھی نہیں چاہا تھا۔“ وہ اور شدت سے روتے ہوئے بولی۔

”پھر کیا چاہا تھا تم نے؟“ صوفیہ کیلے لہجے میں پوچھنے لگی۔

”میں چاہتی تھی ثاقب حسن درمیان سے ہٹ جائے لیکن۔“

”لیکن اُس نے شہر وز احمد کو ہٹا کر دم لیا۔“ صوفیہ بات کاٹتے ہوئے ملامت آمیز نظروں سے نکل کر طرف دیکھنے لگی کہ وہ اپنی جگہ کٹ کر رہ گئی۔

”بہر حال میں تو یہی کہوں گی کہ غلطی تمہاری ہے اور اس کی سزا آٹاں ابا کو نہیں بھگتنی چاہیے“

خود بھگتو۔“

”کیس سزا۔؟“ وہ سہم کر پوچھنے لگی۔

”آٹاں اور آبا میاں تمہارے لیے بہت پریشان ہیں، تمہیں ان کی پریشانی دور کرنی چاہیے۔“

”میرے اختیار میں کیا ہے چھوٹی آیا؟“ وہ بے بسی سے روتے ہوئے بولی۔

”تمہارے ہی اختیار میں ہے۔ جب تم اپنی غلطی تسلیم کر رہی ہو اور سزا کے لیے بھی تیار ہو تو

اب حسن کو سزا کے طور پر ہی قبول کر لو۔“

”میرے ناکرہ گناہوں کی اتنی بڑی سزا۔؟“ اُس کے آنسو جو پل بھر کو ٹھہرنا چاہ رہے تھے، پھر بہنے لگے۔



”مہر و زکواہاں ہے؟“ اتنی کواچانک خیال آیا تو پوچھنے لگیں۔  
”اپنے کمرے میں۔“

”تم بھی تھک گئی ہو گی۔ جاؤ جا کر آرام کرو۔“  
”آپ کھانا نہیں کھائیں گی؟“

”نہیں بیٹا۔ اس وقت نہیں، البتہ شہروز کا خیال رکھنا، آئے تو کھانا وغیرہ پوچھ لینا۔“  
”جی بہتر۔“ وہ آٹھ کمران کے کمرے سے نکل آئی۔ بہت آہستگی سے اپنے کمرے کا دروازہ کھ  
کر اندر جھانکا، مہر و زکیہ میں منہ چھپائے لیٹا تھا۔ وہ سمجھ گئی اس وقت وہ کوئی بات نہیں کرے  
اسی طرح آہستگی سے دروازہ بند کر کے وہ لاؤنج میں آ بیٹھی۔

عجیب سا پراسرار ماحول ہو گیا تھا اس گھر کا۔ ہر شخص ایک دوسرے سے نظریں چراتے اپنے  
کو مخم تصور کرتا۔ جیسے وہی اس گھر کی بادی کا ذمہ دار ہو۔ ابھی ابھی وہ خود بھی ایسا ہی محسوس کر  
لگی تھی۔ جیسے ربیعہ کی شادی میں شرکت کر کے وہ کسی بڑے جرم کی شریک ہوئی ہو۔  
”میں نے ایسا نہیں چاہا تھا چھوٹی آپا۔“ تنہائی اور خاموشی میں بسکتی ہوئی سرگوشی اسے اپنے  
آس پاس سنائی دی۔

”میرے ناکردہ گناہوں کی اتنی بڑی سزا ملے اور پھر۔“

”کبھی فرصت ملے تو شہروز احمد کا محاسبہ بھی ضرور کیجیے گا کہ اس سارے قفسے میں ان کا کیا کر  
تھا۔ بہت قابل رحم ہے ناں وہ شخص۔“

اس نے طویل سانس لے کر صوفے کی پشت سے مڑ نکاتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں اور ابھی  
ان آوازوں سے نکل بھی نہ پائی تھی کہ شہروز احمد آ گئے۔ انہوں نے شاید اسے نہیں دیکھا تھا۔ سید  
بلیک کو غلطی سے آنکھوں مل گئے۔ اور وہ ان کے قدموں کی آہٹ پر آنکھیں کھول کر انہیں دیکھنے لگی۔ پھر کچھ  
سی لے۔ زیادہ تو وہ پہلے بھی نہیں بولنا پڑے پرناک کیا اور کمران کی آواز پر اندر داخل ہو گئی۔  
آنکھوں میں ایک موم مٹھ سا گیا تھا۔ وہی آداسیوں اس پر ڈال کر پوچھنے لگے۔

”آپی۔“ کلنٹم اور ہما باقاعدہ پروگرام کے تحت اس کے پاس گئے۔

”نہیں تو۔“ اس نے حیران ہو کر باری باری دونوں کو دیکھا۔

”پھر آپ ہم سے بات کیوں نہیں کرتیں۔ ہمارے ساتھ بیٹھتی پوچھ لوں۔“  
”سر جھٹکالیا۔“

”ہم آپ سے چھوٹے ضرور ہیں لیکن اتنے بھی نہیں جتنا آپ سمجھتی ہیں۔“  
”یہ جو آپ چپ چاپ دل پر بوجھ لیے پھرتی ہیں تو آپ کیا سمجھ رہی ہیں؟“  
”نہیں آپی، ہمیں سب خبر ہے۔“ قدرے توقف کر کے کلنٹم کہنے لگی کہ ”اگر آپ نے جھانک  
آپ نیا گھر بساے جا رہی ہیں، تو کیا یہ اچھا نہیں ہوگا کہ آپ دل کا سارا بوجھ ہم  
”کلنٹم ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ ہما کہنے لگی۔ ”گذری باتوں کو بھلا دیتا ہی اچھا ہے۔“  
”یہ تو بھول جانا اور بھی ضروری ہے۔“

یہ دونوں جو اس سے چھوٹی تھیں، اسے سمجھانے کی کوشش میں کیا کہہ رہی تھیں اس کے ہاتھ میں کا  
اور زحمت بھی۔ بڑی مشکل سے سر اٹھا کر دونوں کو دیکھتی ہوئی بولی۔

”میں گزری باتیں یاد نہیں کرتی۔“

”پھر کیا بات آپ کو آزدہ رکھتی ہے؟“

”یہ آپ کے پاس کیسے آیا؟“  
”بھینے والے نے بھیجا اور مجھ تک پہنچ گیا۔“ عام سے لہجے میں کہتے ہوئے چائے کا کپ اٹھا  
کر صوفے پر جا بیٹھے۔

”بس نے بھیجا تھا آپ کو؟“ وہ پتا نہیں کس پر شک کر رہی تھی۔ انہوں نے ٹٹولتی نظروں سے  
اس کی طرف دیکھا۔ پھر سابقہ لہجہ برقرار رکھتے ہوئے بولے۔  
”ثاقب حسن نے۔“

”آپ یا وہ۔ میرا مطلب ہے آپ دونوں ایک دوسرے کو کیسے جانتے ہیں؟“  
”صوفیہ۔ بیٹھ جائیں آرام سے۔ اور یہ بتائیں آپ کیا پوچھنا چاہتی ہیں؟“ اسے اُبھتے دیکھ  
کر زبی سے بولے تو وہ ان کے سامنے رکھی میز کے پاس نیچے قالین پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی پھر کہنے  
لگی۔

”آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں کیا پوچھنا چاہتی ہوں؟“  
”اگر ثاقب حسن کے بارے میں پوچھنا چاہتی ہیں تو ابھی کچھ دن پہلے ہماری ملاقات ہوئی ہے۔  
وہ بھی بزنس کے حوالے سے۔ غالباً وہ اس فیلڈ میں نیا ہے لیکن۔“

”شہروز بھائی پلیز۔“ وہ بغور انہیں دیکھ رہی تھی، لوگ گئی۔ ”مت جھوٹی کہانیاں سنائیں  
بچے۔ میں صرف سچ سننا چاہتی ہوں۔“  
”کیسا سچ۔“

”میں نے اس روز آپ سے کہا تھا ناں کہ مجھے لگتا ہے، آپ کے اور ربیعہ کے درمیان کوئی  
تیسرا شخص بھی تھا اور آپ نے اس بات سے انکار کیا تھا لیکن جب میں نے ربیعہ سے پوچھا تو۔“  
”تو انہوں نے اعتراف کر لیا ہوگا۔“ اس تمام عرصے میں آج پہلی بار ربیعہ کا نام سن کر انہوں نے  
فوراً موضوع ختم کرنے کا اشارہ نہیں دیا جیسا کہ اکثر سختی سے ہونٹ بیچ کر لیا کرتے تھے، اس کے  
برعکس طویل سانس لیتے ہوئے یوں نظر آنے لگے جیسے اپنے آپ سے لڑتے لڑتے ہار گئے  
ہوں۔

”جب وہ اعتراف کر چکی ہیں تو اب آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتی ہیں؟“

”صرف اتنا بتا دیں کہ کیا آپ ثاقب حسن کو شروع سے جانتے تھے؟“

”ہاں۔“ اور اس ہاں کے بعد انہوں نے ’الف‘ سے ’ئے‘ تک ساری داستان کہہ سنائی۔  
اب کیا پوچھتا ہے جب کہ وہ بزدل لڑکی اعتراف کر گئی تھی۔ وہ چھٹی چھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ  
لگی۔ جو کہہ رہے تھے۔

”شروع میں میرا خیال تھا، میں ایک ممبور اور بے بس شخص کی مدد کر کے نیکی کما رہا ہوں۔ لیکن  
اب احساس ہوتا ہے جیسے میں نے زندگی میں سب سے بڑا گناہ کیا ہے جس کی کوئی معافی نہیں۔“  
”ہاں۔ جس کی کوئی معافی نہیں۔“ اس کے اندر بے حد آزدگی سمٹ آئی۔ دل چاہا جین جین کر  
دروپار ہلا دے اور اپنا ماتھ سامنے بیٹھے شخص کے گریبان تک لے جائے، زیادہ نہیں، بس اتنا  
پوچھنے۔

”تمہیں میری بہن کی زندگی سے کھیلنے کا حق کس نے دیا تھا؟“

لیکن وہ کچھ نہیں بولی۔ نہ شکوہ، نہ شکایت اور نہ ہی کوئی ملامت۔ چپ چاپ آٹھ کمران کے  
کمرے سے نکلے تو یہ احساس بھری طرح غالب آکر اندر ہی اندر کچوکنے لگا تھا کہ ثاقب حسن اور  
شہروز احمد کی طرح وہ بھی ربیعہ کی مجرم ہے۔

وہ بڑی سادگی سے تیار ہوئی تھی اور جو برائے نام میک آپ کیا تھا، وہ بھی آنسوؤں کی نذر ہو گیا

تھا۔ انیلا اور اس کی بڑی بہنوں نے جلدی عروسی میں سچ پر بٹھا کر جب اس کا جائزہ لیا تو وہ کسی طرح بھی ذہن نظر نہیں آ رہی تھی۔

”اس کا میک آپ تو ٹھیک کرو، اس طرح اگر ثاقب نے دیکھ لیا تو ڈر جائے گا۔“ پہلا ریمارکس جو سننے کو ملا، اس نے اسے مجدد رفتہ میں دھکیل دیا۔ کس طرح نرا اور آپنی نے اسے سنوارتے ہوئے سراہا تھا۔ ان کے بے ساختہ تعریفی جملے ذہن کے دریعوں پر دستک دینے لگے تھے کہ انیلا کی لپکار نے چونکا دیا۔

”ربیعہ۔ تم منذ دھولو، میں تمہارا میک آپ کر دیتی ہوں۔“ وہ چپ چاپ آنکھ کر ہاتھ روم میں چلی گئی۔ منذ دھو کر واپس آئی تو انیلا میک آپ بکس کھلے بیٹھی تھی۔ اس نے قدرے جھجکتے ہوئے کمرے میں کھڑی لڑکیوں کا جائزہ لیا اور اپنی جگہ پر اٹھیں۔ پھر انیلا کا ہاتھ چلنے لگا اور باقی سب کی زبانیں۔ ہر کوئی مشورہ دے کر اپنے آپ کو ماہر بیویشن ثابت کرنے پرتی ہوئی تھی۔

اپنی آوازوں میں اس کا دل گھبرانے لگا، کاش وہ انیلا سے کہہ سکتی، ان سب کو باہر بھیج دو لیکن درمیانی دوسالوں نے اس کے سارے مان چھین لیے تھے۔ اس لیے چپ چاپ اپنا غماخا دیکھتی رہی۔ آخری پر دے کر انیلا نے داوطلب نظروں سے اپنی بہنوں اور کزنز کی طرف دیکھا۔ تو کوچہ نے بے دلی سے سراہا۔ اور ایک نے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

”روپ نہیں آیا۔“ ”روپ کیسے آئے گا، کوئی پہلی بار تھوڑی ذہن بنی ہے۔“ یہ آواز تینا نہیں کس کی تھی، اس کے دل میں ترازو ہو گئی۔ ابھی سنبھلی بھی نہیں تھی کہ تسخیرانہ ہنسی کے ساتھ ایک اور آواز۔

”گویا سارے روپ پہلے ہی لٹا آئی ہیں۔“ ”اور کیا۔“ ”بے چارے ثاقب بھائی۔“ ”کتنے شاندار لگ رہے ہیں آج۔“ ”چلو نظر گینے کا اندیشہ نہیں رہا۔“ ”ہاں نظر ہو گا ساتھ جو ہو گیا۔“

سب کی مشق کہ ہنسی نے کمرے کے اندر شور برپا کر دیا تھا جس میں انیلا کی آواز دب کر رہ گئی تھی۔ جو سب کو خاموش کرنے کے ساتھ کمرے سے جاتے کا کہہ رہی تھی۔ جب کوئی شنوائی نہیں ہوتی تو اس کا ہاتھ تھپک کر ندامت سے بولی۔

”پلیز ربیعہ۔ تم خیال مت کرنا۔“ وہ خود اپنے آپ میں بڑا عجیب سا محسوس کر رہی تھی، نظر اٹھا کر انیلا کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی تو پیشانی گھنٹوں پر ٹیک لی۔ اسی وقت اس کی سانس اندر آئیں اور سب لڑکیوں کو جانے کے لیے کہا۔ کچھ دیر بعد ہی ایک دم خاموشی چھا گئی۔ اس نے کچھ ڈرتے ڈرتے سر اٹھا لیا۔ پھر کمرے میں کسی کو موجود نہ پا کر اطمینان بھرا سانس لیتی ہوئی سیٹھی ہو کر بیٹھ گئی۔

وہ خالی الذہن سی ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔ کمرہ خاصا کشادہ اور خوبصورتی سے سجا ہوا تھا۔ لیکن کسی چیز نے اسے سحر زدہ نہیں کیا، نہ اس کی توجہ کھینچی۔ حالانکہ وہ تو کسی معمولی سی شے میں معمولی سی خوبصورتی دیکھتے ہی اس میں مگن ہو جاتی تھی۔

لیکن اب شاید وہ جان گئی تھی کہ ہر خوبصورت شے درحقیقت خوبصورت نہیں ہوتی۔



نے ہر سری نظر ڈال کر اس نے دوبارہ گھنٹوں پر پیشانی ٹکائی ہی تھی کہ کمرے سے باہر بھاری قدموں سے گھنٹیں۔ اس کے اندر یہاں سے وہاں تک سناٹوں کا راج تھا۔

”خدا۔ کوئی شور اٹھے، کوئی پھل مچے، کچھ تو ہو، آخر میں اتنی مایوس اور دگر رفتہ سی کیوں بن زفاف کی یہ آہٹیں میرے احساسات کی کلیوں کے کھلنے کا سبب کیوں نہیں بنتیں؟“ اس کی بی بی آتے لگی۔ اور پکوں تک آنے کو تھی کہ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے ساری نمی ایک پل کے اندر مار لی۔

”ثاقب حسن اس کے سامنے بیٹھا تو کہنے لگا۔“ گلتا ہے تمہیں دیکھے ہوئے زمانہ بیت گیا۔ ربیعہ سے مت چھو۔ پلنریہ سارے نقاب ہشادو۔“

انے ذرا سا سر اٹھا لیا۔ تین چہرے پر اپنل ویسے ہی رہتے دیا، جسے اُلٹے میں ثاقب حسن نہیں کی۔ اس کے چہرے پر نظر پڑی تو کتنی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔

وہ ربیعہ تو نہیں تھی جسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کی گندی رنگت کی شادابی جانے کہاں کھو گئی تھی؟ بصورت آنکھوں کے گرد حلقہ جو میک آپ کے باوجود چھپے نہیں رہ سکے تھے۔

یہ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“ وہ شہادت کی انگلی اس کی کھوڑی کے نیچے لگا کر اس کا چہرہ اوجھا بولا۔ تو وہ ذرا سی بلکیں اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

بانے تمہیں آزما نشوون میں دھکیل دیا تھا۔“ وہ کہنے لگا۔ ”لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ میرا منتخب کیا یہ پرفارم ہی بلا حرکت گیا۔ اگر میں یونہی تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیتا تو بلن کی برات ہمارے برابھی نہ آتی۔“

لوٹش کے باوجود آنکھوں میں آنے والی نمی کو نہ روک سکی جو دوسرے ہی پل رخساروں پر آئی تھی اور ثاقب حسن یقیناً اس وقت اپنی جیت اور پالنے کے نشے میں سرشار تھا۔ جی ان آنکھوں کا اصل سبب نہ جان سکا۔ بلکہ وہ یہی سمجھا کہ اس کی بدلتی میں اس کا یہ حال ہوا ہے۔

جی وہ اپنے جذباتوں کے اظہار میں موتی لٹا رہی ہے۔ ”ہاں جانتا ہوں گذشتہ دو برسوں میں تم نے میرے لیے بہت موتی لٹائے ہوں گے لیکن اب آنکھوں پر مزید ستم موت دھاوا، اب تو میں آگیا ہوں ناں، گذشتہ تمام دکھوں کی تلافی کرنے، بچنے کے لیے اس کے ہونٹ نیم وا ہوئے تھے کہ وہ اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ گیا۔

ن وقت کوئی شکوہ کوئی شکایت نہیں، یہ ساری باتیں بعد کے لیے اٹھا رکھو، میں سب نہ صرف بلکہ تلافی بھی کروں گا۔ اس وقت تو مجھے صرف یہ یقین کر لینے دو کہ تم میرے پاس ہو۔ میرے قریب۔“

وہ اس کی سرشاری کیفیت سے فائدہ اٹھا کر اپنے اندر چلتے نفرت کے جذبات کو تھپک تھپک سے گئی کہ تقدیر نے اگر اسے اس کا مجازی خدا بنا ہی دیا تھا تو وہ اگر اس سے محبت نہیں کرنا تو نفرت کرے گناہگار بھی نہیں ہونا چاہتی تھی۔

کا بہت جلدی آنکھ کھل گئی۔ کمرے کے اندر پھیلا ملکجا سا اندھیرا اس بات کا غماز تھا کہ ابھی نے پوری طرح اپنے پر نہیں بھیلائے۔ اس نے ذرا سی گردن موڑ کر ثاقب حسن کی طرف دیکھا، نہ سوراہا تھا۔ کچھ دیر تک یونہی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اپنے مسائل کو ششست دے کر اور پھر لالچ کا میاں پر، وہ کتنی گہری اور پرسکون نیند سو رہا تھا۔

انگ اُسے گئے دنوں کا وہ ثاقب حسن یاد آیا جو کانڈھوں پر مسائل کا بار گرا لیے وسائل کی تلاش اٹھا پھر اٹھا۔ پھر میرا بدن اور چہرے پر حالات کی شکست لے آئے والے دنوں سے آتی تھی۔ اور اب جیسے ایک دنیا کو تسخیر کر لیا تھا کہ نیند میں بھی ہونٹوں پر مسکراہٹ چل رہی تھی۔

کرنی ملاقات ہوئی ہے۔ خاصا خوش شکل اور خوش مزاج ہے۔ میرا خیال ہے تم جلدی ایڈجسٹ کر لو گی۔  
 پر انہیں اپنی بات روکنی پڑی کیونکہ اس کی بڑی نندناشتے کی ٹرے لیے آ رہی تھی، ساتھ شاقب حسن  
 تھا۔

آئیے جی۔ ناشتا کر لیں۔ شاقب حسن نے اُس کے ساتھ ساتھ بڑی آپا کو بھی ناشتے کے لیے بلایا تو  
 ہمارے دروازے پر آئی۔

اس میں اب چلوں گی۔ کیونکہ بچے کو چھوڑ کر آئی ہوں، وہ کلوم اور ہما کو پریشان کر رہا ہو گا۔  
 ایک کپ چائے ہی پی لیں۔ شاقب حسن نے اصرار کیا۔

پھر سی۔ اچھا ربیعہ میں چلوں۔ انہوں نے ربیعہ کو اٹھا کر ٹیبل کے پاس بٹھایا پھر خدا حافظ  
 ہوئی چلی گئیں۔ اُن کے پیچھے اس کی نند بھی کمرے سے نکل گئی۔ تب شاقب حسن اُس کے پاس بیٹھا

چلو بھئی۔ جلدی سے شروع ہو جاؤ۔ مجھے شام کی تقریب کے سلسلے میں بہت سے کام کرنے ہیں۔  
 اس اس کے سامنے رکھتا ہوا بولا۔

کیسی تقریب؟ وہ بے خیالی میں پوچھ گئی۔  
 ایسی تقریب۔ وہ دہراتے ہوئے بے حد حیران نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا اور وہ کیونکہ سر

نے میٹھی تھی۔ اس لیے اس کی آنکھوں میں چلتی حیرت نہ دیکھ سکی۔  
 غالباً آج ہمارا ولیم ہے۔ وہ اس کی لالعلقی پر قدرے طنز سے بولا۔ اور لہجے میں چھپا طنز اُس

حسابات کو لمحہ بھر کے لیے منہ کر گیا۔  
 تیس یا تیس رہا یا اس تقریب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بظاہر عام سے انداز میں بات کر

تم مجھے کیا یاد دلانا چاہتے ہو؟ وہ اندر کی آرزو کو لیے میں اُترنے سے نہ روک سکی۔  
 میں کیا یاد لاؤں گا تمہیں۔ میں تو یہ چاہوں گا کہ تم سب کچھ بھول جاؤ۔ ہرگز ریلی بات، ہرگز ریلی جو

بے بغیر گزرا۔  
 پتا نہیں۔ مشکل وقت میں سب اس کا ساتھ کیوں چھوڑ جاتے ہیں، یہاں تک کہ اُس کی آواز بھی اس وقت

اساتھ چھوڑ گئی تھی۔ ورنہ وہ جھوٹ ہی ہے، یہ کہہ کر اسے مطمئن کر دیتی کہ میرا کوئی پل تمہاری یاد کے بغیر  
 باؤرا۔ لیکن وہ اپنی آواز کو صدائیں دیتی رہ گئی۔ اور وہ ناشتا کر کے اٹھ بھی گیا۔

پھر سارا دن اُس کے کمرے میں لڑکیوں اور خواتین کا آواز جانا لگا رہا۔ لڑکیوں سے اُس کی نندیں تعارف  
 تیں اور خواتین سے اُس کی ساس۔ ساتھ ہی مختلف جگہ بھی سننے کو ملتے رہے۔ دوپہر کا کھانا اُس

لکے کے ساتھ ہی کھانا پڑا۔ اس کے بعد اُس کا دل چاہا، سو جائے لیکن کسی نے موقع ہی نہیں دیا۔ نہ ہی کسی  
 لڑکیا، سب اس کے پاس ڈیرا جمائے بیٹھی ہیں۔

شام کی تقریب میں وہ تھکی تھکی سی تھی۔ اس کے باوجود تھکنے سے میٹھی رہی۔ تقریب کے بعد اُن کا آسے  
 ساتھ لے جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا شاید اس کی دوسری شادی کی وجہ سے وہ رسوں کو اہمیت نہیں

دیتی تھیں۔ لیکن صوفیہ بھند تھی اور اُن سے کہہ کر اسے ساتھ لے آئی۔ سارا دن بیٹھے بیٹھے وہ اتنی تھکی  
 تھی کہ اُن کے گھر آتے ہی کپڑے بدل کر لیٹ گئی۔ خیال تھا فوراً سو بھی جائے گی۔ لیکن صوفیہ چائے

پھونکیا۔ آپ؟ وہ اٹھ کر بیٹھتی ہوئی بس اسی قدر کہہ سکی۔  
 چائے آج میں تمہاری وجہ سے یہاں رکی ہوں۔ صوفیہ ایک مگ آسے تھما کر اس کے پاس ہی

رکھی۔  
 میری وجہ سے؟

ہاں تمہاری وجہ سے ورنہ تم جانتی ہو، میں رات یہاں نہیں رکتی۔ خیر تم چائے پیو۔ اُن اور چھوٹی

اُسے اس پر ترس آنے لگا۔

شاقب حسن۔ جب تمہارے پاس کچھ نہیں تھا، تب تمہارا دامن معتوں سے لبریز تھا اور اب  
 تمہارے پاس سب کچھ ہے تو اس معاملے میں تم بالکل تہی دامن ہوئے اُس نے سوچا اور بہت افسوس

پڑے اُن کی۔ پہلے گھر کی سے پردہ ہٹا کر دیکھا، باہر کا منظر باؤں کن تھا یعنی ایک تنگ سی گلی تھی اور  
 سے پہلے کہ اسے کوئی اور منظر یاد آتا۔ اُس نے پردہ چھوڑ دیا۔ پھر الماری سے اپنے کپڑے نکال کر

باتھ روم میں چلی گئی۔ نہ کہ رنگی تو شاقب کمرے میں موجود نہیں تھا۔ اُس نے ایک نظر گلی کے دروازے کی  
 طرف دیکھا اور ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ اُسے کیا کرنا چاہیے کہ اُس کی بڑی نند اندر آ گئی۔ پہلے اس کا

لیا، پھر کہنے لگی۔  
 یہ کون سے کپڑے پہن لیے ہیں تم نے؟

اُس نے خاموشی سے سر جھکا لیا تو کہنے لگی۔  
 یہ میسج ہے کہ تمہاری دوسری شادی ہے اور تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن اب ہمارا

کو تو یہ بات معلوم نہیں ہے ناں۔ نہ ہی ہم نے کسی کو بتایا ہے۔ چلو کوئی ڈھنگ کے کپڑے پہن  
 بلکہ میں خود نکال دیتی ہوں۔

یہ صورتحال اور ایسی باتیں تو اس کے گمان میں بھی نہیں تھیں۔ گویا یہاں بھی وہ غم ہے۔  
 گہرے احساس میں گھر کر وہ زردیہ نظروں سے اسے الماری کھولتے ہوئے دیکھنے لگی۔ پھر اُس

نے گہرے جامنی رنگ کا شلوار سوٹ جس پر تیلے کا کام کیا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں تھما ہوا  
 جلدی پہن لینے کی تاکید کرتی ہوئی، کمرے سے نکل گئی۔ اُس نے ایک نظر سوٹ پر ڈالی اور پھر نہ

ہوئے بھی اُسے پہن لیا۔  
 ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو یہ رنگ اس پر بالکل میسج نہیں کر رہا تھا۔ پھر

رنگت چھکی چھکی اور آنکھوں کے گرد حلقے، سوٹ کے رنگ سے مل رہے تھے۔ اسے اپنا آپ برا عیب  
 شاید اس لیے بھی کہ وہ بہت دلفن کے بعد اس طرح اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی۔

یہ میں ہوں؟ اپنے آپ سے سوال کرتے ہوئے وہ انگلیوں سے اپنا چہرہ چھونے لگی۔ کبھی وہ  
 انگلیاں آنکھوں کے گرد حلقوں پر گردش کرتیں، کبھی ہونٹوں پر اور کبھی رخساروں پر۔ پھر جاتیں۔

”روپ نہیں آیا؟“ اچانک رات کی بات یاد آئی۔ پتا نہیں کس نے کہا تھا۔  
 ”روپ کیسے آئے گا؟ کوئی پہلی بار تھوڑی دلفن بنی ہے۔“

”گویا سارے روپ پہلے لٹا کر آئی ہے۔“  
 سارے روپ میں ضرور لگتی، اگر جو میرے راستے میں دیواریں نہ کھڑی ہوتیں۔ اُس نے سو

چہرے کی پچھلی رنگت کو چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔ ایک آپ سے فارغ ہو کر ابھی اپنی جگہ پر  
 تھی کہ انیلا کے ساتھ اس کی اپنی بڑی آپا آگئیں۔ شاید رواج کے مطابق ناشتا لے کر آئی تھیں۔

کے دیس میں کوئی اپنا نظر آیا تو آپ ہی آپ ہونٹوں پر مسکراہٹ رنگ گئی۔  
 کیس ہو؟ بڑی آپا نے اُسے گلے لگا کر پیار کیا تو وہ صرف سر ہلا سکی۔

میں ناشتا لے کر آئی ہوں۔“ انیلا کچھ شورش نظروں سے اُسے دیکھتی ہوئی کمرے سے نکل گئی  
 آپا تنقیدی نظروں سے کمرے کا جائزہ لینے لگیں پھر اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”خوش ہو۔؟“

”پتا نہیں خوش کیسے کہتے ہیں؟“ اُس نے سوچا۔

”تمہیں خوش رہنا چاہیے۔ بڑی آپا اُس کے سر جھکانے پر کہنے لگیں۔ تمہاری قسمت اچھی ہے بول  
 میں دوبارہ گھر بس گیا۔ ورنہ آج کل اچھے رشتے ملتے کہاں ہیں۔ ابھی آتے ہوئے میری شاقب حسن

والی تھی۔ تب بھی میں اور کچھ نہیں تو تمہیں ثاقب حسن جیسے شخص سے تو پناہ ہی سکتی تھی۔ لیکن تم نے ایک تو مجھے، دوست اور ہمدرد نہیں جانا، مجھ پر اعتبار نہیں کیا، دوسرے اپنے آپ پر بھی ظلم کیا ہے۔ میں کسی پر کیا اعتبار کرتی جب تقدیر ہی مہربان نہیں تھی۔

تقدیر کو الزام دے دو۔ تقدیر شروع ہی سے تم پر مہربان تھی، اسی روز سے جس روز تمہارا شہر و زامہ سے اج ہوا تھا لیکن تم نے اس مہربانی سے خود منہ موڑا۔

میں کبھی منہ نہ موڑتی اگر جو وہ شخص صبح معنوں میں مجھے اپنی بیوی تسلیم کر لیتا۔ لیکن اُس نے ہمیشہ مجھے کی امانت سمجھا۔ اور۔۔۔ اب بس کریں چھوٹی آیا۔ میں نے کہا ہے ناں، گزری باتوں کو مت دہرائیں۔ جب کہ میں ثاقب حسن کے ساتھ نئی زندگی کی ابتدا کر چکی ہوں تو مجھے زیب نہیں دیتا کہ میں کسی دوسرے کے بارے میں بات کروں۔۔۔ قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔ صبح ثاقب بھی کہہ رہا تھا کہ مجھے گزری بات بھلا دینی چاہیے۔

ظاہر ہے وہ اور کیا کہے گا۔ صوفیہ طنز کرنے سے باز نہ رہ سکی۔ پھر اس کی دل آزاری کا خیال کر کے فوراً مذرت کرتی ہوئی اصل بات کی طرف آگئی۔

آئی ایم سوری۔ میں بھی تمہیں یہی بات سمجھانا چاہتی ہوں۔ دیکھو ربیع، میری نظر میں تم دنیا کی بڑول در بڑول ترین لڑکی ہو۔ اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ حالات بھی تمہیں سمجھانے میں ناکام رہے ہیں۔ ہماری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو ایک ہی ٹھوکر پر سنبھل جاتی۔ لیکن تم اگر ساری زندگی دھوکے پر دھوکا کھاتی ہوئی، تب بھی ایسی ہی ہو گئی۔

میں کیا کروں؟ وہ بے چارگی سے بولی۔

دوبی کرو جو حالات کا تقاضا ہے۔ پھر باقاعدہ سمجھاتے ہوئے کہنے لگی۔ جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا ہے نے بھلا نا آسان نہیں ہے لیکن تم اسے بھلا دینے کا فریب تو دے سکتی ہو ناں۔ آخر تمہارے ساتھ بھی ذریعہ ہوا۔ اور جس شخص نے تمہاری زندگی کے ساتھ یہ مذاق کیا تھا تم اسی کے ساتھ غافل کر ڈالو۔

کیا مطلب؟ وہ بالکل نہیں سمجھی۔

کیا اب تم کبھی ثاقب حسن سے محبت کر سکتی ہو؟ صوفیہ اٹا اُس سے سوال کرنے لگی۔

پتا نہیں۔

صاف کہو کبھی نہیں، اور اس کے باوجود تمہیں بقیہ تمام عرائس کے ساتھ رہنا ہے، اسی کے بچوں کی ان منشا ہے کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی اور خود تم بھی نہیں چاہو گی کہ تمہارے ماتھے پر دوبارہ کوئی داغ لگے، ذریعہ اسی صورت میں ممکن ہے جب تم اس گھر کی بنیادیں مضبوط کر لو گی اور بنیادوں میں جب تک محبت اور اعتبار لائیں گے، گھر مضبوط نہیں ہوتا۔

چھوٹی آیا۔ وہ اچھے لگی۔

اپنے آپ پر سے یہ سر و مہر کی لبادہ آتا دو، ورنہ اگر ثاقب حسن کو ذرا بھی یہ شبہ ہو گیا کہ تم عبور اُس کے ساتھ بنا کر رہی ہو تو وہ کوئی انتہائی قدم اٹھانے سے ذرا بھی دریغ نہیں کرے گا۔ قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔ جس طرح وہ اپنی جیت کے نشے میں سرشار ہے، تم بھی اُس کے ساتھ شریک ہو جاؤ۔ اُسے بڑھاپا لاؤ کہ شہر و زامہ کے گھر دو سال تم نے بڑی اذیت میں گزارے ہیں۔ اور یہ کہ ہر مل تم نے اس کے نظار میں کاٹا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو ناں۔ تمہیں کا یہ فریب تمہیں دینا ہے ورنہ زندگی کے اسے تنگ ہو جائیں گے، وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔

میں مر جاؤں گی۔ وہ رو دینے کو ہو گئی۔

کوئی نہیں مرتا، جب تک مرنا کھانا گیا ہو۔ یہ دنیا ہے، یہاں اب فریب کے سوا کچھ نہیں رہا۔ خود ہائے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ کم نہیں۔ اگر تم ایک فریب کر لو گی تو قیامت نہیں آجائے گی اور پھر یہ ضروری

دونوں کو آتے دیکھ کر صوفیہ موضوع بدل گئی۔

بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو؟ اماں اس کے تھکے تھکے چہرے کو دیکھتی ہوئی بولیں۔

ہاں اماں، اصل میں سارا دن لیٹنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کرا کوٹھی ہے۔

مہمان بھی تو ان کے گھر میں بھرے ہوئے ہیں۔

اسی لیے تو میں اسے ساتھ لے آئی ہوں۔ یہاں ذرا آرام سے سوئے گی۔ صوفیہ نے فوراً تو یہ

پیش کی۔

چلو تو اب سوئے دو اُسے۔ اماں نے فوراً کہا۔

میں کیاں چلوں، میں یہیں سوؤں گی اس کے پاس۔ پھر کلثوم سے کہنے لگی۔ کلثوم پلیز اس کو

چارپائی پر رکھیں بچھا کر تنکیہ رکھ دو۔

کلثوم نے سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً اس کا لیٹر لگا دیا۔ تو وہ اپنا اور بیہ کاغذ

مک آتے سمٹاتے ہوئے بولی۔

چلو، اب تم بھی جا کر سو جاؤ۔ میں بھی نیند آ رہی ہے۔

کوئی نہیں چھوٹی آیا۔ میں ابھی نیند نہیں آ رہی ہے۔ کلثوم نے ربیع کی محبت میں کہا۔

نیند نہیں آ رہی تو بیٹھ کر پڑھو۔ صوفیہ نے اُسے ہٹانا چاہا۔

پڑھنے کا موڈ نہیں ہے۔

پھر۔۔۔

پھر یہ ہم آپ کی ساتھ باتیں کریں گے۔

تمہاری آپ کی کہیں سمجھا گیا نہیں جا رہی۔ صبح باتیں کر لینا۔ ابھی دیکھ نہیں ہی ہو سکتی تھکی ہوئی ہے صوفیہ

نے ڈانٹا تو وہ بول پڑی۔

بیٹھنے دیں۔ چھوٹی آپا کیوں ڈانٹ رہی ہیں؟

اُنہیں ڈانٹنے کے علاوہ اور آتا ہی کیا ہے؟ کلثوم منہ بھلائے ہوئے چلی گئی۔ تو وہ صوفیہ کی طرف

دیکھنے لگی۔

لیٹ جاؤ۔ آرام سے میں لائٹ آف کر رہی ہوں۔

نہیں پہلے کلثوم کو بلائیں، وہ خفا ہو کر گئی ہے۔

وہ اب لاکھ خوشامد پر بھی نہیں آئے گی۔ مجھے اس کی عادت کا پتا ہے اور اس کی عادت سے تو

وہ بھی واقف تھی، اس لیے زیادہ اصرار نہیں کیا اور پھر وہ بھی سمجھ گئی تھی کہ صوفیہ اس سے کوئی خاص بات

کرنا چاہتی ہے۔ اس لیے اماں کو شب بخیر کہہ کر لیٹ گئی۔

آلیٹ۔ پھر جیسے ہی اماں، ہما کو لے کر کمرے سے نکلیں، صوفیہ نے اُٹھ کر لائٹ آف کر دی اور اپنی جگہ پر

لیٹی۔ چھوٹی آیا۔ وہ صوفیہ کے لیٹنے ہی اس کی طرف منہ کر کے کہنے لگی۔ میں جان گئی ہوں کہ آپ کو مجھ

سے کوئی بات کہنی ہے۔ لیکن خدا کے لیے گزری کوئی بات مت دہرائیے گا۔

میرا ایسا کوئی مقصد نہیں ہے لیکن باتوں کے دوران اگر کہیں کسی گزری کی کا ذکر آجائے تو خیال مت

کرنا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پوچھنے لگیں۔

سنو۔ تم خوش ہو؟

پتا نہیں چھوٹی آیا۔ میں خود نہیں سمجھ پا رہی کہ مجھے خوش ہونا چاہیے یا۔

میں تمہاری کیفیت سمجھتی ہوں اور کاش کہ میں بہت پہلے جان جاتی لیکن تم مجھے بھی لاعلم رکھا ہو۔

کہتی کھڑی کر کے ہتھیلی پر سر رکھتی ہوئی نیم اندھیرے میں اس پر نظریں جما کر بولی۔

اگر تم اس وقت بھی مجھے ساری حقیقت بتا دیتیں جب ثاقب حسن کے پرنسپل پر میں نے تم سے ہائی

بھی نہیں ہے کہ تم تمام عمر قریب ہی دیتی رہو۔ ہو سکتا ہے کسی مقام پر ثاقب حسن تمہارے دل میں رہنا بنانے میں کامیاب ہو جائے۔  
 ”آپ نے تو یہ بھی کہا تھا کہ ہو سکتا ہے، میرے نصیب میں حقیقی خوشیاں ثاقب حسن کے حوالے سے لکھی ہوں، اس نے یاد دلایا۔

”ہاں، میں نے کہا تھا اور اب میں دعا کرتی ہوں کہ خدا کرے تم واقعی اس کے ساتھ حقیقی خوشیوں کو لو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تم اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر مت چھوڑو۔ خود اپنے اندر پورا کرو۔ تم نے سنائیں کہ تدبیر سے تقدیر بھی بدل جاتی ہے۔“  
 ”ہاں۔ لیکن آپ نہیں جانتیں، مجھے کن حالات کا سامنا ہے۔ مجھے لگتا ہے ثاقب کے گھر والے اس شادی پر رضامند نہیں تھے۔ ایسی باتیں اور طنز پر مجھے سننے کو ملے ہیں کہ کیا بتاؤں۔“  
 ”تم بیوقوف ہو، ایسی باتوں کی پروا کرنے کے بجائے اس بات پر اکتو کرو کہ ان کی مخالفت کے باوجود ارٹھیا تہیں بیاہ کر لے گیا ہے۔ اور لقیقتاً تم میں کوئی خاص بات ہے جیسی تو۔ خبردار کسی سے نہ کی ضرورت نہیں ہے۔ سب کی عزت ضرور کرو لیکن ناجائز بات نہ سنو اور نہ مانو۔“  
 ”میں کسی کے سامنے نہیں بول سکوں گی۔ وہ سدا کی بزدلی تھی۔“

”ٹھیک ہے، تو پھر ایسا کرو۔ روایتی ہو ہی جاؤ۔ ہر بات نہ صرف ثاقب حسن کو تیار دیکھا بلکہ اس پر جتنا بھی کہ اس کی وجہ سے تمہیں پچھلی زندگی کے طے سننے کو مل رہے ہیں۔ نہ وہ تمہارے ساتھ آیا اور نہ تمہیں طے سننے پڑتے۔“

وہ خاموش رہ کر پتیا نہیں کیا سوچنے لگی تھی کہ صوفیہ اس کا کندھا ہلا کر کہنے لگی

”میری اتنی بکواس کا تم پر کوئی اثر ہوا ہے کہ نہیں؟“

”ہاں، میں کوشش کروں گی۔ وہ مری مری آواز میں بولی۔

”کس بات کی؟“

”آپ کی باتوں پر عمل کرنے کی۔“

”کوشش نہیں، تمہیں کل ہی ثاقب حسن پر ثبات کر دینا ہے کہ تم اس کے بغیر اس تھیں۔ پھر اس آزدگی کم کرنے کی غرض سے شرارت سے بولی۔“ ویسے ہے خاصا ہنڈیٹم اور اسماٹ، رات رات نامی میرا تھا اس نے؟۔“

”پتیا نہیں، میں نے تو دیکھا بھی نہیں۔“

”دیکھا، یہ کی ناں تم نے حاکمت، اب آئندہ ایسی حماقتیں مت کرنا، کم از کم اس کے سامنے۔“

”نہیں کروں گی، اب آپ مجھے سونے دیں۔“

”ضرور سوؤ۔ اس یقین کے ساتھ کہ آنے والا ہر کل تمہارا ہے۔“

”اچھا۔“ وہ پتیا نہیں کیوں ہنسی، پھر شب بخیر کہہ کر روٹ بدل گئی۔

اگلے دن دوپہر سے پہلے ہی ثاقب اسے لینے آ گیا۔ وہ اکیلا ہی آیا تھا جب کہ اماں نے اس کے گھر والوں کو رات کے کھانے پر بلایا تھا۔ اور اس وقت وہ اسی سلسلے میں صوفیہ اور ربیعہ سے مشورہ تھیں کہ رات کے کھانے پر کیا کیا پکنا چاہیے۔ لیکن اب جو اسے یوں اکیلا اور وقت سے پہلے آتے ہا قدرے تعجب سے پوچھنے لگیں۔

”خیر تو ہے، بٹھا، یہ تم اتنی جلدی کیسے ربیعہ کو لینے آ گئے۔؟ اور تمہارے گھر والے۔؟“  
 ”اصل۔ میں آج شام انیلا کے سسرال والے آرہے ہیں اس لیے اماں وغیرہ نہیں آسکیں گی۔  
 نے مجھے بھیجا ہے کہ ربیعہ کو لے آؤں۔ اس نے اپنے اکیلے اور جلدی آنے کی وجہ بتائی، پھر اس کو دیکھتا ہوا بولا۔ چلیں۔“  
 ”لے جانا سے اتنی جلدی کیا ہے؟ کچھ دیر بیٹھو تو۔“ صوفیہ کسی کہنے پر اس کے سامنے کھڑی ہوئی

بٹھنے ہوئے بھی اسے چلنے کا اشارہ کرنے لگا اور اُن کی باتیں جملت میں دیکھ کر چائے وغیرہ کا انتظام کرنے لگی۔ تب صوفیہ کو جیسے موقع مل گیا۔ لہجے میں شرارت سمو کر بولی۔  
 ”جی مان گئی، تم دونوں کے جذبے کتنے زور آور ہیں۔“

”ما مطلب؟“ وہ انجان بننے کی ایکٹنگ کرنے لگا۔  
 ”نہ تمہیں کو صبح سے آداسی کا دورہ پڑا ہوا ہے۔ بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ حالانکہ تمہا کہ تم شام کو آؤ گے لیکن۔“ صوفیہ بات چھوڑ کر زور سے ہنسی تو وہ جھینپ کر سر جھٹکا گیا۔  
 ”راخاں ہے میں بھی آداسی شکل بنا کر دروازے پر نظر میں ہماروں، ہو سکتا ہے آفس میں بیٹھے کے دل پر کچھ اثر ہوا اور وہ سب کام چھوڑ کر مجھے لینے چلے آئیں۔“

”ہٹ آداسی شکل بنانے سے کچھ نہیں ہوگا، دل کو دل سے راہ ہونی چاہیے۔“ وہ کنکھیوں سے اس کو دیکھ کر بولا۔ جو سر جھٹکا کے شاید یہ سوچ رہی تھی کہ صوفیہ کی باتوں کو پرچہ ثابت کرنے کے لیے تیار کرنا چاہیے۔

”جھک کہتے ہو تم، واقعی دل کو دل سے راہ ہونی چاہیے۔“ صوفیہ نے تائید کی، پھر اس سے کہنے لگی۔  
 ”جاؤ ربیعہ، تم جب تک اپنا حلیہ ٹھیک کر آؤ۔“

وہ چپ چاپ اٹھ کر چلی گئی پھر بالوں میں برش کرتے ہوئے اور اس کے بعد میک اپ کرتے ہوئے حل ہی سوچتی رہی۔ کہ کیا وہ ثاقب حسن سے بات کرتے ہوئے اپنے لیے میں محبتوں کی چاشنی لے گی؟۔

ربیعہ۔ ”صوفیہ اسے پکارا تو ہوئی آئی اور وہ یوں گم صم کھڑی تھی کہ بس خالی خالی نظروں سے اس کی دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا ہے تمہیں؟“ صوفیہ نے اس کا کندھا جھنجھوڑ ڈالا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ چونکی۔

”چلو۔ ثاقب تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“ صوفیہ اس کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً کہنے لگی۔

”چھوٹی آیا۔“ اس نے اپنے ہاتھ کو جھٹکا دے کہ صوفیہ کو متوجہ کیا۔

”کیا ہے؟“

”مجھے پتیا نہیں کیوں ڈرگ رہا ہے۔“

”کس سے؟ یا کس بات سے؟“ صوفیہ اس کی ہنسی بھی شکل بنو رو دیکھنے لگی۔

”جو باتیں آپ نے ثاقب سے کہی ہیں، اگر اس نے مجھ سے ان کی تصدیق چاہی تب۔“

”پاگل ہوئی، رات میں نے تم سے اتنی مغزادی کی ہے، اس کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔“ صوفیہ جھنجھلا گئی۔

”مجھے کوئی امید نہیں تھی، اس لیے ابھی میں نے خود ابتدا کر دی ہے۔ اب آجے تم سنبھالنا۔ کوئی ایسی شکل نہیں ہے۔ اور اب ذرا اپنی شکل ٹھیک کرو واداس تم اس کے آنے سے پہلے تھیں۔ اب تمہارا چہرہ

بلا شاداب نظر آنا چاہیے۔“

وہ زبردستی کی تسکراہٹ ہوٹوں پر سجا کر صوفیہ کے ساتھ کمرے سے باہر آ گئی۔ اماں ثاقب سے انیلا

دلی کے بارے میں معلوم کر رہی تھیں۔ اسے دیکھا تو کہنے لگیں۔

”اؤ، چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“

اس نے کپڑے کھڑے چائے کا کپ اٹھا لیا اور جلدی جلدی پی کر ثاقب حسن کی طرف دیکھنے لگی۔ اور

یہ انتظار میں بیٹھا، فوراً کھڑا ہو گیا۔ اماں سے اجازت لی، پھر صوفیہ سے کہنے لگا۔

”کبھی فرصت سے آئیے ناں، ہمارے گھر۔“

”ضرور آؤں گی۔“ صوفیہ نے تسکرا کر ہائی بھری، پھر ان دونوں کو چھوٹے دروازے تک آئی تو سرگوشی

اس سے کہنے لگی۔

”ابھی یہ شخص اپنی کامیابی کے نشے میں سرشار تہبہاری دسترس میں ہے۔ اس پر اپنی گرفت مضبوط کر کے جلدی سے آگے بڑھ گئی۔“

”یہ چھوٹی آیا بھی عجیب ہیں۔“ ثاقب حسن کے برابر بیٹھے ہوئے اس نے سوچا۔ ”چاہتی ہیں پبلک میں سب کچھ ہو جائے۔“

”تمہاری اماں کا ابھی تک تم سے جی نہیں بھرا یا تم اس گھر سے کچھ زیادہ مانوس ہو؟ وہ گاڑی میں پر لایا تو کچھ طنز سے پوچھنے لگا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ اپنے خیالوں میں مگن تھی، اس کے بچے میں چھپے طنز کو محسوس نہ کر سکی۔

”جی اتنا عرصہ ان کے پاس رہی ہو، رات پھر تمہیں لے آئیں۔“

”نیم دینا تو نہجانی پڑتی ہے۔“

”تم سنجیدگی سے۔“

”تم اگر کہتے تو میں ضرور منع کر دیتی۔ لیکن تم نے کچھ کہا ہی نہیں تھا۔“ وہ خوبصورتی سے اس پر بات کر رہی تھی۔

”اور یہ تمہاری چھوٹی آیا کب سے یہاں ڈیرہ جمائے ہوئے ہیں؟“

”کل ہی آئی ہیں وہ۔“ وہ اس کے بات کرنے کے انداز پر جڑبڑسی ہوئی، پھر ٹوک گئی۔ ”یہ تمہارے کیوں بات کر رہے ہو؟ تمہاری اماں، تمہاری چھوٹی آیا۔ کیا تمہارا ان سے کوئی رشتہ نہیں؟“

”خفا کیوں ہوتی ہو۔ چلو میں اس طرح کہہ دیتا ہوں کہ میری چھوٹی آیا کب سے اماں کے ہاں آئی ہو وہ اس کی طرف سے رخ موڑ لینا چاہتی تھی لیکن فوراً سنبھل گئی، پہلے کو سلام بنا کر بولی۔“

”میں تم سے خفا نہیں ہو سکتی۔ سمجھی بھی۔“

”پر یہ رہی ہو؟“ وہ اعتبار لیتے ہوئے بولا۔

”کیا تمہیں میرا اعتبار نہیں؟“ مان سے بولی لیکن اس کی طرف دیکھ نہیں سکی۔

”تم پر اعتبار نہ ہوتا تو اتنا عرصہ تمہیں ایک ایسے شخص کے پاس کیوں چھوڑ دیتا، جس پر مجھے رتی اعتبار نہیں تھا۔“

اس کا اشارہ شہر و زامہ کی طرف تھا۔ اور پتا نہیں اب وہ ایسی بات کیوں کر رہا تھا جب کہ اس نے اسے اس پوری دنیا میں وہی قابل اعتبار نظر آئے تھے۔ وہ اس کی بات پر خاموش رہی کیونکہ تھی کہ اس سلسلے میں اس کے ہونٹوں سے نکلا چھوٹا سا لفظ بھی اس کے لیے الزام بن جائے گا۔

”سزاوارتھ ہے گی۔“

”یاد ہے؟“ وہ گاڑی ایک جگہ روک کر اس نے پوچھا تو وہ فوراً سر اٹھا کر دیکھنے لگی۔ نظروں عین سامنے وہی فانیو اشار ہوٹل تھا جہاں وہ آخری بار اس سے رخصت ہوئی تھی۔

”یاد ہے؟“ وہ پھر پوچھ رہا تھا۔

”ہاں۔“ وہ پُرسوچ انداز میں سر کو اثبات میں ہلانے لگی۔

”ابھی بات ہے، اب میں اندر جا رہا ہوں، تم دس منٹ کے بعد آنا۔“ وہ اپنی طرف کا اشارہ ہوا بولا۔

”کیا مطلب؟“ کیوں تم مجھے اپنے ساتھ۔“

”آؤتوں۔“ وہ ٹوک گیا۔ ”میرے ساتھ تو تمہیں زندگی بھر چلنا ہے۔ بس اس وقت میری ہے کہ تم کچھ دیر بعد میرے پاس آؤ۔ اس کے ساتھ ہی وہ آکر اندر چلا گیا۔ اور وہ اس کی اس غریب خواہش پر الجھتی رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ آخر اس کا مقصد کیا ہے، تب کہ گھڑی دیکھنے لگی۔ مقررہ وقت گزرنے کے بعد اس کے پیچھے چل پڑی۔ گلاس ڈور سے داخل ہو اُدھر اُدھر نظریں دوڑائیں اور جہاں وہ بیٹھا نظر آیا، اسی طرف آگئی۔ میں اس کے پاس رکی ہی تھی کہ وہ اس سے اٹھتے ہوئے بولا۔“

”ہیلو سبز ربیعہ ثاقب حسن۔“ اس کی آواز میں شوخی تھی، اور لہجے میں کھٹک جب کہ وہ زلزلوں کی زد میں آگئی۔

”سبھی کل ہی کی بات صدیوں پرانی لگتی ہے اور کبھی صدیوں پہلے کی بات پر لگتا ہے جیسے ابھی ابھی تو یہاں رہے اور یہاں تو درمیان میں صرف دو سال تھے۔ فقط دو سال پہلے یہیں اسی جگہ، اسی طرح کھڑے ہو کر نے کہا تھا۔“

”ہیلو سبز شہر و زامہ۔“

اور اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئی تھیں۔ اور نئی تو اب بھی آنکھوں میں اترنے کوئے تاب نہیں وہ کمال ضبط کا مظاہرہ کرتی ہوئی اس کے سامنے بیٹھ گئی اور یوں ظاہر کرنے لگی جیسے کوئی بات نہ ہو۔ پتا نہیں اس کا مقصد کیا تھا۔ اس کی آزمائش یا اپنی وہی خواہش کی تکمیل، بہر حال وضاحت نہ کرتے دے کہنے لگا۔

”یاد ہے ربیعہ، جب تم یہاں آخری بار مجھ سے ملنے آئی تھیں تو میں نے تمہیں سبز شہر و زامہ کہہ کر ثاقب کیا تھا۔ اس وقت تمہاری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو کر مجھے بے حد شرب گزشتی تھیں۔ میں ذرا اندر ایک کمرے سے گزرتا رہا اور اسی روز میں نے تمہیں کیا تھا کہ ایک روز اسی جگہ میں نہیں اپنے والے سے مخاطب کروں گا تاکہ آنسوؤں بھری یہ آنکھیں میرے نام سے جگمگا اٹھیں۔“

”ارے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر چوڑکا۔ ”تم تو اب بھی اُداس ہو رہی ہو۔ کیا تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟“

”اے یقین دلاؤ کہ شہر و زامہ کے گھر دو سال تم نے بڑی اذیت میں گزارے ہیں۔“ ابھی رات ہی تو موفی نے اسے سمجھایا تھا اور اس کی بات یاد کر کے وہ فوراً سنبھلتی ہوئی بولی۔

”میں خوش ہوں ثاقب، بہت خوش۔“

”پھر تمہاری آنکھوں میں دکھ اور اُداسی کی پرچھائیاں کیوں لہر رہی ہیں؟“ وہ فکر مند کم مشکوک زیادہ لگ رہا تھا۔

”تم نے بات ہی ایسی کی ہے۔ ان خوشیوں بھرے لمحات میں وہ اذیت ناک لمحے یاد دلا رہے ہو جنہیں میں کبھی سوچنا بھی نہیں چاہتی۔ تم کیا جاناو تمہارے بنام میں نے۔“ اس کی آواز ساتھ چھوڑ گئی، ضبط کے بندھن بھی موتیوں کی صورت پلکوں سے ٹوٹنے لگے۔

”میں جانتا ہوں۔“ وہ اس کے رونے سے پریشان اور پشیمان ہو کر بولا۔ ”پلیز اس طرح مت رُو، مجھے دکھ ہوتا ہے اور پھر اب تو ہم آزمائشوں کے دور سے نکل آئے ہیں۔ اب ہمیں خوش رہنا چاہیے۔“

”ہاں لیکن مجھے لگتا ہے ابھی بھی آزمائشیں میرے تعاقب میں ہیں۔“ وہ صورتحال اپنے حتمی میں دیکھ کر ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

”تمہیں ربیعہ۔ اب کوئی آزمائش نہیں ہوگی۔“

”یہ آزمائش ہی تو ہے کہ میں جو تمہارے سنگ خوبصورت زندگی کی ابتدا کر کے عہدِ رفتہ کو مکمل طور پر فراموش کر دینا چاہتی ہوں۔ اور تم پہلے ہی قدم پر مجھے یاد دلا رہے ہو، تم ہی بتاؤ کیا مجھے دکھ نہیں ہوگا۔“

”اے اے ام سوری۔ میرا مقصد تمہیں دکھ پہنچانا نہیں تھا۔ میں تو صرف اپنی خواہش کی تکمیل چاہتا تھا۔“

”ایسی اور کون کون سی خواہشات ہیں تمہاری جن کی تکمیل تم اس طرح مجھے عہدِ رفتہ کی یاد دلا کر کرو گے؟“

”پوچھنے بغیر نہ سکی۔“

”طنز کر رہی ہو؟“

”نہیں۔“

”چلو چھوڑو یہ سب باتیں، یہ بتاؤ، کھانے میں کیا منگاؤں؟“ وہ خود ہی مینو اٹھا کر دیکھنے لگا اور وہ



اس کے چہرے پر نظر بن جا کر اس کے اندر اترنے کی کوشش کرنے لگی کہ آیا یہ شخص اندر سے بھی انا ہی اجلا ہے جیسا کہ بقا پر نظر آ رہا تھا۔

ابھی شاقب حسن کی شادی کا ہنگامہ مرنہیں پڑا تھا کہ انیل کی شادی کا ہنگامہ آگیا۔ گھر میں پھر سے مہمانوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی اور کیونکہ بڑی دونوں نہیں بیاہی ہوئی تھیں، اس لیے گھر کی سامانہ زبانی اس پر آن پڑی۔ ویسے بھی یہاں کوئی ملازم وغیرہ نہیں تھا۔ گھر کی صفائی ستھرائی، کھانا پکانا اور اب مہمانوں کی خاطر مدارات میں وہ بالکل گھن چکر بن گئی۔ اس کی ساس بھی جیسے اسی انتظار میں تھیں۔ سارے کام اسے سونپ کر بالکل بے فکر ہو گئیں۔ ان کا کام بس پینک پر بیٹھے بیٹھے حکم چلانا تھا اور ملک کی مکمل سبب ذرا سی دیر ہوئی نہیں کہ وہ آئے گئے کا لحاظ کیے بغیر ایسی ایسی باتیں سناتیں کہ وہ اپنے آپ میں کھٹ کر رہ جاتی۔ اس لیے کوشش کر کے پہلی ہی آواز پر ان کے پاس بھاگی چلی جاتی۔ پھر بھی نہیں نہ کہیں کوئی تاہی ہو رہی جاتی تھی، اس وقت بھی وہ ڈراٹنگ روم کی صفائی میں لگی ہوئی تھی جب عاقب اس نے پاس آکر پہننے لگا۔

”بھائی۔ اماں بہت دیر سے آپ کو بلارہی ہیں۔“

”ہیں۔“ ڈسٹنگ کرتے ہوئے اس کے ہاتھ رک گئے۔ اور وہ کچھ خوفزدہ سی ہو کر عاقب کی طرف دیکھنے لگی۔

”آپ تو یوں ڈر رہی ہیں جیسے میں نے ملک الموت کے آنے کی خبر دی ہو۔“ عاقب نے ہنس کر چہرہ لکھ لیا۔ لیکن وہ اسے نظر انداز کرتی ہوئی وہاں سے نکل گئی۔ اس کی ساس کے پاس پتا نہیں کون خاتون بیٹھی تھیں۔ جن سے وہ کہہ رہی تھیں۔

”دیکھا تم نے، کتنی آوازیں دے چکی ہوں، نواب زادی کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔“

”عاقب بھی کچھ نہیں کہتا اسے۔“ خاتون تعجب سے پوچھنے لگیں۔

”وہ کیا کہے گا۔ اس پر تو پتا نہیں کیا جاوے کہ وہ کیا کہتا ہے۔ اور اب سے نہیں بہت پہلے سے ہر بچے کے پیچھے لگی ہوئی ہے اور اپنی سچی باورہی ہے اس کی آنکھوں پر کہ اچھی بھلی خاندان کی لڑکیوں کو چھوڑ کر اسی طلاق سے شادی پر لبزد تھا۔“ پھر سینے پر دو ہتھ مار کر بولیں۔ ”ایسا بھولا ہے میرا بچہ، یہ بھی نہیں سوچا کہ جو ایک کا گھر نہیں بسا سکی، وہ اس کا کیا بسائے گی؟“

”میرے خدا۔ اس کے پیروں تلے سے زمین کھسکے لگی۔“

آنکھوں کے سامنے پہلے دائرے بنے پھر اندھیرا چھانے لگا، بشکل تمام بڑھ کر دیوار کا سہارا لیا اور چاہا کہ اسی طرح چلتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی جائے لیکن دوسرے ہی قدم پر ریت کی دیوار کی مانند زمین بوس ہو گئی۔

بس وقت اسے ہوش آیا، وہ اپنے کمرے میں تھی اور کیونکہ ذہن پوری طرح میرا نہیں ہوا تھا اس لیے اپنے بے وقت لیٹے پر حیران ہوئی اور فوراً اٹھنا چاہتی تھی کہ شاقب حسن نے سامنے آکر اسے لیٹے لیٹے لے لیا۔

”کیا ہو گیا تھا تمہیں؟“

”مجھے۔“ اپنی طرف اشارہ کیا پھر ایک ایک کر کے ساری باتیں یاد آنے لگیں۔

”بتاؤ ماں۔“ وہ اصرار سے بولا۔

”پتا نہیں۔ میں اماں کے بلانے پر ان کے پاس جا رہی تھی کہ اجانک مجھے چکر آیا اور میں گر گئی۔“ کتنا سمجھا یا تھا صوفیہ نے کہ روایتی بیوی بن کر ہر بات شاقب کو بتاتے ہوئے اپنی پوزیشن صاف رکھنا لیکن اس کا دل ایسے چھوچھوڑے ہتھکنڈے استعمال کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوا۔

”ڈاکٹر نے کمزوری بتائی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ خوش رہنے کی کوشش کرو۔“ دوسرا جملہ کہتے ہوئے

وہ ایک شاکی نظر اس پر ڈال کر سرگرمی سے لگ گیا۔ اور وہ نادان نہیں تھی، جانتی تھی کہ ایسی کسی بھی بات پر خاموشی، اس کی زندگی میں مزید زہر گھول دے گی۔ اس لیے پہلے ہنسی پھر اس کا ہاتھ، اپنے ہاتھوں میں لے کر لے لی۔

”مجھے کوشش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں جانتی ہوں میں بہت خوش ہوں۔ میرا دل تمہارے دم سے شاد ہے اور تمہاری محبتوں سے آباد۔ اور کیا چاہیے مجھے؟“

خلاف توقع وہ اس کی بات سن کر خاموش رہا تو وہ پتا نہیں اپنے آپ کو بھلانے لگی یا اسے۔

”پتا ہے شاقب، کسی کسی وقت مجھے اس حقیقت پر خواب کا گمان ہونے لگتا ہے اور میں ڈرنے لگتی ہوں، یہی کچھ کھلے اور۔“

اور تم شہزاد احمد کے گھر میں ہو۔“ اس نے فوراً بات اچک لی تو وہ ایک دم سناٹے میں آ گئی۔ حقیقت اپنی جگہ آگے ہوتی ہے ربیع۔ البتہ تم جان بوجھ کر نظر بن کر اپنا چاہو تو آگے بات ہے۔ وہ اس کی پوری تھلی آنکھوں میں دیکھتا ہوا کہنے لگا۔ حیرت ہے کہ مجھے اپنے سامنے، اپنے قریب دیکھ کر بھی تم مجھے محسوس نہیں کرتی ہو۔ ابھی بھی تمہارے ہاتھوں میں میرا ہاتھ ہے۔ میرا ہاتھ۔ یا تم اس میں کسی اور کا لمس کھون رہی ہو۔“

”ہیں۔“ وہ۔ خیالی میں اس کا ہاتھ جھٹکنا چاہتی تھی لیکن وہ اپنے مضبوط ہاتھ میں اس کا ہاتھ یوں بھر لیا کہ اس کی انگلیاں چٹختے لگیں۔

”شہزاد احمد کے حصار سے نکل آؤ ربیعہ ورنہ۔“ وہ بات آدھوری چھوڑ کر ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ چھوڑ کر کمرے سے نکل گیا۔ تو وہ اپنے آپ کو انتہائی بے بس محسوس کرتے ہوئے رو پڑی۔

”شاید آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ آئے والے وقت میں آپ کو کس قدر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس شخص نے کہا تھا جس کا کہ ابھی ابھی شاقب حسن اسے طعنہ دے گیا تھا۔

”مجھے اندازہ تھا۔“ وہ دلی دل میں انہیں مخاطب کر کے بولی۔ ”لیکن افسوس کہ کسی نے میرا ساتھ نہیں دیا، یہاں تک کہ تقدیر بھی مجھ سے رو تھی رہی۔“

”خدا کے لیے ربیعہ۔“ صوفیہ جیسے اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ ”اس طرح رو کر اس کے شک کو تقویت مت دو۔ ذرا سا اپنے اندر حوصلہ پیدا کرو۔ بتاؤ اسے کہ تمہاری یہ حالت اس کی ماں کی باتیں سن کر ہوئی ہے اور بجائے اس کے کہ وہ تمہیں الزام دے، تم اسے زیر کر دو ورنہ۔“

”ہیں۔“ وہ فوراً اٹھ بیٹھی۔ ”میں راستہ ہی پڑا کوئی پتھر نہیں ہوں جسے جب جو چاہے ٹھوکر مار کر اپنے راستے سے ہٹا دے۔ اب یہی میرا گھر ہے اور میں مجھے اپنی زندگی تمام کرنی ہے۔“ وہ ایک غم سے اٹھی، منہ ہاتھ دھو کر کمرے سے نکلی تو شاقب حسن برآمدے میں ہی عاقب کے ساتھ بیٹھا نظر آیا۔ وہ جان بوجھ کر اسے نظر انداز کرتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔ ایک طرح سے خشکی کا اظہار تھا، وہ اس کی بیوی تھی اس سے لڑنے اور خفا ہونے کا حق۔ رکھتی تھی اور کب تک وہ اپنا حق استعمال نہ کرتی۔

سارا دن منہ پھلکا دے وہ گھر کے کاموں میں مصروف رہی۔ کتنی بار کمرے سے برآمدے اور برآمدے سے آگن میں آتے جاتے شاقب سے سامنا ہوا، ایک دو بار اس نے جان بوجھ کر راستہ بھی روکا لیکن وہ مزہڑ کر چل پڑی۔

رات میں سب کاموں سے فارغ ہونے کے بعد اپنے کمرے میں جانے کے بجائے انیل کے پاس جا بیٹھی اور یوں ہی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ کافی وقت گزر گیا، پھر جب اسے یہ یقین ہو گیا کہ وہ سوچا کا ہو گا تب اپنے کمرے میں آئی لیکن وہ اس کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی کہنے لگا۔

”تمہارے کام ابھی تک ختم نہیں ہوئے؟“ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے آکر بیڈ کی چادر ٹھیک کرنے لگی۔

”میں تم سے پوچھ رہا ہوں؟“ وہ اس کی خاموشی توڑنے کی غرض سے بولا۔ لیکن وہ اسی طرح خاموش

بلکہ اس کی طرف سے رُخ بھی موڑ گئی۔ تب وہ اُنھ کے پاس چلا آیا۔  
 ”دوٹھے دوٹھے سے میرے سر کا نظر کرتے ہیں۔ کیا بات ہے؟“  
 ”مجھ سے بات مت کرو۔“ وہ منہ پھلٹا لے ہوئے دوٹھے پہلے میں بولی۔  
 ”پھر کس سے بات کروں؟“

”جیسے نہیں پتا۔“ وہ کرنے کے انداز میں بیڈ پر بیٹھی اور لیٹنا چاہتی تھی کہ وہ اس کا کمر بے دیکھا کر اس کے برابر بیٹھ گیا۔ شاید اپنی صبح کی باتوں پر نادم تھا، جیسی کچھ کہنے میں دشواری محسوس کر رہا تھا۔ پھر بھی جب بولا تو اپنی غلطی کم تسلیم کی اسے زیادہ الزام دیا۔  
 ”میں مانتا ہوں، میں کچھ غلط بات کہہ گیا تھا لیکن غلطی تمہاری ہے جو تم مجھے ایسی باتیں کہنے کے مواقع فراہم کرتی ہو۔ تمہاری خاموشی، تمہارا گم رہنا اور اپنے آپ سے لاتعلقی مجھے یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ تم میرے ساتھ خوش نہیں ہو۔ تم کو کہ زبان سے اقرار کرتی ہو لیکن تمہارا ہر عمل تمہاری بات کی نفی کرتا ہے۔“

”میری خاموشی اور اپنے آپ سے لاتعلقی کا یہ مطلب ہے کہ تم مجھے شہر وز احمد کا طعنہ دو۔“ بالآخر وہ اپنے آپ کو مضبوط کر گئی۔ تمنی سے کہنے لگی۔ ”شہر وز احمد کے پاس میں خود نہیں گئی تھی، تم نے مجھے بھیجا تھا۔ اور اب خود ہی طعنہ بھی دیتے ہو۔ افسوس ہے تمہاری سوچ پر۔“ لمحہ بھر تک کر کہنے لگی۔  
 ”لاتعلقی میں نہیں بلکہ تم مجھ سے ہو۔ اسی گھر میں رہتے ہوئے یہ نہیں جان کے کہ میں نے اپنے ہونٹوں پر قفل کیوں لگا رکھے ہیں؟ سننا چاہتے ہو تو سنو۔“ اول شب مجھے اس گھر میں طلاق ہونے کا طعنہ ملا۔ اس کے بعد تمہاری ماں ہر آئے گئے کے سامنے میری ذات کو نشانہ بناتی ہیں اور ایسی ایسی باتیں کہ تم سنو تو حیران رہ جاؤ۔ ایسے میں، میں خاموش نہ ہوں تو کیا کروں؟ زبان کھولوں گی تو تب بھی تمہاری نظروں میں بڑی بنوں گی کہ تمہاری ماں کی عزت نہیں کرتی۔ تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟ خوشیوں پر میرا بھی حق ہے۔ میں خوش رہنا چاہتی ہوں لیکن۔“  
 وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر جھوٹ جھوٹ کر رونے لگی۔



”زمزمیہ۔“ ریحہ۔ ”ناقب حسن اُس کے یوں جھوٹ جھوٹ کر رونے سے پنج پرچ پریشان ہو گیا۔ اُسے کندھوں سے ختام کر بیڈ پر بٹھایا۔ پھر اس کے پاس بیٹھتا ہوا کہنے لگا۔  
 ”پلیئر زمزمیہ۔ اس طرح مت رو۔ مجھے بے حد دکھ ہو رہا ہے۔“  
 ”تم جلنے ہو دکھ کیسے ہوتے ہیں؟“ وہ ہاتھوں سے چہرہ اٹھا کر اُس کی طرف دیکھتی ہوئی تمنی سے بولی۔  
 ”تم کیا جانو گے، تم تو پالینے کے نشے میں سرشار ہر طرف سے بے گناہ ہو گئے ہو۔ یہاں تک کہ مجھ سے بھی۔“  
 ”میں تم سے بیگانہ نہیں ہوں۔“ وہ کمزور سے پہلے میں بولا۔

”یہ بے گناہی نہیں تو اور کیا ہے کہ مجھے گھر میں ڈال کر بے خبر اور لا پروا ہو گئے ہو۔ تمہیں معلوم ہی نہیں کہ یہاں میرے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔ کیسی کیسی باتیں سننی پڑتی ہیں مجھے۔ تمہاری اماں ہر آئے گئے کو یہ بتانا فرم جیتی ہیں کہ میں پہلے سے شادی شدہ اور پھر طلاق یافتہ ہوں۔ اس کے بعد یہ کہنا بھی ضروری کہ میں پہلے گھر میں نہیں رہی تو یہاں کیا بسوں گی؟“

”تم نے تو کہا تھا یہ سب وقتی باتیں ہوں گی پھر بہت جلد لوگ انہیں مہلا کر ہماری زندگی پر رشک کر دیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہے اور ایسا ہو بھی کیسے سکتا ہے کیونکہ تمہاری اماں ہر روز ایک نیا قصہ میرے ساتھ منسوب کرتی ہیں کہ میں خود اپنے آپ پر شرمندہ ہوجاتی ہوں۔ ایک تجربانہ سا احساس جیسے میں قصور ہوں۔ تم ہی بتاؤ کب تک میرے ساتھ ایسا ہوتا رہے گا؟“

”بس کچھ دن اور۔“

”کچھ دن اور۔ کیوں؟“

”سنجھنے کی کوشش کرو۔ گھر میں بہانوں کا آنا جانا ہے۔ میں ابھی اماں سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ اُسے چاہتے ہوئے کہنے لگا۔ ”انہیلا کی شادی ہو جائے۔ پھر میں اماں سے بات کروں گا۔ انہیں واقعی ایسی باتیں کرنی چاہئیں۔ اور تم نے پہلے مجھے نہیں بتایا۔“  
 اگر میں شروع دن سے تمہیں یہ ساری باتیں بتلے نہ تھی تو تم بھی سمجھتے کہ میں تمہیں ماں بہنوں کے خلاف رہی ہوں۔ جب کہ مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے۔“ وہ اسی طرح منہ پھلٹا لے ہوئے بولی۔  
 ”میں اتنا جانتا ہوں تم بہت اچھی ہو۔ اب پلیئر اُنھ کر منہ ہاتھ دھولو، پھر کہیں باہر چلیں گے۔“  
 شاید اسے ہلانا چاہ رہا تھا۔  
 ”میں اس وقت کہیں نہیں جاسکتی۔“

”کیوں؟“

”دیکھتے نہیں، گھر میں مہمان آرہے ہیں اور سارا کام مجھے ہی کرنا ہوتا ہے۔“  
 ”ہوتے ہی رہیں گے سب کا تم چلو۔“ وہ زبردستی اُسے اٹھا کر ہاتھ روم کی طرف دھکیلتا ہوا بولا۔  
 ”کپڑے تو لینے دو۔“ وہ ہاتھ پھڑا کر الماری کی طرف بڑھ گئی۔  
 ”پھر جب وہ قدرے ڈھنگ سے تیار ہو کر اس کے ساتھ کمرے سے نکلی تو کہنے لگی۔  
 ”اماں سے تم خود ہی کہہ آؤ، مجھے ڈر لگتا ہے۔“  
 ”ہو قوت۔“ وہ اُسے ساتھ لیے ہوئے اماں کے کمرے میں گیا۔ اور انہیں اپنے جانے کے بارے میں بتایا تو وہ ایک دم سینٹرا بدلتی ہوئی کہنے لگیں۔  
 ”ذہن کو کہاں لے جا رہے ہو۔؟ اس کی پہلے ہی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آرام کرنے دو اسے۔“  
 ”آرام بھی کر لے گی۔ ابھی اسے کھلی ہوا میں جانے کی ضرورت ہے۔ وہ اُن کی مزید کوئی بات سننے بغیر لے کر باہر نکل آیا۔

پہلے یونہی مختلف سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے ہوئے اُس سے ہلکی پھلکی باتیں کرتا رہا۔ پھر جب شام ہوتی ہوئے گئی تو پوچھنے لگا۔  
 ”اپنی اماں کے گھر چلو گی۔؟“ اُس نے جیسے دل کی بات کہہ دی تھی۔ وہ فوراً اشبات میں سر ہلانے لگی۔  
 ”جیسے بھی کافی دن ہو گئے تھے اُسے اماں کے گھر گئے ہوئے اور ادھر انہیلا کی شادی کی وجہ سے تو وہ لک لکھ کر ہو کر رہ گئی تھی۔ بس یہی سوچتی شادی سے فارغ ہونے کے بعد دو ایک دن کے لیے اماں کے گھر چلی جائے گی۔ اب جو اُس نے پوچھا تو فوراً ہامی بھر گئی۔  
 لیکن اماں کے گھر جا کر اسے احساس ہوا کہ اُس نے اس وقت یہاں آکر بڑی سخت غلطی کی ہے۔  
 کیونکہ چھوٹی آپا کے ساتھ ہر روز بھی موجود تھا۔ اور اس تمام عرصے میں کیونکہ آج پہلی بار اس کا مہر وز سے سامنا ہوا تھا، اس لیے دونوں ہی اپنی اپنی جگہ ٹھک گئے تھے۔ گو کہ مہر وز اور اُس کا رشتہ اپنی جگہ اٹل تھا جو ٹوٹ نہیں سکتا تھا لیکن فطری طور پر دونوں کے چہروں پر اس ٹوٹنے والے رشتے کا ملال سمٹ آیا تھا۔

”کیسے ہو تم؟“ وہ ہشکل تمام اپنے آپ پر قابو پا کر بس اسی قدر کہہ سکی۔  
 ”آپ کیسی ہیں؟“ جو آیا اُس نے بھی سوال دہرایا تو وہ آہستہ سے سر ہلاتی ہوئی ناقب حسن کو دیکھ کر اس کے پاس چھوڑ کر اندر چلی آئی جہاں اماں چھوٹی آپا حیرت اور خوشی کا مہلا جلا اظہار کرتی ہوئی پوچھنے لگیں۔

”ارے تم کب آئیں؟“  
 ”ابھی۔“ پچھلی سی تسکراہٹ کے ساتھ اُس نے سلام کیا اور اماں کے پاس بیٹھ گئی۔  
 ”فرست رمل گئی تمہیں؟“ اماں اُس کے اتنے دنوں بعد آنے پر شکایت بھرے لہجے میں بولیں۔

”نہیں امان۔ ایشیا کی شادی کی وجہ سے اتنی مصروفیت ہے۔ نکلنا ہی نہیں ہوتا۔“

”کس کے ساتھ آئی ہو؟“ صوفیہ پوچھنے لگی۔

”ثناقب کے ساتھ۔ وہ باہر مہر وز کے پاس بیٹھے ہیں۔“

”اچھا۔“ امان اٹھ کھڑی ہوئیں۔ تم دونوں بیٹھو، میں ذرا کھانے کا انتظام دیکھ لوں۔“

”ہمارے لیے تردد مت کیجئے گا امان۔“ وہ فوراً بول پڑی۔ ”ہم زیادہ دیر نہیں رکیں گے۔“

”کیوں؟ اتنے دنوں پر تو آئی ہو؟“

”ابھی بھی خاص طور سے یہاں نہیں آئی۔ اصل میں۔“

”اچھا اچھا آرام سے بیٹھو۔“ امان اس کی پوری بات سننے بغیر کمرے سے نکل گئیں۔ پھر برآمدے میں سے اُن کی آواز آنے لگی۔ وہ ثناقب سے اس کا اور اس کے گھر والوں کا حال احوال پوچھ رہی تھیں۔

”آپ سنائیں چھوٹی آیا، کیسی ہیں؟“ وہ ادھر سے توجہ ہٹا کر صوفیہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”ٹھیک ٹھاک۔ تم اپنی سناؤ۔“ پھر بغور اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ”روتی رہی ہو کیا؟“

”ہاں۔“ اُس نے اعتراف کیا۔

”کیوں؟“

”بس چھوٹی آیا۔“ پھر اُس نے ساری باتیں کہہ سنائیں۔ آخر میں کہنے لگی۔ ”آج میں نے آپ کی

باتوں پر عمل کر ہی ڈالا یعنی ثناقب حسن کو اس کی امان کی کہی ساری باتیں بتا ڈالیں۔“

”بہت اچھا کیا۔ اسی طرح اسے باخبر رکھو اور اس سے پہلے کہ اس کی ماں اُس کے کان بھرے، تم

اُس پر اپنی گرفت ضبط کر لو۔ اور خبردار کسی مقام پر کمزور مت پڑنا۔ جب اس سارے نئے میں تیار

کوئی قصور ہی نہیں تو پھر سزا تم کیوں جھگڑو؟“ کچھ دیر خاموش رہ کر گیدنے کے انداز میں پوچھنے لگی۔

”ویسے ثناقب تو تمہارے ساتھ ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں۔ لیکن کسی کسی وقت اس کا رویہ بڑا عجیب سا ہو جاتا ہے۔“

”کیا کہتا ہے؟“

”کچھ نہ بھی کہے، تب بھی بہت کچھ کہتا ہوا لگتا ہے جیسے۔“ برآمدے میں ابامیاں کی آواز ابھری تو

وہ ادھر متوجہ ہو گئی، پھر کہنے لگی۔

”میرا خیال ہے ابامیاں آگئے ہیں۔ چلیے اُن سے مل لیں۔ بہت دن ہو گئے ہیں انہیں دیکھ ہوئے

ہاں چلو۔ میں بھی اُن سے ملنے کی خاطر ٹرکی ہوئی ہوں۔“

صوفیہ اُس کے ساتھ ہی کھڑی ہو گئی۔ پھر دونوں باہر آئیں تو ابامیاں نے دونوں کو ایک ساتھ بٹھا

”ابامیاں۔ آپ تو آتے ہی نہیں ہیں۔“ صوفیہ شکوہ کرنے لگی۔

”کس وقت آؤں بیٹا؟“ ایک چٹھی کا دن ہوتا ہے۔ اس میں کہیں نکلنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ اُس

نے دیکھا ابامیاں بہت تنگ ہوئے نظر آ رہے تھے اور اس وقت اسے امان کا شکوہ بجا لگا کہ اگر جو

ابامیاں کا کوئی بیٹا ہوتا تو وہ اس عمر میں کیوں اتنی محنت کر رہے ہوتے۔ وہ بے اختیار اُن کا ہاتھ پائی اٹھانے

سے لگ گئی تو جلتی آنکھوں میں دھیرے دھیرے ٹھنڈک اترنے لگی۔

”کیا بات ہے بیٹا۔ تم ٹھیک تو ہو؟“ ابامیاں کا شفق توں سے چور لہجہ اور وہ اپنے آپ کو نوٹ

اور سنسن پوز کرتے رتے بھی آنکھیں نم کر گئی۔ اور جہاں آنکھوں میں نمی اترے، وہاں قوت گویا پتا

نہیں کیوں ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ وہ جانتی تھی ابامیاں کی محبت میں اس کا دل بھر آیا ہے۔ لیکن ثابت نہ

نہیں جانتا تھا، پتا نہیں کیا سمجھا اور اس وقت یہاں کا جو ماحول اور جو صورتحال تھی اُس سے وہ اپنے

طور پر بہت کچھ سمجھ سکتا تھا، یہ اُس کے طرف پر منحصر تھا اور جو وہ اِتنا عالی ظرف ہوتا تو اُس کی زندگی میں

یہ مقام آتا ہی کیوں؟“

”چلو ربیعہ۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔“ وہ فوراً کھڑا ہو گیا اور وہ بھی اٹھنا چاہتی تھی کہ صوفیہ نے

ن کا ہاتھ پکڑ لیا اور ثناقب حسن کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

”ابھی تو آئے ہو۔“ کچھ دیر بیٹھو ناں۔ دیکھو، کلثوم چلائے لاری ہے۔ چائے پنی کر چلے جانا۔“

”نہیں، میں ایک جگہ اور بھی جانا ہے۔“ کوئی ادب، کوئی لحاظ نہیں کہ صوفیہ بڑی ہے۔ انتہائی

بڑی کا مقام کرتا ہوا رعوت بھرے لہجے میں بولا تو وہ اس خیال سے کہ کہیں کوئی بد مزگی نہ پھیلے،

برا کھڑی ہو گئی۔

”پھر کسی وقت فرصت سے آؤں گی چھوٹی آیا۔ ابھی واقعی ہمیں ایک اور جگہ جانا ہے۔ اچھا ابامیاں

میں چلوں۔“ وہ ابامیاں کے سامنے جھکی تو وہ اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

”جیتی رہو بیٹا۔ خوش رہو۔“

”میں امان سے مل آؤں۔“ اُس نے کہا اور فوراً کچن کی طرف چلی گئی۔ کلثوم اور ہما چلائے کے

ہاتھ دیگر لوازمات ڈرے میں سجانے میں مصروف تھیں، اُسے دیکھا تو کہنے لگیں۔

”آپی۔ ہم ابھی آ رہے ہیں۔“

”لیکن میں جا رہی ہوں۔“

امان نے کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ وہ کہنے لگی۔ ”بس امان پھر کسی وقت آجاؤں گی؟“

”چائے تو پی لو۔“

”پھر سی۔“ اچھا خدا حافظ۔“ وہ کلثوم اور ہما کو حیران چھوڑ کر پلٹ آئی۔ ثناقب حسن تیار کھڑا تھا۔

س کے دوبارہ وہاں تک آنے سے پہلے خود اُس کی طرف بڑھا اور وہیں سے اُسے لے کر باہر نکل گیا۔

”کم از کم چائے کے لیے تو رک جاتے۔“ راستے میں وہ اُس کی غیر معمولی خاموشی محسوس کر کے،

اپنی بات کرنے کی غرض سے بولی۔

”تر اگر رکنا چاہتی تھیں تو وہیں کہہ دیتیں، میں تمہیں چھوڑ دیتا۔“

وہ اُس کے جواب پر حیران ہوئی۔ اُس کا انداز بھی نہ سمجھ میں آنے والا تھا۔

”میرا دل رکنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔“

”خواہش تو ہوگی۔“

”اول تو اس وقت ایسی کوئی خواہش نہیں تھی۔ اگر ہوتی بھی تو یہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں۔ میرے

باپ کا گھر ہے۔ اور بقول تمہارے لڑکیاں شیکے جاتی ہی رہتی ہیں۔“ وہ خوبصورتی سے اُسے گئے

دنوں کی یاد دلانے لگی۔

”تم مجھ پر کیا جتنا چاہتی ہو؟“ وہ ایک نظر اُس پر ڈال کر دوبارہ سامنے دیکھنے لگا۔

”میں تم پر کچھ نہیں جتنا چاہ رہی۔ لیکن اِتنا نہ دیکھوں گی کہ اپنے رویے میں یک پیرا کرو۔ کم از کم میرے

لیے سوچتے ہوئے تمہیں اپنا دل اور ذہن کشادہ رکھنا چاہیے۔“

”خاص طور سے تمہارے لیے کیوں؟“

”اس لیے کہ میں بڑے کٹھن اور صبر آزما مراحل سے گزر کر دوبارہ تم تک آئی ہوں۔ نہایت ثابت قدمی

کے ساتھ۔“

”اچھا۔“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا اور پھر اُس کا ہاتھ تھام کر کہنے لگا۔ ”کیا تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ

تمہارا یہ ہاتھ کبھی شہر و زاحمد کے ہاتھوں میں نہیں گیا؟“

”اے اپنے سینے میں سانپیں رکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ گہرے دکھ کے احساس میں گھر کر

نامف سے بولی؟ کیسی باتیں کر رہے ہو؟“

”میری بات کا جواب دو۔“ کینگی کے ساتھ سگھلنے کی انتہا کر دی تھی اُس نے۔ اُس کا دل چاہا،

اپنا ظرف کا دروازہ کھول کر اس جلتی گاڑی سے نیچے چھلانگ لگا دے۔ زندگی کا بدترین مقام، جب انسان

کو خود اپنے آپ پر رحم آنے لگے۔ اُسے بھی اپنے آپ پر رحم آ رہا تھا کہ کس قدر بے بس ہے وہ، کوئی

232

ریکارڈ کی آواز سن کر متعجب ہوئی۔ کیونکہ اس کا خیال تھا، وہ آفس جا چکے ہوں گے۔ کچھ دیر تک کھڑی رہ کر سوچتی رہی، پھر ان کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ دروازے پر ہلکی سی دھک دے کر اندر داخل ہوئی تو وہ صوفے پر نیم دراز نظر آئے۔ انگلیوں میں دبا جلتا ہوا سگریٹ اپنی ناقدری پر رکھ ہوا اور بند آنکھوں میں بقینا کوئی تکلیف دہ منظر آئینا جس کے آثار چہرے پر واضح نظر آرہے تھے۔ پر سے ہوتی ہوئی اس کی نظریں ٹیپ ریکارڈ پر جا پھریں۔

”کیسے کہوں تیرے سنا زندگی کیسے ہوگی  
جیسے کوئی سنا، کوئی بد دعا ہوگی“

اس نے بڑھ کر ٹیپ بند کر دیا تو انہوں نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ اور اسے دیکھ کر سیدھا ہوشیار ہو گئے۔

”بے کار ہے۔“ وہ ماحول پر چھائی افسردگی دور کرنے کی خاطر ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔

”زندگی۔“ وہ بے اختیار کہہ گئے۔

”نہیں بھئی، زندگی کیوں بے کار ہونے لگی؟“

”پھر۔؟“

”پھر یہ کہ پہلے بندہ غلطی کرے پھر اس پر پشیمان ہو اور آخر میں یہ حالت بنالے۔“ وہ ان کے سر سے پاؤں تک اشارہ کرتی برا سامنے بنا کر بولی تو وہ ذرا سا مسکرائے۔

”کیوں میری حالت کو کیا ہوا؟“

”مجھ سے پوچھنے کے بجائے آئینے میں جا کر دیکھیں۔ منوں کو بھی مات کر دیا ہے آپ نے تو۔“

”آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے منوں کو بہت قریب سے دیکھ رکھا ہو۔“

”دیکھ تو رہی ہوں۔“ اس کی جڑبجی پر وہ بے ساختہ ہنس پڑے، پھر پوچھنے لگے۔

”مہر و آفس جا چکا ہے۔“

”ہاں، اور آپ کیوں نہیں گئے؟“

”بس یہی۔ ویسے بھی آج کل کام کچھ زیادہ نہیں ہے۔“

”اگر کام کا پریش کر ہے تو کوئی زبردست قسم کا پروگرام بنائیں۔“ وہ پرجوش لہجے میں بولی۔

”شٹا۔؟“ وہ دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”شٹا۔“ مثلاً یہ کہ آپ کے پاس لاہور چلتے ہیں یا پھر سوات۔ یا پھر آپ کی شادی کا پروگرام بنا۔

”ہیں۔“

ان کے ہونٹوں پر پھہری مسکراہٹ ایک دم معدوم ہو گئی اور وہ پکیٹ اٹھا کر اس میں سے سگریٹ نکالنے لگے۔

”میرا خیال ہے آخری والا پروگرام صحیح ہے۔ ہم سب کی خواہش ہے کہ آپ۔“

”صوفیہ۔“ وہ ٹوک گئے۔ ”میں آج آرام کی غرض سے گھر پر رکھا ہوں۔ آپ پلینر مجھے ڈسٹر بنا۔“

”شہر و زبانی۔“ وہ بھی سنجیدہ ہو گئی۔ ”میں غلط نہیں کہہ رہی۔ آپ خود سوچیں جس کے لیے آ۔“

اس طرح جوگ بے بیٹھے ہیں، وہ تو اپنے گھر میں خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے۔

”کیا واقعی؟“ وہ ہلکا ارادہ اور بے اختیار پوچھ گئے۔ اور اس کے نظریں چلنے پر کہنے لگے۔

”روز مجھے یہ یقین مل گیا کہ وہ اپنے گھر میں خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے، اس روز سب سے پہلے خود اپنے آپ کو معاف کروں گا۔ اس کے بعد باقی ماندہ زندگی کا سفر یقیناً آسان ہو جائے گا۔“

”یہ یقین کیسے ملے گا آپ کو؟“

”میرا دل۔“ میرا دل گواہی دے گا صوفیہ بی بی۔“

”آب آپ کا دل کیا کہتا ہے؟“

”بے پناہ دشواریوں کا سامنا ہے جن کا اندازہ مجھے شروع ہی سے تھا اور پتا نہیں وہ بزدل دشواریوں سے نکل بھی سکے گی یا نہیں۔“ وہ اس کی دشواریاں سوچ کر افسردہ ہو گئے تھے۔

”آپ کو پہلے سے اندازہ تھا تو پھر آپ نے ایسا قدم کیوں اٹھایا؟“ اسے جلتے بوجھتے ہوئے یوں میں کیوں دھکیل دیا؟۔“ وہ انہیں الزام دینے سے باز نہ رہ سکی۔

”سب کچھ آپ کے اختیار میں تھا۔ تمام قانونی اور شرعی حقوق حاصل تھے آپ کو۔ اگر ربیعہ نے میں یہ یقین نہیں تھا کہ آیا وہ آپ کے ساتھ رہنا بھی چاہتی ہے یا نہیں، تو خود آپ تو ایسا فرمایا۔ اپنی خواہش ہی کے پیش نظر اس کے پاؤں میں اولاد کی زنجیر ڈال دیتے کہ پھر اگر وہ جاتا بھی نہیں جاسکتی تھی حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ یہاں سے جانا ہی نہیں چاہتی تھی۔“

”مجھے بھی اس بات کا اظہار کیوں نہیں کیا؟“

”اظہار کرتی۔ وہ، جس کے نام کے ساتھ آپ بزدل کا لفظ ضرور استعمال کرتے ہیں،“

”بزدل تو وہ تھی۔“

”نہ وہ نہیں، آپ بھی یا پھر آپ نے اسے اپنی انا کا سلسلہ بنالیا تھا۔“ وہ خاموش ہو کر اسے

نہیں دیکھتے۔

”ن کیجیے شہر و زبانی، مجھے آپ پر بالکل رحم نہیں آتا۔ میں جب اسے دیکھتی ہوں، مجھے آپ

کا خیال آتا ہے اور آپ مجھے ثابت حسن سے بھی بڑے مجرم نظر آتے ہیں؟“

”اب حسن کی شخصیت کا یہ پہلو اس کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا۔ پتا نہیں وہ شروع ہی سے پست

کا مالک تھا یا اب وہ اس انداز سے سوچنے لگا تھا بہر حال اس نے کبھی گمان بھی نہیں کیا تھا

اس سے شہر و زائد کے حوالے سے ایسی باتیں کرے گا۔ حالانکہ شروع دن سے وہ خود اسے

تیار ہاتھ تھا کہ وہ یعنی شہر و زائد بہت اچھے انسان ہیں۔ اور یہ کہ دنیا میں اس کے لیے سب

دہ قابل اعتبار۔ پھر اب پتا نہیں کیوں وہ ایسی باتیں کرنے لگا تھا۔ مزید المیہ یہ بھی تھا کہ وہ

اگر کوئی سوچنا چاہتی تھی، ثابت حسن کی باتیں اسے بہت کچھ یاد دلانا نہیں سوچنے پر مجبور

ہا حالانکہ اس میں اس کی شعوری کوشش کو ہرگز دخل نہیں تھا بلکہ شعوری طور پر تو وہ کبھی ان کا

بھی تو سر جھٹک دیا کرتی تھی۔

ن جب ایک شخص کا بار بار ذکر کیا جائے، چاہے کسی بھی انداز سے تو پھر اس کے خیال سے

دامن بچایا جاسکتا ہے۔ وہ بھی دامن بچاتے بچاتے تھک گئی، اس کے باوجود ہتھیار نہیں

وہ ہر صورت اپنے آپ سے کیا عہد نبھانا چاہتی تھی کہ اب جب کہ وہ صبح معنوں میں ثابت حسن

ہم سے تو اسے زیب نہیں دیتا کہ وہ کسی اور کے بارے میں سوچے لیکن ثابت حسن پتا نہیں کیا

خاکا کہ اکثر بات بے بات شہر و زائد کا ذکر کرنے لگا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ ان کی قدر و شخصیت

بوج ہو اور ان کے مقابلے میں احساس کمتری کا شکار ہو کر اس خوف میں مبتلا ہو کہ کسی مقام

میں کاموا زدن سے نہ کرنے لگے، اس لیے وہ ربیعہ کو ان سے متنفر کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اس کا مقصد کچھ بھی ہو، ربیعہ کے لیے یہ صورت حال انتہائی تکلیف دہ تھی۔ وہ سوچتی۔

انہیں کاتپ تقدیر نے میرے لیے ایسی آزمائشیں کیوں لکھی ہیں۔ شہر و زائد کے گھر تھی تو۔

سن کا خوف اور یہاں ہوں تو شہر و زائد کا خیال زندگی میں نہ رکھوں رہا ہے۔ میری زندگی میں کمزور

والے گھر ہی کیوں لکھے گئے ہیں؟۔ سر پر سا ثبات ملے بھی تو ایسے کھوکھلے جو نہ تپتی دھوپ سے

ہیں اور نہ چھاؤں برستی بارش سے۔“

بہر حال - آخر میں اس نے فیصلہ کرنا انداز میں سوچا - یہی میرا گھر ہے اور اس کی بنیاد میں خود مضبوط کروں گی۔ خواہ اس کے لیے مجھے کتنی ہی بڑی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔  
 اس نے گھر کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کا سوچا تھا لیکن انیلا کی شادی میں اسے ان میں مزید بڑی نظر آئیں۔ جب اس نے ثاقب حسن کو اپنی خالہ زاد شہانہ کے ساتھ بہت زیادہ فری ہوئے پہلے اس نے سوچا، شادی کا گھر ہے، آپس میں ہنسی مذاق تو ہوتا ہی ہے لیکن بات صرف گھر نہیں رہی ثاقب حسن کسی کام سے باہر جانے لگتا، تب بھی اپنے ساتھ شہانہ کو لے جاتا، وہ گھر سے یہ سب دیکھتی اور ٹوکتی رہتی۔ فوری طور پر ٹوکا اس لیے نہیں کہ شادی کے گھر میں کہیں بد چھل جائے۔

مندی والے روز تو وہ یوں ثاقب حسن کے ساتھ ساتھ تھی جیسے وہی اس کی بیوی ہے۔ اور انجان لوگ یہی سمجھتے رہے، جس وقت یہاں سے لڑکیاں مندی لے کر دو لہا والوں کے ہاں جانے لگیں وہ بھی اپنے طور پر اہتمام سے تیار ہو کر کمرے سے نکلتی تھیں لیکن برآمدے ہی میں ثاقب حسن کے میں شہانہ کو کھڑے دیکھ کر اس کے قدم وہیں رگ گئے۔ پھر اس نے سنا کوئی خاتون ثاقب کی دا سے کہہ رہی تھیں۔

”ماشا واللہ - کیا خوب جوڑی ہے۔ بہو تو اچھی ڈھونڈی تم نے۔“

”کہاں بہن! ثاقب کی والدہ آہ بھر کر بولیں۔“ میں تو خود اسے بہو بنانا چاہتی تھی لیکن اپنی قسم کیا مطلب؟ کیا یہ تمہاری بہو نہیں ہے؟“

”نہیں، یہ میری بھانجی ہے۔“

”پھر کیا مشکل ہے۔ بہو بنا ڈالو۔ دیکھو تو دونوں ساتھ کھڑے کتنے لہجے لگ رہے۔“ خاتون بالکل ہی انجان تھیں لیکن اور سب تو انجان نہیں تھے۔ ان کی باتوں پر ثاقب حسن نے شورخ نظروں شہانہ کی طرف دیکھا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ اور وہ جو خاص اہتمام سے تیار ہو کر نکلتی بہت خاموشی سے دوبارہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ پھر کتنی دیر تک وہ انتظار کرتی رہی، شاید کوئی بلائے آئے لیکن کوئی نہیں آیا۔ اور اگر اس مقام پر اسے ندا کی شادی یاد آگئی تھی تو اس میں نہ شعوری کوششوں کو دخل تھا اور نہ ہی وہ قصور وار تھی۔

شہر و زاحر کی اتنی، بھائی، بہن اور تمام کزنز نے اسے کس قدر اہمیت دی تھی۔ چھوٹی سے بے بات میں اس کی رضا شامل، جیسے کوئی بھی بات اس کی مرضی کے خلاف ہوگئی تو قیامت آج کتنی معتبر ہوگئی تھی وہ۔ خود بخوبی نظروں میں بھی۔ پھر تمام کزنز کا اسے گھیر کر گانے کی فرمائش کرنا، غر پیار کر لیں گھڑی دو گھڑی

اس کے ہونٹ بے آواز حرکت کرنے لگے تھے اور وہ بیڑ کی پٹی سے سر ہٹا کر آنکھیں بند کر گئی اس کے اندر دھیرے دھیرے گنگنا رہا تھا۔

آج سے اپنا وعدہ رہا، ہسم ملیں گے ہر اک موٹر پر دل کی دنیا بسائیں گے ہم غم کی دنیا کا در جھوڑ کر ٹوٹ جائے گی ہر تھکڑی، پیار کر لیں گھڑی دو گھڑی پیار کر لیں گھڑی۔

”ربیعہ۔“

”آں۔“ اس نے جو تک کر آنکھیں کھولیں۔ دروازے میں کھڑی انیلا پتا نہیں کیا کہہ رہی تھی۔ چپ چاپ اسے دیکھنے لگی۔  
 ”تم سب کے ساتھ نہیں گئیں؟“ اندر آتے ہوئے انیلا نے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ سیدھی بیٹھتی ہوئی بولی۔  
 ”کیوں؟“

”بس اچانک پتا نہیں مجھے کیا ہوا کہ دل گھبرانے لگا۔ سر میں بھی درد ہو رہا ہے۔“ اس نے جھٹ بارا لیا۔ انیلا بیڈ پر اس کے سامنے بیٹھی تو کچھ دیر تک اس کے چہرے پر نظریں جمائے رہی۔

”نہ ابھی تو میں اسی گھر میں ہوں اور یہاں کی ہر بات سے باخبر بھی البتہ جب چلی جاؤں گی تو شاید بری کی بنیاد پر تمہاری باتوں کا یقین کر لیا کروں گی۔“

”یہ مطلب؟“ وہ بہت حد تک اپنے آپ پر قابو پا چکی تھی۔

”نہ بہت اچھی طرح جانتی ہو، میں کیا کہہ رہی ہوں۔ بہر حال مجھے یہ بتاؤ ثاقب بھائی تمہارے اس کیوں کر رہے ہیں؟“

”یہ تو رہے ہیں؟“ وہ انشا اس سے پوچھنے لگی۔

”بہن ربیعہ، مت بات کو الجھاؤ۔ کیا میں نہیں جانتی کہ ثاقب بھائی تم سے کتنی محبت کرتے تھے۔ ان کی مخالفت کے باوجود انہوں نے تمہارے ساتھ شادی کی، یہ جاننے کے باوجود کہ تمہاری پہلی نکاح نام ہو چکی ہے، پھر بھی انہوں نے تمہیں اپنا لیا، پھر اب انہیں کیا ہو گیا ہے، یہ وہ کیوں نہیں ذکر رہے ہیں؟“

”بات تم اپنے بھائی سے پوچھو۔“ وہ اس سلسلے میں کیا کہتی بس اپنا دل من بچانے لگی۔

”میں بھی تو اندازہ ہو گا۔“

”میں تو یہی ہوں گی کہ تمہارا بھائی جذباتی انسان ہے۔ میرے حالات کے پیش نظر یقیناً مجھ سے مایہ ناز پر شادی کر بیٹھا اور اب۔ اپنی غلطی پر پچھتا رہا ہے۔“ وہ اپنے ناخن سے ٹیل پالش ہوتی بولی۔

”مادی کوئی گڑھے، گڑیا کا کھیل نہیں ہے۔ یہ تمام عمر کا بندھن ہے۔ اس میں ہمدردی اور پھر ایسا سوال؟“ اس کے خاموش رہنے پر کہنے لگی۔ ”شہانہ میری خالہ زاد بہن ہے لیکن اس کا نہیں کہ میں اسے تم پر ترجیح دوں گی۔ شاید تمہیں معلوم نہیں ہے کہ اسان ثاقب بھائی کی شادی سے کرنا چاہتی تھیں لیکن اس وقت ثاقب بھائی نے سختی سے منع کر دیا تھا۔“

”پچھا۔“ وہ اندر کا درد چھپانے کو ہنسی۔ ”میرا خیال ہے اب وہ منع نہیں کرے گا۔“

”یہی باتیں کرتی ہو؟“ تم ثاقب بھائی کو روکو۔ منع کرو انہیں کہ وہ شہانہ کو اتنی لفٹ نہ دیں۔“

”یادہ باز آ جائے گا۔“

”رہنے سے منع کرو گی تو ضرور باز آ جائیں گے۔ ویسے تم ان کی بیوی ہو، ہر طریقہ استعمال کر سکتی ہو۔“

”یہ پارسے۔“ اگر اس طرح نہ مانیں تو غصہ، خفگی، آخر میں میکے جانے کی دھمکی۔“ اس نے صرف نہ بولنے لگا۔

”الکھنڈن انڈیا رخصت ہو کر اپنے گھر چلی گئی تو اتنے دنوں سے جو گھر میں شادی کے ہنگامے سے تھے، ایک دم ماند پڑ گئے۔“

”دونوں تک سب کی زبان پر اس شادی کا تذکرہ رہا، پھر خود بخود ہر بات معمول پر آگئی۔ روز و شب اوروں۔ البتہ اب وہ گھر کے سارے کام کرنے کو تنہا ہوگئی۔ جب تک انیلا تھی، وہ اس کا کرتی تھی، اب آماں تو بس حکم ہی چلایا کرتی تھیں۔“

”گھر کے کام کرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ وہ تو ویسے بھی مصروفیت کے بہانے ڈھونڈتی ہی بہانے وہ سارا دن مصروف رہتی لیکن جب طاقت سے بڑھ کر بوجھ آٹھا یا جائے تو زیادہ نظر نہیں رہا جاسکتا، وہ بھی بالا خرڈھے گئی۔ پہلے دو ایک روز ہلکا ہلکا بخار رہا، تیسرے دن صبح

جب ثاقب حسن نے اسے اٹھایا تو وہ بخار میں جل رہی تھی۔  
 رات تو تم اچھی بھلی تھیں، پھر اچانک اتنا تیز بخار کیسے آگیا؟ وہ اچھٹے سے ہونچنے لگا  
 وہ کیا کہتی خاموش ہی رہی۔

تم بیٹھی رہو، میں تمہارے لیے چلے کر آتا ہوں۔ شاید اس میں کچھ انسانیت باقی ہو  
 کبھی کبھی غالب آکر اسے مغلوب کر دیا کرتی تھی۔ اسے لیٹے رہنے کا کہہ کر وہ باہر نکل گیا، پھر  
 اس سے اپنی آمان سے چائے بنانے کے لیے کہا تھا جو انہوں نے ایک سنگٹا گھر کر دیا۔  
 جو روکے غلام ہو تم۔ اب اس نوابزادی کو کمرے میں چائے پہنچاؤ گے، وہ بھی مجھے ہے  
 میں اس کے باپ کی نوکر نہیں بنی ہوئی۔

اماں۔ اماں۔ وہ انہیں اس کی باری کا بتانا چاہتا تھا لیکن وہ اپنی کہے گئیں۔  
 کہہ دو اس سے۔ اگر اتنا ہی پیٹنگ توڑنے کا شوق ہے تو باب سے کہہ کوئی خدمت  
 دے۔ مجھ سے اس کلبوی کے خمرے نہیں اٹھائے جاتے۔ مجھے تو یہی یادو کرنی گئی ہے۔ پتا  
 ایسا کون سا جادو کیا ہے تم پر کہ تمہیں اس کے پھیلے لہجے ہی نظر نہ آئے۔  
 میرے خرا۔ اس نے نیکہ کھینچ کر اپنے سر پر رکھ لیا لیکن اماں کی آواز تھی یا اسرائیل کا  
 جو ہر رکاوٹ توڑ کر سماعتوں پر ہتھوڑے برسائے جا رہی تھی۔

ربیع۔ کہانی در بعد ثاقب حسن کی آواز سنائی دی لیکن وہ شاید اسے نام نہیں دیکھا  
 تھی، اس لیے سوئی بن گئی اور وہ بھی دو تین آوازیں دینے کے بعد کمرے سے نکل گیا۔  
 پھر سارا دن وہ اسی طرح پڑی رہی۔ کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ کھانا، پانی تو دور کی بات کہ  
 کمرے میں جھانکا تک نہیں اور پتا نہیں ثاقب حسن ایسے کون سے ضروری کاموں میں الجھا ہوا  
 اسے بھی گھر میں بیمار بیوی کا خیال نہیں آیا۔ بس اتنا کرم کیا کہ گورنمنٹ کئی روز سے جو رات گئے  
 تھا، سہ شام چلا آیا۔ لیکن جتنا سے سے بھی باز نہیں رہ سکا۔

میں تمہاری وجہ سے اپنا اتنا ضروری کام چھوڑ کر چلا آیا ہوں۔  
 اس کا دل چاہا کہہ دے، اب بھی نہ آتے، لیکن وہ خاموش رہی۔  
 اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟ بخار آتا یا نہیں؟

اور سارا دن مجھ کی پیاسی رہنے کے باعث نقاہت اتنی تھی کہ وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔ تب  
 بڑھ کر اس کی پیشانی چھو کر دیکھنے لگا۔ بخار کی شدت میں اضافہ ہی ہوا تھا۔  
 کوئی دوا تو نہیں لی ہوگی تم نے؟ مجھ سے غلطی ہوئی عاقب سے کہہ جاتا تو وہ تمہیں ڈاکٹر  
 پاس لے جاتا۔ پھر خود ہی کہنے لگا۔ عاقب کو بھی کہاں فرصت ہے، ابھی بھی ایک پارٹی سے لٹا  
 تھا۔ وہ چپ چاپ سستی اور دیکھتی رہی۔

چلو اٹھنے کی کوشش کرو۔ ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے لگا۔  
 تمام وہ بیڈ سے اتر کر کھڑی ہوئی تھی کہ چکر کر دو بارہ بیٹھ گئی۔  
 اسی وقت کال بیل بجنے کی آواز آئی تو وہ اسے چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو  
 پیچھے آتی صوفیہ کو بس ایک پل کو دیکھ سکی کہ آنکھوں کے سلسلے وندھ کی چادر ہی تھی۔  
 تم نے تو شاید گھر سے نہ نکلنے کی قسم کھائی ہے، میں نے سوچا، میں ہی تم سے مل آؤں۔  
 کھنٹی ہوئی آواز سنائی دی تو وہ ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی تھام گئی۔

ارے کیا ہوا تمہیں؟ صوفیہ کو لگا جیسے کلائی جلتے انگاروں سے چھو گئی ہو۔ ایک دم پریشان  
 وہیں گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام لیا۔  
 اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں ابھی اسے ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا تھا۔ اس کے

حسن نے جواب دیا۔  
 تم سے بیمار ہے؟ کم از کم ہمیں اطلاع تو کرتے۔

بیمار ہی تو تھیک تھی۔ بس اچانک۔ آپ ٹھیک سے بیٹھیں، میں چائے وغیرہ۔  
 انہیں میرا خیال ہے پہلے اسے ڈاکٹر کے پاس لے چلتے ہیں۔ چلو ربیع، ہمت کرو، میں بھی  
 تھ جاتی ہوں۔ صوفیہ نے سہارا دے کر اسے اٹھایا۔ پھر اسی طرح اپنے ساتھ لگائے ہوئے  
 سے کر ثاقب حسن کے پیچھے باہر آئی تو وہ جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر خود اسے بٹھانے لگا۔  
 نیلے اپنی گاڑی وہیں لاک کر دی اور خود ربیع کے ساتھ بیٹھ گئی۔  
 دیر نہ ہوئی اسے آپ کے ساتھ؟ وہ گاڑی اسٹارٹ کرتا ہوا پوچھنے لگا۔

و معروف اتنے رہتے ہیں کہ مشکل ہی سے کہیں جانے کے لیے وقت نکال پاتے ہیں۔ آج کل  
 لیے بھی ایک نئے پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ پھر اخلاقا کہنا پڑا کبھی تم لوگ آؤ ناں۔  
 رسمی باتیں۔ اس نے سوچا حالانکہ یہ سٹے ہے اور دونوں اچھی طرح جانتے ہیں کہ نہ بھی  
 زیاں طرف اسے گا اور نہ کبھی ہی ہم جاسکیں گے پھر بھی ایک دوسرے کو دعوت دے رہے ہیں۔  
 ثاقب حسن کس قدر وفلا ہے۔ اس روز تو مہر وز کے خلاف اتنا زہرا لگ رہا تھا اور اب یوں  
 رہا ہے جسے اس سے بڑے اچھے مراسم ہوں۔

نہیں طرف چلتا ہے؟ وہ گردن موڑ کر پوچھنے لگا۔ میرا مطلب ہے کون سے ڈاکٹر کے پاس؟  
 ڈاکٹر حسین کے کلینک چلیں۔ وہ بہت اچھے ڈاکٹر ہیں۔ صوفیہ نے مشورہ دیا۔  
 یہ کہاں پر ہیں؟

تم چلو، میں بتاتی ہوں۔ صوفیہ اسے راستہ بتانے لگی اور وہ شیشے سے سرٹکا کر آنکھیں بند کر گئی۔  
 ربیع تم ٹھیک تو ہو۔؟ صوفیہ اس کی طرف متوجہ ہوئی اور اسے اتنا ڈھال دیکھ کر پریشانی  
 سے پوچھنے لگی۔ اس نے وراسی آنکھیں کھول کر دیکھا اور بکے سے سر ہلا کر دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔  
 میرا خیال ہے ربیع کی طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔ پلینر گاڑی تیز چلاؤ۔

ایسا خیال بھی تو نہیں رکھتی۔ وہ اسپید بڑھاتا ہوا بولا۔ ہر وقت کام، کام اور بس کام۔  
 میرا خیال ہے تم ملازم انور ڈاکٹر سکتے ہو، تمہارے نہیں رکھتے؟  
 یہی کلینک ہے؟ وہ اس کی بات نظر انداز کر کے پوچھنے لگا۔  
 ہاں، بس یہیں روک دو۔

اس نے گاڑی روکی اور جلدی سے اتر کر ربیع کو اترنے میں مدد دینے لگا۔  
 دوا نہ سہی، اگر غذا بھی اسے ملتی ہو تو وہ اتنی بڑھال نہ ہوتی، صبح سے ایک قطرہ پانی تک اس  
 منہ میں نہیں گیا تھا، جیسی یہ حالت تھی کہ صوفیہ اور ثاقب حسن کے سہارے چلنے کے باوجود کوڑھ  
 آتے آتے اس کی سانس پھول گئی۔ اور بدن کا مینے لگا۔ ٹانگوں میں جسے جان ہی نہ رہی۔ مزید  
 پچھلنے سے ان کا کرتے ہوئے وہ وہیں بیٹھ کر بیٹھ گئی اور دیوار سے ٹیک لگا کر لمبے لمبے سانس  
 لیتی۔

میں ڈاکٹر صاحب کو یہیں لے آتی ہوں۔ صوفیہ اسے چھوڑ کر بہت عجلت میں ڈاکٹر صاحب کے  
 کے طرف چلی گئی تو وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ لاکھ ستر سو روپے مہر سہی، اس وقت اس کی حالت  
 بہتر نہ تھی بلکہ حد پریشان ہو رہا تھا۔ اپنی غلطی اور اماں کی زیادتی کا احساس جاگنا تو کہنے لگا۔  
 مجھے صبح ہی تمہیں ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے تھا۔ میرا خیال ہے، اماں نے تو سارا دن تمہیں پوچھا بھی  
 ہوا کہ کم از کم تمہیں کوئی بلکی چھلکی غذا ہی کھلا دیتی۔ پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا کر کہنے

پلینر میری کوتاہی معاف کر دو۔

”عجیب شخص ہے کبھی شعلہ، کبھی شبنم۔“ اس نے سوچا اور اپنا دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھ پر لگا کر گویا یقین دلانے لگا کہ وہ اس سے خفا نہیں ہے۔

”میں تمہیں بہت دکھ دینے لگا ہوں لیکن میں کیا کروں کہ۔“

صوفیہ کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کو آتے دیکھ کر اس نے اپنی بات وہیں چھوڑ دی۔

”ارے بیگم شہر و زاحمد۔ کیا ہوا ابھی آپ کو؟“ ڈاکٹر صاحب انجانے میں بھونچال لے اُس کے اور خود اطمینان سے اس کا معائنہ کرنے لگے۔ جب کہ صوفیہ کی ساری خود اعتمادی دھڑکی دھڑکی اپنے آپ میں چور سی بن کر نکلیوں سے شائبہ حسن کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہونٹ اور شکر پشانی نے شدت سے احساس دلایا کہ وہ کتنی بڑی حاققت کر گئی ہے لیکن وہ کیا کرتی، فوری طور پر جہاں ڈاکٹر حسنین کا نام زبان پر آیا تھا وہاں وہ یہ بھی بھول گئی کہ ڈاکٹر حسنین، شہر و زاحمد کے غیور ہیں اور گزشتہ دو برسوں میں کبھی کبھی ربیعہ سے ضرور مل چکے ہوں گے۔

اور ربیعہ جو پہلے ہی بیماری کے باعث نڈھال ہو رہی تھی، ڈاکٹر صاحب کے اس طرح غافلہ کرنے پر اس کی روح ٹپک ٹپک کر گئی۔ یوں لگا جیسے اس کا وجود ہوا میں نہیں معلق ہو گیا ہو۔ بالکل غیر ارادی طور پر اس نے سہارے کے لیے شائبہ حسن کے ہاتھوں پر اپنی گرفت مضبوط کر لی چاہی کہ وہ بڑی بے دردی سے اس کے ہاتھ جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”غالباً شہر و زاحمد آپ کا خیال نہیں رکھ رہے۔ مجھے بیگم صاحبہ سے ان کی شکایت کرنی پڑے گی ڈاکٹر صاحب چیک آپ کر کے سیدھے کھڑے ہوتے تو پھر مزاح جعبے میں کہنے لگے۔ وہ مدد کے صوفیہ کی طرف دیکھنے لگی تو وہ فوراً بول پڑی۔

”ڈاکٹر صاحب کوئی پریشانی کی بات تو نہیں؟“

”نہیں میں میڈیسن کلمہ دیتا ہوں لیکن میڈیسن سے زیادہ انہیں آرام کی ضرورت ہے۔ ویلے کمزور بھی بہت ہو رہی ہیں۔ اگر کہیں تو ڈرپ لگا دوں؟“

اس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلادیا۔

”چلیے پھر میں کل کپاؤنڈر کو گھر بھیج دوں گا، وہ آپ کو ڈرپ لگا آئے گا؟“ اس نے ان سخی کرتے ہوئے اور اس صورتحال سے لاتعلقی ظاہر کرنے کی خاطر فراموشی گوا موڑ کر واپسی کے رستے پر نظر پڑا تو انہیں تو لگا جیسے اچانک اس کی رگوں میں لہو جمد ہو گیا ہو۔ ساتھ ہی کائنات کی ہر شے ساکن۔

اور اس سارے منظر میں اگر کوئی چیز متحرک تھی تو وہ شہر و زاحمد کے قدم، جو لمحہ بلمحہ دریا فاصلہ رشتاتے چلے آ رہے تھے۔



وہ شہر و زاحمد کے قدم روکنے پر قادر نہیں تھی، اندر ہی اندر بے حد خوفزدہ ہو کر رخ موڑ گئی۔ شاید ساری قیامتیں آج ہی ٹوٹی ہیں! اس نے سوچا اور غیر محسوس طریقے سے اچانک پشانی آگے تک کھینچ لیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ شہر و زاحمد اسے دیکھیں اور ابھی تک تو واقعی انہوں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ وہ وہیں اپنے قدم روک لیتے اور شاید واپس بھی پلٹ جاتے۔ لیکن تقدیر کا ستم ظریف کہ وہ جانے کن خیالوں میں مگن ہو کر چلے آ رہے تھے کہ وہاں موجود کسی شخص پر بھی ان کی نظر نہیں پڑی اور شاید وہ اسی طرح سب کے قریب سے گزر رہی جاتے لیکن ڈاکٹر حسنین نے انہیں لیا اور وہ چونک کر رُکے تو ڈاکٹر صاحب کہنے لگے۔

”غالباً آپ اپنی مسز کے لیے آئے ہیں۔“

یہ ایک اور چونکانے والی بات تھی۔ وہ حیران ہوئے اور کچھ کہنا چاہتے تھے کہ صوفیہ بول پڑے

”ڈاکٹر صاحب۔ اگر آپ میڈیسن کلمہ دیتے تو۔“

صوفیہ آپ۔؟“

انہوں نے اسی قدر کہا تھا کہ صوفیہ نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اور ڈاکٹر صاحب کے پیچھے چل دی۔ اور وہ صوفیہ کے اشارے پر خاموش تو ہوئے تھے لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ کچھ اُچھے اُچھے سے اس کے پیچھے جانا چاہتے تھے کہ شائبہ حسن اسے اُکھڑا ہوا اور طنز آمیز لہجے میں دانت پس کر بولا۔

”آپ لوگوں کی پلاننگ کی داد دینی پڑے گی شہر و زاحمد۔“

”پلاننگ؟“ ان کی سمجھ میں نہیں آیا، آخر انہیں کس قسم کی صورت حال کا سامنا ہے۔

”انجانہ بننے کی کوشش بے کار ہے شہر و زاحمد۔ مجھے تو صرف ایشیا تبا دیں کہ اس پلاننگ میں میری بیوی

کس حد تک شریک تھی؟“

بات کرتے ہوئے شائبہ حسن نے نیچ پر بیٹھی ربیعہ کی طرف اشارہ کیا تو ان کی نظریں بھی اُس طرف اٹھ گئیں اور پھر یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ جیسے ہر پہل نظریں تلاش کرتی تھیں۔ ایک طویل مدت بعد اس پر نظر پڑے اور شہر و زاحمد نے بہت چاہا اس کی رسوائی کا سامان نہ ہو۔ اس پر کوئی آہنج نہ آئے۔ لیکن اپنے آپ پر انتہا نہیں رہا تھا۔ ہزار کوشش کے باوجود اس پر سے نظریں نہ ہٹا سکے۔ اور یہی بات شائبہ حسن کے شک کو تقویت دے گئی۔ ان پر بس نہیں چلا تو ربیعہ کی کلائی تھام کر ایک جھٹکے سے اٹھایا اور قریباً گھسیٹا ہوا اپنے ساتھ لے گیا اور وہ وہیں کھڑے ایک بار پھر اسے دور جانا ہوا دیکھتے رہے۔

”ربیعہ! ہاں ہے؟“ عقب سے صوفیہ کی آواز آئی تو وہ فوراً اس کی طرف پلٹے اور نقطہ اس کا نام لے لے۔

”ربیعہ۔“

”ہاں ابھی ربیعہ اور شائبہ یہاں تھے، کہاں گئے؟“

”پتا نہیں۔ شاید باہر موجود ہوں۔“ انہوں نے کہا تو صوفیہ تقریباً بھاگتی ہوئی گیٹ تک گئی۔ اور ہاں شائبہ حسن کی گاڑی نہ دیکھ کر یاہوسی سے پلٹ آئی۔ پھر قدرے تیز لہجے میں پوچھنے لگی۔

”آپ یہاں کیا کرنے آئے تھے؟“

”میں امی کی رپورٹس لینے آیا تھا۔“

”آپ کو بھی اسی وقت آنا تھا۔“ اس کے لہجے میں دکھ، تاسف، پریشانی اور جلنے کا کچھ تھا کہ شہر و زاحمد زیادہ تو نہیں سمجھے لیکن اتنا اندازہ ضرور ہو گیا کہ کہیں کوئی گڑبڑ، کوئی غلطی ضرور ہو گئی ہے۔

”سب محض اتفاق ہے لیکن وہ کبھی یقین نہیں کرے گا۔“ صوفیہ پرسوج انداز میں جیسے اپنے آپ سے بولی دین وہ سن کر کہنے لگے۔

”کیا بات ہے؟“ آپ پریشان کیوں ہیں؟ سب ٹھیک تو ہے ناں؟“

”کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ آپ جا کر امی کی رپورٹس لے آئیں۔ پھر گھر چلتے ہیں۔“

”رپورٹس میں کھل لے لوں گا۔ آپ آئیے۔“

وہ اس کی حالت کے پیش نظر اپنا کام کل پر چھوڑ کر اسے لے کر باہر نکل آئے، پھر ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”آپ امی کیسے تھیں؟“ میرا مطلب ہے آپ کی گاڑی؟“

”میں ربیعہ اور شائبہ کے ساتھ آئی تھی۔“

وہ اتنا کہہ کر ان کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اور جب انہوں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تو ان کے پوچھنے سے پہلے ہی کہنے لگی۔

”میں ربیعہ سے ملنے آئی اس کے گھر گئی تھی۔ وہ بیمار تھی اور شائبہ حسن اسے ڈاکٹر کے پاس لے



جانے والا تھا۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں بھی اُس کے ساتھ چل پڑی۔ اور مزید غلطی یہ کہ ہر شاقب نے ڈاکٹر کی بابت پوچھا تو میں نے بنا سوچے سمجھے ڈاکٹر حسنین کا نام لے دیا اور یہاں آکرنا میں کیا ہوا؟

وہ ایک نظر اُس پر ڈال کر دوبارہ سامنے دیکھنے لگے۔

”ڈاکٹر حسنین، ربیع سے اسی پرانے تعلق کے حوالے سے بات کرنے لگے۔ یعنی انہوں نے اسے بیگم شہر و زاحمد کہہ کر مخاطب کیا۔“

”مائی گاڈ۔“ اسٹیرنگ پر اُن کی گرفت سخت ہوئی۔

”ستم تو یہ ہے کہ شاقب حسن بھی وہیں موجود تھا۔ اور آپ سوچ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب طرز مخاطب پر اس کا کیا رد عمل ہوا ہوگا۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ اگر اس کا پس چلتا تو وہ پہلے ڈاکٹر حسنین کے ترجمان پر ہاتھ ڈالتا۔ اس کے بعد ربیع کے ٹکڑے کر دیتا۔ قدرے توقف کے کہنے لگی۔

”میں اگر غیر جانبداری سے بات کروں تو یہی کہوں گی کہ جہاں ربیع بے قصور ہے، وہاں شاقب حسن کا رد عمل بھی بالکل فطری تھا۔ وہ تو کیا، کوئی بھی شخص یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اُن کی بیوی کو کسی دوسرے شخص کے ساتھ منسوب کر کے مخاطب کیا جائے۔ اور مزید ستم یہ کہ اب چلے آئے۔“

”مجھے اگر معلوم ہوتا تو۔“ وہ تاسف سے بولے۔

”میں آپ کو الزام نہیں دے رہی۔“ وہ فوراً بولی پڑی۔ ”مجھے تو لگتا ہے جیسے حالات ربیع کے خلاف محاذ بنا لیا ہے۔ وہ کہتے ہی ہاتھ پاؤں کیوں نہ مارے، حالات کو شکست نہیں سکتی۔“ بہن کو درپیش حالات کی سنگینی محسوس کر کے وہ رو پڑی اور اسی طرح روتے ہوئے چٹانیں، اس کے مقدر میں یہ سب کیوں لکھا گیا؟ اتنی ڈھیر ساری آزمائشیں، اتنے ٹکڑے امتحان اور ایسے مکٹھن مراحل یا میں انہیں سزا سے تعبیر کروں۔ لیکن سزا بھی کیوں بیکار کیا ہے نے؟ اس کی ساری زندگی میرے سامنے لکھی کتاب کی مانند ہے۔ کہیں کوئی گناہ، کوئی خطا! نہیں ہے جو گرفت میں آجائے پھر اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

پلیئر صوفیہ۔“ وہ آسے رونے سے منع کرنا چاہتے تھے لیکن وہ اور شدت سے روتی بن۔

”آپ جانتے ہیں اُسے۔ کس قدر سادہ ہے وہ۔ شروع ہی سے ایسی ہے۔ صابر، شاکر اور زیادتی چپ چاپ سہہ جانے والی۔ اگر کوئی اُسے تپتی ریت پر کھڑا کر کے یہ کہہ دے کہ تمہیں عمر بیس کھڑے رہنا ہے تو میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ اپنا قصور پوچھے پنا وہیں اپنی زندگی تمام کر دے گی۔“ انہوں نے گھر کے سامنے گاڑی روک تو کھینے لگے۔

”میں آپ کا دکھ اور پریشانی محسوس کر سکتا ہوں لیکن مجھے افسوس ہے کہ اس سلسلے میں؟ کر سکتا۔ کیونکہ میں بالکل بے اختیار ہوں۔“

”جب بااختیار تھے تب کیا کیا؟“ وہ ہنسنے پر یہ جتانے سے باز نہیں رہ سکتی تھی کہ اُنہی سے ہوئی، اب بھی طنز سے بولی۔ تو وہ افسردگی سے مسکرائے۔

”مجھے تو رہ کر ربیع کا خیال آ رہا ہے۔ ایک تو وہ بیمار ہے۔ اوپر سے شاقب حسن پتانا اُس کے ساتھ۔“

”پلیئر۔“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر طے بولنے سے روک دیا، پھر کہنے لگے۔ ”آپ خواہوا یا ہو رہی ہیں۔ شاقب حسن اُس کا شوہر ہے۔ محبت میں ہر حد پھیلاؤنگ جانے والا شخص۔ وہ اگر

دنی کرے گا تو تلافی بھی کر دے گا۔ میاں بیوی کا رشتہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ادھر لڑے، ادھر جوئی۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو آپ۔“

اُس کے شکی نظروں سے دیکھنے پر ایک دم خاموش ہو گئے۔ ہاتھ بڑھا کر سگریٹ کا پیکٹ اُٹھایا ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دباتے ہوئے کہنے لگے۔

”خیلے۔ آپ گھر جائیں۔ اتنی انتظار کر رہی ہوں گی۔“ اور آپ؟

”میں ایک کام سے جا رہا ہوں۔ اتنی پوچھیں تو بتا دیجیے گا۔ اور یہ بھی کہ ہو سکتا ہے مجھے نہیں دیر ہو جائے۔“

اس کے ساتھ ہی انہوں نے لائٹر جلا کر سگریٹ سلگایا اور پھر ڈھیر سارے دھوئیں میں اپنے کو غیبیائی کی ناکام کوشش کی۔

”جو باتیں آپ نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی ہے شہر و زبھائی، اُن سے اپنے آپ کو بھی بہلا جاؤ۔ وہ دھند کے اُس پار اُن کے چہرے پر نظر میں جا کر بولی۔ پھر فوراً اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکلے۔ اور وہ جو سوچ رہے تھے، اُس کے آرتے ہی گاڑی بھگالے جائیں گے، چپ چاپ اُس کی نہ دیکھے گئے۔

”میری گاڑی ربیع کے گھر ہے، ہو کے تو ڈرائیور بھیج کر منگوا لیجیے گا۔“ اُس نے کہا اور اُن کا جواب بغیر اندر چلی گئی۔

شاقب حسن کی پیشانی شکن آکوتھی اور ہونٹ سختی سے جھپٹے ہوئے تھے۔ وہ اُس کی طرف دیکھنے کی بہت بار پائی تھی۔ لیکن گاڑی کی مسلسل بڑھتی ہوئی اسپید سے وہ اس کے اندر اُٹھنے طوفان کا اندازہ کر سکتی تھی۔ اس طوفان کا اندازہ کر کے ہی اندر ہی اندر وہ بے حد خوفزدہ ہو گئی۔ اور اپنے آپ کو اس طوفان کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرنے لگی۔ اُس کا خیال تھا وہ ڈاکٹر حسنین کے طرز مخاطب پر خفا ہو گیا پھر اچانک دروازہ کے آجانے پر اور زیادہ سے زیادہ ان دونوں حضرات کو گالیوں سے نوازے گا لیکن وہ تو کچھ اور لہ رہا تھا۔ ایسی باتیں جو اس کے گمان میں بنی نہیں تھیں۔ گھر اور پھر اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی زوردار آواز کے ساتھ دروازہ بند کیا۔ پھر اسے دھکا دے کر بیڈ پر گرانا ہوا کہنے لگا۔

”تم آوارہ اور بے وطن ہو۔ میرے گھر میں رہ کر شہر و زاحمد کے ساتھ عشق و محبت کا کھیل، کھیل رہی ہو۔ اس کھیل میں تمہاری وہ لنگڑی بہن بھی شریک ہے۔“

”نہیں۔“ وہ چیخنا چاہتی تھی لیکن آواز نے ساتھ نہیں دیا۔ تو نفی میں سر ہلاتی ہوئی اُس کے سامنے نہ جڑ گئی۔

یہ الزام مت لگاؤ مجھ پر اور میری بہن پر۔“

یہ الزام نہیں، حقیقت ہے۔“ وہ اُس کے ہنڈھے ہاتھوں پر پیر سے ٹھوکر مارتا ہوا کہنے لگا۔ ”مجھے پڑھ تو اسی روز ہو گیا تھا جس روز فون پر تم نے مجھ سے بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ تمہارے کی بیزاری اور اُتار پٹ میں نے صاف طور پر محسوس کی تھی۔ پھر اپنی بہن کو محض اس لیے تم نے باگھر میں بیاہا تاکہ آئندہ بھی وہاں تعلق رکھ سکے۔ اور تم اس میں کامیاب ہوئیں۔“

”نہیں شاقب حسن۔ نہیں۔“ اُس کے آنسو روانی سے بہہ نکلے تھے۔

”تم ساری کا ڈھونگ رہا کر شہر و زاحمد سے ٹٹنے لگی تھیں۔ اگر میں وقت سے پہلے نہ آجاتا تو تم اپنی ناک کے ساتھ آزادی سے طے شدہ پروگرام کے تحت اپنے اُس عاشق سے مل آتیں۔“

”فدا کے لیے شاقب حسن۔ چاہو تو مجھے جان سے مارو لیکن ایسے گھٹیا الزام مت لگاؤ کہ مجھے اپنے آپ کو کھین آنے لگے۔“

”گھن تو تمہیں اُس وقت آئے گی، جب میں نہیں بے نقاب کروں گا اور سارا زمانہ تم پر ٹھوکرے مارے گا اور تمہارے ساتھ ساتھ شہر و زاحمد پر بھی جو بڑا عزت دار بنا پھرتا ہے۔“  
اُس نے ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا تو اُس کے بالوں کو سمیٹھی میں جکڑ کر اس کا چہرہ اونچا کرتا ہوا لنگے لگا۔

”تم اگر یہ سمجھ رہی ہو کہ میں تمہیں دوبارہ شہر و زاحمد تک جانے کے لیے آزاد کر دوں گا۔ تو یہ خیال دل سے نکال دو۔ گو کہ میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا، اس کے باوجود تمہیں یہیں رہنا ہے، اسی گھر میں اور اگر کبھی گھر سے باہر قدم لگانے کی کوشش کی تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔ تمہیں اُس کے بالوں کو زور سے جھٹکا دے کر چھوڑا تو تکلیف کی شدت سے اُس کی چیخ نکل گئی۔  
”چلاؤ مت۔“ وہ دھاڑا۔ ”اپنی آواز کو ہمیشہ کے لیے اپنے اندر دفن کر دو۔ اور اب میں ذرا تمہیں عاشق نامدار سے دو دو ہاتھ کر آؤں۔“

وہ پیر پختا ہوا کمرے سے نکل گیا تو وہ نیکی میں منہ چھپا کر رونے لگی۔  
یہ صبح ہے کہ وہ شہر و زاحمد سے نانا توڑنا نہیں چاہتی تھی لیکن جب نانا ٹوٹ گیا تو اُس نے زمین پر تعلق ختم کر لیا تب تک اپنی سوچوں پر بھی پرے پھٹا لیتے تھے۔ اور یہ بھی صبح ہے کہ وہ ثاقب حسن سے بہت پہلے متفرق ہو گئی تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ وہ دوبارہ اُس کی زندگی میں آئے لیکن جب ربات ہی اُس کی خواہش کے برعکس ہوئی، تب اُس نے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ گو کہ وہ اپنے دل میں ثاقب حسن کے لیے محبت نہیں پیدار کر سکی تھی۔ لیکن اُسے مجازی خدا سمجھتے ہوئے وہ اس سے ہٹ کر سوتی تھی نہیں تھی۔ اور وہ تھا کہ ابھی اس پر اثنا بڑا الزام رکھ گیا تھا۔ آوارہ اور بدچلن کہہ کر اُس کی روتیوں میں شین شکاف ڈال گیا تھا۔

وہ کسک کسک کر روتی رہی۔ اس سارے واقعے کو سوچتی تو کہیں بھی حالات اُس کے حق میں نہیں تھے۔ گو کہ سب کچھ محض اتفاق تھا۔ چہ نہ آیا کا آنا۔ ڈاکٹر حسنین کی لاعلمی۔ پھر شہر و زاحمد آمد۔ لیکن ثاقب حسن نے اپنی سوچ کے مطابق کوئی سے کڑی ملا کر اسے ان سب کی پلاننگ قرار دیا تھا اور وہ قصور وار نہ ہوتے ہوئے بھی قصور وار ٹھہرائی گئی۔

ایک تو پہلے ہی طبیعت خراب تھی۔ رونے سے بخار اور تیز ہو گیا۔ سر بھی درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ صبح سے کچھ کھانا پیا بھی نہیں تھا۔ اس وقت بھی کچھ کھانے کو تو دل نہیں چاہا لیکن چائے کی شدید خواہش تھی۔ کوئی ایک کپ چائے ہی پلا دے اور کون تھا، کوئی بھی نہیں۔ اس نے یہ جاننے کے باوجود کہ اس کی طبیعت خراب ہے، کمرے میں جھانکنا نہیں تھا۔ اور خود سے اٹھنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

کچھ دیر تک خود ہی اپنا سر اور پیشانی دباتی رہی۔ پھر دوپٹے سے اپنا سر باندھ رہی تھی کہ پہلے دروازے پر دستک ہوئی اور پھر اُس کے سر اندر جھانک کر شاید ثاقب کے بارے میں پوچھنا چاہتے تھے لیکن اس کے سر پر دوپٹہ بندھے دیکھا تو اندر آتے ہوئے بولے۔  
”کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟“

”جی۔“  
وہ اسی قدر کہہ سکی اور وہ قریب آئے تو اُس کی سرخ آنکھیں اور بھیکھا چہرہ دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔  
”تم زور ہی ہو؟“ اُس نے نفی میں سر ہلایا لیکن زبان پھسل گئی۔  
”جی۔“

”ثاقب نے کچھ کہا ہے یا اُس کی ماں نے؟“  
”جی۔ کسی نے نہیں۔“

”اچھا۔“ وہ اطمینان سے اُس کے سامنے بیٹھ گئے۔ اور فوراً اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔  
”اچھی بات ہے کہ تم کسی کی شکایت نہیں کرتیں۔ لیکن بیٹا اس طرح اکیلے رونے سے مسئلہ تو حل نہیں ہوتا۔“  
”مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟“  
”کوئی بات نہیں آتا۔ بس سر میں درد ہو رہا ہے۔“ وہ سر ہلا کر بولی۔

”لاؤ میں تمہارا سر دبا دوں۔“  
”نہیں آتا۔“ وہ نامم ہوئی اور جلدی سے سر پر بندھا دوپٹہ کھولنے لگی۔ ”میں اسپرین لے لیتی ہوں۔“

”اسپرین ہے؟“  
”میں دیکھتی ہوں۔“  
”رہنے دو۔ میں لے کر آتا ہوں۔“

وہ اٹھ کر چلے گئے تو اُس نے پیشانی گھٹنوں پر رکھ لی اور آنکھیں بند کرتے ہوئے فوری طور پر خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ کیونکہ ڈاکٹر اسی سوچ درد کی ٹیسوں میں اضافہ کر رہی تھی۔ البتہ آنکھیں بند رہے ہی سارے واقعات فلم کی طرح چلنے لگے تھے۔ کافی دیر بعد جب آیا آئے، وہ اسی طرح بیٹھی ہی انہوں نے یکبارہ، تب سر اونچا کیا۔ اور اُن کے ہاتھوں میں ٹڑے دیکھ کر حیران ہوئی اور اپنے پاپی بے حد شرمندگی محسوس کرتی ہوئی اٹھنے لگی تھی کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ بے بسی سے رنجام کر رہ گئی۔

”اپنے کیوں تکلیف کی آتا؟“  
”کوئی تکلیف نہیں کی۔ لویہ بسٹ کھاؤ۔“ اُٹانے پلیٹ اُس کے آگے رکھی۔ پھر ایک بسکٹ اٹھا کر اُس کی طرف بڑھایا۔

”میرا کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ بس چائے پیوں گی۔“  
”تمہیں اسپرین بھی لینی ہے اور خالی پیٹ اسپرین نقصان دہ ہوتی ہے۔ چلو پہلے بسکٹ کھاؤ۔“  
اُٹانے پیا رہ کر عرب جایا تو اُس نے بسکٹ لے لیا۔

یہ صبح ہے کہ میں الگ تھک ایک کمرے میں پڑا رہتا ہوں۔ ”آجائے کاکپ اُس کے سامنے رکھتے ہوئے کہنے لگے۔ ”لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں گھر کے حالات سے بالکل ہی بے خبر ہوں۔ میں سب جانتا ہوں۔ تمہارے سامنے اس گھر میں کوئی اچھا سلوک نہیں ہو رہا اور اس سلسلے میں مجھے سب سے زیادہ حیرت اپنے بیٹے ثاقب پر ہے کہ وہ تو تمہیں ہماری مخالفتیں اور ناراضگی مول لے کر بیاہ کر لایا تھا۔“

اُس نے یوں دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو ”آپ بھی“۔ اور وہ اُس کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر کہنے لگے۔  
”ہاں، میں بھی۔“ وہ نچوڑی ایمانداری سے اعتراف کرتے ہوئے کہنے لگے۔ ”میں خود اس شادی کا مخالف تھا۔ اور میری مخالفت کی وجہ خاص طور پر تمہاری ذات نہیں تھی، تمہاری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تب بھی میں ایسا ہی کرتا کیونکہ میں ثاقب حسن کی شادی اپنی بھتیجی سے کرنا چاہتا تھا۔ اسی طرح اُس کا والدہ اپنی بھانجی کو اس گھر میں لانے کی خواہشمند تھیں۔ بہر حال میری مخالفت اور ناراضگی اُسی روز ختم ہو گئی جس روز تم بیاہ کر اس گھر میں آئیں لیکن شاید تمہاری ساس ابھی تک دل میں بغض رکھتے ہوئے ہیں۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

”میرا خیال تھا جس چاہ سے ثاقب حسن تمہیں بیاہ کر لایا ہے، اس سے بہت جلد وہ تمہیں اس گھر میں تمہارا صحیح مقام دلادے گا لیکن وہ تو انتہائی نامعقول نکلا۔ اُس کی مثال اس بچے کی سی ہے جو کسی کھلونے کے لیے چل چل کر روتا اور ضد کرتا ہے۔ اُس کے حصول کے لیے ہر جائز اور ناجائز

حرہ استعمال کرنے کو حق سمجھتا ہے اور جب حاصل کر لیتا ہے تو بڑی بے دلی سے ایک کونے پر ڈال کر مطمئن ہو جاتا ہے۔ تمہارے ساتھ بھی اس نے یہی کچھ کیا۔ اس میں تھوڑا قصور تھا مگر تمہاری بے زبانی کا۔ اور صاف کوئی کے لیے معاف کرنا پڑی کہ تمہارا پہلے سے شائبہ سے کوئی رابطہ؟ جیسی تو اس نے تم سے شادی پر اتنا اصرار کیا۔ اور ایسی صورت میں تو لڑکیاں بڑے دھڑکنے پر نہ صرف شوہر بلکہ اس کے پورے گھر پر حکمرانی کرتی ہیں کیونکہ انہیں یہ مان حاصل ہوتا ہے کہ ہوشی سب کی ناراضگی مول لے کر اسے بیاد لایا ہے، وہ ہر قدم پر اس کا ساتھ دے گا۔

وہی باتیں جو چھوٹی آپا نے اسے سمجھائی تھیں اور جن پر عمل کر کے اس نے یہ مان حاصل کرنا چاہا تھا لیکن تقدیر کی ستم ظریفی کہ وہ جب اسے اپنا احساس دنانے میں کامیاب ہونے لگی، کوئی ایسا بات ہو جاتی، جس سے وہ اور زیادہ منتشر ہو جاتا۔ شام میں بھی تو وہ اپنی غلطی کا احساس کر کے گھبراہٹ اور اس سے اعتراف بھی کر رہا تھا کہ چھوٹی آپا آگئیں۔ گو کہ ان کے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ وہاں ہوگی اور بے چاری محبت یا ہمدردی میں اس کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس بھی چل پڑیں۔ کیا خبر تھی کہ ہر تورا پر بد نصیبی جال بھلائے کھڑی ہے۔

”آخر وہ چاہتا کیا ہے؟“ آپا پوچھ رہے تھے اور وہ تو خود نہیں جانتی تھی، انہیں کیا بتائی، بہت آزدہ سی ہو کر ٹھوڑی کھٹکوں پر رکھی۔

”ابھی کس بات پر اتنے غصے؟“ دنماتا ہوا باہر گیا ہے؟“ آپا نے پوچھا تو اس کا دل زلزلہ سے دھڑکنے لگا تھا۔ آنکھیں الگ جگہ تھیں۔ نچلا ہوا منہ دانستوں سے چپکلی ہوئی پلکیں جھپک جھپک کر آنسو پینے کی کوشش کرنے لگی۔

”مجھے بتاؤ بیٹا، کیا بات ہے؟“ شاید میں اسے سمجھا سکوں۔ اس تمام عرصے میں پہلی بار کہ اس کا ذہن محسوس کر کے نرمی سے بات کر رہا تھا۔ وہ ساری کوششیں ترک کر کے رو پڑی تو آپا نے جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس اکھڑے ہوئے۔ محبت سے سر پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگی۔

”نرومت بچی۔ مجھے بتاؤ۔“ وہ شاید میری گذشتہ زندگی کو ذہنی طور پر قبول نہیں کر پارہ۔ ”وہ بمشکل تمام اسی قدر کہہ سکتی کہ آپا فوراً بول پڑے۔

”کیوں؟“ کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ تمہارے ساتھ ایک حادثہ ہو چکا ہے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ کچھ جانتے ہو جتھے اس نے تمہارے ساتھ شادی کی ہے پھر آپا ان باتوں کو دہرائے اور تہیں طعنہ کا کیا مقصد ہے؟ یہ ساری باتیں تو اسے پہلے سوچنی چاہیے تھیں۔ بہر حال تم فکر نہ کرو، میں اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ اتنی کم ظرفی کا مظاہرہ نہ کرے۔“ پھر اس کا سر تھپکے ہوئے لگے۔

”چلو، ابھی تم نے اسپرین کھائی ہے، اب آرام کرو۔ رنومت اور ذہن پر پوچھ ڈالنے کی ہم ضرورت نہیں ہے۔“ پھر خود ہی اس کے لیے ہیکے سیدھا کر کے، اسے لٹایا اور سونے کا کرتے ہوئے ٹرے اٹھا کر کمرے سے نکل گئے۔

اس نے بہت خاموشی سے انہیں جاتے ہوئے دیکھا، پھر آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ نیند تو نہ آ رہی تھی اور نہ ہی شائبہ حسن کی واپسی تک سونا چاہتی تھی۔

اس وقت سے تو وہ ہر سوچ کو پرے دھکیلتی رہی تھی اور اب پیٹ میں تھوڑی غذا چلنے چائے پینے سے اعصاب قدرے پرسکون ہوئے تو وہ از خود نئے سرے سے سارا واقعہ دیکھنے لگی۔ وہ قصور وار نہیں تھی اور ہو سکتا ہے شائبہ حسن کو بھی اپنی بے گناہی کا یقین دلانے میں کامیاب ہو جاتی۔ لیکن اس وقت جس بات نے اسے پریشان کیا وہ شائبہ حسن کا غصے میں جانا تھا اور

بھی کہہ گیا تھا کہ وہ شہر و زاہد کے پاس جا رہا ہے۔ وہ تصور کرنے لگی۔ شائبہ حسن، شہر و زاہد کا ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہونا اور اس کے بعد بہت ساری باتیں جو اس کی زندگی پر تو اثر انداز ہوتیں، چھوٹی آپا کی پرسکون زندگی میں بھی زہر کھول سکتی تھیں۔ اور یہ ساری باتیں سوچ کر وہ اندر اندر ہونے لگی۔ ساتھ ہی دعا بھی کر رہی تھی کہ شائبہ حسن اور شہر و زاہد کا سامنا نہ ہو۔

کتنا وقت گزر گیا۔ پریشان سوچوں میں گھرے، گھڑی نے ایک کا گھنٹہ بجایا تھا، جب شائبہ حسن آیا تھا۔ گو کہ وہ فوراً جاننا چاہتی تھی کہ وہ کہاں سے آ رہا ہے اور کیا کر کے آ رہا ہے؛ لیکن وہ اس لحاظ سے دیکھنے کی ہمت تک نہ کر سکی۔ بازو کی آڑ سے ذرا سی آنکھ کھول کر دیکھا اور اس کا سرخ چہرہ لکھ کر آنکھ بند کر لی۔

”میرے خدا۔“ دل دھڑک دھڑک کر کسی خطرے کی آگاہی دینے لگا اور کسی خوفناک واقعے کو سوچ کر اس کا سانس تیز تیز چلنے لگا۔

اور وہ جو اسے سوتا سمجھ رہا تھا، اس کے کندھوں میں حرکت دیکھ کر فوراً آگے بڑھ آیا۔ اور اس کی آنکھوں سے بازو ہٹاتا ہوا پوچھنے لگا۔

”کون آیا تھا یہاں؟“

”ابا۔“ اس کے منہ سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

”میں یہاں کی بات نہیں کر رہا۔ تمہارے گھر سے کون آیا تھا؟“ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے جیسے ابھی اسے جلا کر رکھ کر دے گا۔

”کون؟ کوئی نہیں۔“

”پھر تمہاری بہن کی گاڑی کون لے گیا ہے؟“

”بتا نہیں۔“

”گاڑی کیا خود چل کر گئی ہے۔ کوئی تو آیا ہوگا۔“

”میں نہیں جانتی۔ تم اماں یا آپا سے پوچھ لو، انہیں معلوم ہوگا۔“

”پوچھ لوں گا ان سے۔ اور اگر مجھے یہ معلوم ہوا کہ گاڑی کے یہاں کوئی تمہارے پاس بھی آیا تھا، تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”کون آئے گا میرے پاس، کیا میرے گھر والے؟“

”ہاں میں تمہارے گھر والوں کا یہاں آنا بھی پسند نہیں کرتا۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر دبی دبی آواز میں چیخا۔ اگر کوئی آیا تو میں دھکے دے کر نکال دوں گا۔ اور آج تو وہ تمہارا عاشق نامدار پرچ گیا، لیکن آخر تک؟“

اس کے ساتھ ہی وہ پیر پٹختا ہوا ہاتھ روم میں چلا گیا۔ ڈریسینج کر کے نکلا تو قہراً اودھنظر اس پر ڈال کر اپنی جگہ پر جا لیٹا۔ وہ پیر دیر تک سانس روکے اس کی طرف سے مزید کسی بات کی منتظر رہی لیکن جب وہ سمجھ گیا کہ بغیر دوسری طرف کروٹ بدل گیا، تب اس نے بہت آہستگی سے سینے میں دبی سانس ہونٹوں کی قید سے آزاد کی اور دوبارہ بازو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔

اسے یہ سوچ کر ہی خوف آنے لگا تھا کہ شائبہ حسن اس کے گھر سے آئے کسی فرد کو دھکے دے کر نکال دے اور اس سے کوئی بعید بھی نہیں تھا کہ وہ ایسا کر گزرتا۔ ویسے تو اس کے گھر سے کوئی آنا بھی نہیں تھا۔ جب سے اس کی شادی ہوئی تھی، بس اماں ایک بار آئی تھیں یا آج شام چھوٹی آپا، اندر ظاہر ہے، جب وہ نہیں جانے لگی تو کوئی نہ کوئی تو اس کی خیر خبر لینے ضرور آئے گا۔ چھوٹی آپا بھی تو اسی لیے آئی تھیں۔

وہ سوچنے لگی کہ وہ آخری بار اماں کے گھر کب گئی تھی۔ تب اسے یاد آیا کہ انیل کی شادی سے

پہلے شام کے وقت ذرا دیر کو گئی تھی اور اس روز بھی اچانک ہر وز سے سامنا ہونے پر ناقب حسن کا موڈ گڑبگڑ گیا تھا۔ اس کے بعد وہ اسی خوف سے نہیں گئی تھی۔ اور اس بات کو تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ہی گھبراہٹ سے بیان کیا تھا۔ پھر آگے کا بھی کچھ پتا نہیں تھا کہ ناقب حسن کب تک اسے جانے دے۔ اور اس دوران اتنا اس سے بالکل تو غافل نہیں رہ سکتی تھیں۔ یقیناً وہ کسی دن ادھر آ سکتی تھیں اور ان کی آمد پر ناقب حسن کا رد عمل سوچ کر اسے جھڑپ ہی آگئی۔ پھر اس نے سوچا، وہ کسی طرح اتنا کم سن کر دیکھنے لگی کہ فی الحال اس کے گھر کوئی نہ آئے۔ لیکن اس طرح تو آماں پریشان ہو جائیں گی اور وہ اپنی طرف سے کسی کو پریشان نہیں کر سکتی تھی۔

صوفیہ سے تو انہوں نے بڑے آرام سے کہہ دیا تھا کہ۔ آپ خوامنواہ پریشان ہو رہی ہیں۔ ناقب حسن اس کا شوہر ہے۔ اگر زیادتی کرے گا تو تلافی بھی ضرور کرے گا۔ لیکن وہ اپنے آپ کو یہ بات نہیں سمجھا سکے تھے۔ صوفیہ کو گھر پر اتنا کر پھر وہ بے مقصد مڑکوں پر گاڑی دوڑاتے رہے۔ مسلسل اسی کا خیال پریشان کر رہا تھا اور انہیں لگتا جیسے اس سارے واقعے کے وہی ذمہ دار ہوں۔ رہ رہ کر اس کا ہمارا اور افسردہ چہرہ نگاہوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ اور پھر ناقب حسن کا اسے گھسیٹتے ہوئے لے جانا۔ انہوں نے سوچا، جب وہ ہر عام اس کے ساتھ رہ سکتی ہے تو گھر جا کر تو پتا نہیں کیا کچھ نہ کہا ہوگا۔ اور پتا نہیں کوئی اسے روکنے والا بھی ہوگا کہ نہیں۔ وہ لڑکی ربیعہ اکرام علی۔ جس کا خیال ہی زندہ رہنے پر کسنا تھا ہے۔ وہ اس سلوک کی مستحق تو ہرگز نہیں تھی۔ انہوں نے سوچا اور اس کے بہت سارے روپ ایک ساتھ لگا ہوں میں آسمانے۔ وہ اس کا دھیرے دھیرے چلنا اور دھیرے دھیرے ٹسکانا۔

ذرا سے سخت لہجے پر اس کا سہم جانا۔ کبھی ایک دم اپنی اپنی سی اور کبھی ایک دم پرائی۔ یقیناً تمہیں سوچنا مجھے زیب نہیں دیتا۔ وہ قصور میں اسے مخاطب کر کے کہنے لگے "لیکن میرا خود اپنے آپ پر اختیار ہو تب ناں، میں اپنے آپ کو باز بھی رکھوں۔ تم نے تو کوئی لمحہ میرے لیے چھوڑا ہی نہیں۔ اسی لیے ربیعہ اکرام علی، میں تمہیں سوچتے ہوئے اپنے آپ کو سرزنش یا ملامت نہیں کروں گا۔" انہوں نے کلب کے سامنے گاڑی روکی تو اس پاس اس کی آواز کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ "میں آئندہ آپ کا کلب جانا پسند نہیں کروں گی۔" "آپ۔" انہیں یاد نہیں آیا انہوں نے کیا کہا تھا لیکن اس کی بات اچھی طرح یاد تھی۔ "جی۔ جب تک کچھ حق رکھتی ہوں، اسے استعمال بھی کروں گی۔" وہ راہ فرار ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آئے تھے لیکن پہلے ہی مرحلے پر وہ جیسے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ گاڑی موڑنا چاہتے تھے کہ قریب ہی سونیا کی گاڑی آن لڑکی۔ انہیں دیکھتے ہی وہ شیشے سے ہر نکال کر کہنے لگی۔

"ارے شہر و زاجر۔ کہاں غائب ہیں آپ؟" "غائب کہاں، تمہارے سامنے تو ہیں۔" وہ ذرا سا مسکرائے۔ "کیا واپس جا رہے ہو؟" وہ انہیں گاڑی میں بے دیکھ کر پوچھنے لگی۔ "نہیں۔" اتنے عرصے بعد ایک اچھی دوست ملی تھی۔ انہوں نے واپسی کا ارادہ ترک کیا اور گاڑی سے اتر آئے۔ پھر اس کے ساتھ اندر آئے تو وہ پوچھنے لگی۔ "آج اپنی مسٹر کو نہیں لائے؟ کیا بھلا سا نام ہے اس کا۔ ربیعہ۔" انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ ایک طرح سے یوں ظاہر کیا جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔

لان میں آ گئے۔ اور وہ بھی عجیب لڑکی تھی۔ لان چیمبر پر ان کے سامنے بیٹھی تو کہنے لگی۔ "کیا حال ہے ربیعہ کا؟" یقیناً بچے میں مصروف ہو گئی ہوگی۔ جبھی تم یہاں نظر آرہے ہو۔" "تم اپنی سناؤ اس تمام عرصے میں کیا کرتی رہی ہو۔؟" وہ بات کا رخ اس کی طرف موڑ گئے۔ "کوئی خاص کارنامہ انجام نہیں دیا۔" وہ ہنستی ہوئی بولی۔ "وہی پرانی روٹین چل رہی ہے۔ ڈیڑی سا آٹھ ان کے آفس میں بیٹھنا، سب پر ہر گھر اور اس وقت یہاں۔" "شادی کا نہیں سوچا؟" وہ یونہی بات بڑھانے کی غرض سے بولے۔ "سوچا۔ لیکن عمل نہیں کیا۔" وہ بے نیازی سے بولی۔

"کیوں؟" "اس لیے کہ مجھے کوئی پسند نہیں آیا۔ اور کسی کو میں پسند نہیں آئی۔" "ارے۔" وہ اب پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ "کیا کوئی تمہیں بھی ریجیکٹ کر سکتا ہے؟" "کیوں؟ مجھ میں کیا مثر خراب کے پرکھے ہوئے ہیں؟" "یہ تو میں نہیں جانتا لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ تم بہت اچھی لڑکی ہو، ہر لحاظ سے۔" "اتھا۔" وہ ہلکے سے ہنسی۔ "پھر کچھ ویرنگ براہ راست ان کی آنکھوں میں دیکھتے رہنے کے بعد کہنے لگا۔ اگر تمہیں میرے ہر لحاظ سے اچھا ہونے کا یقین تھا تو پھر تم نے مجھے پروپوز کیا ہی نہیں کیا؟" "تم جانتی ہو، میں شادی شدہ آدمی ہوں۔" وہ اپنا دفاع کرنے کی غرض سے بولے۔ "میں اس سے پہلے کی بات کر رہی ہوں۔" "اس سے پہلے۔" وہ سوچتے ہوئے بولے۔ "پہلے کبھی خیال ہی نہیں آیا۔ اور جب خیال آیا تو لڑکی زندگی میں آچکی تھی۔" "ربیعہ کی بات کر رہے ہو؟" وہ فوراً پوچھنے لگی۔

"ہاں۔" وہ مزید اس کے ذکر سے بچنے کی خاطر سگریٹ شنگانے لگے، پھر طویل کش لے کر بولے۔ "سنو۔ یہ ریجیکٹ کرنے اور ریجیکٹ ہونے کا سلسلہ چھوڑو، آرام سے گھر بساؤ۔ رڈ کیا ان اپنے ب میں ہی اچھی لگتی ہیں۔" "اتھا۔" وہ زور سے ہنسی۔ "گویا اب تم نصیحت کرنے والے بن گئے ہو۔" نصیحت سمجھو یا ایک دوست کا مخلصانہ مشورہ۔ "سوچو گی۔" وہ کندھے اچکا کر لاپرواہی سے بولی۔

اب سوچنے کا نہیں، عمل کرنے کا وقت ہے ورنہ عمر گزر گئی تو کوئی پوچھے گا کبھی نہیں؟ "سنو، کہیں تم بیٹی کے باپ تو نہیں بن گئے؟" وہ میز پر قدرے آگے جھک کر شرارت سے بیٹی، نہ بیٹا۔ میں تمہیں گزرتے وقت کا احساس دلانا چاہوں۔" "کس کے ساتھ ہی وہ آٹھ کھڑے ہو گئے۔" "لہاں جا رہے ہو؟" "اندر۔ اتنے دنوں بعد آیا ہوں۔ باقی لوگوں سے مل لوں۔" "ان سب لوگ تمہیں بہت مرس کرتے ہیں۔" "اوکے۔ سی یو۔"

وہ اسے وہیں چھوڑ کر اندر چلے آئے۔ کچھ نئے لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب وہی تھے۔ جن کے ساتھ اچھی خاصی دوستی تھی۔ سب کے ساتھ ہیلو ہائے، کرتے ہوئے آخر میں وہ سلمان کی ٹیبل پر آکر پھر ان کے ساتھ کارڈز کھیلنے ہوئے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔

بلنتر، طعنے اور آج کل تو اس کے پاس ایک ہی موضوع تھا، تمہاری آتماں۔ اور پھر آتماں کو لالچی عورت نے ہوئے ایسی ایسی باتیں کرتا کہ وہ اندر ہی اندر رکٹ کر رہ جاتی۔

لالچی عورت بیٹیوں کے لیے محلوں کے خواب دیکھتی ہے۔ اسے اس سے کہو پہلے اپنی حیثیت تو بچھو۔ رات بھی وہ اس قسم کی باتیں کرتا رہتا تھا۔

اب کبھی آنے کی تو تین خدو اس پر اس کی حیثیت اچھی طرح واضح کر دوں گا۔ جس طرح اس نے پہلی بیری ماں کو مایوس کر لیا تھا میں اس سے زیادہ اسے ذلیل کر کے یہاں سے نکالوں گا۔

آتماں یہاں نہیں آئیں گی۔ انہیں کبھی یہاں نہیں آنا چاہیے۔ اس نے سوچا اور چائے کا آخری گھونٹ لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ویسے بھی وہ کئی روز سے سوچ رہی تھی، کسی طرح اماں کو منہ کروا بھیجے کہ فی الحال اس کے گھر کو نہ آئے۔ اور یہ اچھا موقع تھا کہ وہ بڑی آپا یا چھوٹی آپا کو فون کر سکتی تھی۔ ورنہ تو اسے فون کرنے اور فون سننے کی اجازت بھی نہیں تھی۔

پہلے اس نے سوچا کہ وہ بڑی آپا کو فون کرے لیکن بڑی آپا اس کے حالات نہیں جانتی تھیں اور پھر جس طرح وہ بڑی تھیں، اسی طرح اپنی بڑائی جتنا کہ چھوٹوں کو سمجھانا اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ ان کی طرف سے یہی رشتہ تھا کہ وہ اس کی بات تو سن لیتیں لیکن شام میں کسی بہانے آکر اس کے ساتھ ساتھ نائب جس کو کبھی بھانے بٹھے جاتیں اور نائب حسن فوراً جان جاتا کہ اسی نے انہیں بلایا ہے اور اس کے بعد ہو سکتا ہے بڑی آپا کا لحاظ بھی نہ کرتا۔

یہی سب سوچ کر اس نے چھوٹی آپا کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری طرف بیل جاری تھی اور گو کہ وہ اس ت بالکل اکیلی تھی۔ پھر بھی اچانک کسی کے آجانے کا خوف اتنا حاوی تھا کہ اس کے ہاتھ ٹھنڈے ہو گئے۔ پیشانی پر پسینہ چلنے لگا۔ اور دل کا عالم یہ تھا کہ ابھی پسلیاں ٹوڑ کر باہر آ کرے گا۔

”ہٹو شہر واز احمد اسپیکنگ۔“ ریسپونڈر آتھتے ہی مانوس آواز ابھری اور اس کا رہا سہا وصلہ بھی ٹوٹ گیا۔ فوراً کڑیل پر ہاتھ رکھ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ اور خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ یہ تو بالی نہیں رہا تھا کہ چھوٹی آپا کے علاوہ کوئی اور بھی فون اٹھا سکتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد دوبارہ اور پھر بارہا کوشش کی۔ اور ہر بار وہی آواز سنائی دی تو مانوس جو کہ ریسپونڈر رکھ دیا۔ پھر دل نے سمجھا یا کہ یہ موقع نہیں ملے گا۔

”ہاں ایسا موقع پھر نہیں ملے گا۔ اس نے سوچا اور اپنے آپ پر قابو پا کر نمبر وڈائل کرنے لگی۔ شہر واز احمد۔“ اب کہ صرف اتنا کہا گیا اور وہ بچے کو پر اعتماد بناتی ہوئی بولی۔

”صوفیہ ہیں؟“

”کوئی؟“ رعبہ؟“ کوئی نا، کوئی تعلق نہیں تھا پھر بھی بے اختیار یوں پوچھ گئے جیسے سارے تعلق اسی ہوں اور ان کے بچے کی بے اختیاری محسوس کر کے وہ ڈوبنے لگی۔ کیا کوئی اب بھی اسے اتنی چاہتے رکھتا ہے؟

”رعبہ۔ آپ خاموش کیوں ہو گئیں؟“ وہ پوچھ رہے تھے۔

”پہیز صوفیہ کو بلا دوں۔“ وہ اپنی آواز کی لرزش پر کسی طرح قابو نہ پاسکی۔

”صوفیہ تو غالباً ہاسپٹل گئی ہیں۔“

”خیر برت؟“

”اں کافی دنوں سے کچھ سست سی تھیں۔ چیک آپ کے لیے گئی ہیں۔“

”کیا ہوا ہے انہیں؟“ وہ اپنی بات بھول گئی۔

”صوفیہ کے لیے کوئی میسج دینا چاہیں تو۔“

”نہیں، البتہ آپ سن لیں کہ جن دشواریوں کے بارے میں آپ نے کہا تھا کہ پھر کبھی وقت آنے پر اُن

آہستہ آہستہ سب لوگ رخصت ہو گئے۔ آخر میں وہی چاروں رہ گئے تھے اور جب اس نے بھی پتہ پھینک کر گھر جانے کا اعلان کیا، تب باقیوں کو بھی اٹھنا پڑا۔

وہ جب گھر میں داخل ہوئے، رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ٹی وی لائونج کا لمب غا ان کے انتظار میں جل رہا تھا۔ وہ اسے آف کرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

دیر سے سونے کی وجہ سے صبح بہت دیر سے اُن کی آنکھ ٹھکی۔ سائڈ ٹیبل سے گھڑی اٹھا کر دیکھی، نو بج رہے تھے۔ اپنے آپ میں خاصی شرمندگی ہوئی۔ اس طرح اُن کے معمولات تو کبھی نہ بگڑے تھے۔ انہیں اتنی کا خیال آیا۔ پتا نہیں، وہ کیا سوچیں گی اور پھر صوفیہ۔ وہ یقیناً باز پرس کرے وہ اس وقت صوفیہ کا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے اپنے کمرے سے نکلے تو سیدھے اتنی کے پاس چلے گئے۔ اور اتنی کی زبانی انہیں معلوم ہوا کہ صوفیہ کچھ دنوں کے لیے اپنی اتنی کے گھر گئی ہے۔ گو کہ یہ عام بات تھی لیکن وہ پتا نہیں کیوں اُنچھے لگے تھے۔

وہ ٹیبل پر ناشتا لگا رہی تھی جب اچانک برآمدے سے شور کی آواز آنے لگی۔ وہ بہت آہستہ گئی۔ میں کڑی بلڈ ٹیبل پر رکھ کر کتنے کی کوشش کرتی گئی۔ آتا پتا نہیں کیا کہہ رہے تھے، جواب میں آتماں کی ہائے گونجنے لگی۔

”ابھی خیر۔“ اس نے دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھا اور جلدی سے باہر نکل آئی۔ آتماں جلدی جلدی کا شور رہی تھیں۔

”نائب کہاں ہے؟“ عاقب کو بلاؤ، جلدی کرو۔“

”حوصلے سے کام لو۔ اس طرح پریشان ہوگی تو بہن کو کیا سہارا دو گی؟“ اُتانے کہا اور نائب کے عاقب کو بھی پکارنے لگے۔

”کیا ہوا اب؟“ وہ آگے بڑھ کر پوچھنے لگی۔

”بیٹا۔ وہ شہباز کے ابو کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔“

”اتنا ہی کہا تھا کہ اُنک جینج کر بولیں۔“

”اس معصوم کو تو پرے کرو۔ میں اس کی شکل دیکھ کر نہیں جاؤں گی۔“

وہ اُتانے کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اپنے کمرے میں آگئی۔ نائب حسن شوز پہننے میں مصروف تھا۔ پھر ہوا تو اسے دیکھ کر کہنے لگا۔

”ہم سب ہاسپٹل جا رہے ہیں۔ تم فون کر کے انیلا کو اپنے پاس بلا لینا۔“

”میں بھی چلوں؟“ وہ بڑی آس سے بولی۔

”کہاں؟“

”تم سب کے ساتھ۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے اور سنو دروازہ اچھی طرح بند کر لینا۔“ وہ پتا نہیں کیا جتنا کہ کمرے سے وہ فوراً اس کے پیچھے نہیں گئی۔ جب گاڑی جانے کی آواز سنئی اور اس کے بعد ہر طرف خاموشی چھا کرے سے نکلی۔ پہلے جا کر گیٹ اچھی طرح بند کیا۔ پھر ڈرائنگ روم میں آکر ناشتے کی چیزیں سینے لگی۔ لوگ اسی طرح چلے گئے تھے، بغیر ناشتا کیے۔

ماس نے سب کچھ دوبارہ لے جا کر کچن میں رکھا، پھر اپنے لیے چائے بنا کر برآمدے میں چلی آئی۔ پیتے ہوئے وہ سب کے رویے پر غور کرنے لگی۔ خاص طور پر نائب حسن جو اس روز کے واقعے بالکل ہی بدل گیا تھا۔

گمنا ہی نہیں تھا کہ یہ وہی نائب حسن ہے جو کبھی اُس کے بغیر زندگی کو ادھورا خیال کرتا تھا۔ ہر

کے بارے میں بتائیں گے تو وہ میں جان چکی ہوں۔ وہ پتا نہیں کیسے یہ بات کہہ گئی اور ان کے پکارنے کے باوجود سلسلہ منقطع کر دیا۔

اپنے کمرے تک آتے آتے لگا جیسے میلوں کی مسافیتیں طے کر آئی ہو۔ سانس تیز تیز چلنے لگا تھا۔ دھڑکنیں الگ بے ترتیب۔ اور ٹانگوں میں تو جیسے جان ہی نہیں رہی تھی وہ بے دم سی ہو کر میڈ پر گری اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ دیواروں کے کان تو سنا تھا لیکن اب اسے لگ رہا تھا جیسے دیواروں پر بے شمار آنکھیں لگی ہوں۔ اور ابھی ثاقب حسن کے آنے پر سب گواہی دیں گی کہ ہم نے ربیعہ کو شہر ذرا احمد سے بات کرتے نہ صرف سنا بلکہ دیکھا بھی ہے۔

”میرے خدا۔“ وہ بے حد خوفزدہ ہو کر جیسے اپنی صفائی پیش کرنے لگی۔  
”میں چھوٹی آپا سے بات کرنا چاہتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ دوسری طرف شہر ذرا احمد فون ریسور کریں گے۔“

”تم سلسلہ منقطع کر دیتیں“ ایک طرف سے آواز آئی۔  
”میں نے ایسا ہی کیا تھا لیکن ہر بار ہی۔“ اسی طرح خود ہی سوال کرتی، خود ہی جواب دیتی وہ بھرا گئی کہ ثاقب حسن نے اسے ایلا کو بلانے کے لیے کہا تھا۔

کتنی دیر گزر گئی۔ جب سوال و جواب کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ شور مچا دھڑکنیں معمول پر آ گئیں تب وہ اپنے کمرے سے نکل آئی۔ کرنے کو کوئی کام نہ تھا۔ اور اب کام کرنے کی اتنی عادت ہو گئی تھی کہ فراغت سے بے کرنے لگی۔

”پتا نہیں، گھر والوں کی واپسی کب ہو؟“ اس نے سوچا اور بلا مقصد برآمدے میں ایک برسرے دوسرے برسرے تک ٹپکنے لگی۔  
ابھی دوسرا چکر ہی لگا رہی تھی کہ باہر گاڑی رکنے کی آواز سن کر چونک گئی اور رگ کر انتظار کرنے لگی پھر جیسے ہی بیل بجی، فوراً جا کر گیٹ کھولا۔ سانسے ثاقب حسن ایلا کھڑا تھا۔ اسے تقریباً دھکیلا ہوا اندر آیا اور متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھتا ہوا پوچھنے لگا۔

”ایلا نہیں آئی؟“ اس کے پوچھتے ہی یاد آیا کہ وہ جاتے جاتے کیا کہہ گیا تھا وہ اندر ہی اندر ہنسنے اور بھنسنی بھنسنی آواز حلق سے لٹکی۔

”نہیں۔“  
”کیوں؟ کیا کہہ رہی تھی؟“  
”اصل میں مجھے اس کا نمبر نہیں ملا۔“ اس نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

”نمبر نہیں ملا۔ یا تم نے ملا یا نہیں۔؟“ وہ شکوک نظروں سے دیکھنے لگا۔  
”میں نے کوشش کی تھی۔ لیکن اس کا فون انگریج تھا۔“ وہ اس کی ٹٹولتی نظروں سے گھبرا کر دوسرے طرف دیکھنے لگی۔ پھر اس کا دھیان بٹانے کی غرض سے پوچھنے لگی۔

”خالد جان کی طبیعت اب کیسی ہے؟“  
”خطرے سے باہر ہیں۔“ وہ گرنے کے انداز میں ایڑی چیئر پر بیٹھا تو کہنے لگا۔ ”کچھ پکا یا تو؟“

”ہو گا تم نے۔“ چلو ایک کپ چائے ہی لے آؤ۔“  
”ناشتا اسی طرح رکھا ہے، اگر کھانا چاہو تو۔“

”نہیں بس چائے۔“ اس نے کہا تو وہ کچن میں آ گئی  
ابھی چوبیس پر پانی رکھ ہی رکھی تھی کہ فون کی بیل بجنے لگی۔ ثاقب حسن وہیں موجود تھا۔ اس لیے اس کے جانے کا سوال ہی نہیں تھا۔  
پھر جب وہ چائے لے کر آئی اب ایلا۔ پھر میں بچ رہی تھی۔ اس نے دیکھا ثاقب حسن۔

دیر کان سے لگا کر دو تین بار ہیلو کہا۔ اور پھر کچھ جھنجھلا کر ریسور بٹن دیا۔  
پتا نہیں کون آؤ کا پتھا ہے جسے میری آواز سننے ہی سانپ سونگھ جاتا ہے۔ وہ اونچی آواز میں بڑبڑایا۔  
اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے پتا نہیں کیا خیال آیا کہ کہنے لگا۔  
”ہیں بیٹھ جاؤ۔“ وہ بڑھ گئی تو کہنے لگا۔

”ہو سکتا ہے دوسری طرف کوئی تمہاری آواز سننے کا متمنی ہو۔“  
”کون ہو سکتا ہے؟“ اس نے سوچا اور ذہن ادھر ادھر بھٹکنے لگا۔ اور ابھی کسی خاص فرد تک رسائی ملی نہیں کر سکا تھا کہ بیل دوبارہ بجنے لگی۔ وہ اتنی عورتی کہ بیل کی آواز پر اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔  
”ریسور اٹھاؤ۔“ اس کا لہجہ سفاک اور نظروں میں جانے کیا تھا کہ وہ اندر ہی اندر کانپ کر رہ گئی۔ اور اس کی بات پر عمل نہیں کر سکی۔

”اٹھاؤ۔“ اس نے حکمانہ لہجہ اختیار کیا۔  
”اے کاش کوئی نہ ہو۔“ اس نے دل ہی دل میں دعا مانگی اور ریسور اٹھا کر کان سے لگالیا لیکن بولی نہیں۔

”اپنی آواز سنناؤ آسے۔“ وہ پتا نہیں کیا سمجھ رہا تھا اور کیسے اتنے یقین سے کہہ رہا تھا وہ اس کا غلط ثابت کرنے کی خاطر آہستہ آواز میں بولی۔  
”ہیلو۔“

”تھینکس گاڈ! ربیعہ، تمہاری آواز تو سنائی دی۔“ دوسری طرف صوفیہ جس طرح اطمینان کا سانس لیتی بولی، اس سے وہ سمجھ گئی کہ کافی دیر سے وہی رنگ کر رہی ہے۔  
”کون ہے؟“ ثاقب حسن نے اس سے جھپٹ کر ریسور اپنے کان سے لگایا تو صوفیہ کہہ رہی تھی۔

”اصل میں جس وقت تمہارا فون آیا، میں ہاسپٹل گئی ہوئی تھی۔ شہر وز بھائی بتا رہے تھے، تم کچھ پریشان رہی تھیں۔ سب خیریت تو ہے ناں؟“

”اب تک تو واقعی خیریت تھی صوفیہ بی بی لیکن اب شاید نہ رہے۔“ وہ لفظ جپا جپا کر بولا اور ریسور بٹن پر اس پر جھادیں۔ وہ نہیں جانتی تھی صوفیہ نے کیا کہا ہے البتہ ثاقب حسن کے خطرناک تیور اسے کچھ سمجھا رہے تھے۔

”اسی ہی اس کے اندر کوئی دھیرے دھیرے بولنے لگا۔  
”اسی طرح ڈرتی رہیں تو حالات کا مقابلہ کیسے کریں گی؟“

”میں کیوں ڈر رہی ہوں؟ کیا کیا ہے میں نے؟“ وہ اپنا تصور کھوجنے لگی۔ ”کہیں کوئی خطا نہیں ہوئی ہیں، پھر یہ شخص ناکردہ جرم کی سزا دینے پر کیوں تلا ہے؟“

”وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور جانے لگی کہ وہ پوری قوت سے چیخا۔  
”ربیعہ۔“ وہ چند قدم چلنے کے بعد رگ گئی۔  
”واپس آؤ۔“ وہ اسی طرح چیخ کر بولا۔

”آر یا پار۔“ میں اب کسی ناکردہ گناہ کی سزا نہیں جھیلوں گی۔“ اس نے فیصلہ کن انداز میں سوچا۔ او۔  
”اگر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”تم نے شہر ذرا احمد کو فون کیا تھا؟“  
”نہیں۔ میں نے چھوٹی آپا کو فون کیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ریسور شہر ذرا احمد نے کیا۔“ اس کی وہی جھکی کہ پھر کے نیچے دس کہ چھوٹی بھی کاٹ لیتی ہے اور پھر جب آر یا پار سوچ ہی لیا تھا تو ڈرنے یا

”ایلا سوال؟ جرم کھڑی رہی اور اعتماو سے جواب دیا تو وہ اور زیادہ طیش میں آ گیا۔“

گو یا تم اعتراف کر رہی ہو۔“

”ہاں جو حقیقت ہے میں اس کا اعتراف کر رہی ہوں۔“

”اگر اتنی دیدہ دلیر ہو گئی ہو تو جاؤ، اپنے اس نامراد عاشق سے مل آؤ جو یقیناً۔“

”شائبہ حسن۔“ وہ بھی چیخ پڑی اپنی زبان کو لگام دو۔ مجھ پر کوئی الزام رکھنے سے پہلے نور گریبان میں جھانکو کر تم کو کیا ہو؟“

”اپنے گریبان میں تو بعد میں دیکھوں گا ربیعہ بیگم پہلے اُس کے گریبان میں ہاتھ ڈال آؤں جو میرے عزت سے کھیل رہا ہے۔ اتنی جرأت دے دی ہے اُس نے تمہیں کہ آج تم میرے مقابل کھڑی گئی ہو۔“ اس کے ساتھ ہی وہ کرسی کو پھر کی زوردار ٹھوک سے دوڑ گرتا ہوا انتہائی غصے کے عالم میں باہر طرف چلا تو وہ اس خیال سے کہ کہیں وہ اپنا نقصان نہ کر بیٹھے، اس کے پیچھے لپکی۔

”شائبہ رنگ جاؤ۔“

وہ اُن سنی کرتا ہوا باہر نکل گیا تو وہ اپنے آپ کو انتہائی بے بس محسوس کرتے ہوئے وہیں بیٹھ گئی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا، کیا کرے۔ کسے مدد کے لیے پکارے؟۔ اس وقت تو ویسے بھی کوئی نہ تھا۔ جب کہ چھٹی حسن الارم بجانے لگی تھی۔

”الٹی خبر کرنا۔“ وہ بار بار دُعا مانگنے لگتی۔ شائبہ حسن جس طرح غصے کے عالم میں گیا تھا اُس سے کچھ بھی کر سکتا تھا اور بہت ساری باتیں سوچ کر آخر میں وہ اپنے آپ سے اُبھنے لگی۔

”کیا ضرورت تھی مجھے شائبہ حسن کے سامنے جھک کھڑے ہونے کی۔ کیوں میں نے اُسے مزاح طیش دلایا۔ اگر وہ یہ توقع رکھتا ہے کہ میں ہمیشہ اس سے ڈر کر دب کر رہوں تو پہلے کی طرح اب بھی؟“ سر جھکا دینا چاہیے تھا۔ ہوسکتا ہے وہ بک جھجک کر خاموش ہو جائے۔ اب پتا نہیں کہاں گیا ہے؟۔ وہ اسی طرح سوچتی ہوئی گیٹ تک آئی اور ذرا سا باہر جھانک کر دیکھا، دُور دور تک کوئی نظر نہ پڑا۔ تب بوجھل دل اور بوجھل قدموں سے واپس آ رہی تھی کہ فون کی بیل سے اُس کے اعصاب تن گئے۔ اُس کی پہلی سیڑھی پر قدم روک کر خوفزدہ نظروں سے فون کو کھونسنے لگی۔ دل کا یہ عالم تھا کہ جیسے آج کے بچہ پھر کبھی نہیں دھڑکے گا۔

اُس نے سوچا، دوسری طرف جو بھی ہوگا، خود ہی یایوس ہو کر فون بند کر دے گا۔ لیکن کوئی مستقل ہی تھا جو مسلسل گھنٹی بجتی رہی، جب تک کہ اُس نے ریسپورنڈ نہ اٹھالیا۔

”کون ربیعہ؟۔ کہاں ہو بیٹی؟۔“ دوسری طرف انیلا تھی۔ اُس کی آواز سننے ہی کہنے لگی۔

”میں ہاتھ روم میں تھی۔“ اُس نے جھوٹ بولا۔

”اور کوئی نہیں ہے کیا؟۔“ انیلا نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”کہاں گئے ہیں؟۔“ اُس کا پوچھنا تھا کہ وہ رو پڑی۔

”انیلا۔ تم آ جاؤ پلینز، اسی وقت۔ میں بالکل اکیلی ہوں۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“

”ارے ڈرنے کی کیا بات ہے؟۔ اور یہ امثال اور یا کہاں ہیں؟۔“

”بس یہیں آ جاؤ۔ سب معلوم ہو جائے گا۔“

”اچھا، تم رونا بند کرو۔ میں آ رہی ہوں۔“

اُس نے ریسپورنڈ رکھ دیا اور وہیں بیٹھ کر بانہہ بچکیوں سے رونے لگی۔ پتا نہیں کیوں اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا تھا۔ اب تک کی زندگی میں اسے مختلف حالات کا سامنا رہا تھا۔ لیکن ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ ہتھیالوں سے آنکھیں گردن تو آئسو پھر بہہ نکلتے۔ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر بچکیوں کو روکا۔ تب بھی سنائی دیتی رہیں۔ یہ اس کے ساتھ اور کون رو رہا تھا؟۔

وہ جھبک کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔ کوئی نہیں تھا، پھر یہ آوازیں۔ جیسے کوئی بین کر رہا ہو۔ اُس نے ہیرا کرکان اور آنکھیں بھی بند کر لیں۔ کتنی دیر گزر گئی۔ وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ انیلا کے آنے کا پتا بھی نہیں چلا۔ نہ اُس کی پکار سنائی دی۔

”ہیہا ہوا ربیعہ؟۔“ انیلا نے اُس کا کندھا ہلایا تو اُس کی چیخ نکل گئی۔

”کیا ہوا ہے؟۔“ انیلا بچ بچ پریشان ہو گئی۔ قریب بیٹھ کر اُس کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنایا، اس کا وجود لے ہولے لرز رہا تھا۔ اُس کے بازوؤں کے حلقے میں قدرے پرسکون ہوا۔ تب آنکھیں کھولیں انیلا دیکھا تو بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔

”سب خیریت تو ہے نا؟۔“ انیلا اُس کی پیٹھ تھپکتی ہوئی نرمی سے پوچھنے لگی۔

”اب تک تو سب خیریت تھی صوفیہ بی بی۔ لیکن اب شاید نہ رہے۔“ انیلا کے پوچھنے پر شائبہ حسن بات یاد آئی تو آئسو پھر بہہ نکلے۔

”ربیعہ۔ اسی طرح روتی رہو گی تو میں کیا سمجھوں گی؟۔ آخر کچھ تو بتاؤ۔“ انیلا کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ”کیسے چپ کروائے۔ پہلے رومال سے اُس کی آنکھیں صاف کیں، پھر اُٹھ کر پانی لے آئی۔ اور گلاس کے پونٹوں سے لگا دیا۔ وہ جانے کب سے پیاسی تھی۔ ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر گئی، بچکولے ہاتھوں قدرے ٹھہر سا گیا۔ تب اُس نے دیکھا، انیلا جسم سوا لیم نشان بنی ہوئی ہے۔

”تمہارے خالوجان کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔“ اُس نے اتنا ہی کہا تھا کہ انیلا بول پڑی۔

”کب؟۔“

”قابلات کے آخری پیر۔ اور اماں اب صبح وہیں گئے ہیں۔“

”اُس کے بعد کوئی اطلاع؟۔“

”ہاں شائبہ بتا رہے تھے، اب خطرے سے باہر ہیں۔“

”چلو شکر ہے۔“ انیلا اطمینان کا سانس لیتی ہوئی سیدھی ہو بیٹھی۔ پھر شدت گریہ سے اُس کی زبان ہوتی آنکھوں کو دیکھ کر بولی۔

”لیکن تمہارے رونے کی وجہ یہ تو نہیں ہو سکتی۔ میرا مطلب ہے۔“ وہ بات ادھوری چھوڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ اُس نے پہلے نظریں چرائیں پھر سر جھک لیا۔

”شائبہ بھائی نے کچھ کہا ہے؟۔“ وہ خود ہی سمجھ کر پوچھنے لگی۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا، نہ ہی اٹھا کر اُس کی طرف دیکھا، تب وہ کہنے لگی۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا، شائبہ بھائی کو کیا ہو گیا ہے۔ کہاں تو تمہارے لیے مرے جاتے تھے اور یہ عالم ہے کہ ہر وقت تمہیں زلاتے رہتے ہیں۔ اور تم کتنی بیوقوف ہو۔ چپ چاپ اُن کی باتیں سن نہ ہو اور پھر رونے بیٹھ جاتی ہو۔ کسی دن کھری کھری سنا دو۔ دماغ ٹھکانے آ جائے کھان کا۔ صاف دہ دہ دن بھول گئے جب میرے حصول کے لیے بے قرار رہتے تھے۔ اُس نے سر اٹھا کر دیکھا تو نسکرا پٹہ لندھے اچکائے پھر ازاداری سے پوچھنے لگی۔

”ویسے اب کس بات پر خفا ہوئے ہیں؟۔“

”باتیں تو وہی پرانی ہیں۔“ وہ سوچ کر بولی۔ لیکن ابھی وہ اتنے غصے میں گئے ہیں کہ مجھے ڈر لگے گا۔“

”کہاں گئے ہیں؟۔“

”پتا نہیں۔“

”اچھا خیر چھوٹو۔ تم زیادہ دل پر بوجھ مت ڈالو۔ بلکہ ایک طرح سے اچھا ہی ہے کہ کہیں باہر نکل نہ ہیں۔ واپس آنے تک غصہ بھی ٹھنڈا ہو چکا ہوگا۔ پھر اُس کا دھیان بٹلنے کی خاطر بولی۔

”تم نے کچھ کھایا بھی ہے کہ نہیں؟“  
”نہیں کسی نے بھی کچھ نہیں کھایا۔ صبح میں ابھی ناشتا لگاہی رہی تھی کہ خالہ جان کے ہال سے فون آگیا اور اسی وقت سب چلے گئے۔“ اس نے تفصیل سے بتایا۔

”اچھا۔ تم اپنے ذہن کو آرام دو۔ میں کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔“ انیلا اٹھنے لگی کہ اس نے روک لیا  
”نہیں انیلا، تم بیٹھو۔ یہ فرض تو میرا ہے۔ اور دیکھو اپنی پریشانی میں، میں تم سے کھانے کا پوچھنا تو بھول ہی گئی۔ وہ شرمندگی محسوس کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔  
”افوہ۔ یہ نگفشات رہنے دو ربیعہ۔ ویسے بھی میں کھانا کھا کر آئی ہوں۔“

”پھر بھی تم بیٹھو۔“  
وہ انیلا کو بٹھا کر خود کچن میں آگئی۔ خاص طور پر اپنے لیے کوئی اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔  
اس لیے صبح والے سلاش دو بارہ گرم کیے۔ املیٹ بنایا اور ابھی چلے کا پانی رکھ ہی رہی تھی کہ انیلا کے چینی کی آواز سنائی دی۔  
”ربیعہ۔“ وہ اسے پکار رہی تھی۔



ولا کیتلی پھینک کر بھاگی چلی آئی۔ انیلا کو دیکھا، وہ انتہائی پریشانی کے عالم میں کوئی نمبر ڈال کر رہی تھی۔  
”کیا بات ہے؟“ اس نے قریب آکر پوچھا تو انیلا ایک نظر اس پر ڈال کر فون پر بات کرنے لگی۔  
”ہاں منصور، یہ میں ہوں انیلا۔ پلیز آپ جلدی آجائیں۔ میں یہاں اماں کے گھر ہوں۔ بس فوراً آئیں۔  
انیلا ریسپونڈ کر رکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی تو وہ اس کے کندھے جھنجھوڑ کر چیخنے لگی۔  
”مجھے بتاؤ انیلا، کیا ہوا ہے؟ خالو جان تو ٹھیک ہیں اور ثاقب حسن۔ ثاقب کہاں ہے؟“

”پتا نہیں ربیعہ۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ انیلا وہیں ڈھے گئی پھر  
”اس کے سوا بے پر نظر ڈالتی ہوئی بولی۔  
”جاؤ تم ڈریس چینج کر آؤ۔ ابھی منصور آجائیں، پھر ہم چلتے ہیں۔“

”کہاں؟“  
”ہاسٹل۔“

”ہاسٹل۔“ اس نے دہرایا۔ ”کیا خالو جان؟“  
”بس تم جاؤ جلدی کرو۔“ انیلا اس کے سوالوں سے جھنجھلا کر چیخ پڑی۔  
”لیکن میں ثاقب کی اجازت کے بغیر کیسے جاسکتی ہوں؟۔ وہ تو مجھے۔“  
”ثاقب نے ہی تمہیں بلایا ہے۔ اب جاؤ۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

وہ الجھتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔ ڈریس چینج کر کے بالوں میں اوپر ہی اوپر سے برش پھیرا  
اور کمرے سے نکل کر آئی تو منصور آچکا تھا۔ انیلا سرگوشیوں میں پتا نہیں کیا کہ یہ رہی تھی کہ اسے دیکھا  
خاموش ہو گئی۔

”چلیں۔“ منصور ہاتھ کے اشارے سے اسے سلام کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تو انیلا نے جلدی جلدی  
کروں کے دروازے بند کیے، پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر منصور کے پیچھے چلی آئی۔

تمام راستہ ایک پراسرار سی خاموشی رہی۔ پھر ہاسٹل کے پارکنگ میں گاڑی روک کر منصور سید  
انکڑاڑی کی طرف چلا گیا۔ پھر وہیں سے ان دونوں کو اشارہ کیا اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا سکیٹ فلور پر  
آیا۔ اس کے ذہن میں ابھی تک خالو جان کا خیال تھا، اس لیے وہ اماں آیا اور خالو جان کے گھر والوں  
کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔

پونہ جھکتی ہوئی نظریں آپریشن تھیٹر پر جا ٹھہریں۔ اسی وقت دروازہ کھلا، بس ایک بل کو اور  
ایک بل نے اسے غلاب محوں کی آگاہی دے دی۔ اس کے اندر چیخوں کا طوفان پھرنے لگا۔  
”جوتھ کھلے کی درتھی کہ فرش تاعرش اس کی چیخیں گونجنے لگیں۔ لیکن پتا نہیں کیسے جب جوتھ  
لے تو ساری آوازیں کہیں دُب کر رہ گئیں۔ انیلا کے کندھے پر پیشانی لگائی ہوئی وہ بس اسی قدر کہہ سکی۔  
”ثاقب حسن۔“

”اماں۔ مجھے ربیعہ کے حالات ٹھیک نہیں لگتے۔“ صوفیہ اس وقت سے اماں کے سلاش میں یہی  
جملہ کہہ کر خاموش ہو جاتی تھی۔ اصل میں اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اماں کو کس طرح اس کے  
بات بتانے کیونکہ اس روز جب اس نے اماں کو یہ بتایا تھا کہ وہ ربیعہ کو ڈاکٹر حسین کے پاس  
گئی تھی اور اس کے بعد بھی جو واقعات پیش آئے۔ وہ سب بھی بتائے تو اماں نے سارا الزام  
کے سر رکھ دیا تھا اور یہاں تک کہ ربیعہ کے ساتھ کسی قسم کا کوئی رابطہ رکھنے کی  
دورت نہیں ہے۔ اسی لیے اب وہ ربیعہ کو فون کرنے کا بتاتے ہوئے ڈر رہی تھی۔  
”تم سے کس نے کہا کہ اس کے حالات ٹھیک نہیں ہیں؟“ اماں بار بار ایک ہی جملہ کی تکرار سے  
اسے آکر ناگواری سے پوچھنے لگیں۔

”بس اماں، اب میں آپ کو کیا بتاؤں، آپ خود اس کے گھر کا چکر لگائیں۔“  
”اچھی بات ہے، کسی دن ہو۔ آؤں گی۔“ اماں نے آئندہ پر ٹالا۔  
”کسی دن نہیں اماں، آج ہی بلکہ ابھی چلی جائیں۔“ صوفیہ نے اصرار کیا۔  
”کیوں؟“ اماں کو اس کے منت بھرے انداز پر شبہ ہوا تو کہنے لگیں۔ ”پرچہ بتاؤ، آخر بات کیا ہے؟“  
”میں تم پھر تو نہیں اس کے گھر گئی تھیں؟“

”کیسی باتیں کرتی ہیں اماں؟“ اول تو میں اس کے گھر گئی نہیں اور اگر چلی بھی جاؤں تو وہ میری بہن ہے،  
اس سے تعلق توڑ تو نہیں سکتی۔“ وہ بھی صوفیہ تھی، کسی بھی بات کو ایک حد تک ہی برداشت  
رہتی تھی اور اماں اس کی اس عادت کو نہ صرف اچھی طرح جانتی تھیں بلکہ خائف بھی تھیں، اس لیے نرم  
کر سمجھاتے ہوئے کہنے لگیں۔

”بیٹا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ تمہاری بہن ہے، تم اس سے تعلق نہیں توڑ سکتیں لیکن اس کی بہتری اسی میں  
ہے کہ فی الحال تم اس سے کوئی تعلق نہ رکھو۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔

”ثاقب حسن کو تم جانتی ہو، کتنا شکی مزاج ہے۔ اور اگر شکی مزاج نہ بھی ہو تو تب بھی کوئی شخص ایسی  
بزدل نہ ہو کہ اس سے تعلق نہ بنائے۔“ ارے بیٹا، مرد تو بڑی کا اس کے منیکے سے زیادہ  
حق پسند نہیں کرتا، کہاں اس گھر سے۔“

”میں یہ ساری باتیں سمجھتی ہوں اماں۔“  
”پھر۔؟“  
”آپ سہولت سے میری بات سنیں تو۔“  
”ہاں کہو۔“ اماں پوری طرح متوجہ ہو گئیں تو وہ کہنے لگی۔

”اصل میں صبح ربیعہ کا فون آیا تھا۔ اس وقت میں ڈاکٹر کے پاس گئی ہوئی تھی۔ پھر اس نے شہر وڑے  
۔ مجھے اتنی کا نام لے کر بتایا۔ اس کا فون اتنی نے ریسپونڈ کیا تھا اور انہوں نے ہی بتایا کہ وہ بہت  
ایشان لگ رہی تھی۔ پھر آپ ہی بتائیے، میں چین کیسے بیٹھ سکتی تھی۔ میں نے فوراً اسے فون کیا لیکن  
تب حسن کی آواز سن کر بند کر دیا۔ تین چار بار تو ایسا ہوا، پھر جب ربیعہ نے ریسپونڈ کیا تو میں نے فوراً  
اس سے پوچھا کہ سب خیریت تو ہے اور میرا خیال ہے ثاقب حسن اس کے سر پر کھڑا تھا۔ جو میری بات  
جواب اسی نے دیا۔“



”کیا کہا اس نے؟“ اماں بے تابی سے پوچھنے لگیں۔  
 ”کہہ رہا تھا، اب تک تو سب خیر مت تھی لیکن اب نہیں رہے گی۔“  
 اس نے کہا تو اماں کتنی دیر تک اسے دیکھنے لگیں۔ پھر رابوی سے بولیں۔  
 ”پھر اب میں کیا کر سکتی ہوں؟“

”آپ کسی بہانے اس کے گھر چلی جائیے۔“ اماں شاید منع کرنا چاہتی تھیں کہ وہ فوراً بول پڑی۔  
 ”اے یوں بے اسرامت چھوڑ دیے اماں۔ اگر یہاں سے کوئی اس کی خبر گیری نہیں کرے گا تو۔  
 ثاقب حسن اور شیر ہو جائے گا۔ جو دل چاہے کرتا پھرے گا۔“ اماں کو سوچتے دیکھ کر کہنے لگی۔  
 ”لڑکیوں کے پاس ایک میکے کا مانا ہی تو ہوتا ہے۔ ربیعہ سے یہ مان مست چھینے۔ آپ کے جانے  
 سے اُسے بڑا سہارا ہوگا۔ ورنہ وہ بھی یہی سمجھے گی کہ آپ نے ایک بوجھ کی طرح اسے اتار پھینکا ہے۔“  
 ”تمہاری بات ٹھیک ہے بیٹا لیکن۔“

”لیکن کو چھوڑیں اماں۔ بس آپ جائیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس کی طرف سے دھڑکا لگا ہوا ہے۔  
 صوفیہ میرا اتنی مت سے بولی کہ اماں انکار نہ کر سکیں اور ابھی جانے کی تیاری کر رہی تھیں کہ بڑی آپا  
 آگئیں۔“

”کہاں جا رہی تھیں؟“ بڑی آپا انہیں تیاری کرتے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

”ذرا ربیعہ کی طرف جا رہی تھی۔“

”تو آپ کو معلوم ہو گیا؟“

”کیا؟“ اماں سے پہلے صوفیہ بول پڑی۔

”ثاقب حسن کا اکیڈنٹ ہو گیا ہے۔“

”کیا۔ کب۔؟“ اماں ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھیں۔ وہ خیریت سے تو ہے ناں۔“

”آپ کو کیسے معلوم ہوا بڑی آپا؟“ صوفیہ ایک دم سناٹوں میں گھر کر پوچھنے لگی۔

”ابھی میرے پاس انیلا کے میاں منصور کا فون آیا تھا۔ اسی نے بتایا ہے، میں نے سوچا، اماں

کو بھی ساتھ لے چلوں۔“ پھر اماں کو دیکھتی ہوئی بولیں۔

”لیکن اماں کی حالت تو ایسی نہیں لگ رہی۔ تم چلو۔“

”ہاں میں تو چلوں گی لیکن اماں کا جانا بھی ضروری ہے اور میرا خیال ہے راستے میں کہیں سے آبیاں

کو بھی فون کر دیں گے، پھر کلثوم کو آواز دے کر کہنے لگی۔

”کلثوم جلدی سے گلو کو زبنا کر اماں کو بلاؤ۔“

”اماں۔ آپ حوصلہ رکھیں، اللہ بہتر کرے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ بڑی آپا اماں کی ہتھیلی پر ہاتھ

ہوئی بولیں۔

پھر کلثوم گلو کو زبنا کر آئی تو اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر خود اماں کو بلایا۔

”کیا ہوا ہے بڑی آپا؟“ کلثوم پریشانی سے پوچھنے لگی۔

”کچھ نہیں اور سنو۔ ہم ذرا اماں کو لے کر جا رہے ہیں، تم دروازہ اچھی طرح بند کر لو۔“

”کہاں لے جا رہی ہیں؟“ کلثوم تو پوچھنے بغیر نہ رہ سکی۔

”ربیعہ کے گھر۔“ صوفیہ اس کے مزید سوالوں سے بچنے کی خاطر بولی۔

”میں اور ہما بھی چلیں۔“ وہ اشتیاق سے بولی۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تینوں جا تو رہے ہیں، تم دونوں پھر کسی وقت چلی جانا۔“ بڑی آپا

نے قدرے رعب سے کہا۔ پھر اماں کو اٹھا کر باہر لے آئیں۔

وہ تینوں جب ہاسٹل پہنچیں۔ ثاقب کے اماں آبا اور بڑی بہنیں بھی اچکی تھیں۔ ثاقب حسن ابھی

آپریشن تھیں میں تھا اور ڈاکٹر اس کے بارے میں کچھ بھی بتانے سے گریز کر رہے تھے۔  
 ”بس دعا کریں۔“ آگے جاتے ڈاکٹر یا مسٹر سے کوئی بھی ثاقب کے بارے میں پوچھتا تو وہ یہی

لفظ کہہ کر چل دیتے۔  
 گھنٹہ دو گھنٹہ یا شاید اس سے بھی زیادہ وقت گزر گیا تھا۔ جب نرس نے باہر آ کر ربیعہ کو پکارا۔

جو کئی اور صرف اپنی طرف اشارہ کر سکی۔  
 ”تم اندر چلی جاؤ۔“ نرس نے اس سے کہا۔ اور دوسری طرف چلی گئی۔ تو وہ کچھ سہم کر بڑی آپا کی

نہ دیکھنے لگی۔  
 ”جاؤ۔ بڑی آپا نے اس کا کندھا تھیک کر حوصلہ دیا تو وہ بمشکل تمام اپنے پیروں کو گھسیٹتی ہوئی آپریشن

ٹیبل میں داخل ہو گئی۔ سامنے ثاقب حسن جس حال میں نظر آیا، اس سے اس کے سارے حوصلے پست

ہو گئے۔  
 ”میرے خدا۔ ایسا تو کبھی نہیں سوچا تھا میں نے۔“ انتہائی دکھ سے سوچتی ہوئی وہ آگے بڑھی اور

ہا خون آلود چہرہ ہاتھوں میں تھام لیا۔  
 ”ثاقب۔ دیکھو میں ہوں ربیعہ۔“

”ربیعہ۔“ اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی، پھر وہ ذرا سی آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگا۔  
 ”تو اتنے سے بہتے آنسو اور چہرے پر بچ پڑ جانے کا خوف۔ وہ حیران ہوا۔

”کیا تم اب بھی مجھ سے محبت کرتی ہو؟“  
 اور اگر ایک ذرا سی ہاں اس کے اندر زندگی کی لہر دوڑا سکتی تھی تو وہ ضرور اعتراف کر لے گی۔

”ہاں۔“  
 ”میری زیادتیوں کے باوجود۔؟“

”تم نے کوئی زیادتی نہیں کی۔ میں نے کبھی تمہاری کسی بات کا برا نہیں مانا۔“ وہ اس کی آنکھوں کے

اڑوں سے بہتے آنسو آنکھوں پر سمیٹ کر بولی تو اس کے چہرے پر کرب سمٹ آیا۔  
 ”میں خدا کی قسم تھی ہوئی تقدیر کو مٹا کر شاید خود خدا بن بیٹھا تھا اور یہی بات آپرلے کو پسند نہیں

مانے۔“  
 ”ایسی باتیں مت کرو۔“ اس کے آنسو اور روانی سے بہنے لگے۔

”کہنے دو مجھے کہ میں نے تمہارے ساتھ۔“  
 وہ اعتراف کرنے جا رہا تھا لیکن زندگی دعا دے گئی۔ سانسوں نے نانا توڑ لیا۔ وہ منتظر اس کے

ہا ہونٹوں کو دیکھ کر جا رہی تھی کہ ڈاکٹر نے بہت آہستگی سے اس کے ہاتھ سے ہٹا کر اس کا چہرہ

انپ دیا، وہی چہرہ جسے پہلی بار دیکھ کر وہ گرد پیش سے بے گانہ ہو گئی تھی۔  
 ایک پل میں اس کے سارے روپ نگاہوں میں آسمائے۔ اس کے بعد سارے منظر ہڈیوں

وہی سسکیاں، وہی بین کی آواز جو صبح اُسے دھیرے دھیرے سنائی دی تھیں اور اس نے اپنے

ہا اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اب وہی آوازیں اس کے چاروں طرف گونج رہی تھیں اور وہ نہ کان بند

مندی تھی، نہ آنکھیں اور آنکھیں اس وقت بھی بند نہیں کیں، جب محبت میں ہر حد چھلانگ جانے

الچھے بڑے کی تمیز مٹا دینے والا ثاقب حسن چار کندھوں پر سوار ہو کر گیا۔  
 اس وقت بھی آنکھیں کھلی رہیں، جب سانس نے چوڑیاں اس کی کلائیوں میں یوں توڑیں کہ

یاں ہولناک ہو گئیں۔ پھر کان بھی کھلے رہے۔ نہ صرف بین کی آوازیں بلکہ کونسنے بھی۔  
 ”مخوس۔ ابھاگن۔ جب سے آئی ہے، میرے گھر پر خوش کا سایا پڑا ہے۔ آخر میرے

شیر جوان کا سر لے کر چھوڑا۔ ہائے خود کیوں نہ مر گئی؟

کوئی نہیں تھا جو اس زبان کے آگے بند باندھتا۔ سب کی ہمدردیاں اس عورت کے ساتھ تھیں جو سیدہ کو لے کر رہی تھی۔ وہ بے آواز آنسو لٹائی رہی۔ لے وے کے ایک انیلا ہی تھی جو کسی کسی وقت آکر اس کے گلے لگ جاتی۔ اور جب ثاقب کے آبانے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو اس کی اماں سے کسی طرح برداشت نہ ہوا۔ اسی وقت اسے یہاں سے نکل جانے کا حکم سنایا۔ وہ تڑپ تڑپ کر پل پل کر رونی، ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔

”جانا تو ہے ہی لیکن ابھی نہیں۔“

”ابھی اسی وقت۔ میں مزید ایک لمحہ تمہیں برداشت نہیں کر سکتی۔“

پھر انیلا اور آپا اس کی حمایت میں بولے بھی لیکن انہوں نے ایک نہیں سنی۔ اماں، بڑی آپا اور صوفیہ وہیں موجود تھیں۔ پہلے تو وہ اسے ساس کی منت سماجت کرتے خاموشی سے دیکھتی رہیں۔ پھر ان سے برداشت نہیں ہوا۔ بڑی آپا نے اماں کو اشارہ کیا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”چلو بیٹا۔ جس کے دم سے تم اس گھر میں تھیں، وہی نہیں رہا تو اب تمہارا یہاں رہنا فضول ہے!“

”اماں۔“

وہ احتجاج کرنا چاہتی تھی لیکن اماں کے اشارے پر بڑی آپا اور صوفیہ اسے اٹھا کر لے آئیں۔

زندگی کا یہ امتحان بالکل اچانک اور غیر متوقع تھا۔ ورنہ اب سے پہلے تو ہر امتحان کے لیے بہت پہلے سے جیسے پرچہ سوالات اس کے ہاتھوں میں تھا دیا جاتا تھا اور وہ اگر اس امتحان میں پوری نہیں لگتی آ کر سکتی تھی، تو بھی اپنے طور پر پہلے سے اپنے آپ کو آنے والے امتحان کے لیے تیار ضرور کر لیتی تھی۔ لیکن یہ امتحان جس کے بارے میں اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا، اسے بالکل توجہ کر رکھ دیا تھا۔ ورنہ وہ سنبھل نہیں پاتی، اس پر ساس کے سلوک نے ذہنی حالت بھی مفلوج کر دی تھی۔

ثاقب حسن خواہ کیسا ابھی بھی بہر حال اس کا شوہر تھا۔ اور پھر مرنے والے کی زیادتیاں تو ویسے بھی ٹھنڈا دی جاتی ہیں۔ انسان دانستہ نظر میں چرالیتا ہے۔ وہ بھی بھول گئی۔ کھٹول سے اسے معاف کر دیا۔ اور پھر بہ شہر و زاہد والا معاملہ بھی نہیں تھا جو وہ اپنے اندر دفن کر دیتی۔ اس کے برعکس وہ اسے علی الاعلان یاد کرتی۔ اماں کے پاس بیٹھتی تو اس کی ڈھیروں باتیں کرتی۔ بولنے پر آتی تو بولتی چلی جاتی۔

”اماں۔ وہ شروع سے ایسا نہیں تھا۔ پتا نہیں کس بات نے اسے اتنا تلخ بنا دیا تھا۔“

پھر اپنی خالی گود کا احساس۔

”اللہ میاں اگر مجھے اولاد دے دیتا تو شاید حالات ایسے نہ ہوتے۔“

پھر مایوسی سے کہتی۔

”پتا نہیں اللہ میاں نے میرے مقدر میں اتنی آزمائشیں کیوں لکھی ہیں۔ اور کون جانے یہ آزمائشیں

میں یا میرے کسی گناہ کی سزا۔“

اماں کسی کسی وقت اسے حوصلہ دینے کی خاطر ایک آدھ جملہ کہہ دیتیں ورنہ زیادہ تر خاموش رہتی۔ شاید اس لیے کہ وہ بول کر، کہہ کر دل کا بوجھ ہلکا کر لے۔ پھر وقت کا دامن بڑا وسیع ہے۔ اگر دوسروں کی خوشیاں اپنے دامن میں سماتا ہے تو غم بھی سمیٹ لیتا ہے۔ اس کے دکھوں کو بھی اگر مکمل طور پر بیٹھا نہیں تو کچھ نہ کچھ تو لے ہی اڑا تھا۔ جبھی تو اس میں ٹھہراؤ آ گیا۔ آنسوؤں میں وہ روانی رہی، نہ ٹھپ میں وہ شدت نہ۔ پھر ذہن کسی قابل ہوا تو شاید زندگی میں پہلی بار وہ خود اپنے بارے میں سوچنے لگی۔ اس یقین و اعتماد کے ساتھ کہ اب اس کی زندگی پر خود اس کا اپنا اختیار ہے اور وہ اپنے لیے خود کوئی ایسا راستہ منتخب کرے گی، جس پر چل کر بقید زندگی کچھ سہل ہو جائے۔ حالات نے اگر اسے توجہ

دیے دیا تھا تو زندہ رہنے کے کچھ ڈھنگ اور انداز بھی سکھا ہی دیے تھے۔

اپنے دکھوں کی چادر سمیٹ کر اس نے اپنے اطراف کا جائزہ لیا تو ہر ایک کو اپنے لیے پریشان اور رہ گیا۔ آبامیاں پہلے سے بہت کمزور اور جھکی ہوئی کمزور۔ اماں آئیں بھرتی نظر آتیں۔ کلثوم رتیاں کسی کسی کو نے میں دیکھیں، کبھی کسی کام میں مصروف، کبھی کتابوں میں سر دیے ہوئے یہاں سے کہ گھر کے در و دیوار میں آداسیاں نکلی ہوئی تھیں۔ اس نے ان سارے چہروں پر چھائی آداسیوں کا زہر خود کو سمجھا، پھر پہلے اپنے آپ کو سہارا دیا پھر اس گھر کی زندگی کو دوبارہ پہلے والے معمول پر لانے سوچا اور لگے دن سے عمل بھی کر ڈالا۔

”ارے۔“ اماں صبح ہی صبح اسے کچن میں دیکھ کر حیران ہوئیں۔ تم اتنی جلدی کیوں اٹھ گئیں؟“

”مجھے اسی وقت اٹھنا چاہیے اماں اور ہمیشہ میں اسی وقت اٹھتی رہی ہوں۔ آپ خواںخواہ میری عادت اب کر رہی ہیں۔“ وہ اپنے پرانے انداز میں بولی اور چوہلے پر چائے کا پانی رکھ کر تسلی میں آنا لگے۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن تم یہاں کیوں چلی آئیں، باورچی خانے میں۔؟“

”ناشتا بنانے۔“ وہ اطمینان سے بولی۔

”چھوڑ دو۔ میں بنا لوں گی یا پھر ہما اور کلثوم۔“

”اماں۔“ وہ ہاتھ روک کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ ”مجھے مت روکیں اب جب کہ مجھے ہمس رہنا ہے میرے ساتھ مہمانوں والا سلوک مت کریں کہ میرے اندر ہر دم اجنبیت کا احساس جاگتا رہے۔“

”تم اجنبی کیوں ہونے لگی بیٹا؟۔ یہ تمہارا ہی گھر ہے۔“ اماں کو کھینچا پڑا۔

”ہاں یہی میرا گھر ہے۔“ روکتے روکتے بھی آنکھوں میں نمی آٹا آتی ہے اماں سے چھپانے خاطر وہ سر جھکا کر آٹا گوندھنے میں مصروف ہو گئی۔ اماں کچھ دیر تک کھڑی اسے دیکھتی رہیں، پھر رچکی گئیں۔

عہد گزشتہ کی طرح اس نے سب سے پہلے ناشتا بنا کر آبامیاں کو دیا اور اماں کو بھی زبردستی کے ساتھ بٹھا دیا۔ پھر کچن میں آکر آدوچی آواز میں کلثوم اور ہما کو ناشتے کے لیے نیکارے لگی اس آواز میں کوئی جادو، کوئی سحر نہیں تھا، پھر بھی در و دیوار پر چھائے آداسیوں کے بادل سٹھنے لگے۔ میاں نے پہلے حیران ہو کر اماں کی طرف دیکھا پھر اطمینان بھر سانس لے کر ناشتا کرنے لگے تھے۔ کلثوم اور ہما تقریباً بھاگتی ہوئی کچن کی طرف گئی تھیں۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی گمشدہ چیز ایک ہاتھ لگتی ہو۔

”آپ کی کسٹر کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، اس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔“ شہر و زاہد نے کہا تو صوفیہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ ہمیشہ سے برعکس، بیوی کے بارے میں بات کرتے ہوئے

نہ کا پھر سہاٹ اور انداز بے حد سرسری تھا جیسے فرمیں بھجوا رہے ہوں۔

”بہت بڑا سناخ ہوا ہے ان کے ساتھ۔“ یقیناً بہت ڈسٹر ب ہوں گی۔“

صوفیہ خاموش رہی تو بوہی بات کرنے کی غرض سے پوچھنے لگی۔

”ابھی وہیں ثاقب کے گھر میں یا۔؟“

”نہیں۔“ اماں کے گھر آچکی ہے۔“

اسی وقت اسی آدھر آ گئیں۔ انہوں نے صوفیہ کی بات سن لی تھی، جیسی بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

”کون آچکی ہے؟“

صوفیہ نے جواب دینے سے پہلے شہر و زاہد کی طرف دیکھا اور ان کے نظریں چرانے پر کہنے لگی۔

”میں ربیعہ کی بات کر رہی ہوں۔ وہ اماں کے گھر آچکی ہے۔“

”اچھا۔“ اتنی کچھ دیر سوچنے اور حساب لگانے کے بعد کہنے لگیں۔ ”میرا خیال ہے ابھی اس کو گھر کے دن تو نوپورے نہیں ہوئے۔“

”نہیں۔“ اور اتنی کے مزید ایسے کئی سوالوں سے پہلے خود ہی بتانے لگی۔ ”اصل میں ہم اُسے سرگم کے بعد ہی گھر لے آئے تھے کیونکہ وہاں اس کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ اور شاقب حسن کے گھر والوں کو تو خود اپنا ہوش نہیں ہے، اُسے کون دیکھتا ہے؟“ اُس نے قصداً اُس کی ساس کے رویے کے بارے میں نہیں بتایا۔

”تم نے پہلے نہیں بتایا۔“

”کیا؟“

”یہی کہ ربیعہ میکے آچکی ہے۔ کم از کم میں اس کے پاس تعزیت کے لیے تو چلی جاتی۔“ قدرے تو نصف کے بعد کہنے لگیں۔ ”مجھے اُس کے پاس جانا تو ہے لیکن اب تک میں نے اس لیے نہیں کہا کیونکہ میرا خیال تھا وہ اپنے سسرال میں ہوگی۔ اور وہاں جانا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ آخر تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟“

”اتنی اہم سوری مجھے خیال نہیں رہا۔“ صوفیہ نہامت سے بولی۔

”اتنی کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہیں۔ پھر کہنے لگیں۔“

”مہر و زکھاں ہے؟ بلاؤ اسے، ابھی چلتے ہیں۔“

”جی۔“ صوفیہ فوراً اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تو اتنی یونہی شہر و زاحم کی طرف دیکھنے لگیں اور وہ چٹانیں کیا سمجھے، اُٹھتے ہوئے بولے۔

”میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔“ واپسی میں دیر ہو جئے تو پریشان مت ہوئے گا۔ اس کے ساتھ ہی وہ لمبے لمبے دوگ بھرتے باہر نکل گئے، اتنی مہر و زکھاں کا انتظار کرنے لگیں۔ پھر ربیعہ ہی وہ دونوں کمرے سے نکل کر آئے، اتنی چلنے کے لیے تیار ہو گئیں۔

”شام ابھی پوری طرح نہیں اُترتی تھی۔ صوفیہ اور مہر و زکھاں کے ساتھ اتنی کو دیکھ کر اماں کو حیرت ضرور ہوئی لیکن ظاہر نہیں ہونے دی۔ غصے تپاک سے دہلیں اور بڑے کمرے میں لے آئیں۔“

”میں کافی دنوں سے آنا چاہا رہی تھی۔ اتنی بیٹھتے ہی کہنے لگیں: ”آپ کے داماد کا شتا، بہت افسوس ہوا۔“

”بس جی۔ اللہ کی مرضی۔“ اماں آہ بھر کر بولیں۔

”صوفیہ بتا رہی تھی ربیعہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اب کیا حال ہے اُس کا؟“

”اب تو اللہ کا شکر ہے، کافی بہتر ہے۔“

”بے کہاں؟“ اماں نے صوفیہ کو اشارہ کیا تو وہ ربیعہ کو بلانے کچن میں آگئی۔

”ارے چھوٹی آپا۔ آپ کب آئیں؟“ وہ اچانک صوفیہ کو سامنے دیکھ کر حیرت کا اظہار کرتی ہوئی بولی۔

”ابھی آئی ہوں۔ تم سناؤ کیسی ہو؟“

”ٹھیک ہوں۔ چلیں آپ اندر چل کر بیٹھیں، میں چلے جا کر لاتی ہوں۔“

”چلے بعد میں بنالینا، پہلے میرے ساتھ اندر آؤ۔“

”خیریت، کیا ہوا؟“

”اتنی ہمارے ساتھ آئی ہیں اور وہ تم سے ملنا چاہتی ہیں۔“

”اتنی؟“ فوری طور پر وہ سمجھ ہی نہ سکی۔ پھر یاد آیا تو کہنے لگی۔ ”اچھا، آپ کی ساس؟“

”ہاں۔“

”مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟“ وہ بہت حد تک نارمل نظر آ رہی تھی۔

”بڑی آپا کی ساس کیوں آئی تھیں؟“ اور سب لوگ کیوں آ رہے ہیں؟“ صوفیہ نے کہا تو وہ ایک خاموش ہو گئی۔ پھر چوہا دھیا کر کے چلیں، کہتی ہوئی اُس کے ساتھ اندر آگئی۔

”اتنی سامنے ہی بیٹھی تھیں۔ وہ انہیں آداب کہہ کر اماں کے پاس بیٹھ گئی۔ اور فوری طور پر اتنی کچھ ہی نہ سکیں، پس اُسے دیکھ گئیں۔“

”یہ وہ ربیعہ تو نہیں تھی جو دو سال اُن کے گھر میں رہی تھی، گو کہ اس میں شوخی اور بے باکی تو اب بھی نہیں تھی لیکن اس کا دھیمادھیماء انداز زندگی کا پتا ضرور دیتا تھا۔ اور اب اس کا پورا وجود ستائوں اُڑ میں تھا۔“

”کیسی ہو بیٹا؟“ کتنی دیر بعد اتنی اسی قدر کہہ سکیں۔ اور وہ اثبات میں سر ہلا سکی۔

”شاقب حسن کی موت کا بے حد افسوس ہے۔“

”اُس کی آنکھوں میں ڈھیروں پانی اُتر آیا اور روکنے کی کوشش کے باوجود چمکتا چلا گیا۔“

”صبر اور حوصلے سے کام لو بیٹا۔ خدا کے کاموں میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔“

”اُس کے آنسو اور روانی سے بہنے لگے۔“

”رو و مت۔ مرنے والے کو تکلیف ہوتی ہے۔“

”وہ کسی طرح آئندہ روک سکی اور اسی طرح اُٹھ کر چھوٹے کمرے میں چلی گئی۔ تو صوفیہ بھی اُس کے پیچھے چلی آئی۔“

”بس کرور ربیعہ، مت روؤ۔“

”کیوں نہ روؤں؟“ وہ پگڑنے لگی۔ ”شاقب حسن مر گیا اور میں روؤں بھی نہ۔ کیا دیا ہے میں نے؟“

”میری آنکھوں کے سامنے وہ زندگی سے نانا توڑ گیا۔ اور میں کچھ نہ کر سکی۔“

”جب وہ اتنی ہی زندگی لے کر آیا تھا تو تم کیا کر سکتی تھیں؟“ پھر اپنے ہاتھوں سے اُس کے آنسو نکالتی ہوئی بولی۔

”تھیں اس طرح اُٹھ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔ ابھی تو اتنی تم سے بات کر رہی تھیں۔“

”بس میں نے شن لیں اُن کی باتیں میں مزید اُن کے سامنے نہیں بیٹھ سکتی۔“

”وہ کمرے سے اسٹور اور اسٹور سے نکل کر دوبارہ کچن میں چلی گئی۔ کلنوم چلے بنا رہی تھی اُس کو تو توجہ نہیں دی، پہلے جو کام کر رہی تھی، دوبارہ اسی میں مصروف ہو گئی۔ پھر جب جانے سے صوفیہ اُس کے پاس آئی تو وہ اپنے آپ پر قابو پا چکی تھی، اس سے کہنے لگی۔“

”بُرا مت ماننیے گا چھوٹی آپا۔ مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہتا۔“

”میں جانتی ہوں۔“ صوفیہ نے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

”آپ جا رہی ہیں کیا؟“

”ہاں۔“

”اتنی جلدی؟“

”پھر کسی وقت آؤں گی۔ ابھی تو اتنی ساتھ ہیں ناں، اس لیے رُک نہیں سکتی۔“

”پھر ربیعہ سے آئے گا۔ بلکہ مہر و زکھاں سے کہیں کچھ دنوں کے لیے آپ کو یہیں چھوڑ دے۔“

”رُکنے کا وعدہ نہیں کرتی البتہ صبح سے ضرور آؤں گی اور سارا دن رہوں گی۔ اچھا میں چلوں۔ اتنی رُکنے چکی ہیں۔“

”صوفیہ جلدی سے خدا حافظ کہہ کر چلی گئی تو وہ ہما کو دیکھنے لگی جو چلے کے برتن لے کر آ رہی تھی۔

”دیکھتے ہی کہنے لگی۔“

”آپا۔ آپ ہٹ جائیں، روٹی میں پکاؤں گی۔“

”کیوں؟“

”اماں ناراض ہو رہی ہیں۔ کہہ رہی ہیں، ہم نے سارا کام آپ پر ڈال دیا ہے۔“  
 ”کوئی نہیں۔“ اس نے چوہا جلا کر توار کھا، پھر کہنے لگی۔ ”میں خود مصروف رہتا چاہتی ہوں اور مجھے مصروف رہنے دو، ورنہ فارغ بیٹھتی ہوں تو کتاب زندگی کا ہر باب کھلتا چلا جاتا ہے، جن پر سارا آجوں اور آنسوؤں کے کچھ نہیں ہوتا۔ اور میں سمجھتی ہوں یہ سب میری اپنی غلطیوں کے سبب ہے۔ ورنہ ایسا تو کہیں نہیں ہوتا۔ ہر رات کی سحر ضرور ہوتی ہے۔ پھر میں مسلسل اندھیروں میں کیوں غلطی رہی؟ شاید اس لیے کہ میں بزدلی تھی، خوشیوں نے دستک دی بھی تو میں نے خود دروازے بند کر لیے روشنی کی کرن بلکہ مینارے نظر آئے اور میں آنکھیں بند کرتی رہی لیکن اب میں ایسا نہیں کروں گی ہیں کمزور اور بزدل نہیں ہوں۔“

”ہمارا خوشگوار حیرت سے اس کی طرف دیکھ گئی جو کہہ رہی تھی۔“

”مجھے اگر زندہ رہنا ہے تو زندہ رہنے کے ڈھنگ بھی سیکھنے ہوں گے۔ گذشتہ پر کڑھنا اور آئندہ کے لیے خوفزدہ ہونا عقلندری نہیں ہے۔ اور پھر یہ ضروری نہیں کہ انسان صرف اپنے لیے سوچے، اپنے لیے زندہ رہے۔ اصل زندگی وہ ہے جو دوسروں کے کام آئے۔ میں بھی اپنے لیے ایسی ہی زندگی منتخب کروں گی۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

”میں زندہ رہوں گی اماں کے لیے جو ہمارے لیے خوشحال زندگی کی آرزو میں اپنی خواہشات کا گلا گھونٹتی آئی ہیں۔“

ابامیاں کے لیے جو ہماری فکروں میں اپنی صحت تباہ کر بیٹھے ہیں۔ کاش ان کا کوئی بیٹا ہوتا جو آج ان کا سہارا بنتا۔ وہ ایک عزم سے بولے گئی۔

”آپنی۔“ ہمانے اس کے گرد اپنے بازوؤں کا حلقہ بنا لیا۔ آپ جانتی ہیں، ابامیاں راضی راضی رہنا چاہتے والے ہیں۔ وہ حالات سے مایوس نہیں ہوتے۔ وہ صرف آپ کی طرف سے فکر مند رہتے ہیں۔ آپ خوش رہیں گی تو دیکھیے گا، وہ پھر سے جی اٹھیں گے۔“

”ہاں میں اب انہیں اپنی طرف سے فکر مند نہیں ہونے دوں گی۔“ اس نے عزم سے کہا اور سر کر پیلے ہما کا کال تھپتھپایا پھر اپنی کر کے گرد مائل اس کے بازو ہٹاتی ہوئی بولی۔ ”چلو ہٹو، اب مجھے روٹی پکانے دو۔“

”پیلے اماں کو سمجھا ئے، پھر آکر پکائیے گا، وہ خواہ مخواہ مجھ پر خفا ہو رہی ہیں۔ ہمانے منہ بنا کر کہا۔ ”وہ یہاں آئیں گی تو میں کہہ دوں گی ان سے۔ تم جاؤ۔“ وہ زبردستی ہما کو باہر دھکیل کر روٹیاں پکانے میں لگ گئی۔

پھر اگلے کئی دن تک وہ سوچتی رہی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ کبھی خیال آتا چوں کو گھر میں ٹیوشن پڑانا شروع کر دے، کبھی روٹیوں کو سلائی سکھانے کا سوچتی، لیکن پھر خیال آتا کہ اس طرح وہ ہمیشہ کی طرح اب بھی گھر میں محدود ہو جائے گی جب کہ وہ دنیا کا سامنا کرنا چاہتی تھی۔ یوں وہ سنجیدگی سے جواب کرنے کے بارے میں سوچنے لگی اور جب فیصلہ کر لیا تو اماں سے کہا۔

”اماں! میں جا کر ناپا جاتی ہوں۔“

”کیا۔؟“ اماں حیران ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔

”اس طرح مت دیکھیں اماں۔ میں نے کوئی انہونی بات نہیں کی، آخر روٹیاں کیں۔“  
 ”بس کرو۔“ اماں نے ٹوک دیا۔ ”مجھے اور لڑکیوں کی مثالیں مت دو۔ میں جانتی ہوں، لڑکیاں بہت کچھ کرتی ہیں لیکن تمہیں کیا ضرورت ہے؟“  
 ”مجھے یہ ضرورت۔“ وہ زور دے کر بولی۔ ”آپ مجھے دوبار اس گھر سے رخصت کر چکی ہیں۔“

قدری کی ستم ظریفی کہ پھر مجھے یہیں لاپٹا۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اب میں آپ کی ذمہ داری نہیں ہوں۔ اپنا بوجھ خود اٹھانے دیں۔“

ایسی باتیں کرتی ہو۔ ”اماں تاسف سے بولیں۔“ بیٹیاں بوجھ نہیں ہوتیں اور اگر تم دوبارہ یہاں ہو تو اس میں تمہارا کیا تصور؟ یہ تمہارا گھر ہے۔ جب تک ہم زندہ ہیں، تمہارے لیے سوچیں گے۔ تمہیں اپنے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

انہیں اماں۔ آپ کے آگے دو اور لڑکیاں بھی ہیں ان کے بارے میں سوچیں، میرے لیے پنے کرنا تھا، کر لیا۔“

پھر بھی تمہاری دو وقت کی روٹی ہم پر بھاری نہیں ہے۔“

بات صرف دو وقت کی روٹی کی نہیں ہے۔ وہ اُلجھ کر بولی۔

اور بھی جو کچھ چاہو گی، پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اماں نرمی سے بولیں۔

آپ بھی کماں کرتی ہیں، میرا مطلب یہ تھوڑی ہے۔ وہ جھنجھلائی۔

پھر؟

بس آپ مجھے اجازت دے دیں، میں کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ ”کچھ دیر تک کر کہنے لگی۔“ میں اب نو عمر نہیں ہوں، حالات نے مجھے بہت کچھ سکھایا ہے۔ ہماری سادگی اور شاید غریبی نے ہی لوگوں کو اتنا حوصلہ پیدا کر دیا ہے کہ جس نے جو چاہا ہمارے ساتھ سلوک کیا۔“

بس کی بات کر رہی ہو؟ ”اماں چونک کر پوچھنے لگیں۔“

ثاقب حسن کے گھر والوں کی۔ اس کی اماں کو شاید یہ خوف تھا کہ کہیں میں ان کے گھر پر قابض جاؤں، جہی تیسرے دن تین کپڑوں میں نکال باہر کیا اور میں بھی کتنی پاگل تھی کہ جلی آئی جب کہ گھر کی ہر شے میرے شوہر کی تھی اور مجھے یاد آ رہا ہے اماں، ایک دن ثاقب حسن نے کہا تھا، وہ نے میرے نام سے خریدتا ہے۔ اس طرح تو اماں میں۔“

”اماں۔“ اماں نے ٹوک دیا۔ ”بھول جاؤ سب، جب سر کا سائیں ہی نہیں رہا تو پھر یہ چیزیں لڑکیاں کرو گی؟“

”مجھے واقعی ان چیزوں کی ضرورت ہے اور نہ خواہش، لیکن جو سلوک انہوں نے میرے ساتھ کیا، اس کی منزا تو انہیں ملنی چاہیے۔“

تم اس طرح مت سوچو جو جیسا کرے گا، ویسا بھرے گا۔“

آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ پھر بھی میں ان پر یہ ضرور واضح کرنا چاہوں گی کہ جتنا کمزور انہوں نے سمجھا تھا، اتنی میں ہوں نہیں۔“ وہ قطعیت سے بولی۔

کیا کرو گی تم؟

یہ بعد کی بات ہے، پہلے اب مجھے جا کر اجازت دیں۔“

”اب مان جائیں، ابامیاں کو منانا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس نے اماں کے گلے میں بازو لپٹا کر کہاں ان کے گال سے ملا دیا۔“ منع مت کریں اماں، یہ میری خواہش ہے۔“

اچھی بات ہے۔ لیکن پہلے اپنے ابامیاں سے پوچھ لو۔“ اماں اس کی خوشی کی خاطر مان گئیں۔ ”اب اس کی بات رڈ کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ کسی بھی طرح سہی، وہ خوش رہے۔ اور ل بھی یہی چاہتے تھے، جہی انہوں نے بھی اجازت دے دی۔“

وہ اتنا جانتی تھی کہ جا ب آسانی سے نہیں ملے گی لیکن اتنی دشواریوں کا اندازہ نہیں تھا۔ ایک سال تک صرف انٹر تھی، دوسرے کوئی تجربہ بھی نہیں تھا، جہاں جاتی تجربے کے بارے میں پوچھا یا پھر پاپنگ، شارٹ ہینڈ، کمپیوٹر وغیرہ کے بارے میں۔ اور اسے کچھ بھی نہیں آتا تھا۔

پھر ایک جگہ اُسے ٹیلی فون آپریٹر کی جانب مل گئی۔ اور اس طرف سے اطمینان ہوتا ہی نہیں۔ ایک انشٹیٹیوٹ میں داخلہ لے کر شام کی کلاسز میں شامل ہو گیا اور شارٹ ہینڈ سیکھنا شروع کر دیا۔ آٹس سے پانچ بجے چھٹی ہوتی تو وہاں سے سیدھی انشٹیٹیوٹ چلی جاتی اور پھر گھر آتے آتے سات بج جاتے تھے۔ یوں وہ بہت مصروف ہو گئی۔ اور اس کے لیے مصروفیت بہت ضروری تھی جیسی تو وہ اب گزشتہ پیر گزرتے کے بجائے آئندہ کے بارے میں سوچنے لگی تھی اور آئندہ کے لیے سوچتے ہوئے اُس کے پیش نظر اپنی ذات نہیں بلکہ وہ کلثوم اور ہما کے بارے میں سوچتی تھی۔

اُس روز وہ جب حسب معمول سات بجے گھر لوٹی تو صوفیہ اور مہر زار آئے ہوئے تھے۔ وہ بہت تھکی ہوئی تھی، اس لیے دُور رہی سے دونوں کو سلام کر کے منہ ہاتھ دھونے کے لیے چل گئی۔ پھر اطمینان سے اُن کے پاس بیٹھی تو فوراً شکوہ کرنے لگی۔  
 ”واہ چھوٹی آیا۔ آپ نے صبح سے آنے کو کہا تھا اور میں انتظار ہی کرتی رہی۔“  
 ”میں اگر صبح سے آ بھی جاؤں تو تم کون سا گھر میں ملو گی۔“ چھوٹی آپا نے جوابی شکوہ کیا۔  
 ”آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ بھتے میں ایک دن چھٹی کا بھی ہوتا ہے۔“  
 ”میں جانتی ہوں۔ خیر یہ بتاؤ، جاب کیسی چل رہی ہے؟“  
 ”بس ٹھیک ہے۔ اپنا شارٹ ہینڈ کا کورس مکمل کر لوں، پھر کسی اچھی جگہ ملائی کروں گی۔“ پھر مہر زار کی طرف متوجہ ہوئی ”آپ کیسے ہیں مہر زار بھائی؟“  
 ”میں تو ٹھیک ہوں البتہ صوفیہ ٹھیک نہیں ہیں۔“ وہ قدرے شرارت سے بولا۔ ”ہر مہینے ڈاکہ کے پاس وہ بڑا پڑتا ہے۔“

”کیا ہوا چھوٹی آپا؟“ وہ پریشانی سے پوچھنے لگی۔  
 ”کچھ نہیں، مہر زار تو بس یوں ہی۔“ صوفیہ، مہر زار کو گھورنے لگی۔ لیکن اُس کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ دہی تھی، اُس نے اُسے بہت کچھ سمجھا دیا۔ اس وقت تو کچھ نہیں بولی، جب مہر زار ابھار کے پاس جا، لیا، تب کہنے لگی۔  
 ”مبارک ہو چھوٹی آپا۔ لیکن بیٹا ہونا چاہیے۔“  
 ”کیوں؟“

”بس مجھے بیٹیاں اچھی نہیں لگتیں۔“  
 ”پاکل ہو تم بیٹا ہو یا بیٹی۔ اللہ کی دین ہے۔“  
 ”ہاں، ہے تو اللہ کی دین، پھر بھی بیٹی نہ ہی ہو تو اچھا ہے۔“ پھر خود ہی کہنے لگی۔ ”اگر اللہ ماری بیٹی دے تو اُس کا نصیب آپ جیسا ہو یا بڑی آپ جیسا۔“  
 ”اچھا۔ اب یہ داریوں جیسی باتیں چھوڑو، یہ بتاؤ کبھی ثاقب حسن کے گھر سے بھی کوئی آیا یا نہیں صوفیہ نے پوچھا تو وہ جو خاصے خورشید گوار موڈ میں باتیں کر رہی تھی، ایک دم خاموش ہوئی۔  
 پھر کچھ دیر بعد بولی۔

”نہیں چھوٹی آپا۔ وہاں سے کوئی نہیں آیا۔ حالانکہ کسی نہ کسی کو ضرور آنا چاہیے تھا۔ اور کوئی نہیں تو اٹھلا یا آتا۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔ ”میں سوچ رہی ہوں کسی دن میں خود دم جاؤں لیکن اتنا جانے سے منع کر رہی ہیں؟“

”تم کیوں جانا چاہتی ہو؟“ صوفیہ بغور اُس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔  
 ”وہ میرے شوہر کا گھر ہے۔ وہ نہیں رہا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میرا حق ختم ہو گیا۔ اور جو میرا جائز حق ہے، وہ میں نہیں چھوڑوں گی۔“ وہ اتنے مضبوط لہجے میں بولی کہ صوفیہ کتنی

اُس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ پھر اس کا کندھا تھیک کر بولی۔  
 ”جی رہو۔ مجھے خوشی ہے کہ تم اپنے حق کے لیے لڑنا سیکھ رہی ہو۔“  
 حالات سب کچھ سکھا دیتے ہیں۔ وہ افسردگی سے مسکرائی۔ پھر موضوع بدلنے کی غرض سے ”چلے تو آپ نے پم لی ہو گی اور میرا خیال ہے کھانا بھی تیار ہو گا۔ آپ بیٹھیں میں دیکھوں کیا کر رہی ہیں؟“  
 کلثوم اور ہما کے ساتھ لگی ہوئی ہیں۔ ”صوفیہ تمکی سیدھا کر کے لیٹتی ہوئی بولی۔

میں دیکھتی ہوں۔“ وہ اٹھنے لگی کہ صوفیہ نے روک لیا۔  
 ”تم کہاں جا رہی ہو۔؟ جب کھانا پک جائے گا بلکہ دسترخوان پر لگ جائے گا، اتنا بلا لیں جی۔“  
 وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ اچھا نہیں لگتا کہ اُن کچن میں ہوں اور میں یہاں بیٹھی رہوں۔“  
 ”تاں ویسے بھی تمہیں کچن میں نہیں گھسنے دیں گی۔“  
 ”کیوں؟“

ظاہر ہے پہلے ہی اتنی تھکی ہوئی آئی ہو، اب کچن میں جاؤ گی تو وہ خفا ہوں گی کیونکہ ابھی تمہارے ہیں وہ یہی بات کر رہی تھیں کہ تم بہت تھک جاتی ہو۔“  
 ”وہ نہیں۔“ اور پھر رازداری سے پوچھنے لگی۔ ”اور کیا کہہ رہی تھیں۔ میرا مطلب ہے میرے لڑنے کے بارے میں؟“

پہ نہیں بلکہ مطمئن ہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں اچھا ہے، تم مصروف ہو گئی ہو اور مجھے بھی تم پہلے بہت بہتر نظر آ رہی ہو۔“  
 ”چھوٹی آپا، زندگی تو گزاری ہی ہے۔ اور اگر میں پہلے ہی اپنے بارے میں سوچ کر حوصلے ہام لیتی تو شاید یہ دوسرا سانحہ میری زندگی میں نہ آتا۔“ وہ افسردہ ہو کر بولی۔  
 ”دوسرے کی بات کر رہی ہو، جب کہ میں اس سے بھی پہلے کا سوچتی ہوں، کاش تم۔“  
 ”ہوئی آپا۔“ وہ اُن کی پوری بات سننے بغیر بول پڑی ”آپ کلثوم کے لیے کوشش کریں ورنہ اچھا لڑکا دیکھیں کہیں۔“

”اُٹاں بتا رہی تھیں۔ بوا ایک دو جگہ سے پیغام لائی تو ہیں۔“  
 ”جھا۔“ وہ حیران ہوئی۔ ”مجھے اتناں نے نہیں بتایا۔“  
 ”ناجی تو آئی تھیں بوا۔ تمہارے پاس اتناں بیٹھیں گی تو ضرور بتائیں گی۔“ وہ پرسوچ انداز میں نے لگی۔ اُسی وقت ہما آئیں ریکارڈ ہوئی آگئی۔  
 ”ابیں بیٹھی آئی اور چھوٹی آپا، کھانا لگ چکا ہے۔“

وہ خاص چیز بھی بنائی ہے یا وہی روزہ رکھنا ہے۔“ وہ اٹھتی ہوئی پوچھنے لگی۔  
 ”ہاں نہیں ہیں ہم۔“ صوفیہ نے فوراً ٹوکا۔ پھر اُٹھ کر اُس کے ساتھ ہی کمرے سے نکلی۔  
 ”اور مہر زار دسترخوان پر آ چکے تھے۔ وہ دونوں بھی بیٹھ گئیں۔  
 ”کلثوم کے بعد جب کلثوم نے چائے کا پوچھا تو مہر زار کہنے لگا۔  
 ”نہیں۔ چلو تم لوگوں کو آشکریم کھلا لاؤں۔“

”ج۔“ ہما نے خوشی کا اظہار کیا۔  
 ”کل پیج۔“ وہ ہنسنا پھر اُسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ”چلیں ربیعہ، آپ بھی ہمارے ساتھ ہاں۔“  
 ”بھائی، میرا بالکل موڈ نہیں ہے۔“ وہ واقعی نہیں جانا چاہتی تھی۔ لیکن صوفیہ نے رُوٹھ

”جی نہیں۔ ہم آپ سے ملنے نہیں آئے۔ ہم کاشی اور گریا سے ملنے آئے ہیں۔“  
 ”اور کیا۔ اور بڑی آپا آپ نہیں آتی، نہ آئیں لیکن بچوں کو ضرور بھیج دیا کریں۔“  
 ”اچھا۔“ بڑی آپا سنیں۔ پھر ربیعہ کو فارغ دیکھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔ اور  
 اپنی نظروں سے دیکھتی ہوئی بولیں۔  
 ”اچھی لگ رہی ہو۔“

”اچھا۔“ وہ جھینپ کر منسی۔  
 ”میرے پاس آ کر رہو ناں، کچھ دنوں کے لیے ہی سہی۔“  
 ”کیسے آؤں آپا۔ سارا دن تو آفس میں گزار جاتا ہے۔“  
 ”تو کیا ہوا؟ رات میں کچھ دیر مل کر بیٹھا کریں گے۔“

لیکن یہاں سے آفس جانے کی پرابلم ہوگی۔ وہاں سے تو ڈائریکٹ بس مل جاتی ہے۔ وہ ساگی  
 بولی اور بڑی آپا پیار بھری خفگی سے ڈانٹتے ہوئے بولیں۔

”خوخواہ بہانے مت بناؤ۔ یہاں سے آفس جانے کی کیا پرابلم ہے؟ صبح عاصم کے ساتھ  
 جایا کرنا اور واپس میں وہ لیتے بھی آئیں گے۔“

”آؤں گی۔“ اسے ہامی بھری پڑی۔ لیکن ابھی نہیں، میرا شارٹ مینڈ کا کورس مکمل ہو جائے،

”کیا بات ہے بھئی، چائے وغیرہ کا پروگرام نہیں ہے؟“ عاصم بڑی آپا کو مخاطب کر کے بولے  
 وہ فوراً اٹھنے لگی تھیں کہ سب نے روک دیا۔

”نہیں عاصم بھائی اب ہم چلیں گے۔“  
 ”کیوں بھئی؟“

”اصل میں اس وقت ہم آسکریم کھانے نکلے ہیں۔ اگر چائے پی لی تو آسکریم سے محروم رہ جائیں  
 گے۔ ہمارا آسکریم بہت پسند تھی، اور وہ کسی طرح اس سے دستبردار نہیں ہو سکتی تھی۔“

”چلو تو میں آسکریم بہیں منگوا لیتا ہوں۔“  
 ”نہیں نہیں۔ آپ کی طرف آسکریم ادھار رہی۔ ابھی تو ہم مہروز بھائی کی جیب خالی کرائیں گے۔“

”بھئی، میرا تو چائے پینے کا موڈ ہے۔“ مہروز شرارت سے بولا۔ اور اطمینان سے سامنے  
 لپٹا ناگس سیدھی کرنا چاہتا تھا کہ ہمارے فوراً ٹیل اپنی طرف گھسیٹ لی۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے پیر پیر کر بیٹھنے کی، چلیں انٹیں۔“  
 ”ہاں مہروز بھائی، یہ بے ایمانی نہیں چلے گی۔ چلیں جلدی انٹیں۔“ کلثوم نے بھی ہما کی تائید کی تو

ربیعہ کی طرف دیکھنے لگا، جو آج بھی اسے اسی پرانے حوالے سے غزب تھی۔ دل چاہا گذشتہ کی طرح  
 لا شوش قلم کہہ کر اسے چوکا دے۔ اور اگر یہ یقین ہوتا کہ وہ چونک کر اسی طرح پیار بھری خفگی

”دیکھنے لگے گی تو ضرور کوئی ایسی بات کہہ جاتا۔“  
 ”چلیں ناں۔“ کلثوم اور ہما اصرار کرنے لگیں۔ اور وہ اسے چونک لانے کی خاطر بس اسی قدر کہہ سکا۔

”ربیعہ کہیں گی تو چلوں گا۔“  
 ”ہیں۔“ وہ سچ بچ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی اور اس کے چہرے پر اسی پرانے تعلق کی

امانیان دیکھ کر کلمہ بھر کو کانپ گئی۔ پھر فوراً سنبھل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ”چلیں۔ میں نے کب منہ کیا ہے۔“

”لو اب بھی میری جیب کی خوشن ہیں۔“  
 بالکل۔

جانے کی دھکی دی تو اسے آمادہ ہونا پڑا۔ کیونکہ وہ لاکھ اپنے آپ کو بدل ڈالے لیکن یہ سب  
 کہ وہ نہ روٹھتی تھی اور نہ روٹھنے دیتی تھی۔ پتا نہیں کیسے اس کے اندر یہ خوف بڑھ گیا تھا کہ  
 وہ روٹھی یا کوئی اس سے روٹھا تو ہر دو صورتوں میں روٹھنے والا یا ملانے والا جان سے گزر جائے  
 گا، اس لیے اس کا کہنا تھا کہ نہ روٹھو اور نہ مجھے روٹھنے دو۔

پھر آماں اور آبا میاں سے اجازت لے کر وہ سب باہر نکل آئے۔ کچھ شہر کے حالات ٹھیک  
 نہیں تھے، اس لیے شاید نوبت ہی سب گھروں کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ لگیاں اور گھر  
 کے قریب والی سڑک سنسان تھی۔ لیکن جب گاڑی مین روڈ پر آئی تو تب کچھ گہما گہما کا احساس ہوا  
 ”کہاں چلیں؟“ مہروز گردن موڑ کر ان تینوں سے پوچھنے لگا۔

”میرا خیال ہے کسی قریبی کولڈ کارنر سے کولڈ ڈرنک پی لیتے ہیں۔“ ربیعہ نے فوراً اپنا خیال  
 ظاہر کیا۔

”نہیں مہروز بھائی۔ آپ تو بس ایسے ہی بور کریں گی؟ ہمارا اس کے گھرنے کے باوجود اپنی  
 گئی۔ ہم طارق روڈ جائیں گے۔ اور اگر طارق روڈ جانے سے پہلے آپ ہمیں کچھ دیر کے لیے بڑا  
 آپا کے گھر لے چلیں تو ہم ساری زندگی آپ کو دعا میں دیتے رہیں گے۔“

”کیا بدتمیزی ہے ہمارے؟“ اس نے ڈانٹا۔ ”اتنے لمبے چوڑے پروگرام کی کیا ضرورت ہے؟۔  
 آخر انہیں گھر بھی جانا ہے۔“

”ہماری فکر مت کرو۔“ صوفیہ نے اسے ٹوکا، پھر مہروز سے کہنے لگی۔  
 ”ٹھیک ہے مہروز، پہلے بڑی آپا کے گھر چلیں۔ ہمیں بھی کافی دن ہو گئے ہیں وہاں گئے ہوئے  
 مہروز نے بڑی سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گاڑی بڑی آپا کے گھر جانے والے رات

پر ڈال دی۔ ساتھ ہی کیسٹ پلیئر بھی آن کر دیا۔  
 اس نے ایک نظر ساتھ بیٹھی ہما اور کلثوم پر ڈالی، پھر سیٹ کی پشت سے سر ٹکرا کر انھیں ہا

کر لیں۔ ایک تو دن بھر کی تھکی ہوئی تھی، دوسرے گاڑی کے اندر مدھم مڑوں میں بجتی موسیقی اور  
 کھڑکی سے آتی ہست ہوا کے جھونکے، اسے نیند آنے لگی۔ ایک سیٹی اور پریکون نیند بیسے

پلے پلے تھیک کر سلا رہا ہوں۔  
 گاڑی ایک جھکے سے رکی، تب اس نے چونک کر انھیں کھولیں اور سب سے پہلے نیچے

آئی۔ سب کے آگے تک وہ کال بیل پر انگلی رکھ چکی تھی۔ گیٹ عاصم بھائی نے کھولا۔ ان سے  
 کو دیکھ کر حیرت اور خوشی کا ملا جلا اظہار کرتے ہوئے بولے۔

”تم لوگ کیسے راستہ بھول گئے؟“  
 ”ہم تو راستہ بھول بھی جلتے ہیں۔ آپ تو بھولتے بھی نہیں۔“ مہروز ان سے مصافحہ کا

شکوہ کرنے لگا۔  
 ”کہا کروں یا رہ؟۔ وقت ہی نہیں ملتا۔ خیر اندر تو آؤ۔“ وہ سب کو لیے ہوئے اندر آ۔

تو چاروں بہنیں بڑی آپا کو نظر انداز کرتی ہوئی، ”آن کے دونوں بچوں پر جھپٹ پڑیں۔“  
 ”ارے رے۔“ بڑی آپا چیخیں۔ ”ابھی ابھی دونوں سوئے ہیں۔“

”انہوں نے جیسے سنا ہی نہیں، خود میں لے کر گد گد لے لگیں، جس سے چھوٹی گردیاں ر  
 شروع کر دیا۔

”دیکھا، نیند میں سے اٹھا دیا ناں، اب یہ روتی رہے گی۔“ آپا ہلکی سی خفگی سے بولیں۔  
 ”کوئی نہیں۔ ہم ابھی چپ کر آئے دیتے ہیں۔“ کلثوم اسے بازوؤں میں جھولانے لگی۔

”اچھا تم لوگ بیٹھو۔“

ہا اور کلثوم لاکھ کسی چیز کی فرمائش کرتیں، کوئی نیا کپڑا بنانے کے لیے اصرار کرتی رہ جاتیں۔  
ان کا وہی پیرا جواب ہوتا۔  
”کہاں سے لاؤں؟ میرے پاس نہیں ہے۔“  
”سب کچھ ہے آپ کے پاس۔ ناشکری کیوں کرتی ہیں؟“ ایک دن ہمارے ٹوک ہی دیا اور  
کے بعد جو اس کی شامت آئی۔ تو بے چاری اگلے کئی دن تک منہ چھپائے پھری۔

چھٹی کا دن تھا اور اس دن وہ اپنے ہفتے بھر کے جمع شدہ کپڑے دھوتی اور سوکھنے کے بعد  
پریس کر کے رکھتی تھی۔ شروع میں ایک بار امان نے کہا تھا کہ یہ کام چھوٹی بہنیں کر دیا کریں  
لیکن اس نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ اپنا کام خود کرے گی۔  
اس وقت بھی وہ کپڑے دھونے کے بعد انہیں تار پر پھیلا رہی تھی کہ کلثوم اور ہما کی کوئی  
لک دست آگئی۔ وہ دونوں اس کے بالکل برعکس تھیں۔ ان کو دیکھ کر وہ دوسرے کے کھانے کی فکر ہی اتنی رہی۔  
تاک کہ اپنی دوست کو چائے پانی کے لیے بھی نہیں پوچھا۔  
وہ ان دونوں کی لاپرواہی پر انہیں دل ہی دل میں سخت سست کہتی ہوئی کپڑوں سے فارغ  
کچن میں چلی آئی۔ پتا نہیں دونوں میں سے کون چاول چن رہی تھی کہ یونہی تھال نیچے رکھ کر  
لٹی تھی۔ دل بھی ویسے ہی رکھی تھی۔ اس نے دونوں برتن اٹھا کر شیلیف پر رکھے، پھر  
آچائے کا پانی چوبے پر لکھ کر ٹرے میں کپ رکھنے لگی۔ اس وقت امان کسی کام سے ادھر آئیں تو  
چائے بنا تے دیکھ کر کہنے لگیں۔

”تم کیوں چائے بنا رہی ہو۔ جب ان دونوں کو ہی خیال نہیں ہے تو۔“  
”کوئی بات نہیں امان۔ غالباً بہت دنوں کے بعد ملی ہیں، جیسی سب بھلائے بیٹھی ہیں۔“  
”اتنی لاپرواہی اچھی نہیں ہے۔“ امان نے اپنے انداز میں کہا۔  
”ٹھیک ہو جائیں گی۔“ اس نے دونوں کی طرف داری کی تو امان خاموش ہو رہیں۔  
پھر اس نے جلدی سے ٹی پاٹ میں چائے دم کی اور ٹرے اٹھا کر ڈرائنگ روم کی طرف آ  
دروازے سے داخل ہو رہی تھی کہ ایک نام کا عتوں سے کمرایا۔ وہ شاید توجہ نہ دیتی لیکن اندر  
لکھے ہی کلثوم پر نظر پڑی جس کے ہونٹوں پر شرمیلیں سکڑا ہٹ کھیلنے لگی تھی اور انھیں کسی  
سے چمکتی ہوئی بہت سی آن کہی دستاؤں کا پتا دے رہی تھیں۔ اور وہ اب ناواں نہیں  
ایک پل میں اس کے تصور تک رسائی حاصل کر گئی۔  
”آپ کی۔“ اسے دیکھ کر ہما چونکی اور فوراً اٹھ کر اس کے ہاتھوں سے ٹرے لے کر ٹیبل  
تھوڑی لہجہ دوست کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

”یہ ہماری آپنی ہیں۔“  
”سلام علیکم۔“ ثمنینہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اسے سلام کیا۔  
”بلک سلام۔“ بیٹھو بیٹھی، کھڑی کیوں ہوں گیں؟“ وہ مسکرا کر بولی۔  
”دونوں آپ کا بہت ذکر کرتی ہیں اور تعریف بھی۔“ ثمنینہ بیٹھتی ہوئی بولی۔  
”پنا۔“ وہ ہنسی۔ لیکن میں ان کی تعریف نہیں کروں گی۔“  
”ہاں آپنی۔“ ہما فوراً پوچھنے لگی۔

”اے اے کہ تم دونوں بہت لاپرواہو۔ اتنی دیر سے تمہاری دوست آئی ہوئی ہے۔ اور تم نے  
اسے تک نہیں پلائی۔“  
”میں ہم باتوں میں۔“

”پھر تو اٹھنا پڑے گا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ پھر سب سے پہلے بڑی آپا کو خدا حافظ کہتا ہوا باہر  
نکل گیا تو ان سب نے بھی اس کی تقلید کی۔  
طارق روڑے آسکیم کھاتے ہوئے جب گھر واپس آئے تو بارہ بج رہے تھے۔ امان ان سب  
کے انتظار میں برآمدے میں ہی بیٹھی تھیں۔ اور اس سے پہلے کہ دیر سے آنے پر سزائش کرتیں  
ہمارے ان کے گلے میں بازو ڈال دیے۔  
”پیارے امان، کچھ بیکے گامت۔ کیونکہ ہم پہلے بڑی آپا کے گھر چلے گئے تھے۔“  
”یہ کوئی وقت ہے اس کے گھر جانے کا۔“ امان بگڑنے لگیں۔  
”ابھی تھوڑی، جب یہاں سے نکلے تھے تو سیدھا وہیں گئے تھے۔ اس وقت تو یہی تو  
بچے تھے۔“  
”کیا حال ہے اس کا اور اس کے بچوں کا؟“ امان نرم پڑتے ہوئے بڑی آپا کے بارے میں  
پوچھنے لگیں۔  
”ٹھیک ٹھاک ہیں۔ اور چھوٹی گریٹا تو ماشاء اللہ بہت پیاری ہو گئی ہے۔“ اس نے بڑے دیر  
کر ہما کی بات سنی اور پھر پپ چاپ اندر چلی گئی۔

وقت کا اپنا انداز ہے۔ اس کا بہتہ صدیوں سے اپنی مخصوص رفتار سے چل رہا ہے البتہ  
انسان کے احساسات و محسوسات بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی ایک دم فراغت، کرنے کو کچھ نہ ہو یا  
بات کو اپنے اوپر طاری کر لو تو الزام وقت کے سہ کہ وقت ریگ رہا ہے۔ ایک ہی موسم میں  
ٹھہر گیا ہے۔ خاص کر آداسیوں کے موسم میں ٹھہرا ہوا لگتا ہے۔ اور جب یہ موسم بیت جاتے ساء  
ہی بے پناہ مصروفیات گھیر لیں تو پھر یہی وقت بھاگتا ہوا لگتا ہے۔  
وہ بھی ریگتے وقت سے نکل آتی تھی۔ بے پناہ مصروفیات میں گھر کر پتا ہی نہ چلا کہ کتنا وقت  
بست گیا ہے۔ وہ ٹائپنگ شارٹ ہینڈ بکمل کر کے کمپیوٹر کا کورس بھی کر چکی تھی اور اب ایک  
ملٹی ٹیشنل فرم میں جاب کر رہی تھی پُرکشش تنخواہ کے ساتھ۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے آد  
کا ماحول بھی بہت اچھا ملا تھا۔ یوں اچھے لوگوں کے ساتھ کام کرنے اور ان کے درمیان آٹھ  
بیٹھنے سے جہاں اس کی شخصیت میں مزید نکھار پیدا ہوا تھا، وہاں وہ بہت پر اعتماد بھی ہو گئی تھی  
گو کہ اس کے مزاج میں سادگی ویسے ہی تھی اور یہ سادگی اس کے سراپے میں بھی جھلکتی تھی کیونکہ  
اس سادگی نے اسے جو وقار بخشا تھا، اس کی بدولت وہ اکثر سب میں نمایاں نظر آتی تھی۔ پھر  
کے اندر محنت کا جذبہ بھی تھا۔ اپنا کام پوری ایمانداری اور لگن سے کرتی تھی۔ اس لیے کبھی کسی  
اس سے کوئی شکایت نہیں ہوئی بلکہ متعززہ صدمہ میں اس نے اپنا ایک الگ مقام بنالیا تھا۔  
امان کے گھر میں ساری زندگی ایک ایسا مینا کمانے والے رہے اور کوئی بیٹا نہ ہونے کی وجہ  
سے امان نے بلکہ گھر کے کسی فرد نے یہ تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اس گھر کی آمدنی میں کبھی اضافہ ہو  
سکتا ہے۔ امان ساری زندگی قناعت کرتی رہیں اور یہی سبق اولاد کو بھی دیا تھا۔ اب جب آمدنی  
دو گنا بلکہ تین گنا اضافہ ہوا، تب بھی امان اپنی پرانی ڈگر سے ہٹنے کو تیار نہ ہوئیں۔ اول تو وہ بے  
کی تنخواہ کے روپے لینے کو آمادہ ہی نہیں تھیں۔ لیکن جب اس نے اپنی قسم دینے کے ساتھ  
تک کہہ دیا کہ وہ کچھ کھا کر سو رہے گی، تب مجبوراً انہیں لینے پڑے۔ پھر بھی خرچ کرنے کو تیار نہ ہوئے  
ان کا کہنا تھا۔

”ہماری وال روٹی تو چل ہی رہی ہے۔ اور خرچ کا کیا ہے جتنا بڑھائیں گے اتنا ہی بڑھ جائے  
اس لیے بہتر ہے کہ اس اضافی آمدنی کو لک کے لیے محفوظ کر لیا جائے۔“

”بھوک نہیں ہے۔“

”چائے بنا دوں؟“

”آپ رہنے دیں، میں بنالوں گی۔“

اس کے ساتھ ہی وہ آٹھ کرکچن میں آگئی۔ پھر وہاں سے رات کا کھانا بنانے کے بعد ہی ملتی تھی۔

”سنو“ رات میں جب وہ تینوں فراغت سے بیٹھی باتیں کر رہی تھیں تو وہ اچانک سرگوشی میں بنے لگی ”ایک بات پوچھوں، تم دونوں اس کا پوری ایمانداری سے جواب دینا۔“  
”پوچھیں۔“ کلثوم اور ہما اس کے رازدارانہ انداز پر قندے اس کی طرف جھک گئیں۔  
”یہ قبیح کون ہے؟“ اس نے پوچھا تو وہ دونوں اس پر سے نظریں ہٹا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔

”مجھ سے چھپانے کی کوشش فضول ہوگی کیونکہ میں سب سن چکی ہوں“ اس نے مبالغہ آرائی سے کام لیا جب کہ اس نے صرف نام سنا تھا۔

”بتا دوں؟“ ہما کلثوم سے پوچھنے لگی اور اس کے سر جھکانے پر بولی۔ ”وہ ثمنہ کا بھائی ہے۔ کلثوم کو ملکہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔“

”کب سے؟“ وہ ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

”جب سے ہم نے کالج جانا شروع کیا تھا۔“

”کیا کرتا ہے وہ؟“ اس نے اپنی معلومات کے لیے پوچھا۔

”پہلے تو بے کار تھا لیکن آج ثمنہ بتا رہی تھی، اسے کہیں جاب مل گئی ہے۔“

”اس کے ارادے کیا ہیں؟“

”وہ کلثوم سے شادی کرنا چاہتا ہے اور آج ثمنہ یہی کہنے آئی تھی کہ وہ اپنی اسی کولا ناچاہتی ہے۔ لیکن آپ آتماں نہیں مانیں گی؟“ ہما نے فوراً خدشہ بھی ظاہر کر دیا۔

”کیوں؟“

”اس لیے آپ کی کہ وہ کوئی بہت بڑے لوگ نہیں ہیں۔ اور آپ تو جانتی ہیں کہ آتماں۔“

”ہاں، میں جانتی ہوں۔“ وہ فوراً بول پڑی۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگی۔ ”بہر حال تم ثمنہ سے کہنا وہ اپنی اسی کو لے آئے، ہم جنید کو دیکھنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کریں گے۔“

”لیکن آپ۔“

”اوپر ہوں۔“ اس نے ٹوک دیا۔ ”قبل از وقت انڈیشن میں مت گھرو۔ اگر جنید اچھا لڑکا ہے تو آتماں کو ماننا پڑے گا۔ اور کلثوم نے اپنی آنکھوں میں جو خواب سجالیے ہیں، میں انہیں ٹٹے نہیں دوں گی۔“ اس نے بہت پر یقین لہجے میں کہا تھا اور اس کے لہجے کا عزم کلثوم کو ابوں کی تعمیر دے گیا۔



کبھی چھٹی آپا نے اسے حوصلہ دیا تھا۔ اور اپنے طور پر تو انہوں نے کوشش بھی کی تھی کہ اس کی دن پر سے خواب ٹوٹنے نہ پائیں۔ لیکن قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ اور اب وہ کلثوم کو حوصلہ دیتے ہوئے اس کی پیکوں پر سے خوابوں کو تعمیر دینے کا وعدہ کر رہی تھی۔

پھر زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ثمنہ اپنی اسی کو لے آئی۔ اس وقت وہ گھر پر نہیں تھی۔ اگر ہوتی اسی وقت انہیں کوئی حوصلہ افزا جواب دیتی۔ لیکن آتماں نے اُتار دیا تھا۔ اور شاید دل میں اسے انکار کرنے کا ٹھان چکی تھیں، جب ہی اس سے ذکر بھی نہیں کیا۔ اسے ہما کی زبانی ثمنہ کی اسی کی

”مجھے پتا ہے اور اب اس سے پہلے کہ چائے ٹھنڈی ہو، اسے پیش کرو۔“ وہ بات کاٹ کر بڑا ”آپ بھی آئیں ناں۔“

”نہیں بس مجھے کام ہے۔“ وہ وہیں سے واپس چلی آئی۔ آتماں کھانا پکانے کی تیاری کر رہی تھیں، وہ فوراً ان کے سر پر پہنچ گئی۔

”آپ ہٹ جائیں آتماں۔ میں پکالوں گی۔“

”ابھی تو کیڑے دھو کر کھٹی ہو۔“

”تو کیا ہوا، بس آپ ہٹیں۔“ وہ زبردستی انہیں اندر بھیج کر خود ان کی جگہ کھڑی ہو گئی۔ پھر مختلف کام کرتے ہوئے اچانک اس کا دھیان کلثوم اور ہما کی طرف چلا گیا۔ ساتھ ہی وہ نام یاد آیا جو ان کی دوست کے ہونٹوں سے نکلتا تھا اور کلثوم کے چہرے کو قوس و قزح کی سوغات دے گیا تھا۔

”جنید رتانی۔“ اس نے دہرایا ہی تھا کہ وقت کا یہیہ اٹھا چلنے لگا۔ کلثوم کی جگہ وہ خود بھی اڑ تھیں کی جگہ انیلا آن کھڑی ہوئی تھی۔

”شائب حسن۔“ ہونٹوں نے اس نام کو کیا چھوا کہ آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

”اونوں۔“ جن آنکھوں میں محبتوں کے دیپ جلتے ہوں، ان میں پانی نہیں اترتا چاہیے۔“ اس کی آواز کی باؤ گشت چاروں طرف سنائی دینے لگی۔ تو وہ گھبرا کر اندر چلی آئی۔

”کیا ہوا؟“ آتماں اس کی آواز کی نیت دیکھ کر پریشانی سے پوچھنے لگیں۔

”کچھ نہیں آتماں۔“ میرا سر پکڑنے لگا ہے۔ آپ کلثوم سے کہیں، وہ کھانا بنا دے گی، میں نے تو پہلے ہی تمہیں منع کیا تھا۔ جاؤ کچھ دیر آرام کرو۔“

”ہاں میں سوئے جا رہی ہوں، اگر خود سے اُٹھ گئی تو ٹھیک ورنہ خاص طور سے کھانے کے لیے مت اُٹھائیے گا۔“ اس کے ساتھ ہی وہ چھوٹے کمرے میں چلی آئی اور اپنی چارپائی پر لیٹے ہی سر تک چادر اوڑھ لی۔ پھر عہد رفتہ سے دامن چھڑانے کی اس نے کوئی کوشش نہیں کی۔

”تم تو بس۔“ آتماں کو دیر ہی جان کہ میرے حوالے سے اچھے اچھے خواب سجاؤ۔“ ہر مقام پر لے آؤر دیکھیں سے نکالنے کی خاطر وہ اسی طرح کی باتیں کیا کرتا تھا۔

”شائب حسن۔“ محبتیں تو کھائی تھیں پھر ان پر سے اعتبار کیوں اُٹھا دیا میرا کہ اب سب دھوا کاؤ فریب گستا ہے۔ آنکھوں کے اندر ٹھہرا پانی چلنے لگا تو اس نے سارے حفاظتی بند ہٹا دیے۔

اور پھر یادوں اور اشکوں کے سیل رواں میں بہتے ہوئے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

پھر جب دو پہر ڈھل رہی تھی تب وہ اٹھی۔ کچھ دیر تک تو بوہنی خالی الذہن سی چھت پر نظریں جمائے رہی، پھر چانک ہر طرف خاموشی کا احساس ہوا تو اُٹھ بیٹھی۔ کمرے سے نکل کر آئی تو دیکھا، آتماں، کلثوم اور ہما سو رہی تھیں بے خیالی میں اس کی نظریں کلثوم کے چہرے پر پڑی رہ گئیں۔ اسے لگا جیسے وہ اس کی بند پیکوں کے اندر تک رسائی حاصل کر چکی ہے۔

”یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟“ اس نے سر جھٹکا اور برآمدے میں نکل آئی۔ گرمیوں کی دھج پورے وجود میں سما رہا تھا۔ اس نے سوچا آتماں کے اُٹھنے سے پہلے ہی نہالے ورنہ وہ اس وقت نہانے کو منع کریں گی۔ پھر وہ جلدی سے اپنے کپڑے لے کر باتھ روم میں گھس گئی۔ نہا کر نکلی تو طبیعت کا بوجھل پن قدرے دور ہو چکا تھا۔ البتہ نامعلوم سی آوازیں اب بھی اس کی گھبراہٹ کیے ہوئے تھیں۔ وہ وہیں برآمدے میں بیٹھ کر گیلی بالوں میں برش کرنے لگی۔

”تم اس وقت نہائی ہو؟“ آتماں پتا نہیں کب اُٹھ کر آگئیں۔ وہ خاموش رہی۔

”کھانا بھی کھایا یا نہیں؟“ اس کے خاموش رہنے پر آتماں پوچھنے لگیں۔



آمد کا علم ہوا اور اگلے دو تین روز تک وہ انتظار کرتی رہی کہ اماں آسے تذکرہ کریں گی لیکن جب اُن کا ایسا کوئی ارادہ نظر نہیں آیا، تب اُسے خود ہی بات چھپڑنی پڑی۔

”اماں - شمیمہ کی والدہ آئی تھیں؟“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“ اماں چونک کر پوچھنے لگیں۔

”بس معلوم ہو گیا۔ یہ بتائیے آپ نے انہیں کیا جواب دیا؟“

”کیسا جواب؟“

”انجان مت بنیں اماں۔ میں سب جانتی ہوں، مجھے صاف صاف بتائیں“

”صاف سننا چاہتی ہو تو سنو۔ میں کلثوم کی شادی وہاں نہیں کروں گی۔“ اماں نے صاف الفاظ میں لگا کر کہا۔

”کیوں؟“ وہ اپنی جگہ جم گئی۔

”کیوں کا کیا سوال، بس مجھے نہیں پسند۔“ اماں بات ختم کرنا چاہتی تھیں۔

”نہیں اماں، بڑکے کو دیکھ اور جانے بغیر آپ کیسے کہہ رہی ہیں کہ آپ کو پسند نہیں؟“

”دیکھنے کی کیا بات ہے، اُن کے حالات ہی ایسے ہیں۔“ اصل وجہ اماں کے ہونٹوں پر آہی گئی۔

”کیسے ہیں حالات؟“ وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔

”باپ سر پر ہے نہیں اور یہ بڑکا اکیلا کمانے والا۔ جب کہ۔“

”بس کریں اماں۔ وہ اُن کی بات ٹوری ہونے سے پہلے چیخ پڑی۔“ مجھے دیکھیں، میرے لیے بھی

آپ نے اسی انداز سے سوچا تھا، پھر کیا ملا مجھے؟ ایک بار رسوائی اور دوسری بار بیوگی کی سفید چادر

اس کے علاوہ کیا ملا مجھے؟ نہ خوشی، نہ سکون اور دونوں بارتین کپڑوں میں نکلی۔ اب یہ مت کہہ دیجئے

گاکا میری قسمت ہی ایسی تھی۔ نہیں اماں، یہ سب آپ ہی کی وجہ سے ہوا کیونکہ آپ کو قسمت پر یقین

ہی نہیں۔“ وہ اچانک پھٹ پڑی۔

”کیسی باتیں کر رہی ہو؟“ اماں جھٹی جھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔

”میں غلط نہیں کہہ رہی۔ اگر آپ میرے حالات کی ذمہ دار خود کو نہیں سمجھتیں، تب بھی آپ کو

اپنی سوچ ضرور بدل لینی چاہیے تھی لیکن آپ اب بھی اپنی سوچ پر قائم ہیں۔“

”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“ اماں نے حیرانی سے پوچھا۔

”صرف اتنا کہ جو کچھ میرے ساتھ کیا، وہ کلثوم کے ساتھ مت کیجیے۔ ایک ہی کہانی کو دوبارہ مت

دہرائیے اماں، اگر قسمت پر یقین رکھتی ہیں تو صرف بقید کے بارے میں جان کر فیصلہ کریجیے۔ یقین

کیجیے، اگر کلثوم کے نصیب میں خوشحالی اور آسودگی دکھی ہوگی تو خنبد کے توسط سے ہی مل جائے

گی ورنہ میری طرح سب حاصل ہو کر بھی خالی ہاتھ۔“

اُس کی آواز ساتھ چھوڑ گئی تو وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر اپنے کمرے میں چلی گئی جب کہ اماں اتنی

دیر تک بے حس و حرکت وہیں بیٹھی رہ گئی تھیں۔

اُس نے کہنے کو تو اماں سے سب کہہ دیا تھا۔ جذبات میں آکر اپنی تباہی کا ذمہ دار بھی انہیں ٹھہرا

گئی تھی لیکن اب اُن کا سامنا کرنے سے کترانے لگی تھی صبح بہت خاموشی سے انشاکر کے نکل جاتی اور

واپسی میں اماں اندر ہوتیں تو وہ باہر اور اماں باہر ہوتیں تو وہ اندر۔ کلثوم اور اُمیا الگ اپنی جگہ جی رہی ہوتی

تھیں۔ اُن کا سر جوڑ کر بیٹھنا، سرگوشتیوں میں بائیں کرنا اور دلی دلی مسکراہٹ کے ساتھ معنی خیز نظروں سے

ایک دوسرے کو دیکھنا سب ختم ہو گیا تھا۔ دونوں الگ الگ کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتیں۔

اس کھینچا تانی نے گھر کی فضا کو عجیب سا رنگ دے دیا تھا۔ کوئی ضروری بات بھی ہوتی تو ایک دوسرے

سے نظریں چرا کر کی جاتیں زندگی میں کوئی کہا بھی تو پہلے بھی نہ تھی اور اب تو بالکل ہی چپکلی اور بے کیف

سی لگنے لگی تھی۔

اُس شام وہ آفس سے لوٹی تو اماں گھر میں نہیں تھیں اور اتنے دنوں بعد یہاں بے اختیار اُس کے گلے

بازو ڈالتی ہوئی بولی۔

”ایک اچھی خبر ہے آپنی۔ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”چھوٹی آپا کے جڑواں بیٹے ہوئے ہیں۔“

”کیا۔؟“ اُس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی گئی۔

”ہاں، ہم ایک بیٹے کی دعا کر رہے تھے اور اللہ میاں نے دو بیٹے ایک ساتھ دے دیئے۔“

”چھوٹی آپا کیسی ہیں؟“

”ٹھیک ہیں، اماں ان ہی کے پاس گئی ہوئی ہیں۔“

”اچھا۔“ وہ وہیں تخت پر بیٹھ گئی۔ چھوٹی آپا اور اُن کے پہلو میں دو بچوں کا تصور اُس کے ہونٹوں

سکراہٹ لے آیا۔

”بیجے، مٹھائی کھاؤں۔“ کلثوم نے مٹھائی کی پلیٹ اُس کے سامنے کر دی۔

”یہ کون لایا ہے؟“ اُس نے حیرت سے پوچھا۔

”مہر وز بھائی۔“

”خوش ہوں گے مہر وز؟“

”ہاں، بہت چہک رہے تھے۔“ اُس نے پلیٹ میں سے ایک گلاب جاسن اٹھایا، پھر پوچھنے

”اماں وہیں رہیں گی کیا؟“

”بتا نہیں۔“ دونوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو وہ دیوار سے کمر لگاتے ہوئے بولی۔

”میرا دل چاہ رہا ہے، میں ابھی چھوٹی آپا کو دیکھ آؤں۔“ وہ کہاں وہ؟

”ڈاکٹر شبنم کے کلینک میں۔“

”پھر تو میں جا سکتی ہوں۔“ وہ طویل سانس لے کر بولی۔ ”کل آفس کے بعد اُن کے پاس سے ہوتی

ولی آؤں گی۔“

”آئی، میں بھی لے چلیے گا ناں۔“ ہما مت سے بولی۔

”تمہارا کیسا ہے، تم تو کسی بھی وقت اُن کے گھر بھی جا سکتی ہو جب کہ۔“ وہ خاموش ہو گئی اور پھر اسی

لڑا اُٹھ کر اندر چلی گئی۔

اگلے دن اُس کا آفس میں بالکل دل نہیں لگا۔ مسلسل دھیان صوفیہ کی طرف رہا۔ بار بار گھڑی دیکھتی

اور گک رہا تھا، وقت جیسے رک گیا ہے۔ شام تک انتظار نہیں کر سکی اور لُنج ٹائم میں ہی چھٹی لے کر آفس

سے نکل آئی۔ ڈاکٹر شبنم کا کلینک یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا، اس لیے وہ بس کا انتظار کرنے کے

بجائے رکشے میں چلی گئی۔

کو ریڈور میں ایک نرس کو روک کر صوفیہ کے بارے میں پوچھا اور جس طرف اُس نے اشارہ کیا، اُسی

طرف چل پڑی۔ مطلوبہ کمرے کے سامنے رک کر پہلے یہ یقین کیا کہ اندر صوفیہ کی ساس کے علاوہ اور کوئی

نہیں ہوگا۔ تب قدرے اعتماد کا مظاہرہ کرتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ اس کا اندازہ صبح تھا۔ سامنے ہی

صوفیہ کی ساس بیٹھی تھیں۔

”السلام علیکم۔“ وہ انہیں سلام کر کے فوراً صوفیہ کے بیڈ کی طرف بڑھ گئی اور اس پر جھکتی ہوئی بولی۔

”بہت مبارک ہو چھوٹی آپا۔“

”تمہیں بھی۔“ چھوٹی آپا مسکرا کر بولیں۔

”آپ تو ٹھیک ہیں ناں۔“

بچے کے منہ میں دودھ ڈالنے لگی۔ اس وقت اس کے اندر کی مانتا چہرے اور آنکھوں میں سٹ  
نہی مہر و زچہ دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا پھر پلٹ کر دوسرے بیڈ پر جا بیٹھا۔ وہ بچے کو دودھ پلا کر  
تو بہنے لگی۔

”اجتہا چھوٹی آیا، میں اب چلتی ہوں۔“  
”کہاں جائیں گی؟ میرا مطلب ہے آفس یا گھر؟“ مہر و زچہ نے پوچھنے لگا۔  
”گھر جاؤں گی۔“

”کچھ دیر تک جائیں، میرے ساتھ چلیے گا، میں آپ کو گھر چھوڑ دوں گا۔“  
وہ منع کرنا چاہتی تھی کہ صوفیہ بول پڑی۔

”مہر و زچہ کبہہ رہے ہیں، ان کے ساتھ چلی جانا۔“  
”آؤ یہاں آکر بیٹھو۔“ اسے شش و پنج میں دیکھ کر اتنی بولیں جیسے جانتی ہوں کہ وہ ان کی بات سے  
نہیں کرے گی۔

اور اتنی کی جگہ کوئی اور خاتون ہوتی، تب بھی وہ بڑائی کا خیال کرتے ہوئے انکار نہ کرتی، اس لیے  
شی سے بیڈ کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی اور زیدہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی جہاں  
راکھ کھڑے تھے۔ اب وہ وہاں نہیں تھے۔ اس نے قدرے اطمینان کا سانس لیا اور یونہی بات  
نے کی غرض سے صوفیہ سے پوچھنے لگی۔  
”آپ کب تک یہاں رہیں گی؟“

”مالیہ پانچ چھ دن۔“  
”اسی وقت ڈاکٹر صاحبہ راؤنڈ پر آگئیں تو مہر و زچہ کبہہ باہر آگیا۔ کارڈور کے آخری سرے پر رینگ  
سارے شہر و ز احمد کھڑے نظر آئے تو وہ ان ہی کے پاس چلا آیا۔  
”آپ یہاں کیوں آگئے؟“ قریب پہنچ کر اس نے پوچھا لیکن پھر اپنا سوال احمقانہ لگا۔ کچھ غل ساہو  
لچکانے لگا تو شہر و ز احمد ہلکے سے ہنس دیے۔  
”تم یہاں کیوں آئے؟“

”ڈاکٹر صاحبہ راؤنڈ پر آئی ہیں، میں اس لیے یہاں آگیا۔“  
”دونوں بچے تو ٹھیک ہیں نا؟“

”جی۔“  
”سنو۔“ شہر و ز احمد اسے متوجہ کر کے خاموش ہو گئے اور نظریں بھی ہاسٹل کے احاطے سے باہر  
روڈ پر رواں دواں ٹریفک میں بھٹکتی چھوڑ دیں۔  
”آپ کچھ کبہہ رہے تھے؟“ مہر و زچہ پوری طرح ان کی طرف متوجہ تھا اور ان کی طرف سے کسی بھی بات  
نظر۔

سوچ رہا ہوں، تم سے کہوں یا نہیں، پتا نہیں تم کیا خیال کرو۔“ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولے۔  
”ایسی کیا بات ہے جس کے لیے آپ کو سوچنا پڑ رہا ہے؟“ مہر و زچہ اچنبھا ہوا۔ وہ خاموش رہے  
پہنچے گا۔

”آپ حکم کریں، میں کچھ خیال نہیں کروں گا۔“  
”ایک نظر اس پڑا ل کر دوبارہ سامنے متوجہ ہو گئے تو مہر و زچہ نے بے اختیار ان کا بازو تھام کر  
الار۔

”آپ خاموش کیوں ہیں؟۔ بتائیے نا، مجھے بہت تجسس ہو رہا ہے۔“  
”کی کیا کر رہی ہیں؟۔“ انہوں نے کہا تو مہر و زچہ بھجلا گیا۔

”ہاں۔“ پھر سرگوشی میں بولی۔ اتنی بہت خوش ہیں، انہیں بھی مبارکباد دو۔“  
”اجتہا۔“ وہ سیدھی کھڑی ہوئی، پھر پلٹ کر کہنے لگی۔ ”پوتے مبارک ہوں انٹی۔“  
”خوش رہو۔ تمہیں بھی مبارکے مبارک ہوں۔“ اتنی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔  
”میں بچوں کو دیکھ لوں؟“ وہ کاٹ کی طرف بڑھتی ہوئی پتا نہیں کیوں جھجک گئی۔  
”دیکھ لو۔“ صوفیہ کو ہنسی آگئی۔ دیکھنے کے لیے کوئی ٹکٹ نہیں ہے۔“  
”آپ تو ہیں۔“ وہ جلدی سے آگے بڑھ کر کاٹ پر جھجک گئی۔

صحت مند اور گول مثول بچے سکون سے سو رہے تھے۔ اسے بے اختیار ان پر پیار آیا تو ان کی  
ان کے گال چھو کر دیکھنے لگی۔ نرمی سے چھونے کے باوجود بچہ کسمسایا اور رونے کی تیاری کر رہا تھا کہ اس  
نے گود میں اٹھا لیا اور پھر بے اختیار ہو کر اپنے ہونٹ اس کے گال پر رکھ دیے۔ پھر سینے میں بھینپا  
تو اس کے اندر مانتا انگڑائیاں لینے لگی۔

”چھوٹی آیا۔“ وہ اپنے آپ میں نہیں رہی۔ کھویا کھویا لہجہ اور کھوٹے کھوٹے انداز میں کہنے لگی۔  
”اسے مجھے دے دیں۔“  
”دونوں تمہارے ہیں۔“ صوفیہ سے پہلے اتنی بول پڑیں۔ انہوں نے شاید اس کا دل رکھنے کی خاطر  
کہا تھا۔

”اجتہا۔“ وہ بچے کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کرنے لگی۔ اگر آپ اجازت دیں تو اسے میں اپنے  
ساتھ لے جاؤں۔“

”ربیعہ۔“ صوفیہ حیران ہوئی۔  
”پلیئر چھوٹی آیا، اسے مجھے دے دیں۔ یقین کریں میں اس کی پرورش میں کبھی کوتاہی نہیں کروں  
گی۔“ وہ عجیب منت بھرے انداز میں بولی۔

”لیکن ابھی یہ بہت چھوٹا ہے، ذرا بڑا ہو جائے پھر۔“  
”اجتہا۔“ وہ مایوس نظر آنے لگی۔ ساتھ ہی ان تمام آرزوؤں کا عکس چہرے پر آتا آیا تھا۔ بہت اڑکی  
سے بچے کو دوبارہ کاٹ میں لٹا دیا۔

”اجتہا، میں چلوں۔“ اپنی بات کہہ کر فوراً پلٹی تو دل دھک سے رہ گیا۔ سامنے مہر و زچہ کے ساتھ  
شہر و ز احمد کھڑے تھے۔

اور وہ جو خاصی پراعتماد ہو گئی تھی اور سمجھنے لگی تھی کہ اب ہر قسم کے حالات کا سامنا کر سکتی ہے،  
شہر و ز احمد کو اچانک سامنے دیکھ کر ساری خود اعتمادی دھڑکی دھڑکی رہ گئی۔ یا پھر شاید اس کے گمان میں بھی  
نہیں تھا کہ کبھی ان سے یوں بھی سامنا ہو جائے گا۔ بہت کوشش کی کہ مضبوط قدموں سے چلتی ہوئی ان  
کے قریب سے نکل جائے لیکن ٹانگوں میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی، مشکل اپنا رخ موڑ سکی۔

عجیب سی صورت حال ہو گئی تھی کہ سب اپنی اپنی جگہ خاموش۔ اور شہر و ز احمد محض اتنی کی موجودگی کی وجہ سے  
اپنی پوزیشن اکورڈ محسوس کر رہے تھے۔ اگر اتنی اس وقت یہاں موجود نہ ہوتیں تو وہ اگر اس کی طرف پیش قدمی  
نہ کرتے تو واپس ضرور پلٹ جاتے۔ کتنے لمحے چپ چاپ ہرک گئے۔ پھر اس خاموش فضا میں ارتعاش بچے  
کے رونے کی آواز سے پیدا ہوا، اس کے بعد ہر شے جیسے حرکت میں آگئی۔

صوفیہ کے ساتھ اس نے بھی گردن گھما کر کاٹ کی طرف دیکھا۔ اتنی اپنی جگہ سے اٹھ کر آگئیں۔ مہر و  
بے اختیار آگے بڑھا اور شہر و ز احمد بے آواز قدموں سے باہر نکل گئے۔  
”اسے بھوک لگی ہے۔“ اتنی نے کہا تو صوفیہ اس سے کہنے لگی۔

”ربیعہ پلیئر، ذرا اس کا دودھ بنا دو۔“  
وہ چپ چاپ میز کی طرف بڑھ گئی۔ اور کپ میں دودھ بنا کر دوبارہ کاٹ کے پاس آئی اور خود

”پتا نہیں آپ وہ بات کریں جو کرنا چاہ رہے ہیں۔“

”بڑا تو نہیں مانو گے؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

شہروز احمد کچھ دیر اس کی طرف دیکھتے رہے پھر قدرے سر جھکا کر بولے۔

”ایک بچہ مجھے دے دو۔“

”شہروز بھائی۔“ وہ حیران ہوتا ہوا بولا۔ ”دونوں آپ کے ہیں۔“

”ہاں۔“ انہوں نے جھکے ہوئے سر کو اثبات میں ہلایا، پھر کہنے لگے۔ ”لیکن ایک بچہ جس کے میں تمام اختیارات چاہتا ہوں، اس کے بارے میں ہر فیصلہ میں خود کروں۔“

”کیسی باتیں کرتے ہیں شہروز بھائی، آپ بڑے ہیں، ہمارے بارے میں بھی فیصلے کے اختیارات آپ کو ہیں۔ کیا میں نے کبھی آپ کی کسی بات سے انکار کیا؟“ مہروز سعادت مندی کا مظاہرہ کرتا ہوا بولا۔ ”تم نہیں سمجھو گے۔ میرا خیال ہے، مجھے صاف لفظوں میں بتانا چاہیے۔“ انہوں نے طویل سانس لے کر کہا تو مہروز پوری توجہ سے اُن کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں وہ بچہ ربیعہ کی گود میں ڈالنا چاہتا ہوں۔“ اپنی بات کہہ کر انہوں نے ذرا سا رخ موڑا پھر کہنے لگے۔ ”ابھی وہ غالباً ایسی کسی خواہش کا اظہار کر رہی تھی۔ اس کی خواہش رومت کرو مہروز، اس نے کبھی ہم سے کچھ نہیں مانگا۔ اور پھر وہ کوئی غیر نہیں، صوفیہ کی بہن ہے۔ بچہ صوفیہ کے پاس رہے یا اس کے پاس، کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ وہ آہستگی سے بولے۔

مہروز چپ چاپ اُن کی طرف دیکھ گیا اور وہ پتا نہیں کیا سمجھے، ہونٹ بیچھ گئے تھے۔ کتنی دیر تک دونوں کے مابین کوئی بات نہیں ہوئی۔ مہروز کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے اور وہ سمجھے مہروز کو اُن کی بات بُری لگی ہے۔ جب ہی کہنے لگے۔

”آئی ایم سوری یار۔ میں کچھ۔“

”نہیں شہروز بھائی۔“ مہروز فوراً بول پڑا۔ ”مجھے آپ کی بات سے نہ اختلاف ہے، نہ انکار البتہ آئی۔ وہ بات اُدھوری جھوڑ کر اُن کی طرف دیکھنے لگا۔

”اتنی اور صوفیہ سے تم خود بات کرو۔“ انہوں نے اپنا دامن بچایا۔

”ابھی۔؟“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہاں، اسے یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جانا چاہیے۔“ وہ کسی ناویدہ نقطہ پر نظریں جما کر کھوٹے کھوٹے لہجے میں بولے تو مہروز ”او“ کے، کہہ کر کمرے کی طرف چلا گیا۔ اندر داخل ہوا تو وہ اُسے دیکھتے ہی بولی۔

”چلیں؟“

”ابھی چلتے ہیں۔“ پھر جیسے اچانک یاد آیا تو کہنے لگا۔ ”ربیعہ، پلیز آپ یہاں سے اپنی بڑی آپا کو فون کر دیں۔ میں کیا تو تھا فون کرنے لیکن مجھے اُن کا نمبر یاد نہیں رہا۔“

”کیا کہنا ہے اُن سے؟“ وہ آہستگی ہوئی پوچھنے لگی۔

”اپنے دو عدد بھائیوں کی خوشخبری سننا دیں۔“ وہ شرر بنسکراہٹ کے ساتھ بولا تو وہ صوفیہ کی طرف دیکھنے لگی۔ اور اُس کا اشارہ پاکر باہر نکل آئی۔ سامنے سے آئی سسٹر سے ٹیلی فون کے بارے میں پوچھا تو اُس نے نیچے پی بی۔ او میں جانے کے لیے کہا۔ وہ اُس کا شکریہ ادا کر کے سیر جھیاں اُتر آئی۔

”کون۔؟ ربیعہ۔؟ بڑی آپا اُس کی آواز سن کر کہنے لگیں۔“ کہاں سے بات کر رہی ہو؟“

”ہاسپٹل سے۔“

”خبریت۔؟“

”ہاں، وہ چھوٹی آپا کو دیکھنے آئی تھی۔“

”کیا ہوا ہے؟“ بڑی آپا اشتیاق سے پوچھنے لگیں۔

”بٹھا۔ بلکہ ماشاء اللہ دو بیٹے۔“

”اچھا مبارک ہو، یہ بتاؤ صوفیہ کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہیں۔ آپ آئیں گی؟“

”ہاں، شام میں عاصم آئیں گے تو اُن کے ساتھ آؤں گی اور تم کیا صوفیہ کے پاس رہ رہی ہو؟“

”نہیں بڑی آپا۔ میں تو ابھی آفس سے چھٹی لے کر آئی تھی، بس اب گھر جا رہی ہوں۔“

”گھر میں سب ٹھیک ہیں ناں؟“

”جی۔ آپ آئیں ناں کسی دن۔“

”آؤں گی۔“

”اچھا، خدا حافظ۔“

وہ فون بند کرنے کے بعد بھی کچھ دیر وہیں کھڑی رہی۔ دل چاہ رہا تھا یہیں سے گھر چلی جائے۔

لہذا سب کے درمیان بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ اُس نے سوچا، اسے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔

بہ صوفیہ گھر آتی، تب وہ بچوں کو دیکھ لیتی۔ لیکن جب آپا کی گئی تھی تو یوں چپ چاپ واپس جانا بھی سب نہیں تھا، اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی دوبارہ اوپر آ گئی۔

”بات ہو گئی بڑی آپا سے۔“ صوفیہ اُسے دیکھتے ہی پوچھنے لگی۔

”جی۔“ وہ مختصر جواب دے کر یونہی کھڑی رہی تاکہ مہروز بھی جانے کے لیے اٹھ جائے اور وہ

بے دیکھ کر کہنے لگا۔

”کیا بات ہے، آپ کو جانے کی بہت جلدی ہے؟“

”ہاں، مجھے اب چلنا چاہیے۔“

”اوکے۔“ وہ اٹھا اتارتی بھی اُس کے ساتھ اٹھ گئیں۔

”آپ بیٹھیں انٹی۔“ پھر صوفیہ کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”اچھا، چھوٹی آپا، میں چلوں۔“

”نکو بٹھا۔“ اتنی نے کہا تو وہ بڑھتا قدم روک کر انہیں دیکھنے لگی جو بچے کو کھیل میں لپیٹ رہی تھیں۔

راتھوں پر اُٹھا کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔

”لو بیٹا، یہ تمہارے پاس رہے گا۔“

”جی۔“ وہ خیر توں کے ساتھ ستائشوں میں گھر گئی۔

”لور ربیعہ، ابھی تم خود ہی تو کہہ رہی تھیں۔“ صوفیہ نے کہا تو وہ فوراً بول پڑی۔

”ہاں لیکن۔“ میرا مطلب ہے آپ۔ مہروز بھائی؟“ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا، کیا کہے۔

”ہم سب خوشی سے اسے تمہاری گد میں دے رہے ہیں، اور پھر یہ تمہارے پاس رہے یا میرے

ما، ایک ہی بات ہے۔“ صوفیہ نے زری سے کہا۔

”چھوٹی آپا۔“ وہ اسی قدر کہہ سکی اور اتنی کے بڑھے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر بچہ اپنے بازوؤں

بھر لیا۔ اگلے بل اسے سینے میں جھینج کر اپنی پیشانی اُس پر رکھائی تو آنکھوں میں پانی اُتر آیا جسے ہاتھوں

ماتے پکوں تک آنے سے روکا اور چہرہ اوجھلایا تو کہنے لگی۔

”میری زندگی کے صحرا میں جو بچہ تول آپ نے کھلایا ہے اس کے لیے میں۔“

”کوئی شکریہ نہیں۔“ مہروز فوراً بول پڑا۔

”شکریہ بہت چھوٹا سا لفظ ہے مہروز بھائی اور میرے پاس الفاظ نہیں، وہ اسے تشکر سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”اچھی بات ہے، اب چلیں۔“

”میں جاؤں؟“ وہ اتنی کی طرف دیکھ کر بہت سادگی سے پوچھنے لگی۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ

صوفیہ کو خدا حافظ کہہ کر کمرے سے نکل آئی۔ بھری آغوش کے احساس نے اچانک اسے بے پناہ خوشی سے ہلکا کر دیا تھا اور اندرونی خوشیوں کا عکس اس کے چہرے کو اس قدر منور کر رہا تھا کہ دور کھڑے شہر و زامہ اسے دیکھ کر لمحہ بھر کو توجیران رہ گئے۔ پھر دُرُتک آن کی نظریں اس کا تعاقب کرتی گئی تھیں۔

مہروز اسے باہر ہی سے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اور جب وہ بچے کو لیے ہوئے اندر آئی تو اماں، کلثوم اور ہما پہلے حیران ہوئیں، پھر سوال پر سوال۔

”کس کا بچہ ہے؟“

”تمہارے پاس کیسے آیا؟“

”کہاں سے آ رہی ہوں؟“ وغیرہ وغیرہ۔

وہ اطمینان سے مسکراتی رہی پھر بیٹھی تو اسی اطمینان سے بولی۔

”یہ میرا بیٹا ہے۔“

”بیچہ۔“ اماں نے تنبیہی انداز اختیار کیا۔ ”کہاں سے لائی ہوا ہے؟“

”میں چھوٹی پاکو دیکھنے گئی تھی۔“ اسے بتانا پڑا۔ ”اُن سے کہا، ایک بچہ مجھے دے دیں، انہوں نے دے دیا۔“

”کیا؟“ اماں کو یقین نہیں آیا۔ فوراً بڑھ کر بچے کے منہ پر سے کیل ہٹایا، پھر کہنے لگیں۔

”ہے تو صوفیہ کا بچہ۔ لیکن اس نے تمہیں کیوں دے دیا؟“

”میں نے کہا تھا ناں ان سے۔“

”اور تمہارے کیسے اس نے دے دیا اور مہروز اور اس کی ساس۔؟“ اماں حیرانی سے بولیں۔

”سب وہیں موجود تھے۔ وہ اماں کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔ اور اُن کی ساس نے خود میری گود میں بچہ ڈالا ہے۔ یہ کہہ کر یہ اب میرا ہے۔“ وہ قدرے بلند آواز میں بولی۔

”وہ تو تھیک ہے بیٹا۔“ اس کی نیز آواز پر اماں نرم پڑتی ہوئی کہنے لگیں۔ ”لیکن تمہیں بچے کو اس کی ماں سے الگ نہیں کرنا چاہیے۔“

”اماں۔ کیا میں اس کی ماں نہیں بن سکتی؟“

اماں خاموش رہیں تو کہنے لگی۔

”میں بنوں گی اس کی ماں۔ میں نے اسے جنم نہیں دیا تو کیا ہوا؟ میں اس کی پرورش کروں گی۔ اور اماں، آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ اس گھر کی خاموش فضاؤں میں اس کی معصوم ہنسی کی جلتی رنگ بجا کرے گی۔“

”اور کیا۔“ ہمارے فوراً اس کی تائید کی، پھر اس کے برابر بیٹھی ہوئی بولی۔ ”لایئے آپ، اسے میری گود میں دیں۔“

”ہاں، تم اسے پکڑو، میں اس کا دودھ وغیرہ لے آؤں۔“ اس نے بچہ ہما کی گود میں دیا، پھر اٹھی تو اماں کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے بولی۔

”اماں، چھوٹی آپا نے خوشی سے دیا ہے۔ یقین کریں میں نے انہیں مجبور نہیں کیا تھا۔ بے شک وہ اٹیں تو بوجھ لیجیے گا۔“

اماں نے اس کے ہاتھ تھیک کر اثبات میں سر ہلایا تو وہ جلدی سے بیگ اٹھا کر باہر نکل گئی۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد واپس آئی تو دودھ اور فیڈر کے علاوہ بچے کی اور کتنی چیزیں اس کے ہاتھوں

میں تھیں۔ جنہیں پٹنگ پر رکھتے ہوئے وہ ہمارے پوچھنے لگی۔

”یہ اٹھا تو نہیں تھا۔“

”نہیں۔“

”اماں کہاں ہیں؟“

وہ بچے کے کپڑے وغیرہ سینے میں لگی ہیں۔“

”اچھا۔“ اس نے خوشی کا اظہار کیا پھر ہما کو اٹھا کر کلثوم کو دیتی ہوئی بولی۔ ”پانی آبال کر اس میں دو۔“ کوئی پتا نہیں خان بہادر کب اچھے جائیں۔“

آپا۔ ابھی اس کا نام تو نہیں رکھا ناں؟“ ہما پوچھنے لگی۔

نہیں۔“

”کیا نام رکھیں؟“

”تم دونوں ناموں کی لسٹ بنا لو پھر اس میں سے جو اچھا لگے گا، رکھ لیں گے۔“ اس نے فراخ دلی لٹٹم اور ہما کو بچے کا نام رکھنے کی اجازت دے دی۔ لیکن جب انہوں نے طویل لسٹ اس کے

ہاتھوں پر رکھی تو اسے کوئی بھی نام پسند نہ آیا۔ منہ بنا کر بولی۔

”ہاں ایسا ہو جس کے معنی بھی اچھے ہوں اور میں اس کے اسم با مستی ہونے کی دعا کیا کروں۔“ پھر

کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔

”یہ میری بے آب وے رنگ زندگی میں خوشیوں کا پیامبر بن کر آیا ہے۔ ہمارے ہونٹوں کی کھلکھلائی

اس ننھے سے وجود کی مہزون منت ہے اور ابھی تو یہ ہمارے لیے اور بہت سی خوشیاں لائے

ہاتھ ہاتھ ہے۔ ہاتھ ہاتھ کا مطلب سمجھتی ہو؟“ اس نے اُن کی طرف منہ کر کے پوچھا۔

کلثوم اور ہما نے نفی میں سر ہلایا تو کہنے لگی۔

”ہاتھ کا مطلب ہے، خوشی، مسرت، شادمانی اور خدا اسے ہمیشہ شادمان رکھے۔“ اس نے بچے

بتاتے ہوئے ساتھ اسے دُعا بھی دی۔ پھر اس کے نرم نرم گال پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ ننھے ہاتھ کی بدولت واقعی اس گھر میں ایک ہلچل سی رہ

لا۔ آبائیاں آفس جانے تک اس کی زبان میں پتا نہیں کیا کیا بولتے رہتے تھے۔ پھر اماں سارا دن اس

اتھ مصروف رہتیں۔ کلثوم اور ہما اس کے کام بھاگ بھاگ کر کرتیں اور وہ جب آفس سے لوٹی تو

کے باوجود اس کے ساتھ گئی رہتی بلکہ اُس کا کہنا تھا کہ ہاتھ کا گود میں لیٹے ہی اس کی ساری تھکن

جاتی ہے اور رات میں بھی اس کا فیڈر وغیرہ بنانے کے لیے وہ خود اٹھتی تھی کئی بار اماں نے کہا کہ

”س جانا ہوتا ہے۔ رات میں سکون کی نیند لے لیا کرے، بچے کو وہ دیکھ لیں گی۔ لیکن وہ نہیں مانی،

اپنے پاس ہی سلاتی تھی۔

ن روز وہ آفس سے لوٹی تو اماں اس کے پاس آ بیٹھیں۔ کچھ دیر یونہی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔

”میرے بارے میں لوگ سوالات کرتے ہیں اور میں نہیں چاہتی کہ تمہارا کلثوم کی شادی سے پہلے

میرے حالات ان کے سسرال والوں تک پہنچیں۔ ہر کوئی اپنی سمجھ کے مطابق سوچتا ہے اتنا، ہو سکتا ہے کہیں بات بنتے غبتے محض میری وجہ سے نہ بگڑ جائے۔“

”کیسی بات کر رہی ہو؟ تمہاری وجہ سے کیوں؟“ اماں نے اسے ٹوکا۔

”میں غلط نہیں کہہ رہی اماں، ایک بار میرے ماتھے پر طلاق کا لیبل لگا اور دوسری بار بیوگی کی چادر اوڑھی۔ آپ ماں ہیں اس لیے کہتی ہیں کہ اس میں میرا کیا قصور؟ لیکن ہر کوئی تو ایسا نہیں کہہ سکتا یا کچھ نہیں تو محسوس ہی سمجھ لیں گے لوگ۔“ وہ تلخ ہوتے ہوئے بولی۔

”ایسی باتیں مت کرو بیٹا۔“

”میرے نہ کرنے سے حقیقت نہیں بدل جائے گی۔ حقیقت یہی ہے جو میں کہہ رہی ہوں، اس پر بہتر یہی ہے کہ آپ بڑی آبا کو لے جائیں۔ ویسے بھی میں ان معاملات میں خاصی اناڑی ہوں۔“

اماں خاموش رہ کر اسے دیکھنے لگیں تو وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔

”اس روز میں آپ کے ساتھ بریگزری کر گئی تھی۔ مجھے معاف کر دیں۔“

”نہیں بیٹا، تم نے تو مجھے میری غلطی کا احساس دلایا تھا۔ کم عقلی ہے میری جو میں یہ سمجھتی رہی کہ کلثوم گھروں میں ہی رہتی ہے۔ ہر ایک کو خوشحالی راس نہیں آتی۔ ہر ایک کو دکھ سکھ سب مقدر سے ملتے ہیں اور میں مقدر ہی کی نفی کرتی رہی۔“ قدرے توقف کے بعد گہری سانس لے کر بولیں۔

”اگر میں مقدر پر یقین رکھتی اور پہلی بار ہی تمہارے لیے ثاقب کے گھر والوں کو ہاں کر دیتی تو شاید حالات۔“

”بس کریں اماں۔“ اس نے ٹوک دیا۔ میرے ساتھ جو ہونا تھا ہوا اب اسے دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ کلثوم اور تمہارا کسوچیں۔“

”ان کا تو سوچ ہی رہی ہوں لیکن ان سے زیادہ مجھے تمہاری فکر۔“

”میری فکر؟“ وہ پھر ٹوک گئی۔

”میری فکر کیوں کرتی ہیں اماں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

کلثوم کی حنید کے ساتھ منگنی ہوتے ہی شادی کی تیاریاں بھی شروع ہو گئیں۔ اماں کا خیال تھا، جو طرح پہلے بیٹیوں کی شادیاں کی ہیں۔ اسی طرح کلثوم کی بھی کریں گی لیکن وہ فوراً بول پڑی۔

”نہیں اماں، پہلے صرف انا کمانے والے تھے۔ اب میں بھی ہوں اور میں صرف اپنے لیے نہیں کرتی ہاں گھر کے لیے کرتی ہوں۔ میرا مقنا پیسہ آپ نے آئندہ کے لیے جمع کر رکھا ہے، وہ سب کلثوم کی شادی پر لگا دیں۔“

اماں تنگ کرتی رہیں، آخر میں اس نے دھمکی دی۔

”ٹھیک ہے، جب میں اس گھر کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ تو مجھے یہاں رہنے کا بھی کوئی حق نہیں۔“

میں اپنا ٹھکانہ کہیں اور کر لیتی ہوں۔ جہاں ابتہاج اور میں رہیں گے۔“

”جودل چاہے کرو۔“ اماں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اور اس کی جمع شدہ رقم اس کے حوالے کر دے جس سے وہ جب آفس سے جلدی نکلنے کا موقع ملتا، کلثوم کے جیز کے لیے کچھ نہ بچھ لے آتی۔

اس روز بھی آفس میں کچھ زیادہ کام نہیں تھا۔ اتفاق سے ایم ڈی بھی نہیں آئے تھے۔ اس لیے بچے کے قریب جب جی، ایم صاحب سے گھر جانے کی اجازت مانگی تو انہوں نے خوشی اجازت دے دی۔ اپنی ٹیبل پر آکر اس نے جلدی جلدی تمام کام غذات سمیٹ کر دروازے بند کیے اور بیگ کھول

پیسوں کا جائزہ لے رہی تھی کہ فرناز اس کے پاس آکر کینے لگی۔

”خیر بہت۔؟ یہ اتنی غفلت کا مظاہرہ کس سلسلے میں ہو رہا ہے؟“

”میں جھپٹی لے کر جا رہی ہوں۔“ وہ مسلسل بیگ میں مصروف رہ کر بولی۔

”تھم جاؤ گی؟“

”ہاں، لیکن پہلے ذرا مارکیٹ جاؤ گی۔“ وہ بیگ بند کر کے اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

”مارکیٹ۔“ فرناز سوچتی ہوئی بولی۔ ”مارکیٹ تو مجھے بھی جانا ہے۔ گھر کے لیے کچھ چیزیں خریدنی

ب۔“

”چلو پھر۔“ وہ فوراً بولی۔

”پتا نہیں مجھے جھپٹی ملتی ہے یا نہیں۔“

”کام تو کچھ ہے نہیں۔ اور رحمانی صاحب بھی اچھے موڈ میں بیٹھے ہیں، تم جا کر بات کر دیکھو۔ ہو سکتا

”جھپٹی مل جائے۔“

”اچھا۔“ فرناز اسے رکنے کا کہہ کر رحمانی صاحب کے کمرے میں چلی گئی۔

کچھ دیر بعد۔ واپس آئی تو وہیں سے انگوٹھا دیکھا کہ جھپٹی مل جانے کا اشارہ دیا اور اس کے پاس

نے کے بجائے اپنی ٹیبل کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے اٹھتے اٹھتے بھی اپنی ٹیبل کا جائزہ لیا۔ پھر فرناز

اردیکھ کر اس کے ساتھ باہر نکل آئی۔

”نہیں کیا لینا ہے؟“ فرناز پوچھنے لگی۔

”میں کلثوم کے لیے ایک دو بتاری ساریاں۔ لوں گی۔ اس کے علاوہ کوئی مخصوص شے ذہن میں

ہے۔ اگر کوئی ایسی چیز نظر آگئی۔ جسے میں نے اس کے لیے ضروری خیال کیا تو لے لوں گی۔“ وہ

نا سے بولی۔

پھر یہیں قریبی مارکیٹ چلتے ہیں۔ ضرورت کی ہر شے تو مل جاتی ہے یہاں۔ فرناز نے کہا تو اس سے

مارکتے ہوئے دونوں پیدل ہی چل پڑیں۔

پھر مختلف دکانیں دیکھتے ہوئے پہلے اس نے ساریاں خریدیں پھر کیونکہ کوئی خاص انیٹم ذہن میں

نہیں تھا۔ اس لیے فرناز کے ساتھ چلنے لگی۔ وہ جس دکان پر رکتی۔ وہ بھی رُک جاتی، وہ چلتی تو وہ بھی

ہڑتی۔ ایک جگہ رُک کر فرناز اپنی مطلوب چیزیں دیکھ رہی تھی تو یونہی جھٹکتی ہوئی اس کی نظریں سامنے

میں میں سب سے بچوں کے خوبصورت ڈیزائن والے کپڑوں پر جا پڑیں۔ اسے فوراً ابتہاج کا خیال آیا۔

سنو، میں ذرا سامنے والی دکان میں جا رہی ہوں۔“ اس نے فرناز کو دکاندار کے ساتھ بحث میں

ت دیکھ کر اس کے کان میں کہا اور اس کے دیکھنے پر سامنے اشارہ کر کے اسی طرف چلی گئی۔ ابتہاج

لیے سوٹ دیکھنے اور پسند کرنے میں کافی وقت لگا۔ اس دوران وہ بار بار فرناز پر بھی نظر ڈالتی

تھی۔ پھر فرناز اپنی چیزیں لے کر اس کے پاس آگئی تو اس نے بھی تین چار سوٹ الگ کر کے

ار کو پیک کرنے کے لیے دے دیے۔

کس کے لیے لے رہی ہو؟ میرا مطلب ہے بھانجا یا بھتیجا؟“ فرناز پوچھنے لگی۔

”بھانجا، نہ بھتیجا۔ میرا اپنا بیٹا۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”کیا۔؟“ فرناز نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”تو کیا تم؟“ باقی بات آدھوری چھوڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

”ہاں۔“ اس کی حیرت سے محظوظ ہو کر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور دکاندار کے ہاتھ سے شاپنگ

لے کر بے منت کر دی۔

پھر فرناز کو چلنے کا اشارہ کرتی ہوئی جیسے ہی پٹی انیلا کو دیکھ کر کھڑکھٹک گئی۔ اس کے ساتھ منصور

سور کی گود میں بیٹھی تھی۔ اس کا خیال تھا ہمیشہ کی طرح انیلا ایک کمرے کی لیکن پتا نہیں کیوں وہ نظریں

ملی تھیں۔ اسے افسوس ہوا کیونکہ ایک وہی تو تھی، جس نے ثاقب حسن کے گھر میں اس کی دلجوئی کی

دراک وہ بھی نظریں چرا رہی تھی۔ اس نے سوچا، بدلے میں وہ بھی انجان بن کر قریب سے نکل جائے

لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ اور فرناز کا ہاتھ پکڑ کر اُس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”کیسی ہوانیلا؟“ پھر منصور کی طرف دیکھ کر بولی: ”آپ کیسے ہیں منصور بھائی اور یہ بچی؟“

”تمہاری ہے۔“ منصور خوشدلی سے ہنسا۔

”مبارک ہو مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں؟“ اُس نے شکوہ کیا۔

”آپ دوبارہ آئی ہی نہیں۔“ جواباً منصور کا شکوہ، تو وہ فوراً بولی۔

”میں آتی، میں۔ کیا میری واپسی کے لیے گنجائش چھوڑی گئی تھی؟“

”ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ اصولاً تو۔“

”چلیں منصور۔“ منصور بتانے لگی کہ اُنیل ٹوک کر واپسی کی بات کرنے لگی۔ اُس نے تاسف سے اُسے دیکھا۔ اور دُکھ سے بولی۔

”رشتوں سے قطع نظر انیلا، تم تو میری دوست بھی تھیں۔ مجھے اور کسی کا نہیں لیکن تمہارا اختلاف ضرور رہا اور میں اب تک تمہاری راہ دیکھا کرتی ہوں۔“

”اڈوں گی کسی دن۔“ انیلا کا انداز صاف جان چھڑانے والا تھا جسے اُس کے ساتھ ساتھ فرناز نے بھی محسوس کیا اور وہ توشاید نظر انداز کر کے کھڑی رہتی لیکن فرناز کو سخت توہین کا احساس ہوا، اس کا ہاتھ

کھینچتی ہوئی دکان سے باہر لے آئی۔

”کون تھی یہ بدتمیز؟“ فرناز نے خاصا جمل کر پوچھا۔

”پہلے دوست پھر نذر۔“ مختصر لفظوں میں تعارف کروا کر وہ پھر انیلا کے پیچھے نظریں دوڑانے لگی تو فرناز است و ہاں سے بھی کھینچ کر باہر لے آئی۔

”عجیب لڑکی ہوتی۔“ وہ تو تبیں لفت نہیں کر رہی اور تم اُس کے پیچھے مری جا رہی ہو۔“ فرناز نے باقاعدہ اُسے ڈانٹ پائی تو وہ رو باہشی ہو کر بولی۔

”یہ بات نہیں ہے۔ اصل میں، میں حیران ہو رہی ہوں کہ وہ تو ایسی نہیں تھی۔“

”آج ہی جا کے اُس کے بھائی سے شکایت کرنا۔“ فرناز نے فوراً مشورہ دیا تو وہ غائب و غامی سے بولی۔

”کون سے بھائی سے؟“

”ہائیں۔“ فرناز نے پوری آنکھیں پھیلا لیں۔ ”کہاں ہوتی؟“ بھئی اُسی بھائی سے جس کی تم منظور نظر منکوحہ ہو۔“ وہ خاصے طنزیہ انداز میں بولی۔

”اچھا۔“ اُس کی ہلکی سی ہنسی میں دُکھ بھی شامل تھا جو بلی بھر میں آنکھیں نم کر گیا۔

”کیا بات ہے؟“ کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی؟“ اُس کی آنکھوں میں نمی اُترتے دیکھ کر فرناز اُکھم

سجیو ہو گئی۔

”نہیں، آؤ واپس چلیں۔“ اُس کے ساتھ ہی وہ شاپنگ سینٹر کی سیڑھیاں اُتر گئی۔ جب کہ فرناز نے وہیں کھڑے کھڑے کچھ دیر اسے دیکھا پھر اُس کے پاس آئی تو کہنے لگی۔

”سنو، مجھے پیاس لگی ہے اور کچھ ٹھوک بھی۔“ پھر ادھر ادھر نظریں دوڑا کر بولی: ”جیلو وہاں بیٹھ کر کوک پی لیں۔“

”اب کھر تو جا ہی رہی ہو، وہیں جا کر پی لینا۔“ وہ اب کہیں بھی رُکنا نہیں چاہتی تھی۔

”ارے واہ۔ راستے میں چاہے پیاس سے دم نکل جائے تب۔“ وہ خاصے غصیلے لہجے میں بولی۔

”ایسا نہیں ہوگا۔“ وہ مسکرائی۔

”تمہیں کیا پیتا۔“ چلو آؤ۔“ فرناز زبردستی اُسے لے گئی اور کونے والی ٹیبل پر بیٹھتی ہی اُس نے کوک کے ساتھ برگر کا آرڈر دے دیا پھر اطمینان سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہاں، اب بتاؤ، اصل معاملہ کیا ہے؟“

”کیسا معاملہ؟“ وہ واقعی نہیں سمجھی۔

”تمہاری خندم سے اُکھڑی کھڑی کیوں تھی؟“ اور شوہر کے ذکر پر تمہاری آنکھیں کیوں بھگیں؟ کیا وہ

ہی تم سے اسی طرح اُکھڑا اُکھڑا ہٹا ہے۔“

”نہیں، وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔“ وہ مختصر بولی۔

”ارے۔“ فرناز کو اس دوسرے انکشاف پر شاک سا لگا۔ کتنی ہی دیر تک گنگ سی اسے دیکھتی

ی۔ پھر کہنے لگی۔

”کمال ہے تم نے کبھی اپنے بارے میں بتایا ہی نہیں۔ میں تو یہ سمجھتی رہی کہ تم میری طرح ہی کی لڑکی ہو

غلیب کے بعد اچھے رشتے کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے کے بجائے جاب کرنے لگی ہوتا کہ

رک کا ڈی مزید سہولت سے چلے کے۔“ اس کے خاموش رہنے پر کہنے لگی۔

”لیکن تم تو مختلف مراحل سے گزر رہی ہو۔ کٹھن مراحل سے۔ کیا ہوا تھا تمہارے شوہر کو؟“ آخر

بہروری سے پوچھنے لگی۔

”ایکسڈنٹ۔“ اُس نے مختصر جواب دیا۔

”ویری سیڈ۔ کتنا عرصہ ہوا؟“ وہ افسوس کرتے ہوئے بولی۔

”ڈیڑھ سال۔“

”واقعی بہت افسوس ہوا۔ کیا تمہارے کسمسرا ل والے تم سے نہیں ملتے؟“

”نہیں۔“ پھر اُس نے ثاقب حسن کے گھر والوں کا شروع سے جو رویہ رہا تھا، وہ سب بتایا اور آخر

کہنے لگی۔

سوئم والے روز ہی میری ساس نے مجھے گھر سے نکال دیا تھا۔ اس کے بعد پھر کوئی میرے پاس نہیں آیا۔

جی نہیں جو میری بہت اچھی دوست رہی تھی۔ اور سب گھر والوں کے ناروا سلوک کے باوجود

رے ساتھ بہت اچھی تھی۔ لیکن آج تم نے خود دیکھ لیا۔“ اُس کی آواز میں دُکھ کا تاثر تھا۔

ہوں۔“ فرناز ہوں کہہ کر پتا نہیں کیا سوچنے لگی۔ پھر برگر کھانے کے دوران بھی وہ مسلسل سوچتی

اُس کے بعد کوک کا بڑا سا گھونٹ حلق سے اتار کر میز پر رکھیں لڑکائی ہوئی پوچھنے لگی۔

سنو، تمہارا شوہر کھر میں واحد کمانے والا تھا؟“

ہاں۔ لیکن بعد میں اُس نے اپنے بھائی کو بھی برنس میں شامل کر لیا تھا۔

سی لیے۔“ فرناز جیسے نای بات سمجھ کر بولی۔

لیا اسی لیے؟“ وہ کچھ حیران ہو کر پوچھنے لگی۔

ی لیے تمہاری ساس نے تمہیں گھر سے نکال دیا تاکہ وہ تمہارے شوہر کے برنس پر قابض ہو

ا۔ اور بیوقوف ہوتی جو پھر کبھی پلٹ کر نہ گئیں۔ پھر سمجھاتے ہوئے کہنے لگی۔

منو اپنا جائز حق کیوں چھوڑتی ہو؟۔ مروت تو وہاں برتی جاتی ہے، جہاں دوسرے میں بھی لحاظ

بدا انہوں نے تمہارے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا تو تم کیوں لحاظ کر رہی ہو۔ دھڑلے سے

راہنے شوہر کی ہر چیز پر قابض ہو جاؤ۔ اگر وہ تمہارا حق تسلیم نہ کریں تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا

لے انصاف مانگو اور اگر اپنے لیے نہیں تو بچے کے لیے۔ مگر وہ اُس کی بات کا ٹکڑا کر فوراً بولی۔

نہ میرا نہیں ہے۔“ مزید انکشاف اور فرناز اُچھل پڑی۔

بمطلب؟“

میری بہن کا بچہ ہے۔ میں نے اُسے اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔“

”اچھی بات ہے۔“ فرناز لاپرواہی سے کہہ کر پھر اسی بات کی طرف آگئی۔

والا تم اپنے لیے بھی تو سوچ سکتی ہو خواہ مخواہ دوسرے کی نوکری کر رہی ہو جب کہ خود اچھی خاصی

”میں یہ نہیں کہوں گا کہ اس وقت آپ کو کوئی سواری نہیں ملے گی۔ یقیناً بہت سواریاں مل جائیں گی۔“  
 لیکن اگر آپ میرے ساتھ چلیں تو۔۔۔  
 اُس نے فوراً اُن کی طرف دیکھا تو کہنے لگے۔

”اگر صوفیہ کو معلوم ہوا کہ میں نے اُن کی بہن کو دیکھنے کے باوجود وہیں کھڑا چھوڑ دیا تھا تو وہ بہت ہوں گی۔“

”صوفیہ کو یونہی نہیں معلوم ہو جائے گا۔ کوئی بتائے گا تب ہی۔“ وہ بھی سنجیدگی سے بولی۔

”بعض باتیں نہ بھی بتائی جائیں، تب بھی لوگ جان جاتے ہیں۔“

”بہر حال میں آپ کے ساتھ نہیں جاسکتی،“ وہ حتمی انداز۔۔۔ میں کہہ کر دوسری طرف متوجہ ہو گئی۔

اور وہ جو اس کے چہرے پر نظریں جمائے کھڑے تھے۔ آہستہ آہستہ اُس کے پورے وجود پر سے لٹی ہوئی نظریں اس کے پیروں پر جا کھڑی ہیں۔ پیشانی پر ہلکی سی ککیر نمودار ہوئی، ہونٹ ذرا سے پھینچنے لگی۔  
 ”یہ کچھ کہنے کا ارادہ ملتوی کر کے گاڑی میں جا بیٹھئے اور ابھی اشارٹ کر ہی رہے تھے کہ وہ رکشے کی پچھتی نظر آئی۔ اُن کی پیشانی پر ککری اور ککیروں کا اضافہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کر نکال لے گئے۔“

”غیب بات تھی، وہ شہر و زاحمد کے ساتھ تھی تو ثاقب حسن سے متفق۔ اور اپنے طور پر نہ صرف جی پکی تھی بلکہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ دوبارہ کبھی ثاقب حسن سے نہیں ملے گی لیکن تقدیر نے ثاقب حسن کو کجا بازی خدا بنا دیا۔ تو وہ زیادہ دیر تک اس کے لیے اپنے دل میں کدورت نہیں رکھ سکی تھی۔ نہ زندگی بہر حال اُسی کے ساتھ گزارنی تھی۔“

لیکن جب شہر و زاحمد کا نام اس کی زندگی میں زہر گھولنے لگا۔ تب وہ اس نام سے بھی متفق ہو گئی۔ سارے فتنے میں وہ سب سے زیادہ قصور وار شہر و زاحمد کو سمجھنے لگی اور اب بھی سمجھتی تھی۔  
 ”کاکینا تھا کہ شہر و زاحمد جیسے شخص کو اول تو شروع ہی میں ثاقب حسن کی باتوں میں نہیں آنا چاہیے۔ اگر کسی بھی وجہ سے وہ اس سے نکاح کر ہی بیٹھے تھے تو پھر چھوڑنے کا کیا سوال جب کہ بعد وہ صوفیہ کے سامنے اس سے محبت کا اعتراف بھی کر گئے تھے۔“

اگر یہی اعتراف وہ اُس کے سامنے کر لیتے تو وہ خود ثاقب حسن کو مایوس لوٹا دیتی لیکن اب وہ کے نزدیک بزدل ترین انسان تھے۔ لوگ محبت کے لیے سر نہ ہڑکی بازی لگا دیتے ہیں اور شہر و زاحمد کی وہ دیوار نہ گرا سکے۔ جو ثاقب حسن نے اول روز ہی اُن دونوں کے درمیان کھڑی کر دی تھی۔ اور آج وہ کس ناستے سے میرے سامنے اُن کھڑے ہوئے تھے؟ رات میں وہ کتنی سے رہی تھی۔

”بڑا گھنڈ ہے شاید انہیں اپنی ذات پر کہ وہ کہیں گے اور میں اُن کے ساتھ چل پڑوں گی۔ ہونہار! اتوار گر ہی پڑی نہیں ہوں ہیں۔ خود ہوں گے زملے بھر کے فالقو۔ آئندہ اگر کبھی میرے راستے سے تو وہ مزا چکھاؤں گی کہ یاد ہی کریں گے۔“ اُس نے سر جھٹک کر کروٹ بدلی تو پھر اُن ہی کا خیال۔  
 ”مجھ رہے ہوں گے میں وہی پہلے والی ہو تو قوت سی ربیعہ ہوں گی، انتہائی بزدل سی۔ وہ ذرا رعب سے گرس گے اور میں ڈر جاؤں گی۔ میں کیوں ڈروں؟ ہاں میں کیوں ڈروں؟“ وہ کسی بھی انداز میں مسلسل اُنہیں ہی سوچ رہی تھی اور اپنے طور پر مطمئن کہ اس شخص کی اس کے نزدیک کوئی بات نہیں۔

”اس روز تو اُسے یاد نہیں رہا تھا، اگلے روز اُس نے اتان کو بتایا کہ اس کی انیلا سے ملاقات ہوئی۔ رجب یہ بتا رہی تھی کہ وہ خاصی کھڑی کھڑی سی تھی تو اسے فرنا زکی باتیں یاد آنے لگیں۔ اُس نے

فرم کی مالک ہو۔“  
 ”تم سے کس نے کہا کہ میں مالک ہوں؟“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

”ظاہر ہے شوہر کے بعد بیوی ہی مالک ہوگی۔ اور اگر مالک نہ بھی ہو، تب بھی تمہیں اس میں سے استاحصہ تو مل ہی جائے گا جس سے تم اپنے مستقبل کو محفوظ کر سکو۔“ فرنا ز اُسے سمجھاتے ہوئے بولا۔  
 ”چھوڑ دو میرا دل نہیں مانتا۔ جب سائبان ہی نہیں رہا تو یہ سب لے کر کیا کروں گی؟“ وہ اُلٹ کر بولی۔

”اچار ڈالنا۔ ایمان سے اگر تمہاری جگہ میں ہوتی تو ایک ایک کو کٹہرے میں گھسیٹ لاتی۔ اور تمہیں بھی میں یہی مشورہ دوں گی۔“

”سوچوں گی۔“ وہ بات ختم کرنے کی غرض سے بولی۔ ”اب ویٹر کو بلاؤ، پے منٹ کر کے چلتے ہم شام ہونے لگی ہے۔“

”چلو لیکن میں پھر تم سے تفصیلی بات ضرور کروں گی۔“ فرنا ز نے اس سے کہہ کر ویٹر کو اشارے سے بلایا۔ پھر پے منٹ کر کے دونوں اپنے اپنے شاپنگ بیگ اٹھا کر باہر نکل آئیں۔ شام کے سا تیزی سے پھیلنے لگے تھے۔ فرنا ز رکشے کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑاتی ہوئی بولی۔  
 ”ایک تو ہمارے راستے الگ الگ ہیں ورنہ ایک ہی رکشے سے چلے جاتے۔“  
 اسی وقت ایک رکشہ قریب آ کر رکا تو پوچھنے لگی۔

”پہلے تم جاؤ گی کہ میں؟“  
 ”مجھ سے پوچھنے کے بجائے رکشے والے سے پوچھو کہ وہ کہاں جانا پسند کرے گا؟“ وہ ہنہ ہوئی بولی تو فرنا ز رکشے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ پھر اس سے بات کر کے پلٹ کر بولی۔

”سنو۔ یہ گلشن جائے گا۔“  
 ”کوئی بات نہیں، تم چلی جاؤ۔ میں دوسرا رکشہ دیکھ لیتی ہوں۔“ اُس نے فرنا ز کی طرف سے اُسے جا کی اجازت دی۔

اس کے جانے کے بعد وہ ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔ ایک رکشہ دور کھڑا نظر آ رہا تھا۔ وہ اس طرف جانے لگی کہ ایک گاڑی بالکل قریب آ کر رکی۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور یونہی سر نہری نظر ڈالی کہ شہر و زاحمد کو دیکھ کر بالکل غیور آدمی طور پر جہاں کھڑی تھی، پنچوں پر پیچھے کی طرف گھوم گئی۔  
 اور وہ کیونکہ دور ہی سے اُسے دیکھ چکے تھے اور گاڑی بھی انہوں نے اُسی کے لیے روکی تھی اس لیے قدرے آواز کے ساتھ اُس کی طرف کا دروازہ کھولا کہ وہ متوجہ ہوگی۔ لیکن وہ اسی طرف رہی اور آواز دینا انہیں اچھا نہیں لگا۔ وہ خود آکر اُس کے سامنے آ گئے۔ نہ آداب، نہ حال احوال سامنے آتے ہی کہنے لگے۔

”آئیے، میں آپ کو چھوڑ دوں گا۔“  
 اور وہ کیونکہ اس صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر چکی تھی۔ اس لیے سے بولی۔

”شکریہ۔ میں چلی جاؤں گی۔“  
 ”شکریہ اس وقت ادا کیجیے گا، جب میں آپ کو آپ کے گھر تک چھوڑ دوں۔“ اُن کے چہرے سنجیدگی کی گہری چھاپ تھی اور لہجہ بہت عام سا۔ جیسے بھی اس سے ملے بھی ہوں تو کسی اور توسط سے، براہ راست کوئی واسطہ نہ رہا ہو۔ وہ بہت خاموشی سے اُن پر سے نظریں ہٹا کر اُدھار دیکھنے لگی جہاں کچھ دیر پہلے رکشہ کھڑا نظر آ تھا۔ اتنی دیر میں رکشہ پتا نہیں کس طرف نکل گیا تھا۔ تلاش میں نظروں کا زاویہ بدلا تو وہ کہنے لگے۔

سوچا، شاید انیلا بھی اس لیے بدل گئی ہے تاکہ میں اس گھر سے کسی قسم کا کوئی واسطہ نہ رکھوں تب وہ اماں سے کہنے لگی۔

”اماں۔ کلثوم کی شادی سے فارغ ہو جائیں، پھر میں اپنی سسرال جاؤں گی۔“

”کلبہ کو؟“ اماں حیرت سے بولیں۔ ”وہاں اب کون ہے تمہارا؟“

”کوئی نہ ہو پھر بھی میں ضرور جاؤں گی۔ اپنا حق لینے۔ آخر کس حساب سے انہوں نے مجھے تین کپڑوں میں نکال باہر کیا تھا؟“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”تین کپڑوں میں تو تم شہروز کے گھر سے بھی آئی تھیں۔“ اماں کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ وہ با دم سناٹے میں آگئی۔ اور اماں اس کی حالت سے بے خبر اپنی کہے گئیں۔

”آج تم ثاقب کے گھر والوں سے اپنا حق لینے کی بات کر رہی ہو۔ کل شہروز سے حق وصول کرنے کھڑی ہو جاؤ گی۔ اور اس سے صوفیہ کی زندگی پر کیا اثر پڑے گا، یہ سوچا ہے تم نے؟“

”اماں! کتنی دیر بعد وہ بولنے کے قابل ہوئی۔ یہاں شہروز کا کیا ذکر۔ ان کے گھر سے میرے تین کپڑوں میں ضرور آئی تھی لیکن انہوں نے مہر کی رقم کے ساتھ مجھے مکان کے کاغذات بھی بھجوا دیے جو میں نے اسی وقت واپس بھجوا دیے تھے۔ جب کہ ثاقب حسن کے گھر سے کوئی بھی

تک نہیں آیا، اس لیے ناں کہ انہیں خدشہ ہے، کہیں میں اپنا حق نہ مانگنے لگوں اور اماں جس کی خراب ہے، اس سے میں ضرور وصول کروں گی۔“ اس نے اماں کو ساری بات کہہ دی۔

”بیٹا۔“ اماں نرم پڑتی ہوئی بولیں۔ ”مت سوچو ایسا۔ میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا، اب پھر کہہ رہی ہوں، جب گھر والا ہی نہیں تو گھر لے کر کیا کرو گی؟“

”میرے اندر آگ گئی ہے اماں جو کسی طرح بچھائے نہیں سمجھتی۔ ان کا سلوک رویہ اور حسد انہوں نے بھری برادری میں مجھے نکال باہر کیا تھا، وہ سب آپ کے سامنے ہوا اور کیا وہ بھڑ والی باتیں ہیں؟“ قدرے توقف کے بعد بولی

”مجھے گھر نہیں چاہیے، کچھ بھی نہیں چاہیے لیکن میں انہیں سبق ضرور سکھانا چاہتی ہوں۔ بتاؤ ہوں انہیں کہ جس لڑکی کو کمزور سمجھ کر انہوں نے گھر سے نکالا تھا، وہ اب کمزور نہیں رہی۔“ اس کے لہجے میں ایک عزم تھا۔

”کیا روگی تم؟“ اماں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”کچھ بھی۔ میں کچھ بھی کر سکتی ہوں اماں۔ وقت کی لگامیں اب میرے ہاتھوں میں ہیں۔ یہ انہیں بتانا چاہتی ہوں کہ وقت بہت بڑا ناصح ہے۔ غریب اور مظلوم کا ساتھ دینے میں دیر نہیں کرتا۔“ آ کی آنکھیں اچانک کسی خیال کے تحت چمکنے لگی تھیں۔



**اماں حیرت سے اس کی طرف دیکھ گئیں۔ ہمیشہ سے کس قدر مختلف لگ رہی تھی وہ۔ ش حالات نے اسے یہ سب سکھایا تھا، انہوں نے دل ہی دل میں شک کیا کہ وہ مزید ٹوٹی نہیں، پھر یہی بلکہ اپنے اندر جینے کا حوصلہ پیدا کر گئی ہے۔**

”اماں۔“ وہ اماں کو یوں اپنی طرف دیکھتے پا کر ان کے ہاتھ تمام کر بولی۔ ”آپ پریشان نہ ہوں، یہ ایسا کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گی جس سے آپ کو تکلیف ہو یا آبائیاں کی ایک نامی پر کوئی بات آئے۔“

”بس بیٹا، یہی خیال رکھنا۔“ اماں کے لہجے میں عاجزی تھی۔ اس نے ان کے ہاتھ ہونٹوں اور آنکھوں سے لگا لیے۔

”آپ بالکل فکر نہ کریں بلکہ فی الحال تو بھول ہی جائیں کہ میں نے ایسی کوئی بات کی ہے۔ ہنسی خوشی کلثوم کی شادی کریں، اس کے بعد اس قصے پر سوچیں گے۔“

”اپنے آبائیاں سے ضرور مشورہ کر لینا۔“

”ذمہ صرف مشورہ بلکہ ان کی اجازت سے ہی کروں گی۔“ اس نے اماں کو فڈٹوں سے نکال کر پوری طرح مطمئن کیا تھا۔

• کلثوم کی شادی میں بہت تھوڑے دن رہ گئے تھے اور وہ چاہتی تھی آفس سے چھٹی لے کر اماں کا ہاتھ بٹائے۔ لیکن اتفاق سے ان دنوں آفس میں کام اتنا زیادہ تھا کہ اسے چھٹی ذمیل سکی۔ دو تین بار اس نے درخواست دی اور ہر بار خود ایم ڈی نے منکر دیا۔ اصل میں ان کی فرم نے کوئی بہت بڑا پروجیکٹ حاصل کیا تھا، جس پر کام کرنا اکیلے ان کی فرم کے بس میں نہیں تھا، اس لیے وہ کوشش کر رہے تھے کہ کوئی دوسری فرم ان کے ساتھ اس پروجیکٹ میں شریک کر لے۔

اس سلسلے میں ایک دوسری فرم سے بات ہو رہی تھی بلکہ ایک طرح سے آخری مراحل میں تھی۔ اس کے لیے کاغذی کارروائیاں ہو رہی تھیں۔ اور وہ کیونکہ اپنے کام کے ساتھ بہت فیر تھی، پوری پامانداری اور محنت سے کام کرتی تھی، اس لیے انتہائی ضروری معاملات میں ایم ڈی خود اس پر انحصار کرتے تھے۔

اور اب جب کہ کاغذی کارروائیاں ہو رہی تھیں تو ضروری کاغذات ٹائپ کرنا خاص طور سے اس کی ذمہ داری تھی، وہ اپنی ذمہ داری اچھی طرح سمجھتی تھی لیکن کیا کرتی، ذہن مسلسل کلثوم کی شادی کی طرف لگا ہوا تھا اور اماں بالکل اکیلی تھیں۔

ہما بازار کے چکر نہیں لگا سکتی تھی جب کہ بڑی آپا اور صوفیہ اپنے اپنے گھروں میں مصروف کسی وقت آتیں بھی تو مزید مشورے دے کر چلی جاتیں۔ بڑی آپا تو خیر شروع ہی سے بہت کم کم آتی تھیں اور صوفیہ خواہ روز آئے لیکن رہنے کی بات کبھی نہیں کرتی تھی اور اب تو بچے کی وجہ سے کہیں نکل ہی نہیں سکتی تھی۔

مجبوراً بے چاری اماں ہی سب کام نپٹاتی پھر رہی تھیں۔

اس وقت بھی جتنی تیزی سے اس کی انگلیاں ٹائپ رائٹر پر حرکت کر رہی تھیں، اس سے کہیں زیادہ تیزی سے اس کا ذہن اٹھ رہا تھا۔ اصل میں صبح جب وہ آ رہی تھی تو اماں نے اس سے کہا تھا کہ وہ جلدی آجائے پھر وہ اس کے ساتھ جیولر کے پاس جائیں گی۔ جہاں انہوں نے کلثوم کا زیور بننے دیا تھا اور اب پانچ بج چکے تھے۔ اس کا کام ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہا تھا۔ اس وقت وہ دونوں کمپنیوں کے درمیان ہونے والے ایگریمنٹ کے کاغذات ٹائپ کر رہی تھی کتنی ڈھیر ساری شرائط کچھ اس کی سمجھ میں آئیں، کچھ سر سے گزر گئیں۔

”یہ بڑے لوگ۔“ آخری کاغذ ٹائپ کرتے ہی اس نے سرگرمی کی نیشٹ سے ٹکراتے ہوئے سوچا۔

”زبانی ایک دوسرے پر اعتبار ہی نہیں کرتے۔ جب تک اتنے کاغذوں پر ایک دوسرے سے سائن نہ کروا لیں، کسی کام میں کامیابی نہیں ڈالیں گے۔“

”بس۔“ چوکیدار کے پیکارنے پر وہ سیدھی ہو بیٹھی اور سوالیہ نظروں سے دیکھنی لگی۔

”آپ کو صاحب بلا رہے ہیں۔“

”ہاں، آ رہی ہوں۔“ اس نے کہا اور جلدی جلدی تمام ٹائپ کیے ہوئے کاغذات سمیٹ کر پہلے انہیں ایک فائل میں لگایا، پھر وہ فائل لے کر ایم ڈی صاحب کے کمرے میں آگئی۔

”ہو گیا سارا کام؟“ وہ اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگی۔

”جیس سر۔“ اس نے فائل ان کے سامنے رکھ دی جسے کھولنے سے پہلے انہوں نے اسے بیٹھے کا اشارہ کیا پھر پوری طرح فائل کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اس نے کچھ دیر انہیں کاغذ پلٹے دیکھا، پھر یہی نظروں کا زاویہ بدل کر شیڈوں سے باہر دیکھنے لگی۔

”ویری گڈ۔“ کافی دیر بعد ان کی آواز آئی تو وہ پھر ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ فائل بند کر رہے تھے پھر اس کی طرف دیکھ کر بولے۔



”بہت اچھا۔ یقیناً اتنا اچھا کام کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔“  
 ”تھینک یو۔“ اُسے زبردستی مسکرایا پڑا۔  
 ”آپ نے غالباً چھٹی کی بات کی تھی۔ وہ یاد کرتے ہوئے پوچھنے لگے۔  
 ”جی۔“ وہ اسی قدر کہہ سکی۔

”آئی ایم سوری۔ یہ کام اتنا ضروری تھا کہ میں۔“

”کوئی بات نہیں سر۔“ وہ فوراً کہہ گئی تو انہوں نے پہلے انٹرکام پر چائے کے لیے کہا، پھر اُسے پوچھنے لگے۔

”کیا اب بھی چھٹی کی ضرورت باقی ہے یا جس کام کے لیے آپ کو چھٹی چاہیے تھی، وہ ہو گیا؟“  
 ”نہیں سر، وہ کام ہوا تو نہیں۔ اصل میں میری سسٹر کی شادی ہے۔“

”اچھا اچھا۔“ وہ خوشدلی سے بولے۔ اب آپ بالکل فارغ ہیں، جتنے دن چاہیں چھٹی کر سکتی ہیں لیکن۔“

”لیکن کیا سر؟“ وہ فوراً بول پڑی۔

”کل آپ کو ضرور آنا ہے۔“ پھر وضاحت کرتے ہوئے بتانے لگے۔ ”اصل میں اس ایگریمنٹ اور اس نئے پروجیکٹ کے افتتاح کے سلسلے میں میں نے اپنے اسٹاف کے خاص لوگوں کو ڈنر پر بلایا ہے۔ اس کے علاوہ میرے پارٹنر اور ان کے اسٹاف کے کچھ لوگ بھی شرکت کریں گے۔ وہیں آپس میں تعارف کا مرحلہ بھی طے ہو جائے گا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے سر لیکن اگر میں۔“

”نہیں، آپ کو ضرور آنا ہے۔“ وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑے۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگے۔ ”ایسا کریں، آپ صبح آفس نہ آئیں، میں شام میں گاڑی بھجوا دوں گا۔ ڈنر میں شرکت کر لیجیے گا۔“

”اوکے۔“ وہ اٹھنے لگی کہ ملازم چائے لے کر آ گیا۔ مجبوراً اُسے چائے پینے تک بٹھنا پڑا۔

”میں جاؤں سر۔“ چائے کا آخری گھوٹ لیتے ہی اُس نے اجازت طلب کی تو وہ کہنے لگے۔

”اگر آپ کو جلدی جانا ہے تو میں ڈرائیور سے کہوں، آپ کو چھوڑ آئے گا۔“

”نو تھینک یوسر۔ میں چلی جاؤں گی۔“

”ایز یو لائیک۔“ انہوں نے مسکرا کر جانے کی اجازت دی تو وہ اُن کے کمرے سے نکل آئی۔ اپنی ٹیبل کے پاس تک کر کھڑے کھڑے اُس نے مٹروں چیزیں دراز میں بند کیں پھر بیک اٹھا کر باہر آ گئی۔

بس اسٹاپ پر بہت دُش تھا اور بسیں بھی بھری ہوئی آرہی تھیں۔ مجبوراً اُسے رکتہ کرنا پڑا۔ گھر کی آواز سن کر انتظار کرتے کرتے آخر ایسوس ہو کر کچن میں مصروف ہو گئی تھیں۔ اُس نے ہمارے پوچھا،

پھر کچن میں اُن کے پاس چلی آئی۔

”اماں جیولر کے پاس صبح چلے جائیں گے۔“ اُس نے ایک تو تھکن، دوسرے گہری ہوتی شام کے پیش نظر کہا۔

”ہاں، اب تو جانے کا وقت بھی نہیں ہے۔“ اماں کوئی شکوہ کیے بغیر بولیں تو وہ اطمینان کا سانس لیتی ہوئی دوبارہ اندر آ گئی۔ بیگ پھینک کر خود بھی گرنے کے انداز میں پینگ پر بیٹھی تو ابہتاج گھٹنوں کے بل چلتا ہوا، اُس کے پاس آ گیا۔

”کتابے مروت ہے۔“ ہمارا کہنے لگی۔ ہم سارا دن اس کے پیچھے ہلکان ہوتے ہیں لیکن یہ جہاں آپ کو دیکھتا ہے، فوراً ہمیں نظر انداز کر کے آپ کی طرف ہلکتا ہے۔“

”میرا بیٹا میری طرف نہیں لپکے گا تو کس کی طرف لپکے گا۔“ اُس نے ابہتاج کو بازوؤں میں بھینچ لیا۔

”ایک بات کہوں آئی۔؟“ ہمارے دلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔  
 ”اگر آپ کا اور شہر ہو جاتی کا کوئی بچہ ہوتا تو وہ بالکل ایسا ہی ہوتا ابہتاج جیسا۔“  
 ”ہاں۔“ اُس کے اندر باہر محشر برپا ہو گیا۔ آنکھیں پوری کھلیں، ہونٹ نیم وا، کتنی دیر تخیل پر بیٹھی ہی، پھر اُسی طرح اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

بہت زیادہ اہتمام سے تو وہ ویسے بھی تیار نہیں ہوتی تھی۔ اس کا اپنا ایک الگ سیدھا سادا سا راز تھا۔ اور شائقِ حسن کے بعد تو اُس نے جیسے اپنے آپ کو دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ شاید کچھ خوفزدہ بھی نہی کہ لوگ کیا کہیں گے، بیوہ ہو کر کسٹھکار کرتی ہے۔ اس لیے بھی محتاط رہتی تھی۔ اس وقت بھی اُس نے ہلکے رنگ کا پلٹین سوٹ پہنا تھا اور ابھی بالوں میں برش کر رہی تھی کہ ہمارے پر پہنچ گئی، پہلے اُس کے پٹوں پر اعتراض کیا۔

”آئی۔ آپ ایک فائو اسٹار ہوٹل میں ڈنر کے لیے جا رہی ہیں اور یہ کپڑے پہن کر جائیں گی؟“  
 ”کیوں؟ کیا ہوا ان کپڑوں کو؟“ وہ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”کپڑوں کو کچھ نہیں ہوا، بس آپ کے ایم ڈی صاحب آپ کو کسی سے متعارف کراتے ہوئے خاصی سبکی محسوس کریں گے۔“

”ہکو مت۔“ وہ ڈانٹنے لگی۔ ”خبردار جو مجھے کوئی مشورہ دیا۔“

”میں مفت مشورہ دیا بھی نہیں کرتی۔“ خیر لائیے، آپ کے بال میں بنا دوں۔“ اُس کے ساتھ ہی ہانے اُس کے ہاتھ سے پرس چھین لیا۔

”جلدی سے چوٹی باندھ دو۔ گاڑی آنے والی ہوگی۔“ وہ کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالتی ہوئی بولی۔  
 ”ایسے ہی کھلے رہنے دیں، اچھے لگ رہے ہیں۔“ پھر آئینے میں اُسے دیکھتی ہوئی بولی۔

”سارا دن بازار میں خوار ہوتی رہی ہیں چہرا بہت تھکا تھکا سا لگ رہا ہے۔“ ذرا سی سنو ہی لگائیں اگر فریش نظر آئیں۔“

اُس نے بالکل غیر ارادی طور پر کریم کی شیشی اٹھالی اور جیسے ہی لگائی، ہمارا تعریف کرتے ہوئے بولی۔  
 ”دیکھا، اب چہرہ فریش لگ رہا ہے۔ لیکن ہونٹ۔“ بس ہلکی سی لپ اسٹک۔“ پھر خود ہی

پس اسٹک اٹھا کر اُس کے ہونٹوں پر لگانے لگی۔ اُسی وقت باہر گاڑی رکنے اور پھر مارن کی آواز مائی دی تو وہ چونک گئی۔

”میرا خیال ہے، گاڑی آگئی ہے۔“ اور تم نے ابھی تک میرے بال بھی نہیں باندھے۔“  
 ”بس بس۔ ایسے ہی رہنے دیں۔“ ہمارے برتس دھڑچھٹک دیا اور اُسے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھا لی ہوئی

لی۔ جائے گاڑی آچکی ہے۔“

”بہت تہمتیں ہوتی۔“ میں تم سے اگر پٹوں گی۔“ وہ اس پر خفا ہوتی ہوئی باہر آئی۔ اماں برآمدے ہی

اُن کھڑی تھیں۔ انہیں جانے کا بتایا تو وہ پوچھنے لگیں۔

”واپس کیسے آؤ گی؟“

”جب گاڑی لینے آئی ہے تو چھوڑ بھی جائے گی اور ہاں دیر ہو جائے تو پریشان مت ہوئیے گا۔“

یسی جگہوں پر دیر ہو جاتی ہے۔“

اماں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ دوپٹہ سنبھال لیتی ہوئی باہر نکل آئی۔ کسی فائو اسٹار ہوٹل میں آنے کا اس کا یہ کوئی پہلا اتفاق نہیں تھا۔ لیکن اجنبی لوگوں میں جانے کا یقیناً پہلا موقع تھا۔ پھر بھی وہ زیادہ نروس نہیں تھی، بس کچھ الگ الگ سی۔ اُس کے وہ مخصوص لگ جن سے روزانہ اس کی سلام دعا ہو جاتی تھی۔ اس وقت بھی ان ہی لوگوں سے اُس نے رسمی

جلے ہوئے، باقیوں کو نظر انداز کرتی ہوئی اپنے ایم ڈی اسفندیار کے پیچھے قدرے فاصلے سے جا کھڑی ہوئی۔

اس طرح اس کا خیال تھا، وہ سب سے پہلے تعارف کے مرحلے سے گزر کر پھر اطمینان سے کسی گوشے میں جا بیٹھے گی۔ اچانک اسے فرناز کا خیال آیا تو وہ اس کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔ پتا نہیں وہ آئی بھی تھی کہ نہیں لیکن وہ اسے ڈھونڈنے میں اتنی مگن تھی کہ اچانک اس پاس چو پچل مچ گئی تھی، اس کا اسے احساس ہی نہیں ہوا۔ چونکی اس وقت جب ایم ڈی اسفندیار کہہ رہے تھے: ”یہ میرے اسٹاف کی بہت دتر دار بہت سختی لڑکی ربیعہ“

”میں جانتا ہوں۔“ اس عدویار آواز پر اسے سننے میں کچھ لمحے ضرور گئے۔ نظریں اس چہرے کی طرف اٹھیں ضرور لیکن ٹھہریں نہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ نروس ہو گئی تھی اس لیے کہ شہر و زاحمد شش ناسانی کا جو دعوا کر رہے تھے، وہ اسے اچھا نہیں لگا۔

”آپ جانتے ہیں انہیں؟“ اسفندیار خوشگوار حیرت میں گھر کر بولے۔

”یاد تو آ رہا ہے کہیں۔“ پہلے بھی ملاقات ہوئی ہے۔ بہر حال آپ سے دوبارہ مل کر خوشی ہوئی مسز ربیعہ شاقب حسن، اس کے ساتھ ہی انہوں نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ان کی اس بے باک جرات پر وہ حیران ہوئی اور محض اس خیال سے کہ کہیں تماشائے بن جائے۔ اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا، جس پر فوراً انہوں نے گرفت مضبوط کر لی اور براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔ ”مجھے واقعی یاد نہیں آ رہا۔ کیا آپ بتا سکتی ہیں، ہم پہلے کب اور کہاں ملے ہیں؟“ اس کا دل چاہا کہ جہنم میں۔ اور پھر ان کی گرفت سے اپنا ہاتھ نکال کر زور سے انہیں دھکا دے اور بھاگتی ہوئی یہاں سے نکل جائے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ ضبط کا دامن تھامنے کی کوشش میں ان کے ہاتھ کی پشت پر اس کی انگلیاں سخت ہو گئیں تو وہ ذرا سا مسکرائے۔

”شاید آپ کنفیوز ہو رہی ہیں۔ بہر حال میں شہر و زاحمد ہوں۔“

”رائل ملٹریز کے ایم ڈی جن کے ساتھ ہم نے نیا پروجیکٹ شیئر کیا ہے؟ اسفندیار نے تعارف مکمل کیا تو اسے رسمی جملہ بولنا پڑا۔

”ہمیں آپ کے ساتھ کام کر کے خوشی ہوگی۔“

”یقیناً۔“ ان کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ ”ہمیں بھی آپ کی صلاحیتوں کو آزمانے کا موقع ملے گا۔“ ”آپ کو بایوسی نہیں ہوگی۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی اور ذرا سی کوشش سے ان کی گرفت سے اپنا ہاتھ نکال کر پیچھے ہٹ گئی تو وہ اس کے پورے سر پر نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

یہ صورت حال بڑی غیر متوقع تھی گوکہ اس نے کافی حد تک اپنے آپ کو سنبھالے رکھا تھا، پھر بھی جھنجھلا کر سوچ رہی تھی۔

اگر پہلے سے معلوم ہوتا کہ سامنا شہر و زاحمد سے ہوگا تو میں اپنے آپ کو ان کا سامنا کرنے کے لیے تیار رکھتی، پھر دیکھتی، صاحب بہادر کیسے اتنا جرم کھڑے ہو سکتے تھے۔

”سنو۔ یہ میں ہوں۔ میں۔ ربیعہ اکرام علی کہو یا ربیعہ شاقب حسن۔“ وہ دور سے شہر و زاحمد پر نظریں جما کر دل ہی دل میں انہیں مخاطب کر کے بولی۔

”گردش دوراں نے مجھے چٹان بنا دیا ہے۔ اب کوئی آندھی، کوئی طوفان میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تم بار بار میرے سامنے آؤ۔ میں ہر بار تمہاری نفی کروں گی۔“

”آپ یہاں کھڑی ہیں؟“ کسی نے قریب سے گزرتے ہوئے کہا تو وہ ایک نظر اس پر ڈال کر سب کے ساتھ جا بیٹھی۔

اسفندیار اور شہر و زاحمد نے پروجیکٹ کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ کچھ لوگ ان کی طرف متوجہ

نے اور کچھ اپنی باتوں میں مصروف۔ اور وہ بظاہر لا تعلق سی لیکن ذہن پوری طرح حاضر کسی بھی وقت انی مخاطب کرے تو وہ فوراً متوجہ ہو سکے۔

کچھ دیر بعد سب کھانے کے لیے اٹھ گئے تو وہ شہر و زاحمد کی سیکریٹری کو غنیمت جان کر اس کے ساتھ ہوئی۔ کھانے کے دوران اور اس کے بعد بھی وہ اسی کے ساتھ رہی۔

چائے کے بعد جب سب جانے پر آمادہ نظر آئے تو وہ اسفندیار سے یہ پوچھنے کی غرض سے کہ آیا ان کا ایئر اے چھوڑ آئے گا یا وہ خود سے جائے گی۔ اسفندیار کے پاس آئی تو شہر و زاحمد جیسے منتظر تھے، اسے بتاتے ہی کہنے لگے۔

”اسفندیار۔ یہ میرے بھائی کی مسٹر ان لاء ہیں۔“

”اچھا۔“ اسفندیار یقیناً حیران ہوئے۔

”اصل میں ایک آدھ بار ہی ان سے ملاقات ہوئی ہے، جب ہی میں فوراً پیپن ان نہیں سکا۔“

”سر میں جاؤں۔“ وہ انہیں نظر انداز کر کے اسفندیار سے پوچھنے لگی۔

”کیسے جائیں گی؟“ میرا مطلب ہے ڈرائیور سے کہیں۔“

”میرا خیال ہے، میں انہیں چھوڑ دوں گا، اسی بہانے ان کے گھر والوں سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ نہ تو مصروفیت میں آپ جانتے ہی ہیں۔“ انہوں نے اسفندیار کی بات کاٹ کر کہا تو اسفندیار اس کی فٹ دیکھنے لگے۔ وہ صاف منع کرنا چاہتی تھی لیکن پھر وہی خیال ”کہیں تماشائے بن جائے“ خاموش رہنے پر بور کر گیا اور خاموشی کو رضامندی سمجھ کر شہر و زاحمد اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اوکے اسفندیار۔ اجازت دیجیے، آپ سے ملاقات تو اب رہے گی۔“

”جی ہاں۔“ اسفندیار نے ان کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا اور اسی طرح چلتے ہوئے باہر آئے۔ وہ بہت لوشی سے ان دونوں کے پیچھے چل رہی تھی بگاڑی کے قریب رگ کر دونوں نے رسمی جملے بولے پھر شہر و زاحمد واڑہ کھول کر اس سے کہنے لگے۔

”آئیے مس ربیعہ۔“

”مسز ربیعہ۔“ وہ دھیمی آواز میں کہہ کر بیٹھ گئی تو انہوں نے پلٹ کر ایک بار پھر اسفندیار سے ہاتھ لیا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

میں روڈ تک وہ گاڑی خاصی تیز رفتاری سے لائے تھے، اس کے بعد سگریٹ سڈگانے کے بہانے مار دھیمی کی تو پھر اسی طرح رہنے دی۔ وہ اندر ہی اندر خاصی تجزیز ہوئی لیکن ان سے کچھ کہنے کی کوشش میں کی، ہونٹ بھینچے شیشے سے باہر دیکھتی رہی۔

”بابا کے مناظر واقعی ہینٹ دکش ہیں یا میری صورت بہت زیادہ خوفناک۔“ اس کی حد سے زیادہ خلقی دیکھ کر بالآخر انہیں متوجہ کرنا پڑا۔ لیکن وہ پھر بھی کچھ نہیں بولی۔

”آپ کا بیٹا کیسا ہے؟“ کچھ دیر بعد پھر پوچھا۔ جان بوجھ کر ایسی بات کی کہ وہ جواب دے گی، نہ ہونو خاموشی۔

”مجھے یاد ہے۔“ وہ ایک نظر اس پر ڈال کر دوبارہ سامنے دیکھتے ہوئے بولے۔

”ایک بار آپ نے کہا تھا کہ آپ کبھی خفا نہیں ہوتیں۔ کیونکہ آپ کو یقین ہے کہ اگر آپ روٹھ میں تو کوئی منانہ سکے گا۔“ اور پھر یہ بھی کہا تھا، شہر و زاحمد اٹھ کھڑے نہ دینا۔

”میرے خدا۔“ ابھی کچھ دیر پہلے وہ اپنے آپ کو چٹان کہہ رہی تھی اور اب دل پتے کی طرح یوں زرد ہاتھ جیسے تیز آنکھوں کی زد میں آ گیا ہو۔

”اور میرا مسئلہ یہ ہے کہ۔“ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے: ”میں کسی کو روٹھا ہوا نہیں بھڑھکا۔ بڑا عجیب سا لگتا ہے مجھے گوکہ ہمارے درمیان روٹھنے اور مرنے والا کوئی سلسلہ ہے، لا تعلق“

پھر بھی میں چاہتا ہوں، دوستی نہیں تو عداوت بھی نہ ہو۔“

کچھ دیر خاموش رہ کر اس کے بولنے کا انتظار کیا لیکن وہ پتا نہیں قصداً خاموش تھی یا قوت گویائی کھو چکی تھی کہ ہونٹوں نے ذرا سی جنبش نہیں کی البتہ پیشانی پر ہلکی ہلکی ککیریں نمودار ہونے لگی تھیں۔ انہوں نے ویو میں اس کا جائزہ لیا، پھر کہنے لگے۔

”آپ کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری حالات یا تقدیر پر ڈال کر ہم بری الذمہ نہیں ہو سکتے، مگر اپنے بارے میں میں ضرور ہوں گا کہ خود اپنے ضمیر کی عدالت میں، میں اپنے آپ کو مخرخو نہیں کر سکا۔ اس تمام عرصے میں بار بار میں نے اپنا حاسب کیا اور کہیں نہ کہیں میرا دامن ضرور ملوٹ نظر آیا۔ اس لیے دل پر ایک بوجھ رہا۔ جس نے مجھے کبھی چین نہیں لینے دیا۔

ہر وقت ایک مجرمانہ احساس کے ساتھ یہ خیال بھی گھیرے رہا کہ کہیں نہ کہیں مجھ سے بھی زیادتی ضرور ہوئی ہے اور اس وقت تو یہ احساس اور زیادہ شدت اختیار کر گیا، جب مجھے معلوم ہوا کہ ثاقب حسن نے آپ کو وہ مقام نہیں دیا جو کہ آپ کا حق تھا۔“

وہ صرف سن رہی تھی۔ اور اپنی ساری توانائیاں صرف کر کے اس پانی کو اندر ہی اندر روکنے کی کوشش میں مصروف ہو آ نکھوں میں آنسو اترنے اور پھر جھپکے کو بے تاب تھا۔

”اگر آپ ثاقب حسن کے ساتھ مطمئن اور خوش و خرم زندگی گزار رہی ہوتیں تو شاید میں بھی مطمئن ہو کر نئی زندگی کی ابتلا کر چکا ہوتا لیکن اس کے برعکس حالات نے مجھے اپنے بارے میں سوچنے ہی نہیں دیا۔ کبھی خیال آیا بھی تو سوچا، پہلے آپ سے اپنے ناکرہ گناہ کی معافی مانگ لوں ورنہ ضمیر ہمیشہ پھونکا رہے گا۔ وہ خاموش ہو کر سوچنے لگے کہ اب جو بات کہنے جارہے ہیں، وہ پتا نہیں کہنی مناسب بھی ہے کہ نہیں مگر کہ بغیر رہ بھی نہ سکے۔

”میں شاید تلافی نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے لیے ایک عمر کا ساتھ درکار ہے۔ جب کہ یہ کچھ وقت کا ساتھ بھی آپ پر گراں گزر رہا ہے۔ بہر حال اگر آپ بھی مجھے قصور وار سمجھتی ہیں تو اس کے لیے جو سزا چاہیں، میرے لیے تجویز کریں، میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔ لیکن خدا را اس کے بعد مجھے معاف ضرور کر دیجیے تاکہ ضمیر کی خلش سے نجات ملے اور میں ہر بوجھ سے آزاد ہو کر مطمئن ہو سکوں۔“

اس کے بعد خاموشی۔

ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا اور وہ بس اندر ہی اندر الجھتی رہی۔ لڑتی رہی۔ گاڑی گھر جانے والے راستے پر مڑی اور پھر رگ گئی تو لگا جیسے پوری کائنات ٹھہر گئی ہے۔ اس نے چاہا، وہ اب ایک عمر کی خلش اور ضمیر کے مسلسل کچوکے دے کر بنا کچھ کہے چپ چاپ آ کر اندر چلی جائے تاکہ حیات کے باقی ماندہ سفر میں فقط ایک خیال طمانیت بخشتا رہے کہ اس سفر میں وہ تنہا نہیں ہے۔ اس کی نظر کوئی اور بھی تہا تہا تھا۔ لیکن وہ تھی ربیعہ اکرام علی، جس نے کبھی دانستہ اپنی ذات سے کسی کو دکھ نہیں پہنچایا تھا۔ اگر کسی کو خوشیاں نہ دے سکی تو دکھ بھی نہیں۔

اور اب دامن پھیلانے والے شہر و زحام تھے جن کی سنگت میں گزرے ماہ و سال کو اس نے اماں کے سامنے خوبصورتوں سے تشبیہ دی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ اب ویسی خوبصورتیاں میرا مقدر نہیں ہو سکتیں۔ بہر حال ان کی جگہ کوئی اور ہوتا، تب بھی وہ اپنی فطرت سے مجبور۔ خوشیاں نہیں تو دکھ بھی نہیں۔ آؤ اس نے ثاقب حسن کو بھی تو معاف کر دیا تھا، جس نے سائبانی دینے کے باوجود تپتی دھوپ میں گھسیٹا تھا۔

وہ اپنے آپ کو بولنے پر آمادہ کر رہی تھی اور اس کی یہ کوشش وہ مریں دیکھ بھی رہے تھے۔ جب وہ بولی تو وہ ساری نمی جسے وہ آنکھوں میں اترنے سے روکتی رہی تھی، اس کے ہچے میں آسمانی۔

”کوئی سزا نہیں شہر و زحام۔ بس معافی ہی معافی۔ اگر میرے معاف کر دینے سے آپ ہر بوجھ سے آزاد ہو سکتے ہیں تو میں نے معاف کیا۔

اگر دل کی خلش سے نجات کا یہی ایک راستہ ہے تو میں معاف کرتی ہوں۔

میری معافی اگر آپ کی خوش آمد زندگی کی ضمانت ہے تو میں یہ ضمانت دے رہی ہوں کہ ربیعہ اکرام علی اپنی بے آب و رنگ زندگی کا نہ کبھی حساب مانگے گی، نہ کبھی الزام رکھے گی۔

آپ مطمئن ہونا چاہتے ہیں تو یہ اطمینان میں سے لے کر جائیں۔ میں نے سب معاف کیا۔ اور آج تک ابھی اپنی کتاب زندگی کے اس باب کو ہمیشہ کے لیے نکال پھینک رہی ہوں، جس میں دو مردوں نے میری زندگی سے متعلق کوئی معاہدہ کیا تھا۔“

اس کے ساتھ ہی وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتر گئی۔ اور شہر و زحام جو اپنا آپ بھلائے بیٹھے تھے ایک دم چوبک گئے۔ اور اس کا تعاقب کرتی ہوئی ان کی نظریں اس دروازے تک گئیں، جہاں سے وہ بار بار اس کے ساتھ داخل ہوئے تھے اور اب وہ اکیلی یوں اس کے پیچھے غائب ہو گئی تھی جیسے پھر کبھی نظر نہیں آئے گی۔

کمال ضبط کا مظاہرہ کر گئی تھی وہ کہ اندر سیلاب مچتا رہا اور آنکھوں میں اس نے ایک بوند تک نہ ترنے دی تھی۔ لیکن دروازے سے داخل ہوتے ہی ضبط کے بندھن ٹوٹنے لگے۔

”بس کچھ دیر اور۔“ اس نے اپنے آپ کو سہارا دیا۔ اور اندر آئی تو ہوا اور کھنکھوتے جیسے منتظر تھیں۔

”کیسا رہا۔؟ ہمارا مطلب ہے۔“ ہٹائے کہا تو وہ بول پڑی۔

”تمہارا مطلب جو بھی ہو، اس وقت میں ذکر کی تفصیل نہیں بتا سکتی کیونکہ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔“

”چائے بنا دوں؟“ ہٹائے غصانہ پیشکش کی۔

”نہیں، چائے پی کر آ رہی ہوں۔ بس اب سوؤں گی۔“ اس کے ساتھ ہی وہ چھوٹے کمرے میں چلی گئی۔

پہلے پل کر بلیک کی چادر ڈھیک کر رہی تھی کہ اماں آ گئیں۔

”آگئیں تم۔“ اس کے ساتھ آئی ہو؟“ اماں نے بونہی بوجھ لیا تھا۔ لمحہ بھر کو اس کے ہاتھ پلنگ کی سطح پر ٹھہر گئے۔ پھر ان کی بات کا جواب دینے کے بجائے پوچھنے لگی۔

”اب تہا ج سو گیا کیا؟“

”ہاں، ابھی سویا ہے۔“

”آج آپ آتے اپنے پاس سلا لیں۔ میں شاید رات میں اٹھ نہ سکوں۔“

”تھک گئی ہوگی۔“ اماں نے بغور اسے دیکھا، پھر کہنے لگیں ”اب زیادہ دیر تک جاگنے کی ضرورت نہیں ہے، سو جاؤ آرام سے۔ اور ہاں اب تہا ج کی فکر مت کرو، میں اسے اپنے پاس سلا لوں گی۔“

”ہاں، اب سو رہی ہوں۔“ اس نے کھلے بالوں کو چوٹی کی شکل دی اور تکیہ سیدھا کر کے لیٹی ہی تھی کہ ماں لاٹ آت کر کے کمرے سے نکل گئیں۔

لمحہ میر کو اسے حیرت ہوئی۔ یوں لگا جیسے سب نے آپس میں طے کر کے اسے عہد رفتہ میں جھپکے کو نہا چھوڑ دیا ہو۔ لیکن اب اسے عہد رفتہ میں نہیں جھپکنا تھا کیونکہ ابھی تو وہ گذشتہ باب کو پھاڑ کر پھینک آئی تھی۔

”گذشتہ باب؟“ اس کے اندر جیسے کوئی پکار کر کہنے لگا۔ ابھی جو کچھ ہوا، اسے تم کیا کہو گی۔ وہ شخص جس کی تم نفی کرنے جا رہی تھیں، کس دھڑلے سے تمہیں سب کے سامنے جانے کا دعوا کر رہا تھا۔ اور اپنے اس دعوے کو پتہ بھی کر دیا تھا کہ تمہیں ساتھ لے آیا۔ حوصلہ تھا تو سب کے سامنے اسے جھٹلا دیتیں۔ پھر اس کی باتیں۔

”میں کسی کو روٹھا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ بڑا عجیب سا لگتا ہے مجھے۔ گو کہ ہمارے درمیان روٹھے اور منانے کا نہ کوئی سلسلہ ہے نہ تعلق۔ پھر بھی میں چاہتا ہوں، دوستی نہیں تو عداوت بھی نہ ہو۔“ اور پھر۔

”میں شاید تلافی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کے لیے ایک عمر کا ساتھ درکار ہے۔ جب کہ یہ کچھ وقت کا ساتھ بھی آپ پر گراں گزر رہا ہے۔“ اور پھر اسے یاد آیا، انہوں نے کہا تھا۔  
 ”اگر آپ شائقِ حسن کے ساتھ مطمئن اور خوش و خرم زندگی گزار رہی ہوتیں تو شاید میں بھی مطمئن ہو کر نئی زندگی کی ابتدا کر چکا ہوتا۔“  
 ”یہ سب سن کر تیریاں میں شہر و زاحر۔“ اس نے سوچا۔ ”مجھے قریب دینے کا کوئی نیا انداز۔ ورنہ کس نے روکا تھا تہیں نئی زندگی کی ابتدا کرتے؟“ اور پھر اب تو میں نے تمہیں پر غفلت سے آزاد کر دیا ہے، تم یقیناً مطمئن ہو گئے ہو گے۔“  
 ایک تلخ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیلی اور وہ کروٹ بدل گئی۔

پھر بس اگلے دن ہی وہ کچھ ڈسٹرب نہ رہی۔ اس کے بعد کلثوم کی شادی کا ہنگامہ شروع ہو گیا تو وہ ادھر مصروف ہو گئی۔ ماموں جان کی باقی سب لڑکیوں کی نو شادی ہو گئی تھی، بس ایک نیلورہ گئی تھی۔ وہ ہندی والے روز سے ہی آگئی۔ بڑی آگیا اور صوفیہ روزانہ صبح سے آتیں بھی تو شام ہوتے ہی واپس چلی جاتیں۔ لیکن جس روز وہ وہاں والے ہندی لے کر آئے اور اس تقریب کے بعد جب صوفیہ واپسی کی تیاری کر رہی تھی تو اس نے آکر اس کا بیگ چھین لیا۔  
 ”بس چھوٹی آیا۔ آج آپ یہیں رہیں گی۔“  
 ”میں صبح پھر آ جاؤں گی۔ صوفیہ اس سے بگ لینے کی کوشش کرتی ہوئی بولی۔  
 ”میں جانے دوں کی تیب ناں۔“ پھر وہ ہر روز سے پوچھنے لگی۔ ”مہر و زہا جی، آخر آپ انہیں یہاں کیوں نہیں رہنے دیتے؟“  
 ”بچہ میں نے کبھی منع نہیں کیا۔“ مہر و زہا نے صاف اپنا دامن پچایا۔  
 ”تو پھر کہیں ان سے، یہ یہیں رہیں۔“  
 ”نہ بابا۔“ مہر و زہا کو ہاتھ رگاتے ہوئے بولا۔ ”یہ سمجھیں گی، میں جان پھڑپھڑا رہا ہوں۔ ان کی مرضی رہے یا نہ رہیں۔ مجھے اس معاملے سے اگہ ہی رکھیں۔“  
 ”چلیے، آپ اجازت دے دیں، انہیں روکنا میرا کام۔“  
 ”نہیں ربیعہ۔“ صوفیہ منت سے بولی۔ ”بچہ پریشان ہو گا، اصل میں اسے اپنی جگہ سونے کی عادت ہے۔ ابھی دیکھو، کیسا بسور رہا ہے۔“  
 ”اسے میں سنہال لوں گی۔“  
 ”تم اپنے والے کو سنہال لو کی یا میرے کو۔“

ربیعہ انتہا کی طرف دیکھنے لگی جو آرام سے پلنگ پر بیٹھا کھیل رہا تھا۔ اس نے لپک کر اسے گود میں اٹھا لیا، پھر کہنے لگی۔  
 ”میرا بیٹا بہت اچھا ہے۔ بالکل تنگ نہیں کرتا۔“  
 ”یقیناً آپ پر گریہ ہو گا۔“ مہر و زہا مسکرا کر بولا پھر صوفیہ کی گود میں بچے کی طرف اشارہ کرتا ہوا کہنے لگا۔  
 ”یہ اپنی ماں پر گریہ ہے، تنگ کرنے میں بائسٹر۔“  
 ”میں تنگ کرتی ہوں؟“ صوفیہ نے غصے سے کہا تو وہ بھیجے ہٹ گیا۔  
 ”بالکل نہیں۔ اور ہاں، چلنا ہے تو تیرا دس ورزہ میں جاؤں۔“  
 ”بڑی فواد علی دکھا رہے ہیں۔ اگر میں رک گئی تو آپ ہی کا منہ پھولا رہے گا۔“ پھر جلدی سے بگ اٹھا کر اسے تھمایا اور ربیعہ کا کال تھپک کر بولی۔ ”صبح آؤں گی، ہاں۔“  
 ”صبح آنے کی کیا ضرورت ہے۔ شام میں آئیے گا ہانوں کی طرح۔“ وہ خفگی سے بولی تو صوفیہ ہنستی

نی اسے خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔

اگلے دن کلثوم زحمت ہو کر اپنے گھر چلی گئی۔ تو جہاں خوش اسلوبی سے اہم فرض کی ادائیگی سے نی ہوئی، وہاں گھر ایک دم خالی خالی گئے لگا۔ اس رات وہ دیر تک کلثوم کے بارے میں نہ صرف سوچتی رہی بہت زندگی کے لیے دعا کرتی رہی تھی۔ اتنے دنوں کی افراتفری کے بعد سب یوں اطمینان سے سوئے کہ کوئی بھی معمول کے مطابق نہ اٹھ سکا۔

سب سے پہلے انتہا کی اٹھا تھا اور سب کو سویا ہوا دیکھ کر اس نے رونا شروع کر دیا۔ اس کے رونے آواز پر ہی اس کی آنکھ کھلی تھی، فوراً اسے گود میں لے لیا۔  
 ”کیا ہوا میری جان؟“ اور اس نے ابھی بولنا نہیں سیکھا تھا، اس لیے اس کے سینے میں منہ چھپا لیا۔

ب آہستہ آہستہ اسے تھکتی ہوئی وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ بہا، اماں یہاں تک کہ ابامیاں بھی سو رہے تھے۔

”بیٹی بیابہ کر سوئے ہیں۔“ وہ پلک سے بڑبڑائی، پھر خود ہی ہنسن پڑی۔

”ماما۔“ انتہا کی سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگا تو وہ اس کی پیشانی چوم کر بولی۔

”آپ کو بھوک لگی ہوگی۔ چلو یہاں بیٹھو، میں آپ کا دودھ بنالائوں۔“ وہ اسے بٹھا کر کچن میں چلی گئی۔ پہلے فیڈر بنا کر اسے دیا پھر منہ ہاتھ دھو کر ناشتا بنانے کا سوچ رہی تھی کہ اماں بھی اٹھ کھین، انہوں نے خاص طور سے، اگ سے ناشتا بنانے سے منع کیا کیونکہ رات کا سامان اور روٹی رکھی ہوئی تھی، اس نے ہی گرم کیا۔ اتنے میں اماں اور بچا کو بھی اٹھا دیا، پھر سب نے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کیا۔

ناشتے کے بعد وہ بھام کے ساتھ مل کر گھر کی حالت ٹھیک کرنے لگی۔ کافی دنوں سے افراتفری مچی ہوئی تھی اور سب سمیٹتے سمیٹتے کافی وقت لگ گیا، پھر شام میں ویسے میں بھی جانا تھا۔ یوں سارا دن مصروف لڑ گیا۔ اور رات میں بھی کافی دیر سے فراغت ملی، اس طرح وہ اگلے دن بھی آفس جانے سے روک گئی۔  
 گوکہ اسفندیار نے کہا تھا کہ وہ جتنے دن چاہے چھٹی کر لے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ بالکل ہی پروا ہو جاتی۔ وہ اپنے کام کو اچھی طرح سمجھتی تھی، اس لیے اگلے دن گوکہ کلثوم اور صنفید کو آنا تھا، اس نے باوجود وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

اور آفس میں داخل ہوتے ہی پہلا خیال اسے یہ آیا کہ جس کمپنی میں وہ ملازم ہے، اس میں شہر و زاحر کی جتنے دار ہیں، یہ خیال نہ خوش کن تھا، نہ مایوس کن، پھر بھی پتا نہیں کیوں اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔

انہیں مطمئن ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ انہوں نے خود کہا تھا کہ وہ انہیں معاف کر دے تاکہ وہ اس کو بچھ سے آزاد ہو سکیں اور دل کی غلطی سے نجات حاصل کر کے مطمئن ہو جائیں۔ لیکن طمانیت تو دور کی بات غلطی مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کا بھینگا بھینکا لہجہ دل کو کوئی بے کلی بخش گیا تھا۔

انہیں لگتا اس کے وہ سارے آسوجہ ہیں وہ تمام راستہ بلکوں کے اندر روکتی رہی تھی، ان کے دل پر رے ہوں۔ شاید ان کا خیال تھا، ان کے اعتراف پر، وہ سارا الزام ان کے سر رکھتے ہوئے پڑے گی، گڑھے کی اور دلوں پہ چھائی ہوئی ساری کورتیں، آپ ہی آپ دھل جائیں گی۔ تب وہ شکوہ کرے گی۔ یہ اعتراف اس وقت کیوں نہ کیا، جب میں آپ کے پاس تھی؟ اور اس ایک شکوے سے سالے ملے بل میں سوٹ جائیں گے۔ لیکن کوئی شکوہ، کوئی شکایت نہیں، اس کے برعکس وہ ان کی جھولی میں، انی ڈال کر خوش آئند زندگی کی ضمانت بھی دے گئی کہ نہ حساب ملے گی، نہ الزام رکھے گی۔

ان دنوں وہ مسلسل اسے سوچ رہے تھے اور ان کے اندر عجیب سی بے چینی ویسے قرار ی بھر گئی تھی۔ رہا ہر بل کھوتی ہوئی۔ بات ہونٹوں پر آ کر رہ جاتی۔ کبھی بیٹھے بیٹھے کھوجاتے اور کبھی کھوٹے کھوٹے بلک جاتے۔

صوفیہ ایسی باتیں بہت جلدی نوٹ کر لیا کرتی تھی لیکن ان دنوں وہ کثرت کی شادی کے سلسلے میں اپنی تیاریوں میں مگنی ہوئی تھی، اس لیے ان کی طرف متوجہ نہ ہو سکی، لیکن اُمی سے ان کی بے قراری کچھ نہ رہ سکی۔ پہلے کچھ دن تک تو وہ دیکھتی رہیں، پھر ایک دن نکلا کر کہنے لگیں۔  
 ”ایسے کب تک رہو گے؟ میرا خیال ہے، اب تمہیں شادی کر لینے چاہیے۔“  
 وہ یوں دیکھنے لگی جیسے انہوں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔  
 ”اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟ میں نے کوئی انہونی بات نہیں کی۔ مرد تو ایک کی موجودگی میں دوسری کر لیتے ہیں۔ اور کم۔“  
 ”بس کریں اُمی۔“ وہ ٹوک گئی۔ ”میں نے ابھی اس بارے میں نہیں سوچا۔“  
 ”تو کب سوچو گے؟“  
 ”پتا نہیں۔“ وہ دامن بچانے لگی۔

”یہ غلط بات ہے۔“ اُمی تنبیہ کرنے لگیں۔ ”مہروز کو دیکھو، تم سے چھوٹا ہے، ماشاء اللہ گھر بار والا ہو کر خوش و خرم اور مطمئن نظر آتا ہے۔ اور تم اکیلے پھرتے ہو۔ مجھے دیکھ رہے ہو، بوڑھی ہو کر کسی کام کی نہیں رہی اور صوفیہ کب تک تمہارا خیال رکھے گی۔ ایک دو بچے اور ہو گئے تو وہ بے چاری خود اتنی مصروف ہو جائے گی۔“  
 ”اس کی کیا گارنٹی ہے کہ آنے والی میرا یا میری ضروریات کا خیال رکھے گی۔“

”پہلے تو تم نے ایسی کوئی گارنٹی نہیں مانگی تھی۔“ اُمی کا لہجہ جیتھتا ہوا سنا تھا۔ کہ وہ اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گئی۔  
 ”بہر حال۔“ اُمی نے حتمی لہجہ اختیار کیا۔ ”تم نہ سوچو، لیکن میں سوچ چکی ہوں۔“  
 ”کیا۔“ کیا سوچ چکی ہیں آپ؟“ وہ گھبرا کر بولے۔  
 ”تمہاری شادی کا، اور اس سلسلے میں اگر تمہاری کوئی پسند ہو تو تیار دو ورنہ میں خود لڑکی تلاش کرتی ہوں۔“  
 ”ابھی نہیں اُمی۔“ وہ کسی جھوٹے سے بچے کی طرح منت سے بولے۔  
 ”پھر کب؟“ اُمی نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔  
 ”بس کچھ وقت دیں۔ میں سوچ کر بتاؤں گا۔“  
 ”اچھی بات ہے۔ لیکن یاد رکھنا، تم نے کچھ وقت کہا ہے اور میں زیادہ وقت انتظار نہیں کروں گی۔“  
 وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ان کے پاس سے اٹھ آئے تھے۔

اور اب تک تو واقعی انہوں نے اپنے بارے میں اور خاص طور سے اس سبب پر نہیں سوچا تھا۔ اب اُمی کے احساس دلانے بلکہ مجبور کرنے پر انہیں سوچنا پڑا۔ اس وقت بھی وہ ان ہی سوچوں میں گتھے بیٹھے بیٹھے تھے گئے تو وہیں صوفیہ پر نیم دراز ہو کر انگلیں سامنے ٹیبل پر سیدھی کر لیں۔  
 سٹریٹ کا گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھڑا تھا، بکری سی (اس دھند کے اس پار لگا جیسے ڈریسنگ روم سے نکل کر وہ آرہی ہو۔ اپنے مخصوص انداز میں انہیں دیکھ کر جیسے پہلے قدم پر گھٹکتی تھی اور لائق کا نظارہ کرتی ہوئی، ابھی چپ چاپ کمرے سے نکل جاتی اور کبھی بیڑی کے شکن چادر کو خواہ مخواہ خشک کرتی ہوئی یہ بتانے کی کوشش کرتی کہ ”میں سونا چاہتی ہوں، آپ جائیں یہاں سے۔“  
 دھوئیں کے مرغولے ادھر ادھر راستہ بناتے ہوئے نکل گئے تو سامنے منظر صاف تھا۔ انہوں نے ایک اور گہرا کش لے کر فضا کو دھندلا دیا تو وہ پھر اس پاس نظر آنے لگی۔ کبھی مہربان ہوئی تو کبھی پریس کرتی ہوئی۔ ادھر ان کے ہونٹوں سے بات نکلی، ادھر چائے کا کپ لے کر حاضر۔ اور کبھی خفا ہو کر اجنبی اجنبی سی جیسے پہچانتی ہی نہ ہو۔

کبھی ہریل آنکھیں نہ کر ساون کا گان ہوتا، اب برسا کہ تپ۔  
 کبھی ہونٹوں پر کھٹکھٹاتی ہنسی کہ اطراف کلیاں چٹکنے لگتیں۔ کتنے روپ سامنے آتے رہے اور بٹتے

ہے۔ وہ شاید راسی دنیا میں لگن رہنا چاہتے تھے کہ ایک کے بعد ایک سگریٹ سلگاتے گئے۔ یہاں تک کہ بکری میں ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا اور اس دھندلی فضا میں وہ دھڑلے سے جلوہ افروز تھی۔  
 ”شہر و بھائی۔“ صوفیہ نے کمرے کا دروازہ ذرا سا کھول کر اندر جھانکتے ہوئے پکارا۔ اور پھر ہر طرف دھواں ہی دھواں دیکھ کر پریشان ہو کر پورا دروازہ کھول کر اندر آتی ہوئی بولی۔  
 ”میرے خدا۔“ یہ اتنا دھواں کہاں سے آگیا؟“ ان پر نظر پڑی تو ٹھٹھک گئی۔ وہ دیکھ تو دل سے کہ ماں سے آٹھٹا ہے، کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑکیوں پر سے پردے ہٹا دیے۔  
 چہرے کے سامنے بیٹھتی ہوئی بولی۔

”کیا ہوا ہے آپ کو؟“ اور یہ اتنی سگریٹ؟“  
 ”ہاں۔“ وہ چونکے پھر طویل سانس لے کر صوفیہ کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے صاف گوئی سے بولے۔  
 ”ابھی مجھے اپنے آس پاس ربیعہ کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔“  
 ”کیا؟“ صوفیہ غصہ حیرت کی تصویر بن گئی۔ ”آپ پھر سے آسے سوچ رہے ہیں؟“  
 ”پھر سے؟“ وہ خود کلامی کے انداز میں بولے۔ ”میں ہمیشہ اسے سوچتا رہا۔ اس تمام عرصے میں کبھی یادہ دن تک اس کے خیال سے دور نہیں رہ سکا۔“  
 ”کیوں؟“ صوفیہ سنبھل کر بیٹھی تو قدرے ناگواری سے بولی۔  
 ”میں خود نہیں جانتا۔ یا شاید جانتا ہوں۔ ایک لڑکی اپنی ذات اور اپنے وجود کی تمام تر خوبصورتیوں سمیت دو سال تک اس گھر میں اس کمرے میں میرے آس پاس رہی، اُسے بھلا دینا آسان ہے کیا؟۔  
 رکو شش کرتا تب بھی اور میرا خیال ہے میں نے ایسی کوئی کوشش کی ہی نہیں۔“ وہ پوری ایمانداری سے اعتراف کر رہے تھے۔

”یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے شہر و بھائی اور اب جب کہ اُمی آپ کی شادی کا سوچ رہی ہیں تو۔“  
 ”اسی لیے تو۔“ وہ اُس کی بات کاٹ کر کہنے لگے۔ ”وہ اور شدت سے یاد آنے لگی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ مجھ سے پوچھ رہی ہو، کیا کوئی اور میری جگہ لے سکتا ہے؟“  
 ”آپ کا جواب کیا ہوتا ہے؟“  
 ”نہیں، اُس کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔“ کچھ دیر تک کہنے لگے۔  
 ”اور اس روز کی ملاقات کے بعد تو میں بالکل ہی ہار گیا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ کیا آپ کی ربیعہ سے ملاقات ہوئی ہے۔؟“ صوفیہ چونک کر پوچھنے لگی۔ اور وہ اُس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔  
 ”اپنے آپ کو بے حد مضبوط پوز کرنے کی کوشش میں وہ کچی کچی ہو رہی تھی۔ آنکھیں خشک صحراؤں نے ایک بوند سے بھی انہیں سیراب نہیں کیا۔ کم از کم میرے سامنے۔ بہر حال جس ضبط کا مظاہرہ اُس نے کیا، اس سے مجھے خوشی ہوئی کہ وہ پہلے والی بزدلی لڑکی نہیں رہی۔ ابھی حالات سے لڑ رہی ہے، مرنے اپنے حق کے لیے لڑ سکتی ہے۔ اور یہ اچھی بات ہے۔ میں اُسے ایسا ہی مضبوط بنانا چاہتا تھا۔ اور باندھنے نہیں تو کسی نے تو باندھا ہی دیا۔“  
 ”حالات نے۔“ صوفیہ فوراً بولی۔

”ہاں، غالباً اس میں حالات کا بڑا دخل ہے۔ بہر حال اس سے پہلے ہم کوئی اور بات کر رہے تھے۔“  
 وہ کچھ دیر تک سوچتے رہے، پھر کہنے لگے۔  
 ”میں آپ کو بتا رہا تھا کہ اس تمام عرصے میں میں ربیعہ کو سوچتا رہا ہوں اور میری سوچیں ان ہی ماہِ سال بگڑتی رہی ہیں۔ جو ربیعہ نے اس گھر میں گزارے۔ اس سے ہٹ کر کبھی کوئی خیال نہیں آیا لیکن اب سے اُمی نے شادی کے لیے اصرار کرنا شروع کیا ہے، تب سے میں اس کے لیے نئے انداز یا نئے

”کچھ کیسے جان گئے؟“

”بس جان لیا۔ آپ یہ بتائیں، آپ اُس سے کب بات کریں گی؟“

”جب جاؤں گی، بات کروں گی۔ اس سے پہلے اگر آپ مزید سوچ لیں تو زیادہ بہتر ہے۔ ایسا نہ بعد میں۔“

”مجھے جو سوچنا تھا، سوچ لیا۔ وہ اُس کی بات کاٹ کر فیصلہ کن انداز میں بولے تو وہ خاموش ہوئی اٹھنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ وہ پوچھنے لگے۔“

”مکثوم کی شادی ٹھیک ٹھاک ہو گئی؟“

”ہاں۔ اللہ کا شکر ہے۔“

”خوش ہے۔؟“

”وہ اثبات میں سر ہلاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی، پھر جاتے جاتے بولی۔“

”اگر آپ نے سگریٹ لی تو میں آپ کی بات ربیعہ سے نہیں کروں گی۔“

”دھکی؟“ وہ سیدھے ہو بیٹھے۔

”بالکل۔“

”اچھی بات ہے۔ ویسے اب مجھے سگریٹ کی ضرورت رہی بھی نہیں۔ شفاف فضا میں بھی بہت نظر آ رہا ہے۔“

”پتا نہیں کیا کہہ رہے تھے وہ۔ صوفیہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کندھے اچکائے اور انہیں شب بخیر کر کے سے نکل گئی۔“

اُس نے جب سوچ لیا تھا بلکہ تہیہ کر لیا تھا کہ ثاقب حسن کے گھر ضرور جائے گی تو اماں کے بھانے کے باوجود وہ اپنا ارادہ ترک نہیں کر سکی اور اس کے گھر جانے کا تو موقع نہیں ملا۔ لیکن روز اپنے آفس سے نکلی تو سیدھی ثاقب حسن کے آفس پہنچ گئی۔ اُس کی کرسی پر اُس کا بھائی ب برامان تھا۔ اُس کے انداز ظاہر کر رہے تھے کہ وہ اس بزنس کے مالکانہ حقوق حاصل کر کے، پوزیشن اچھی خاصی مضبوط کر چکا ہے۔ اُس کے باوجود اچانک اسے سامنے دیکھ کر کچھ بھر کو گھبرا یا۔ ریٹین فوراً سنبھل گیا۔

”اوسے بھائی۔ آپ؟“ خیریت تو ہے؟ یہاں کیسے آنا ہوا؟“ یقیناً اُس نے آفس کا خیال کر کے کو خوشگوار بنایا تھا۔ ورنہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر اسی طرح گھر میں سامنا ہو جائے تو وہ شاید ت بھی کرنا پسند نہ کرتا۔ بہر حال وہ بھی اب پہلے والی ربیعہ نہیں تھی۔ بے حد مطمئن انداز میں لا پرواہی نظر اہر کرتی ہوئی بولی۔

”بہت دنوں سے آنے کا سوچ رہی تھی لیکن ہر بار مصروفیت آڑے آتی رہی۔ آج اتفاق سے یہاں گزر ہوا تو سوچا۔“ وہ خاموش ہو گئی لیکن دل میں اپنی بات مکمل ضرور کی۔ ”کچھ حساب کتاب ہی جاؤں۔“

”آپ بیٹھیے ناں۔ کیا منگواؤں آپ کے لیے۔؟“

”پائے۔ ساتھ کچھ کھانے کو بھی مل جائے تو۔“ وہ کرسی کیچر کر بیٹھتی ہوئی قدرے بے تکلفی بولی تو وہ انٹر کام پر چائے کے لیے کہنے لگا، پھر اُس کی طرف متوجہ ہوا تو مسکرا کر پوچھنے لگا۔

”اور سب ٹھیک ٹھاک؟“

”اللہ کا شکر ہے، سب ٹھیک ٹھاک ہے۔“ پھر آفس کا جائزہ لیتی ہوئی بولی ”تم نے ثاقب حسن بزنس کو خاصی ترقی دے دی ہے۔“ ایک طرح سے باور کرا دیا کہ یہ سب تمہاری جاکیر نہیں ہے۔

”ہاں بس۔“ وہ اسی قدر کہہ سکا، پھر فوراً اُس کی طرف آتا ہوا بولا۔

”سب سے سوچنے لگا ہوں۔ ایسا ممکن تو ہے ناں۔؟“

”انہوں نے براہ راست صوفیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو فوری طور پر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اثبات میں سر ہلا سکی، نہ نفی میں۔ بس پتہ چلا کہ اُن کی طرف دیکھ گئی۔“

”آپ کیا سوچنے لگیں؟“ کتنی ہی دیر بعد شہر و ز احمد نے صوفیہ کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تو وہ چونکی نہیں، بس اُن پر سے نظریں ہٹا کر میز کی سطح پر آئی تو چھی کیسے پکھینے لگی۔

”کیا بات ہے، آپ اس طرح چپ کیوں ہو گئیں؟“ میں نے کوئی غلط بات کہہ دی کیا یا کوئی انہونی ہے؟“ شہر و ز احمد کی سمجھ میں اُس کی خاموشی نہیں آرہی تھی۔

”پتا نہیں، آپ کی بات غلط ہے یا انہونی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“ صوفیہ الجھ کر بولی۔

”اس میں سمجھ میں نہ آنے والی کون سی بات ہے۔ اگر صاف لفظوں میں سننا چاہتی ہیں تو میں کہوں گا، اتنی ایک اور بولا نا چاہتی ہیں۔ تو کسی اور کے بجائے اُسے ہی آئیں جو پہلے بھی یہاں رہ چکی ہے“

آخر میں وہ ذرا سا مسکرائے لیکن صوفیہ اسی سنجیدگی سے بولی۔

”آپ اسے آسان سمجھ رہے ہیں؟“

”کیوں اس میں مشکل کیا ہے؟“ پھر خود ہی سمجھ کر بولے ”شاید آپ ربیعہ کی وجہ سے کہہ رہی ہیں؟“

”ہاں۔ اور پتا نہیں اتنی بھی اس بات کو پسند کریں گی یا نہیں؟“

”اس میں نا پسندیدگی کا کیا سوال؟“ میں سمجھتا ہوں اتنی نے کبھی بھی ربیعہ کو نا پسند نہیں کیا بلکہ اس کی وجہ سے مجھ سے خفا میں۔“

”یہ اس وقت کی بات ہے جب ربیعہ یہاں تھی اور اب حالات مختلف ہیں۔“

”انہوں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ بول پڑی۔“

”اور میں آپ سے بھی یہی کہوں گی شہر و ز بھائی کہ پہلے موجودہ حالات کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کیجیے گا۔“

”میں اس روز سے سوچ رہا ہوں، جس روز اُس سے سامنا ہوا تھا۔ انہوں نے پھر صوفیہ کی پشت سے سرٹکا یا اور نظریں سامنے دیوار پر یوں جمادیں جیسے اُس روز کی فلم چلنے لگی ہو۔“

”کب ہوا تھا اُس سے سامنا؟“ ہاسٹیل میں؟“ صوفیہ یاد کرتی ہوئی پوچھنے لگی۔

”نہیں اس کے بعد۔“ پھر انہوں نے تفصیل سے بتایا کہ اسفند یار کی طرف سے دیے گئے ڈنر میں اُس سے ملاقات ہوئی تھی اور وہ اسے گھر بھی چھوڑنے گئے تھے۔ صوفیہ ساری تفصیل سننے کے بعد حیرت سے بولی۔

”کمال ہے ربیعہ نے مجھ سے ذکر نہیں کیا۔“

”ہو سکتا ہے اُس کے نزدیک یہ کوئی ایسی اہم بات نہ ہو۔ بہر حال آپ اس سے پوچھ لیں کہ وہ کیا چاہتی ہے؟“

”میرا خیال ہے، پہلے آپ اتنی سے بات کر لیں۔“ صوفیہ نے مشورہ دیا۔

”نہیں، اتنی سے بعد میں بات کروں گا کیونکہ مجھے یقین ہے اتنی میری خواہش کو نہیں کریں گی۔“

”اور ربیعہ۔“ اس تمام عرصے میں پہلی بار صوفیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی، کچھ شرمیلے، کچھ معنی خیز سی۔

”اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ وہ بھی کھل کر مسکرائے۔ ”کچھ روٹھی روٹھی سی ہے اور کیونکہ خوابوں کی دنیا سے نکل کر حقیقت میں زندہ رہنے کے ڈھنگ سیکھ گئی ہے، اس لیے اسے منانے میں کچھ وقت ضرور لگے گا۔“

”ارے۔“ صوفیہ نے شوخ حیرت کا مظاہرہ کیا۔ ”اتنی دیر کی ملاقات میں آپ اُس کے بارے میں

”آپ کیا کر رہی ہیں؟“

”جواب۔“ پھر وضاحت ضروری سمجھی۔ مصروف رہنے کی خاطر جواب کر رہی ہوں۔ ورنہ مجھے ضرورت تو نہیں تھی کیونکہ ثاقب حسن نے میرے لیے اتنا تو ضرور چھوڑا ہوگا جس سے میں اپنا مستقبل محفوظ کر سکوں۔“

وہ کوئی جواب سوچ رہی رہا تھا کہ ملازم چائے کے ساتھ دیگر لوازمات لیے آگیا۔ اُس نے ٹرے اس کے سامنے رکھوا کر ملازم کو جانے کا اشارہ کیا۔ پھر اُس سے کہنے لگا۔

”آپ کسی دن گھر آئیں ناں۔“

”میں ضرور آتی لیکن پتا نہیں کیوں وہاں جانے کا سوچ کر مجھے وحشت ہونے لگتی ہے۔ شاید ثاقب حسن کے بغیر اس گھر کا تصور مجھے خوفزدہ کرتا ہے یا پھر تمہاری اماں کا سلوک۔“ وہ بڑی خوبصورتی سے انہر کا گھیراؤ کر رہی تھی ”حالانکہ لوگوں نے مجھے بہت سمجھایا کہ تمہارے شوہر کا گھر ہے، تم اس کی بہت ساری چیزوں میں حصے دار ہو لیکن میرا دل نہیں مانا۔ گو کہ میں جانتی ہوں، اب تمہاری اماں کا میرے ساتھ وہ رویہ نہیں ہوگا، ثاقب حسن کے غم نے انہیں بہت بدل دیا ہوگا۔ پھر بھی۔“ وہ خاموش ہو کر سر جھکا گئی۔

”چائے لیجیے۔“ عاقب کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو کپ اٹھا کر اُس کی طرف بڑھا دیا جسے اُس کے ہاتھ سے لے کر وہ گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔

”یہ سمو سے لیں ناں۔“

”نہیں بس۔“

”ارے۔ ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں، کھانے کو بھی کچھ چاہیے۔“

”ہاں۔ لیکن اب خواہش نہیں رہی۔“ اُس نے بقیہ چائے ایک ہی گھونٹ میں ختم کی پھر دوسرا کپ بنانے لگی۔ اسی وقت ملازم آکر کہنے لگا۔

”سر، اسد صاحب آئے ہیں۔“

”کون اسد صاحب؟“ عاقب پر سوچ انداز میں پوچھنے لگا۔

”سر، وہی انشورنس والے۔“

اور انشورنس پر اسے یاد آیا کہ ایک بار ثاقب حسن نے بھی سرسری انداز میں اس سے ذکر کیا تھا فوراً ملازم کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

”انہیں یہیں بھیج دو۔“

پھر کپ میں پیچھ جلاتی ہوئی خود کلامی کے انداز میں بولی۔ ”اچھا اتفاق ہے۔ میں اسد صاحب ثاقب کی پالیسی کے بارے میں معلوم کر لوں گی۔“

”آپ ایسی کوئی بات نہیں کریں گی۔“ عاقب کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ اور وہ سادگی سے بولی۔

”کیوں؟“

”بس میں کہہ رہا ہوں۔“

”اچھا۔“ وہ ہنسی اور دروازے سے داخل ہوتے اسد صاحب کو دیکھنے لگی۔ پھر صبیحہ ہی وہ کہنے لگی۔

”اچھا ہوا۔ آپ سے یہیں ملاقات ہو گئی ورنہ مجھے آپ کے آفس آنا پڑتا۔“

”آپ کون ہیں خاتون؟“ اسد صاحب پچھاننے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔

”میں ربیعہ ہوں۔ سر ربیعہ ثاقب حسن۔“

”آپ بگم ثاقب حسن؟“ انہوں نے غالباً تصدیق کے لیے عاقب کی طرف دیکھا اور وہ اپنی جگہ ہلچل کر رہ گیا، تب وہ اسے مخاطب کر کے کہنے لگے۔

”میں آپ ہی کے بارے میں معلوم کرنے آیا تھا۔ عاقب نے بتایا تھا کہ آپ ملک سے باہر گئی ہوئی ہیں۔“

”ہا۔ آں۔“ وہ ہاں کو لمبا کھینچتی ہوئی عاقب کی طرف دیکھنے لگی۔

”کب آئیں آپ؟“ اسد صاحب پوچھنے لگے۔

”کچھ دن ہوئے۔ غالباً ہفتہ، ڈیڑھ ہفتہ۔“

”اچھا۔“ اسد صاحب متعجب ہوئے۔ ”ابھی دو روز پہلے میں نے فون کیا تھا، عاقب صاحب نے آپ کی ی کا نہیں بتایا۔“

”میں نے منع کیا تھا۔“ وہ فوراً بولی۔ ”یہ صورتحال جہاں اسے بہت کچھ سمجھا رہی تھی، وہاں وہ دل ہی دل میں محفوظ بھی ہو رہی تھی۔ پھر بھی بظاہر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولی۔

اصل میں میں ابھی کسی سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے میں نے عاقب کو خاص طور سے ہدایت کی بس کو میری واپسی کا نہ بتائے۔ بہر حال آپ بتائیے، مجھ سے کیا کام ہے؟“

وہی انشورنس پالیسی۔“ اسد صاحب بریف کیس کھولتے ہوئے بولے۔

”کیا آپ میرا انشورنس کرنا چاہتے ہیں؟“

اس کے لیے میں آپ کو بعد میں کنوینینس کروں گا۔“ پھر کچھ کاغذات اسے دکھاتے ہوئے کہنے لگے۔ وقت تو میں آپ کو آپ کے مروجہ شوہر کی پالیسی کے بارے میں بتانے آیا ہوں، جو انہوں نے۔“

ایک منٹ۔“ اُس نے روک دیا۔ پھر گھڑی دیکھتی ہوئی بولی۔ ”معاف کیجیے گا، اس وقت تو میں جلدی وں۔ آپ کل کا ٹائم دے دیں، میں خود آپ کے آفس آ جاؤں گی۔“

”جیسے آپ مناسب سمجھیں۔“

”چائے وغیرہ۔“

”نہیں شکریہ۔“ وہ عاقب سے مصافحہ کر کے چلے گئے، تب وہ بھی اُٹھنے کا ارادہ کرتے ہوئے بولی۔ میرا خیال ہے میں بھی چلوں۔ بلکہ اگر تم بھی اُٹھنے کا ارادہ کر رہے ہو تو چلوں تمہارے ساتھ چلتی۔“

وہ کچھ کہے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا تو وہ بھی چپ چاپ اُس کے پیچھے نکل آئی۔ اُس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی چھنے لگی۔

”کیا تم بتا سکتے ہو، ثاقب نے کتنے کی پالیسی کی تھی؟“

”ہاں۔“ وہ پھٹ پڑا۔ ”لیکن تم سن لو کہ اس ساری رقم پر صرف تمہارا حق نہیں ہے۔“

حق کی بات مت کرو عاقب حسن! ورنہ میں اور بہت سارے حقوق کا دعو کرنے لگوں گی۔“

”کیا؟“ وہ چیخا۔

”ہاں۔ میں جانتی ہوں ثاقب حسن نے میرے نام سے شیئر خریدا ہے تمہیں اس کے علاوہ۔“

”باس۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک گیا۔ ”اول تو تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے، نہ مجال تم کہیں سے ثبوت حاصل کر بھی لو تو اب کوئی فائدہ نہیں کیونکہ میں نے تمام شیئر زفر وقت کر لیے۔“

”یہی اجازت کے بغیر؟“ اُس نے حیرت کا مظاہرہ کیا گو کہ وہ بالکل حیران نہیں تھی کیونکہ جس طرح اُس نے نکال کر دوبارہ کوئی پوچھنے بھی نہیں آیا تھا، اس سے وہ بہت پہلے ہی ان کی نیت جان گئی تھی۔

”تم کون ہوتی ہو اجازت دینے یا نہ دینے والی؟“ وہ انتہائی بدتمیزی سے بات کرنے لگا۔

”میں ثاقب حسن کی بیوی ہوں۔ کیا ثبوت کے طور پر مجھے نکاح نامہ پیش کرنا پڑے گا؟“ آخر میں وہ سے بولی۔

”تم ثاقب حسن کی بیوی تھیں۔ اب نہیں ہو۔ اور سن لو، ہمارے تم سے سارے نالتے، سارے تعلق

اُس کے دم سے نچے، وہ نہیں رہا تو سب ختم ہو گیا۔ ہم تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے۔  
 ”اچھی بات ہے، پھر تم مجھے ہمیں اتار دو۔“ وہ بہت پرسکون رہ کر بات کر رہی تھی۔ میں نہیں اپنا  
 دیور سمجھ کر تھارے ساتھ بیٹھی تھی لیکن اب جب تم اس رشتے سے انکار کر رہے ہو تو میں مزید تمہارے  
 ساتھ نہیں چل سکتی۔“

اُس نے ایک بھٹکے سے گاڑی روکی اور خشکین نظروں سے گھورتا ہوا بولا۔

”سنو۔ تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ تم ثاقب حسن کی بیوہ پالیسی کو بھول جاؤ ورنہ۔“

”ورنہ؟“ وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی چیخ کر گئی۔ ”جو کر سکتے ہو کر لینا عاقب حسن! لیکن کوئی  
 بھی قدم اٹھانے سے پہلے اتنا ضرور سوچ لینا کہ ربیعہ ثاقب حسن گھنی نکالنے کے لیے انگلیاں میڑھی کرنا کیسے  
 گئی ہے۔“

”دیکھ لوں گا تمہیں۔“ اُس کا بس نہیں چل رہا تھا، بس اُس کی گردن دبا کر قصبہ ہی ختم کر دے اور وہ اُس  
 کی حالت پر ہنستی ہوئی دروازہ کھول کر اتر گئی۔ پھر قریب سے گزرتے رکشے کو روک کر اس میں بیٹھ گئی۔

گھر آئی تو صوفیہ اور مہروز آئے ہوئے تھے۔ اور وہ جوا بھی تک عاقب کے جھنجھٹلانے اور اس کی  
 بے بسی پر غفلت ہو رہی تھی، بیٹھتے ہوئے بولی۔

”توبہ کیسے کیسے لوگ ہیں اس دنیا میں؟ خدا کا خوف ہی نہیں ہے۔ بس پیسے کو ہی دین ایساں

سمجھ لیا ہے۔“  
 ”خیریت، تمہارا ایسے لوگوں سے کیسے واسطہ پڑ گیا؟“ صوفیہ تجسس سے پوچھنے لگی۔

”واسطہ تو پہلے سے تھا لیکن اُن کی اصلیت اب سامنے آئی ہے۔“

”کون ہیں؟“

”ثاقب حسن کے گھر والے۔“ پھر شوزا تارک آرام سے بیٹھتی ہوئی بتانے لگی۔ ”میں آج ثاقب حسن  
 کے آفس چلی گئی تھی۔ جہاں عاقب سے ملاقات ہوئی۔ پہلے تو اچھے طریقے سے ملا لیکن جب یہ معلوم ہوا  
 کہ میں اپنا حق چھوڑوں گی نہیں تو میں بتا نہیں سکتی چھوٹی آپا کہ اُس نے کیسا رنگ بدلا۔ اُس کا بس نہیں چل  
 رہا تھا کہ مجھے گولی سے اڑا دیتا۔“

”اور میں آپ کو بتاؤں۔ انہوں نے محض پیسے کی رقم حاصل کرنے کی خاطر انشورنس والوں کو یہ کہہ کر  
 تھا کہ میں ملک سے باہر گئی ہوں۔ وہ تو آج اتفاق سے اسد صاحب سے ملاقات ہو گئی ورنہ میں یقیناً  
 کہہ سکتی ہوں کہ کچھ عرصے بعد وہ لوگ میری موت کی خبر اڑا کر وہ رقم بھی حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ میرے  
 شیئرز تو فروخت کر ہی چکے ہیں۔“

”کتنے کے تھے؟“ صوفیہ نے پوچھا تو وہ کندھے اچکا کر بولی۔

”مجھے نہیں معلوم۔ اور مجھے تو انشورنس کی رقم کا بھی پتا نہیں ہے کہ ثاقب حسن نے کتنے کی پالیسی  
 تھی۔ یہ توکل اسد صاحب کے آفس جاؤں گی، تب معلوم ہو گا۔“

”کیا ضرورت ہے تمہیں ان سب جھنجھٹوں میں پڑنے کی؟“ اماں نے پھر ٹوکا۔ ”ایسا نہ ہو وہ لوگ  
 تمہارے دشمن بن جائیں۔“

”دوست کب تھے؟“ وہ مٹنی سے بولی۔ اور اماں آپ خواجہ خانہ کے اندیشوں میں مت گھریں۔ آپ  
 میرے بارے میں کیوں نہیں سوچتیں کہ آخر مجھے بھی زندگی گزارنی ہے اور میں اس طرح ساری زندگی  
 نوکری تو نہیں کر سکتی۔ اگر میرے شوہر نے میرے لیے کچھ چھوڑا ہے تو اسی لیے ناں کہ اڑے وقت  
 میرے کام آئے۔ اس لیے تو نہیں کہ میں اُسے بڑے آرام سے دوسروں کے حوالے کر کے خود ہی اس

رہ جاؤں؟ کیوں مہروز بھائی، میں غلط کہہ رہی ہوں کیا؟“

آخر میں اُس نے مہروز کو مخاطب کیا تو وہ جو حیران سا ہو کر اُسے دیکھ رہا تھا، سنبھل کر سیدھا ہو بیٹھا  
 ”آخر میں اُس نے مہروز کو مخاطب کیا تو وہ جو حیران سا ہو کر اُسے دیکھ رہا تھا، سنبھل کر سیدھا ہو بیٹھا“

کی تائید کرتا ہوا بولا۔

”بالکل نہیں۔ آپ غلط نہیں کہہ رہیں بلکہ آپ کو تو بہت پہلے اپنے حق کے لیے لڑنا چاہیے تھا۔“  
 ”یہی بات آپ اماں کو سمجھائیں، میری بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔“ وہ مہروز کو اشارہ کر کے وہاں  
 اٹھ گئی۔

”کچن میں آئی تو ہاشمی کباب بناتے ہوئے خاصی جھنجھلا رہی تھی۔ وہ چھوٹے موٹے کام تو خوشی سے  
 یا کرتی تھی لیکن جہاں کوئی محنت کا کام ہوا، اُس کی شکل پر مسلسل بیناری چھائی رہتی تھی۔“

”لاؤ میں بنا دوں۔“ اُس نے جیسے ہی اپنی خدمات پیش کیں، ہما خوش ہو گئی۔ لیکن پھر خیال آیا تو کہنے

”آپ پہلے ہی تھکی ہوئی آئی ہیں۔“

”نہیں، ساری تھکن بس کی وجہ سے ہوتی ہے اور میں آج رکشے سے آئی ہوں۔“

”بڑے عیش ہیں۔“

”ابھی کہاں؟ عیش کے دن تو اب آئیں گے۔“



”کیا مطلب؟“ ہما ایک دم چونک کر پوچھنے لگی۔

”کوئی مطلب نہیں۔ چلو مجھ کو یہاں سے۔“ وہ اُسے کچن سے نکال کر خود اُس کی جگہ بیٹھ گئی۔ سارا کام  
 رہی گئی تھی، اب تو بس ٹٹکیاں بنا کر تلنا باقی تھیں۔ وہ جلدی جلدی ٹٹکیاں بنا کر بڑے میں رکھنے لگی پھر  
 سے فارغ ہو کر ایک چولہے پر کڑا ہی میں گھی گرم کرنے کے لیے رکھا اور دوسرے چولہے پر توار کھ

ڑا ہی کے نیچے اُس نے آج دھیمی کر دی تاکہ سہولت سے دونوں کام ایک ساتھ کر سکے۔ اور ابھی  
 نے پہلی روٹی ڈالی ہی تھی کہ صوفیہ اسے ڈھونڈتی ہوئی آگئی۔

”ارے، تم آتے ہی کام میں بھی لگ گئیں؟“

”زیادہ کام نہیں ہے، بس تھوڑی سی روٹیاں ڈالنی ہیں۔ باقی سب تو ہمارا ہی چکی ہے۔“ اُس نے  
 پلٹتے ہوئے کہا۔ پھر کڑا ہی میں کباب ڈالنے لگی۔

”لاؤ، کباب میں تیل دوں۔“ صوفیہ آگے بڑھ آئی۔

”اے نہیں چھوٹی آپا۔ میں کر لوں گی۔“ اُس نے روکنا چاہا۔ آپ بیٹھیں اندر جا کر۔ بس میں ابھی  
 لگاتی ہوں۔“

”اس طرح جلدی ہو جائے گا اور پھر میں تم سے باتیں بھی کرنا چاہ رہی ہوں۔“

”اچھا۔“ وہ یونہی ہنسی اور صوفیہ کے لیے جگہ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

پھر کچھ دیر کام میں مگن رہنے کے بعد صوفیہ اس سے کہنے لگی۔

”سنو۔ ابھی تم کہہ رہی تھیں کہ تمہیں زندگی گزارنی ہے اور تم ساری عمر تو نوکری نہیں کر سکتیں۔“

”کچھ غلط کہا میں نے؟“ وہ سادگی سے پوچھنے لگی۔

”نہیں غلط تو نہیں کہا لیکن تمہیں اپنے لیے دوسرے انداز سے بھی سوچنا چاہیے۔“

”دوسرے انداز سے؟“ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے صوفیہ کی طرف دیکھنے لگی۔

”ہاں، تمہیں سوچنا چاہیے کہ پہاڑی زندگی تمہیں نہیں گوارا سکتیں۔ خواہ کتنا پیسہ حاصل کر لو، اپنے  
 دل تعمیر کر لو پھر بھی سامنے کی ضرورت۔“

”چھوٹی آپا۔“ وہ درمیان میں بول پڑی۔ ”میں آپ کی بات جھٹلا نہیں سکتی لیکن کیا اب اس انداز

سوچنا مجھے زیب دیتا ہے؟“

”کیوں؟ کون سا تمہاری عمر بہت زیادہ ہو گئی ہے یا تمہارے بچے بڑے ہو گئے ہیں؟“



بات عمر کی نہیں ہے چھوٹی آپا۔ حالات کی ہے۔ اور حالات نے دوبار مجھ سے سائبانی چھینی ہے کہ اب ایک تو میرا دل ڈرتا ہے، دوسرے لوگ کیا کہیں گے کہ مجھے شادیاں کرنے کا شوق ہے۔ نہیں چھوٹی آپا، میں خواہ اپنے آپ کو کتنا ہی مضبوط کیوں نہ بنالوں۔ پھر بھی لوگوں کے مذاق کا نشانہ نہیں بن سکتی۔ وہ مسلسل نفی میں سر ہلاتی گئی۔

لوگوں کی بات مت کرو ربیعہ۔ لوگ صرف باتیں کرتے ہیں۔ پھر بھی نہیں۔ وہ بات ختم کرنے کی غرض سے بولی جب کہ صوفیہ کو اصل بات اب شروع کرنی تھی۔

یہ ناممکن نہیں ہے ربیعہ۔ تم لوگوں کی پروا مت کرو۔

چلیے میں لوگوں کی پروا نہیں کرتی۔ پھر اب کون ایسا جی دار ہے جو مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہوگا۔ اپنے تئیں اس نے صوفیہ کو جواب کر دیا تھا لیکن وہ بڑے آرام سے بولی۔

شہر و زاہد۔

کیا۔؟ وہ پتا نہیں حیران تھی، غیر یقین یا متاسف۔ جیسے صوفیہ نے اس کا مذاق اڑایا ہو۔

ہاں، میں شہر و زہد مچائی کی بات کر رہی ہوں۔ وہ خود۔

بس کریں چھوٹی آپا۔ وہ دبے دبے لہجے میں چیرچیر پڑی: اس سے آگے ایک لفظ مت کہیے گا۔ لیکن ربیعہ۔

بس چھوٹی آپا۔ بس، مجھے اس سے زیادہ ذلیل مت کریں۔ وہ بے پناہ دکھ کے احساس میں گھر کر بولی اور چولہا بند کر کے اندر چلی گئی۔

آفس میں لیغ ٹائم میں فرناز کے ساتھ بیچ کرتے ہوئے اس نے اسے کل ثاقب کے آفس جسٹس اور وہاں کی تمام تفصیل کہہ سنائی۔ آخر میں کہنے لگی۔

”آج اسد صاحب نے مجھے اپنے آفس بلایا ہے۔ میرا خیال ہے تمام کارروائی تو اس تمام عرصے میں عاقب مکمل کر ہی چکے ہیں۔ اب صرف رقم کا چیک وصول کرنا باقی ہے۔ اور میرا خیال ہے، اگر چیک وصول کرنا عاقب کے اختیار میں ہوتا تو وہ کب کا وصول کر چکا ہوتا۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔“ فرناز نے تاکید کرتے ہوئے کہا: اگر تم کچھ اور عرصہ ان کے سامنے نہ جائیں تو وہ یہ رقم بھی ہضم کر چکے ہوتے۔ بہر حال اب تم دیر مت کرو۔

”ہاں میں سوچ رہی ہوں، تین بجے تک چھٹی لے چکی جاؤں لیکن۔“ وہ پتا نہیں کیا سوچنے لگی۔

”لیکن کیا؟“ فرناز نے اس کا کندھا ہلایا۔

”لیکن یہ کہ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”کیوں؟“ میرا مطلب ہے کس سے؟“

”پتا نہیں۔“ پھر کچھ دیر بعد بولی: ”شاید عاقب کی طرف سے دھڑکا ہے۔ اصل میں کل اس کا ٹیپ سارڈپ دیکھا۔ مجھے لگتا ہے وہ اوچھے پنکھنڈوں پر آئے گا۔ ہو سکتا ہے وہ مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے۔ اس سے کچھ بعید نہیں۔ ویسے بھی وہ جانتا ہے کہ آج میں اسد صاحب کے آفس جانے والی ہوں۔“

”تمہارا اندیشہ صحیح ہے۔“

”پھر کیا کروں؟“ اس نے پوچھا تو فرناز سوچ میں پڑ گئی۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔

”ایسا کرو، چھٹی لے کر جانے کے بجائے سمر سے کہو تمہیں کسی ضروری کام سے جانا ہے، وہ اپنے ڈرائیور کو تمہارے ساتھ بھیج دیں۔“

”اگر انہوں نے ضروری کام کے واسطے میں پوچھ لیا تو۔؟“

”کم آن۔ انہیں اتنی فرصت نہیں ہوگی۔ ویسے بھی وہ دوسروں کی ذاتیات میں کم ہی دخل دیتے ہیں۔“

”یہ تو ہے۔“

”بس تو پھر ابھی چلی جاؤ۔“

”ابھی۔؟“ وہ سوچنے لگی۔

”ہاں ابھی۔ اسی وقت چلو اٹھو۔“ فرناز نے زبردستی اسے اٹھا کر ایمر ڈی اسفندیار کے کمرے کی تھکیل دیا اور وہ چلی تو آئی لیکن اب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ان سے کیا کہے۔

”جی بی بی۔؟“ اسفندیار نے اسے خاموش کھڑے دیکھ کر مخاطب کیا اور سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

”سہ۔ وہ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔“ وہ ایک دم کہہ گئی۔

”چھٹی چاہیے۔؟“

”جی۔“ بلا ارادہ اس کے منہ سے نکل گیا۔

”صرف ابھی کی یا کچھ دنوں کی۔؟“

”بس ابھی کی۔“

”اوکے۔ اگر کوئی ضروری فائل ہو تو وہ بھجوا دیں، پھر آپ جاسکتی ہیں۔“

”تھینک یو سہ۔“

وہ جلدی سے باہر نکل آئی اور باہر آتے ہی خیال آکا ڈرائیور اور گاڑی کی بات تو رہی گئی لیکن اب بارہ ان کے پاس نہیں جاسکتی تھی اس لیے غواغواہ فرناز پر بگڑنے لگی۔

”تم نے اتنی جلدی میں دھکیل دیا کہ میں کچھ کہہ ہی نہ سکی۔“

”تو اب جا کر کہہ دو۔“

”کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی، تم جاؤ۔“

وہ اس سے ہاتھ ملائی ہوئی آفس سے نکل کر آئی تو شہر و زاہد کی گاڑی سٹارٹ ہوئی تھی۔ وہ خود اس میں موجود تھی۔ ان کے ساتھ پتا نہیں کون تھا جسے وہاں اتار کر وہ گاڑی بڑھانا چاہتے تھے اسے دیکھ کر نہ صرف رُکے بلکہ دروازہ کھول کر پکار بھی لیا۔

”ربیعہ۔ آئیے، میں آپ کو ڈرائیور پر دوں۔“

وہ منع کرنا چاہتی تھی لیکن پھر کچھ سوچ کر بیٹھ گئی اور انہوں نے گاڑی اشارٹ کی تو پوچھنے لگے۔

”کہاں جانا ہے؟“

”میں صدر کی طرف جاؤں گی۔“

انہوں نے گاڑی اسی راستے پر ڈرائی پھر کیسٹ ان کر کے آواز قدرے دھیمی کر دی۔ مدھم مدھم ہن ہننا زکی آواز جادو سا جگانے لگی تھی۔

تم کو میرے سوا اور میرے سانچا!

اب نہ دیکھے کوئی دوسرا

میں تیری دھوپ ہوں تو ہے سایا میرا

زندگی کے عوض پیار پایا تیرا

تو رہے ہمسفر تو یہ لمبی ڈنگر

بتی جائے گی پھولوں بھرا راستہ

رات دن کا جو یہ اجنبی کھیل ہے

ہے جبرائی کہیں اور کہیں میل ہے

عمر فانی وہی، یہ کہانی وہی

لوگ رکتے ہیں، رکتا نہیں قافلہ

آخری بولوں پر اسے ثاقب حسن یاد آنے لگا اور اس کی آنکھوں میں پانی اُڑا گیا۔  
”مجھ پر نہیں تو اپنے آپ پر رحم کرتے ثاقب حسن، اس نے سوچا: ایک عمر اچھی زندگی کے لیے  
بدو جہد کرتے رہے اور جب رتی تو اپنی نادانی میں کھودی۔“

اس نے ایک سرد آہ بھری۔  
”اے روٹھنا ہی تھا تو مجھ سے روٹھتے، ساری دنیا سے کیوں روٹھ گئے؟“  
”کس طرف جانا ہے؟“ شہر و زاحمد پوچھ رہے تھے۔ وہ چونک کر سیدھی ہوئی اور شیشے سے باہر  
ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔  
”بس یہیں روک دیں۔“ مطلوبہ جگہ دیکھ کر رُکنے کے لیے کہا تو وہ پوچھنے لگے۔  
”یہاں کسی کام سے جا رہی ہیں؟“

”جی۔“  
”والیسی کتنی دیر میں ہوگی؟“  
”کچھ کہہ نہیں سکتی۔“  
”اوکے۔“ جتنی دیر بھی گئے، میں یہاں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔“  
وہ ایک نظر ان پر ڈال کر اتر گئی۔ بلڈنگ میں داخل ہو کر بیڑھیاں چڑھتی ہوئی اس صاحب کے آتش  
پہنچی تو وہ جیسے اس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ دیکھتے ہی کہنے لگے۔  
”میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔“

”سوری۔“ مجھے آنے میں کچھ دیر ہوگئی۔“ وہ ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔  
”کوئی بات نہیں۔“ کہتے ہوئے۔ انہوں نے ایک فائل کھول کر اس کے سامنے رکھ دی پھر  
کہنے لگے۔

”آپ کے شوہر ثاقب حسن نے دس لاکھ روپے کی پالیسی لی تھی۔ جس میں انہوں نے وصیت  
فرمائی تھی کہ ان کے بعد اس کی حقدار آپ ہیں۔“  
وہ کچھ نہیں بولی۔ بس فاس پر سے نظریں ہٹا کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”ثاقب حسن کے انتقال کو غالباً ڈیڑھ سال ہو گئے ہیں۔ اس دوران ان کے بھائی ثاقب حسن کئی  
بار میرے پاس آئے۔ اور انہوں نے ہی بتایا کہ آپ ملک سے باہر چلی گئی ہیں۔ پھر وہ یہ بھی چاہتے  
تھے کہ ہم یہ رقم ان کے حوالے کر دیں لیکن ہمارے لیے یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ آپ کے شوہر نے اپنے  
بعد آپ کو اس کا وارث ٹھہرایا تھا۔ وہ خاموش ہو کر دیکھنے لگے کہ شاید وہ کچھ کہے گی لیکن وہ اسی طرح  
خاموش رہی۔

”بہ حال یہ چیک آپ کی امانت کے طور پر میرے پاس تھا۔ آپ یہ کچھ کاغذات سائن کر دیں، پھر  
یہ چیک آپ کا۔“ انہوں نے چیک اور کاغذات دونوں ایک ساتھ اس کی طرف بڑھا دیے تو اس نے  
پہلے کاغذات لے کر سائن کیے، اس کے بعد چیک وصول کیا۔

”آپ کے لیے چائے منگواؤں؟“ وہ اسے یوں چپ چاپ دیکھ کر پوچھنے لگے۔  
”نہیں شکریہ۔“ اصل میں میں نے کسی کو انتظار کرتا ہوا چھوڑا ہی ہوں۔“ وہ آٹھ کٹری ہوئی۔  
”اچھا۔“ وہ اس کے ساتھ کھڑے ہوئے تو وہ الوداعی کلمات کہہ کر ان کے آفس سے نکل آئی۔  
راہداری اس نے تیز قدموں سے عبور کی لیکن بیڑھیوں پر قصد اُتست روی اختیار کی اصل میں  
وہ شہر و زاحمد کے ساتھ یہ بھی نہیں آگئی تھی۔ رات صوفیہ نے جس انداز سے ان کا پروپوزل دینا چاہا تھا  
اس سے اسے زیادہ تو نہیں، تھوڑا بہت اندازہ ضرور ہوا تھا کہ صوفیہ نے شہر و ز سے بات کرنے  
کے بعد اس سے کہا ہے یا غالباً ان کے کہنے پر۔ اور اس وقت تو اس نے صوفیہ کو بنا سوچے سمجھے

خفی سے منع کر دیا تھا۔ لیکن جب رات میں اس نے سنجیدگی سے سوچا، تب بھی اسے یہ بات انتہائی  
غیر مناسب لگتی تھی۔ اور ابھی وہ یہ سوچ کر ان کے ساتھ آئی تھی کہ اگر انہوں نے خود ایسی کوئی بات چھیڑی تو  
وہ انہیں بھی صاف منع کر دے گی۔

آہستہ قدموں سے بیڑھیاں اترتے ہوئے وہ مسلسل اپنے آپ کو ایسی کسی قسم کی صورت حال  
کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرتی رہی۔ آخر میں اس نے یہ بھی سوچ لیا کہ اگر شہر و زاحمد نے ایسی کوئی بات  
بھی چھیڑی، تب بھی وہ اپنے طور پر اپنی کسی بات یا کسی انداز سے ان پر واضح کر دے گی کہ وہ کم گشتہ  
ستوں کو کھوجنے اور پیمانے پر چلنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ آخری سیرٹھی پر نرگس کر اس نے اس صاحب کا  
یا ہوا الفاظ اپنے ہاتھ میں لے لیا، پھر جب اگر شہر و زاحمد کے برابر بیٹھی تو لفافے کو یوں اپنی گود میں  
لیا کہ اس کے اوپر انشورنس کمپنی کا نام بڑے حرفوں میں چھپا ہوا اور نیچے لکھا ہوا اس کا نام سن کر یہ ثاقب حسن  
صاف نظر آ رہا تھا۔ اس مصروف شاہراہ پر بے پناہ رش کی وجہ سے ٹریفک جام ہو گیا تھا۔ وہاں سے نکلتے  
کلنے کوئی آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ اس دوران وہ نہ تو اس کی طرف متوجہ ہوئے، نہ کوئی بات کرنے کی کوشش کی  
بت جیسے ہی مین روڈ پر آئے، پوچھنے لگے۔

”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“ گھر یا آفس؟“  
”گھر جاؤں گی۔ اور آپ مجھے کسی ایسی جگہ آثار دیجیے جہاں سے مجھے سواری آسانی سے مل جائے؟“  
”گھر تک چھوڑنے میں کیا قیاحت ہے؟“ انہوں نے ذرا سی گردن موڑی تو اس کی طرف اٹھنے سے  
پہلے نظر اس لفافے پر جا ٹھہری۔ تو جو سمجھے، اُسی حساب سے پوچھنے لگے۔  
”یہ آپ کا پارٹ ٹائم جاب ہے؟“  
”کون سا؟“ وہ سمجھ کر انجان بنی۔

”انشورنس کمپنی میں۔“ انہوں نے لفافے کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں۔“ پارٹ ٹائم کے لیے نہ میرے پاس وقت ہے اور نہ ہی مجھے اس کی ضرورت ہے۔“  
”پھر غالباً آپ نے پالیسی لی ہوگی۔“ وہ یہ نہیں باتیں کرتے رہنے کی غرض سے پوچھنے لگے۔ کیونکہ  
انے تھے کہ یہ موضوع ختم ہو گیا تو پھر کوئی اور موضوع سوچنے میں سفر ہی تمام ہو جائے گا اور جبکہ وہ چاہ  
ہی تھی یوں ہی باتوں باتوں میں کوئی بات نکلے جسے وہ گرفت میں لے سکے اور یہی موقع اس نے  
ناسب سمجھا۔ کہنے لگی۔

”یہ پالیسی میں نے نہیں ثاقب حسن نے لی تھی اور انہوں نے اپنے بعد اس کا وارث مجھے ٹھہرایا  
ما۔“ یہ کہنے کے بعد اس کی سمجھ میں نہیں آیا، کیا کہے۔ جیسی خاموش ہو گئی۔ اور وہ کچھ دیر انتظار  
رنے کے بعد کہنے لگے۔

”آپ نے اسے اسی وقت کیوں نہ وصول کیا؟“ اتنے عرصے بعد کیوں؟“  
”پہلے مجھے خیال تو آیا لیکن میں نے سوچا جب ثاقب حسن ہی نہیں ہے تو پھر یہ سب لے کر کیا کروں  
ما اور اب میں سوچتی ہوں، جس چیز پر میرا حق ہے، وہ مجھے لینا چاہیے۔ پھر یہ تو میرے شوہر کی طرف  
سے میرے لیے آخری تحفہ ہے۔“

”اسٹیرنگ پران کے ہاتھوں کی مضبوط ہوتی گرفت اس نے دوردہ نظروں سے دیکھی، پھر کہنے لگی۔  
یہ رقم میں نے ہی اس لیے ہے کہ اسے کسی اچھے کام میں لگا کر ثاقب حسن کے نام کر دوں تاکہ  
سانیک علی کی بدولت اللہ میاں اس کے درجات بلند کرتے جائیں۔ یہ ایک بیوی کا اپنے شوہر کے لیے  
ساتھ ہو کا جو اس دنیا میں ہی نہیں، اس دنیا میں بھی اس کے ساتھ ساتھ رہے گا۔“  
”گویا دفنا شکاری کی مثال قائم کرنا چاہتی ہیں آپ۔“ انہوں نے احتیاط سے مونہ کاٹتے ہوئے کہا۔  
”شاید۔“ وہ آہستہ سے بولی تو چنانچہ ان کا لہجہ ایک دم بدل گیا، کچھ سخت ہونے کے

ساتھ ساتھ طنز آمیز بھی۔

”ایک بات بتائیں مسز ربیعہ کہ آپ جو ایک غیر روکے پہلو میں بیٹھ کر وفا شعاری کی بات کر رہی ہیں تو اس سے آپ کیسے دھوکا دے رہی ہیں، اس مرحوم کو یا خود اپنے آپ کو۔ اس کے اندر باہر ایک دم سناتوں کا راج ہو گیا۔ دل چاہا صاف گوئی سے کہہ دے۔“

”تمہیں۔ صرف تمہیں شہر و زاحمد۔“

لیکن آواز نے تو ساتھ چھوڑا ہی، حواس بھی ساتھ چھوڑ گئے۔ بس اتنا ہوا کہ ان کی طرف سے ذرا سا رخ موڑ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ وہ اپنی بات پر اس کا رد عمل دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے مر کا سہارا بھی لیا لیکن وہ کچھ ایسے رخ سے بیٹھی تھی کہ وہ باوجود کوشش کے اس کا چہرہ نہ دیکھ سکے۔ تب مایوس ہو کر گاڑی کی اسپید بڑھا دی اور اس کے گھر کے سامنے جا کر بیٹھ گئی۔ وہ اترنے لگی کہ انہوں نے روک دیا۔

”ایک منٹ۔“ اس نے پلٹ کر سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ کہنے لگے۔

”ایک بات کا آپ نے جواب نہیں دیا لیکن اب میں ہر صورت جواب چاہتا ہوں کہ آپ کس نالے میرے ساتھ یہاں تک آئیں؟“

وہ اپنے آپ پر کافی حد تک قابو پا چکی تھی۔ براہ راست ان کی آنکھوں میں تو نہ دیکھ سکی، پھر بھی نظر ان کے وجود پر ٹھکتی چھوڑ دین اور قدرے اعتماد سے کہنے لگی۔

”آپ نے کس نالے سے مجھے اپنے ساتھ بیٹھنے کی آفر کی تھی؟“

”آپ صوفیہ کی بہن ہیں اس لیے۔“

”اور آپ مہروز کے بھائی ہیں۔ میں اس لیے آپ کے ساتھ آگئی۔“ وہ برابر سے جواب دے کر اتر گئی اور جب پیکر گاڑی کے گھر کے دروازے کی طرف بڑھنے لگی تو وہ پکار کر بولے۔

”سنیں۔ کیا مہروز کا بھائی تو یہی دروازے سے واپس چلا جائے؟“

وہ رک کر انہیں دیکھنے لگی۔ بظاہر سنجیدہ نظر آ رہے تھے لیکن آنکھوں میں ہلکی شوخی کا رنگ چھپا ہوا تھا۔

”چپ رہا تھا بتا نہیں کیسے وہ پل بھر میں پیچھے سفر کر گئی۔“

”کب تک یہاں رہنے کا ارادہ ہے؟“ وہ اکثر اسے یہاں چھوڑنے آتے تو پوچھتے تھے۔

”کچھ کہہ نہیں سکتی۔“

”لیکن میں زیادہ دن رہنے کی اجازت نہیں دوں گا۔“ ایک بار خاصی سنجیدگی سے کہا تھا۔

”کیا۔؟“ وہ چیخی تھی۔

”ہاں۔ جب تک کچھ حق رکھنا ہوں، اسے استعمال بھی کروں گا۔“ وہ کہہ کر باہر نکل گئے تھے اور وہ جھنجھلائی ہوئی اندر آئی تھی۔

”میں نے مشکل بات کہی ہے یا میری بات نے آپ کو مشکل میں ڈال دیا ہے؟“ انہوں نے اس کے خاموش رہنے پر پوچھا تو وہ چونک گئی اور جاتے جاتے بولی۔

”مہروز کے بھائی ہیں اگر جرأت ہے تو خود ہی اس دروازے پر دستک دے لے۔“ یہ کہتے ہی وہ اندر چلی گئی۔

”جرأت بھی ہے اور دستک بھی دوں گا۔“ وہ قدرے اونچی آواز میں بڑبڑلاتے اور گاڑی بیک کرتے ہوئے ان کے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ آن ٹھہری جو گھر آنے تک ہونٹوں سے جدا نہیں ہوئی تھی۔ اتفاق سے پہلے ہی مرحلے پر صوفیہ سے سامنا ہو گیا۔ وہ اسے چلے گا کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد صوفیہ چائے لے کر آئی تو پوچھنے لگے۔

”آپ کوئی ضروری کام تو نہیں کر رہیں؟“

”نہیں۔“

”یہ کہاں ہے؟“

”اسے ابھی مہروز باہر لے گئے ہیں۔“ پھر شرارت سے بولی۔ ”آخر بات کیا ہے؟“

”پہلے آرام سے بیٹھ جائیں پھر مجھے بتائیں کہ آپ نے ربیعہ سے بات کی یا نہیں؟“ انہوں نے کسی تمہید کے اصل بات پوچھ ڈالی تو وہ کیونکہ ستانے کے موڈ میں تھی، اس لیے انجان بن گئی۔

”کون سی بات؟“

”صوفیہ۔“ انہوں نے فوراً بڑائی کے رعب کے ساتھ تنبیہی لہجہ اختیار کیا۔ ”کوئی ضرورت نہیں ہے مجھ سے مذاق کرنے کی۔“

”میں کہاں مذاق کر رہی ہوں؟“

”پھر بتائیے، اس سے کیا بات ہوئی؟“

”آپ ہی نے تو کہا تھا کہ وہ کچھ روٹھی روٹھی سی ہے۔ منانے میں کچھ وقت لگے گا۔“ وہ اپنی چوڑیوں سے کھیلے ہوئے بولی۔ پھر ذرا سی پکلیں اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی۔

”کیا کہا اس نے؟“

”کچھ نہیں۔ میں نے جیسے ہی آپ کا نام لیا، اس نے ٹوک دیا تھا اور سختی سے منع کر دیا کہ میں یہی کوئی بات نہ کروں۔ وہ کچھ بھی سننے پر تیار نہیں تھی۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

”میرا خیال ہے، وہ ڈرتی ہے۔ اندر سے خوفزدہ ہے کہ دنیا والے کیا کہیں گے۔“

”آپ نے اسے سمجھایا نہیں؟“

”کوشش کی تھی لیکن۔“ وہ خاموش ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔ جو پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھے۔

”لیکن کیا۔؟“ صوفیہ کی مسلسل خاموشی پر شہر و زاحمد قدرے بے قراری سے پوچھنے لگے۔

”میں کچھ نہیں جانتی شہر و زاحمد کی کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ آپ کے نام پر وہ بہ حال بیٹھے سے اکھڑ گئی تھی۔“ وہ بات ختم کرنے کی غرض سے کچھ جھجھلا کر بولی۔ انہوں نے شامی نظروں سے دیکھا تو کہنے لگی۔

”میرا خیال ہے، آپ اتنی سے بات کریں۔ پہلے بڑوں کے درمیان بات ہو جائے، اس کے بعد سے کوئی بھی سمجھا سکتا ہے۔ اماں، آبا میاں، بڑی آپا۔ اور ہو سکتا ہے، وہ کسی ایک کی بات ان بھی جائے۔“

”کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں۔“ وہ طویل سانس لے کر کھڑے ہو گئے اور یونہی چلتے ہوئے کمرے کے آخری کونے تک چلے گئے۔ ان کا انداز سوچنے والا تھا اور جب پلٹے تو کہنے لگے۔

”لیکن ابھی تو وہ زیادہ اکھڑی ہوئی نہیں تھی۔“

”کون؟“ صوفیہ بے خیالی میں پوچھ گئی۔

”ربیعہ۔“

”کیا مطلب؟“ کیا آپ ابھی اس سے مل کر آ رہے ہیں؟“ صوفیہ کو یقیناً حیرت ہوئی، کیونکہ کل تو وہ اس کا نام بھی سننے کی روادار نہیں تھی اور اب وہ کہہ رہے تھے کہ اس سے مل کر آ رہے ہیں۔

”میرا مطلب ہے اس سے ملاقات کہاں ہوئی؟“

”یونہی۔ سر راہ۔ پھر میں نے اسے گھر چھوڑنے کی پیشکش کی جو اس نے قبول کر لی۔“

”حیرت ہے۔“ صوفیہ نے برملا حیرت کا اظہار کیا۔

”کس پر؟“ وہ رک کر پوچھنے لگے۔

”آپ دونوں پر۔“ اس نے دانستہ صراحت ربیعہ کا نام نہیں لیا، پھر کہنے لگی۔ ”میرا خیال ہے، آپ

دونوں سارے معاملات طے کر لیں، آخر میں ہمیں بلا لیجیے گا، ہم آکر چھوہارے کھالیں گے، وہ بے ساختہ ہنس پڑے۔

”بہت اچھے لگ رہے ہیں ہنستے ہوئے۔“  
ان کی ہنسی قہقہے کی شکل اختیار کر گئی تو وہ انہیں گھورتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور جانے کو تھکی کر کہا: ”بچے کو لیے ہوئے غالباً اسے ڈھونڈتا ہوا وہیں آ گیا۔ بڑے بھائی کو جو یوں ہنستے دیکھا تو پہلے متوجہ ہو، پھر پوچھنے لگا۔“

”کیا صوفیہ نے کوئی لطیفہ سنایا ہے؟“  
”جی نہیں۔“ وہ فوراً بول پڑی۔ ”لطیفہ انہوں نے خود سنایا ہے اور ہنس بھی خود رہے ہیں۔“  
”اچھا۔“ مہروز غلط فہم ہو کر ہنسا پھر بچہ اس کی گود میں دے کر اطمینان سے بیٹھتا ہوا بولا۔ ”کیا لطیفہ تھا۔ میں بھی سنوں۔“

”یہ اپنی شادی کی بات کر رہے تھے۔“ صوفیہ نے بول کہا جیسے لطیفہ ہو۔  
”سچ۔“ مہروز ابھی بیٹھا تھا، آنچل کر کھڑا ہو گیا۔ ”سچ شہر وز بھائی؟“  
”اُن سے کیا پوچھ رہے ہیں، مجھ سے پوچھیں۔ اور میں آپ کو یہ بھی بتاؤں کہ یہ شادی کڑا کس سے چاہ رہے ہیں۔“

”کس سے؟“ مہروز فوراً اُس کی طرف مڑا۔ اُس کے لہجے میں تجسس، اشتیاق اور نہ جانے کیا کچھ تھا اور شہر وز احمد اسے نہ بتانے کا اشارہ کرتے رہ گئے، لیکن وہ خاموش نہیں ہوئی۔  
”بربیعہ سے۔“

”کیا۔؟“ مہروز دوبارہ صوفیہ پر ڈھے گیا۔ ”یارو، مجھے ہوش میں لاؤ، یہ میں نے کیا سنا؟“  
”مہروز۔“ پھر وہی بڑائی والا رعب کہ مہروز فوراً سیدھا ہو بیٹھا۔  
”آئی ایم سوری۔“ پھر سر کھجنا ہوا بولا۔ ”ارادہ تو نیک ہے اور میرا خیال ہے نیک کام میں دیر بھی نہیں کرنی چاہیے۔“

”اب تم دونوں جاؤ اپنے کمرے میں۔“ انہوں نے دروازے کی طرف اشارہ کیا تو صوفیہ منہ پھلائے ہوئے فوراً اُن کے کمرے سے نکل آئی۔ مہروز اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

اگر ساری خوشیاں صرف پیسے کی مہربان منت ہوتیں تو دنیا میں سارے پیسے والے بہت خوش ہوتے اور وہ جس نے اپنے حق کے لیے لڑنا سیکھ لیا تھا اور اب اپنا حق دس لاکھ کی صورت وصول بھی کر آئی تھی، اسے بھی خوش ہونا چاہیے تھا لیکن وہ خوش نہیں تھی۔ اس کے برعکس ایک اضطرابی کیفیت میں گرفتار ہو گئی تھی۔

اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا وہ کیا کرے۔ دل بوجھل سا تھا۔ کہتے ہیں، کہہ دینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ اور وہ کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں رہی تھی۔

پھر جب سے وہ انشورنس کی رقم وصول کر کے آئی تھی، آتماں نے بھی اسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ اُن کا انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہوں، جودل چاہے کرو۔ اور یہ صورت حال اُس کی برداشت سے باہر تھی۔ اُس نے کب اپنی مرضی کی۔ ہمیشہ تو دوسروں کی مرضی پر چلتی رہی۔ زندگی اُس کی اور لگاؤ دوسروں نے تھا مگر کٹھ پتلی بنائے رکھا۔ وہ کب تک چک پیسہ یاں کھائی، سب کے سامنے تاشا بنی رہتی۔ آخر کہیں نہ کہیں تو اس نے اپنے وجود کے گرد بندھے دھاگوں سے نجات حاصل کرنی ہی تھی اور۔ اب جب وہ آزاد تھی، اپنی سوچ سوچنے لگی تھی، تب بھی سب خفا، جیسے وہ نادان ہو، غلطیوں پر غلطیاں کر رہی ہو۔

”کیا میں غلطی پر ہوں؟“ اُس روز وہ ہمارے پوچھنے لگی۔ اگر نہیں تو پھر میرا دل بھاری بوجھ تلے کیوں دب گیا ہے۔ ہر پل ایک جہرمانہ سا احساس۔ جیسے کوئی بہت بڑا جرم سرزد ہو گیا ہو مجھ سے۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔

نہ کسی کی حق تلفی کی ہے۔  
یقین کرو ہمارا، مجھے ثاقب حسن کے پیسوں کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے محض اُس کے گھر والوں کو یہ بتانے کی خاطر کہ میں اب کمزور نہیں ہوں، اپنا حق وصول کیا ہے۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو جانتی ہو گیا ہوتا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد وہ لوگ مجھے ڈرا دھمکا کر وہ پلاٹ حاصل کرنے کی کوشش کرتے جو ثاقب نے میرے نام سے خریدا تھا۔ اُس کے بعد بھی وہ لوگ چین سے نہ بیٹھے۔ اور میں تبیں بتاؤں میں ہر چیز سے دستبردار ہو سکتی تھی اگر جو ثاقب حسن کے والدین میرے سر پر ہاتھ رکھ دیتے۔ اپنے گھر میں نہ رکھتے لیکن کبھی کبھار یہاں آکر میرا حال احوال پوچھ لیتے۔ اس کے برعکس اُس کی اماں نے بھری برادری میں مجھے محسوس اور نہ جانے کیا کچھ کہہ کر نکال باہر کیا۔ اس کے بعد بھی میں اپنے آپ کو سمجھاتی رہی، جو ہوا اسے نبھول جانا اچھا ہے۔ لیکن جب سربراہ انیلا سے ملاقات ہوئی تو اُس کا منہ موڑنا میرے دل میں ترازو ہو گیا۔ اسے منہ اس وقت موڑنا چاہیے تھا، جب ایک بار پہلے اس سے اسی طرح سامنا ہوا تھا اور اس وقت میں شہر وز احمد کی منکوحہ تھی لیکن اس وقت وہ نہ صرف بڑے تپاک سے ملی بلکہ بعد میں گھر تک آئی تھی۔ اُس وقت تو میرا اس سے کوئی ناتا نہیں تھا اور اب جب کہ میں اُس کے محروم بھائی کی بیوہ ہوں تو وہ صرف اس لیے منہ موڑ گئی کہ میں کچھ لینے کی بات نہ کرنے لگوں۔ چرچہ، اس قدر تنگ نظری اور تنگ دلی۔ بہر حال میں نے یہ سب اپنے لیے حاصل نہیں کیا۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگی۔  
”میں جانتی ہوں ثاقب حسن نے یہ سب میری محبت میں نہیں کیا۔ اور نہ ہی ہماری اولاد تھی جو وہ سوچتا کہ کل کو اولاد کے کام آئے گا۔ اُس نے محض ٹیکس بچانے کی خاطر میرے نام سے پلاٹ خریدا اور انشورنس لے لے کر مرے وراثت کے خانے میں میرا نام بھی اُس نے یہی بلا سوچے سمجھے لکھ دیا ہو گا یا اس وقت کوئی ورنام اس کے ذہن میں نہیں آیا ہو گا۔ اور پھر اُس وقت اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ اتنی جلدی دنیا سے اس کا ناتا ٹوٹ جائے گا۔ بہر حال اگر وہ یہ سب میری محبت میں کرتا، تب بھی مجھے یہ سب اصل کر کے خوشی نہ ہوتی۔“

”پھر اب آپ کیا چاہتی ہیں؟“ وہ لمحہ مجھ کو خاموش ہوئی تھی کہ ہمارا پوچھنے لگی۔  
”میں کیا چاہتی ہوں؟“ اُس نے جیسے خود سے سوال کیا۔ پھر کہنے لگی۔

”اصل میں، میں خود فریبی میں مبتلا ہوں۔ اپنے طور پر یہ سمجھ لیتی ہوں کہ عہد رفتہ سے مکمل طور پر رہنا توڑ رہے ہیں، لیکن ایسا نہیں ہے۔ ہر دوسرے قدم پر کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے جو مجھے ماضی میں دھکیل دیتی ہے۔ اور پتلا ہے ہمارا، سب سے زیادہ مجھے ثاقب حسن کے وہ آخری لمحات یاد آتے ہیں۔ جب وہ اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے جا رہا تھا۔ اُس کی بھتیجی ہوئی آنکھوں میں دھک کی لہری پڑ چکی تھی، ساتھ میں حیرتیں تھیں، التجائیں تھیں جیسے وہ کچھ وقت کی تہلکت مانگ رہا ہو۔ اور ہمارا کسی یہ کو بھی اس حالت میں دیکھ تو تولد درد سے پھٹنے لگتا ہے اور وہ تو میرا شوہر تھا۔ وہ اپنی غلطیوں کے اعتراف کے بعد مجھ سے معافی چاہتا تھا۔ میں نے اسے معاف کر دیا لیکن پتا نہیں کیوں، کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے جس طرح میں نے محض زندگی کو چرسکون رکھنے کی خاطر اس سے محبت کا اعتراف کیا اور اُس نے یقین نہیں کیا۔

اسی طرح آج آخری لمحوں میں جب میں اُس سے کہہ رہی تھی کہ میں نے کبھی اُس کی باتوں کا بُرا نہیں منایا، اس وقت بھی اُس کی آنکھوں میں غیر یقینی سرشت آئی تھی جیسے کہہ رہا ہو، اب وقت رخصت میرے ساتھ

”بس اب سو رہے ہیں۔“

وہ دونوں ایک دوسرے کو اشارہ کر کے اپنی اپنی جگہ ٹھیک کرنے لگیں۔

”ایک بج رہا ہے۔“ اماں جلتے جاتے بولیں۔ ”صبح دفتر کی چھٹی تو نہیں ہے، پھر کیوں اس وقت تک جاگ رہی ہو؟“

”بس سو رہی ہوں۔“ وہ ہٹا کو لاٹ آف کرنے کا اشارہ کر کے خود جلدی سے لیٹ گئی۔

اگلے دن وہ پھر عاقب کے آفس چلی گئی۔ اس وقت وہ کسی میٹنگ میں مصروف تھا۔ وہ اُسے اپنی آمد کی اطلاع کروانے کے بجائے اطمینان سے بیٹھ کر اُس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی اور جب وہ آیا تو اُسے دیکھتے ہی ناگواری سے بولا۔

”اب کیا لینے آئی ہو؟“

”میں پہلے بھی تم سے کچھ لینے نہیں آئی تھی۔“ وہ سکون سے بولی۔ ”اور تم مجھے دے ہی کیا سکتے ہو؟ تمہارے پاس تمہارا اپنا ہے ہی کیا؟“

”بہت کچھ۔“ وہ گردن اگڑا کر بولا۔ ”دس لاکھ تو میرے ہاتھوں سے یوں نکل جاتا ہے اور تم۔“ غالباً اتنی رقم حاصل کر کے اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھ رہی ہوگی۔

”نہیں۔“ اُس کے سکون میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ وہ دس لاکھ روپے میرے پاس ثابت حُسن کی امانت ہیں اور اسی سلسلے میں مجھے تمہاری رہنمائی اور مدد کی ضرورت ہے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ جو ریوا لونگ چیئر کو مسلسل دائیں بائیں حرکت دیتے ہوئے اُس کے وجود سے لاتعلقی اور بنیادی کا مظاہرہ کر رہا تھا، ایک دم سیدھا ہو بیٹھا تو وہ کہنے لگی۔

”میں اس سلسلے میں کسی اور سے بھی بات کر سکتی تھی لیکن تمہارا انتخاب میں نے یوں کیا کہ۔ تم ثابت حُسن کے بھائی ہو اور پورے خلوص سے مجھے مشورہ دو گے۔“

”کیا چاہتی ہو تم؟“ وہ بغور اسے دیکھتے ہوئے پوری طرح اُس کی طرف متوجہ تھا۔

”میں ان سارے پیسوں کو ثابت حُسن کے نام سے کسی ایسے فلاحی کام میں لگانا چاہتی ہوں جس کا اجر ثابت حُسن کو ملتا رہے۔“

”تم۔“ بس ہونٹوں کی بے آواز جنبش ہوئی اور وہ جس طرح بغور اسے دیکھ رہا تھا، کتنی دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا۔

”کیا تم اس سلسلے میں میری کچھ مدد کرو گے؟“ اُس نے پوچھا تو وہ پہلے چونکا پھر طویل سانس لے کر دوبارہ کرسی کی بیک سے سر ٹکا لیا۔

”کہتے ہی پل بیت گئے۔ وہ کچھ نہیں بولا، شاید کچھ سوچنے میں لگ گیا تھا۔

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟“ وہ مسلسل خاموشی سے اکتا کر بولی۔

”پہلے تم میری بات کا جواب دو۔“ اُس نے اپنی گردن کو حرکت نہیں دی، بس نظریں ترچھی کر کے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

”ہاں کہو۔“ وہ سوالیہ نظریں اُس پر جھا کر اُس کے بولنے کی منتظر تھی اور وہ کہنے لگا۔

”پسیدہ انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ خاص کر آج کے دور میں اور جب کہ ہر شخص اسے جائز و ناجائز طریقے سے حاصل کرنا چاہتا ہے بلکہ اس کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں بھی ہے، پھر تم اسے اپنی آسائش کے لیے استعمال کرنے کے بجائے۔“

”عاقب۔“ وہ اُس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔ ”یہ ساری آسائشیں یہیں تک ہیں اور اصل زندگی یہ نہیں وہ ہے۔ پھر ہم یہاں کی بجائے وہاں کا سامان کیوں نہ کریں؟“

مذاق مت کرو ربیع۔

مجھے فریب مت دو۔

بس مجھے معاف کر دو۔

اور میں چیخ چیخ کر اُس کی جھولی میں معافی ڈال کر اسے اطمینان دینا چاہتی تھی۔ لیکن اس سے پہلے ہی اس کے سانسوں کا رشتہ ٹوٹ گیا۔

اس کے بعد سے اب تک وہ جب بھی مجھے یاد آیا، جب بھی اُس کا خیال آیا، میں نے یہی کہا۔ میں نے تمہیں معاف کیا ثابت حُسن۔ اور وہ جیسے میرے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے، میرے ہونٹوں سے نکلے لفظوں کا یقین لینے۔“

اسے اپنے روائی سے بہتے آنسوؤں کا بالکل احساس نہیں تھا۔ جب آواز ساتھ چھوڑ گئی تب اُس نے پہلے ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑیں پھر دوپٹے کے پلو سے چہرہ صاف کیا، پھر کہنے لگی۔

”میں اسے محبت کا یقین نہیں دینا چاہتی کیونکہ نادانی کی عمر کو چھوڑ کر اس کے بعد مجھے اس سے محبت رہی ہی نہیں تھی۔ اور کسی زندہ شخص کو تو مصلحتاً محبت کا فریب دیا جاسکتا ہے لیکن اسے نہیں البتہ میں اسے معافی کا یقین ضرور دینا چاہتی ہوں۔ کیونکہ میں نے اسے دل سے معاف کر دیا ہے۔ جانتی ہو، میں اُسے یقیناً کس طرح دوں گی؟“

”بھابھو بے حد حیران ہو کر اُس کی باتیں سن رہی تھی، بہت آہستہ سے نفی میں سر ہلاتے لگی۔

”میں ان سارے پیسوں کو ثابت حُسن کے نام سے کسی اچھے نیک کام میں لگا دوں گی۔ یہی اس کے لیے میری معافی کا یقین ہو گا۔“

”آئی۔“ ہما اس کی بات سن کر کہنے لگی۔ ”میں آپ کو ایسا کرنے سے روک نہیں سکتی لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ آپ کو اپنے بارے میں بھی سوچنا چاہیے۔“

”اپنے بارے میں سوچنا چاہتی ہوں جیسی تو ایسا کر رہی ہوں۔ میں آزاد ہونا چاہتی ہوں، ہر بوجھ اور غش سے اور ان سے نجات کا یہی ایک راستہ میری سمجھ میں آتا ہے۔“

”لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ ہما مایوسی سے نفی میں سر ہلاتے لگی۔

”موقوف۔“ ماضی سے نکلوں گی، تب ہی تو آج اور آئندہ کے بارے میں سوچ سکوں گی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ میں ماضی کی ہر شے کو اُس کے صحیح مقام پر چھوڑ کر آگے نکل آؤں۔ دوسری صورت میں آوازیں پیچھا کرتی ہیں۔ اور آوازوں کی بازگشت میں میں اپنے آپ کو بھلا دیتی ہوں۔ تم میری بات سمجھ رہی ہوں؟“ آخر میں اُس نے سنجیدگی سے پوچھا تو ہما سکڑا کر بولی۔

”کچھ سمجھ۔“

”چلو۔“ اتنا ہی کافی ہے۔ وہ بھی مسکرائی پھر موضوع بدلنے کی غرض سے بولی۔

”کافی دنوں سے کلثوم نہیں آئی۔ صبح اماں سے کہنا اُس کی طرف ہو آئیں؟“

”ہاں، صبح اماں بھی اُسے یاد کر رہی تھیں۔ ویسے آئی، اُس کے جانے سے میں بہت اکیلی ہو گئی ہوں۔“

”کیوں؟“ بہت توجہ سے تمہارے پاس۔“

”لیکن بہت توجہ سے میں باتیں تو نہیں کر سکتی۔ کرتی بھی ہوں تو وہ جواب نہیں دیتا۔“

”ابھی چھوٹا ہے ناں۔“ وہ شفقت سے نسیکراہٹ کے ساتھ سوٹے ہوئے بہتاج کو دیکھنے لگی۔ اسی وقت اماں آگئیں۔ غالباً ایک منہ لے کر اٹھتی تھیں۔ سوئی سوئی آنکھیں اور سوئی ہوئی آوازیں پوچھنے لگیں۔

”تم دونوں ابھی تک سوئی نہیں؟“

”پھر بھی۔؟“

”پھر بھی۔“ اس نے دہرایا۔ پھر سوچتے ہوئے بولی۔ ”اگر ہماری کوئی اولاد ہوتی تو میں شاید بلکہ یقیناً اگر پرخرج کرتی اور جہاں تک میری ذات کا سوال ہے تو میں نے خود اپنے لیے جدوجہد کرنا سیکھ لیا ہے۔ پھر اچھے ہوئے بولی۔ غالباً تم مجھے مشورہ دینے کے ٹوڈ میں نہیں ہو، اس لیے میں چلتی ہوں۔“

”بھابی۔“

وہ دروازے تک گئی تھی کہ اس نے پکار لیا لیکن وہ پلٹی نہیں، اسی طرح کھڑی رہی۔ جانتی تھی جب اس نے بھابی کو پکارا ہے تو اٹھ کر بھی ضرور آئے گا۔ اور وہ اٹھ کر اس کے سامنے تو اٹھ کھڑا ہوا لیکن سر نہیں اٹھایا، نہ ہی کچھ کہہ سکا۔

”کیا بات ہے؟“ وہ اس کے نہامت سے جھکے سر کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”آ۔ آپ۔“ اس کی زبان لٹکھڑائی اور پھر وہ اس کے سامنے گھٹنے ٹیک گیا۔

”ارے۔ رے۔“ اس نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔ ”پاگل مت بنو، چلو اٹھو۔“

”آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟“ وہ اونچا پورا دم اس کے سامنے رو پڑا۔ ”ہم نے آپ کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا، یہاں تک کہ بھابی جان۔“

”تم کیا جانو تمہارے بھائی جان نے میرے لیے کیا کچھ کیا؟“ وہ فودا بول پڑی۔

”کیا کیا انہوں نے؟“

”اب وہ ساری باتیں نہیں بتانے والی نہیں ہیں۔“ اس نے مسکراتے کی کوشش کی تو لبیک بھگ گئیں۔ اچانک جانے کیا کچھ یاد آگیا تھا۔ ایک ساتھ کئی روپ، جن سے دانستہ نظریں چرانے کی خاطر پہلے درسا رخ موڑا پھر آواز پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

”بس اب میں جاؤں گی۔ شام اترنے لگی ہے، سواری مشکل سے ملے گی۔“

”لیکن پہلے آپ میرے ساتھ جائیں گی۔“

”کہاں؟“

”گھر۔ آبا آپ کا بہت پوچھتے ہیں۔“ پھر بڑی اس سے بولا۔ ”چل رہی ہیں ناں؟“

”چلو۔“ وہ کچھ سوچ کر اس کے ساتھ چل پڑی۔

وہی گھر جہاں ثاقب حسن سب کی مخالفتیں مول لے کر آئے لایا تھا اور اس کے بعد قدم قدم پر اس کے لیے آزمائشیں رکھ چھوڑی تھیں۔ وہ عاقب کے ساتھ یہاں آ تو کئی تھی لیکن اب اسے بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ شاید دل نے اس حقیقت کو اب تسلیم کیا تھا کہ اس گھر سے اس کا کوئی تانا کوئی تعلق نہیں رہا۔ ویسے وہ کوئی تانا جوڑنے یا ترانے رشتوں کو یاد دلانے نہیں آئی تھی بلکہ ترانے تعلق کا اگر کوئی تصور نہ کیا تھا تو اسے بھی مٹانے آئی تھی، اس خوبصورتی سے کہ دلوں میں کوئی کدورت نہ رہے۔

عاقب اسے سیدھا آبا کے پاس لے گیا۔ وہ انہیں دیکھ کر کتنی دیر تک چپ چاپ کھڑی رہی، جوان

اولاد کے غم نے انہیں زندہ درگور کر دیا تھا۔

”آبا۔“ وہ ان کے پاس بیٹھی اور ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر پکارا تو وہ انکھیں سکیڑ کر یوں دیکھنے لگے جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔

”آبا۔ یہ بھابی ہیں۔ ربیعہ بھابی۔“ عاقب نے قدرے اونچی آواز میں انہیں بتایا پھر اماں

کو بلا لے چلا گیا۔

”بیٹی۔“ آبا کا لرزتا ہوا ہاتھ اس کے سر پر آن ٹھہرا۔ کیسی ہو بیٹی؟“

وہ بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

”میں تمہارے پاس آنا چاہتا تھا۔ لیکن کیا کروں جوان اولاد کے غم نے ایسی کر توڑی ہے کہ چارپائی

سے لگ کر رہ گیا ہوں۔“

اس کی کچھ عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ دل کسی نامعلوم احساس سے سہا ہوا سا لگ رہا تھا۔ بہت ہستکی سے اس نے آبا کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لے کر پہلے ہونٹوں پھر آنکھوں سے لگا لیا۔ اسی وقت آبا اپنی اماں کو لے آیا۔ وہ یقیناً انہیں اس کے ارادوں کے بارے میں بتا آیا تھا جیسی انہوں نے اسے ہی اسے لگے لگا لیا تھا۔ اور وہ ہر بوجھ، ہر خلش سے ایک دم آزاد ہو گئی۔

وہ اپنی عادت یا فطرت سے جمبو رہتی کسی کو خفا نہیں کر سکتی تھی اور یہ گھر جہاں اسے نہ محبت لی اور نہ وہ مقام جو گھر کی بڑی اور پہلی بہو کی حیثیت سے ملنا چاہیے تھا۔ پھر ہماری برادری میں جس

رح ساس نے گھر سے نکالا تھا، اس وقت کو بھی وہ اب تک نہیں بچھوٹی تھی، اس کے باوجود اس کے دل پر بوجھ سہا رہا۔ کوئی اس سے خفا ہے تو کیوں؟ اور جب تک دل پر بوجھ رہتا، وہ خلش محسوس

رہتی رہتی اور اب۔ کیونکہ وہ گزری ہر بات کی خلش سے نجات حاصل کر کے پرسکون ہو کر رہنا چاہتی تھی، اس لیے خود ہی چلی آئی تھی۔ کیونکہ تصور ابہت یہ یقین تھا کہ وہ ثاقب حسن کے پیسوں کو جس طرح اس

کے نام کر رہی ہے، اس سے اس کے گھر والے اگر خوش نہ بھی ہوئے تو خفا بھی نہیں رہیں گے۔

دریہ ہو۔ عاقب اس کے سامنے گھٹنے ٹیک گیا اور اماں نے نہ صرف گے لگا بلکہ اپنے گزشتہ

توبے پر نہامت بھی محسوس کرتی رہی تھیں۔ اس کا مقصد ان سب کو نہامتوں میں دھکیلنا یا اپنے

سامنے ہاتھ جڑوانا ہرگز نہیں تھا۔ وہ پس صلح چاہتی تھی۔ اور جب اماں نے گے لگا لیا تو اس کے

لس سے گزرے وقت کی تمام اذیتیں اور کدورتیں آپ ہی آپ دھل گئیں۔

اس کے بعد وہ زیادہ دیر وہاں نہیں ٹھہر سکی۔ آبا، عاقب کے ساتھ ساتھ اماں بھی خاص طور پر اسے

ات کے کھانے کے لیے روکتی رہ گئیں لیکن اس کے پاس معقول جواز موجود تھا کہ وہ گھر میں کہہ

رہیں آئی، دیر ہو جانے کی صورت میں سب پریشان ہوں گے۔

”اگر آپ نے جانے کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو چلیں میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔“

انہوں نے جب صوفیہ کی بات کو سنجیدگی سے سوچا تو انہیں اس کا مشورہ معقول اور مناسب لگا

اُس نے کہا تھا کہ آپ ربیعہ کے سلسلے میں اتنی سے بات کریں۔ پہلے بڑوں کے درمیان بات ہو

ئے، اس کے بعد اسے کوئی بھی سمجھا سکتا ہے۔ پھر انہوں نے صوفیہ کے مشورے پر عمل کرنے

سوچ تو لیا لیکن اب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنی سے کس طرح بات کریں۔ انہیں بالکل اندازہ نہیں تھا

ربیعہ کا نام سن کر اتنی کا کیا رد عمل ہوگا؟

وہ جانتے تھے، ربیعہ اتنی کو بہت عزت دیتی تھی اور اس کی وجہ سے اکثر اتنی انہیں بھی سخت سست کہہ

یا کرتی تھیں اور انہیں یہ بھی یاد تھا کہ جب انہوں نے ربیعہ کو طلاق دی تھی تو اتنی صدر سے نہ ڈھال

رہی تھیں۔ پھر اگلے کئی دن تک ان سے خفا بھی رہی تھیں۔

اور جب صوفیہ اور مہر و زور دوبارہ ربیعہ کو اس گھر میں لانے کی بات کرنے لگے تھے تو اتنی بھی ان

سے متفق تھیں۔ لیکن یہ سب اس وقت کی باتیں تھیں اور وہ جانتے تھے کہ جب اچانک کوئی غیر متوقع

شے ہو جائے تو فطری اور فوری طور پر انسان ایسی ہی باتیں سوچتا ہے کیونکہ اس وقت انسان مکمل طور

پر جذبات کے تابع ہوتا ہے۔ لیکن پھر جب وقت کی گردش جذبات میں وہ شدت نہیں رہنے دیتی

شہان کی سوچیں بھی بدل جاتی ہیں۔ ایک ٹھہراؤ آ جاتا ہے اور اب وہ نہیں جانتے تھے کہ تین، چار

ل کا عرصہ گزرنے کے بعد اب اتنی، ربیعہ کے لیے کیسے جذبات رکھتی ہیں اور پتا نہیں اب وہ اس

شکوہ مناسب سمجھتی ہیں یا نہیں۔ بہر حال تین چار روز تک تو وہ اتنی سے بات کرنے کے لیے خود کو

رکھتے رہے۔

پھر یہ اتفاق تھا کہ اس وقت وہ اتنی کے پاس جانے کا سوچ رہے تھے کہ اتنی خود ان کے کمرے میں

ان کی طرف دیکھتی رہیں۔ پھر کہنے لگیں۔

”اچھی بات ہے۔ میں جلد صوفیہ کے ساتھ جاؤں گی۔“ پھر اٹھتے ہوئے بولیں: ”ایک بات یاد رکھنا کہ نظارہ یہ بات غشی آسان ہے، اتنی ہی مشکل بھی ہے کیونکہ پہلے تم اس طرحی کے ساتھ جو سلوک کر چکے ہو، اس کے پیش نظر ہو سکتا ہے اس کے والدین یا وہ خود آمادہ نہ ہو۔“

”جی۔“ وہ ہیں اسی قدر کہہ سکے۔ پھر اسی کمرے سے چلی گئیں تو صوفیہ کی پشت سے سر نکاتے ہوئے قدرے اونچی آواز میں بڑبڑاتے۔ اسے آمادہ ہونا پڑے گا۔

صوفیہ کو شہر و زاحد پہلے ہی بتا چکے تھے کہ اتنی آن کی ربیعہ سے شادی کے لیے جی جان سے تیار ہیں پھر بھی جب اتنی نے صوفیہ سے بات کی تو وہ انجان بن کر پوچھنے لگی۔

”آپ نے شہر و زبجائی سے پوچھ لیا ہے۔“

”ہاں، وہ بھی ایسا ہی چاہتا ہے۔“

”اچھا۔“ صوفیہ اچھا کہہ کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی کہ پھر اب کیا مسئلہ ہے اور اتنی سمجھ کر بولیں۔

”تمہارا کیا خیال ہے، پہلے تم اپنے گھر والوں سے بات کرو گی یا میں پیغام لے کر جاؤں؟“

”جیسا آپ مناسب سمجھیں۔“ اس نے اپنا دامن بچالیا۔ پھر اسی کے خاموش رہنے پر سوچتے ہوئے بولی۔

”آپ چلیں تو زیادہ اچھا ہے۔“

”میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔ یہاں شام میں تیار رہنا، چلیں گے۔“

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پھر شام میں صوفیہ اور بہرور کے ساتھ اتنی کو اپنے گھر میں دیکھ کر اماں حیران تو ہوئیں لیکن اپنی حیرت ظاہر نہیں ہونے دی۔

”آج میں پھر سوالی بن کر آئی ہوں۔“ اتنی نے بیٹھتے ہی کہا تو اماں چونک کر صوفیہ کو دیکھنے لگیں۔ اشارے سے پوچھا بھی کہ کیا بات ہے لیکن ظاہر ہے کہ وہ کوئی جواب نہیں دے سکتی تھی۔ ہلکے سے کندھے اچکا کر رہ گئی، تب اماں خود ہی قیاس کرتے ہوئے بیٹھ گئیں۔

”ربیعہ نظر نہیں آ رہی۔؟“ اتنی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

”وہ اچھی آفس سے نہیں آئی۔“

”کب تک آتی ہے؟“

”پس آنے والی ہوگی۔“

”اچھا۔“ اتنی پھر دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگیں۔ ”مجھے آپ کی بیٹی ربیعہ بہت عزیز ہے اور میں دوبارہ اسے مانگنے آئی ہوں۔“

اماں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ ان کی طرف سے یوں منہ موڑا جیسے انہیں یہ بات پسند نہ آئی ہو۔

”آپ نے شاید میری بات کا بڑا مانا۔“ اتنی کچھ مایوس ہو کر بولیں۔

”بڑا ماننے کی بات نہیں ہے بہن۔“ اماں کہنے لگیں: ”آپ خود سوچیں، پہلے آپ کے بیٹے نے بغیر کسی قصور کے اسے طلاق دی پھر اب۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں پھر بھی میں کہوں گی، آپ سوچیں ضرور۔“

اماں کچھ بنا چاہتی تھیں کہ صوفیہ نے اشارے سے انہیں خاموش رہنے کے لیے کہا، پھر چائے کے بہانے وہاں سے اٹھ گئی اور کچھ دیر بعد اماں اس کے پیچھے چلی آئیں۔

”کیا بات ہے؟“

”اماں، ایسا رویہ اختیار نہ کریں کہ اتنی بالکل مایوس ہو کر چلی جائیں۔ آپ نہیں جانتیں شہر و زبجائی نے

آگئیں۔

”میں ابھی آپ کے پاس ہی آ رہا تھا۔“ وہ کھڑے ہوئے تو بلا ارادہ منہ سے نکل گیا۔

”اچھا۔“ اتنی ہلکے سے مسکرائیں پھر بیٹھتے ہوئے شکوہ کرنے لگیں: ”تمہیں ہمارے پاس بیٹھنے کی فرصت کہاں ملتی ہے۔ گھر میں بھی بہت کم نظر آتے ہو۔“

”اصل میں جب سے تیار ہو جیکٹ شروع کیا ہے تب سے۔“

”میں جانتی ہوں۔“ اتنی ان کی بات کاٹ کر بولیں: ”اب تم مجھے نئے پروجیکٹ کی تفصیلات بتانے بیٹھ جانا۔“

”نہیں۔“ انہوں نے بے ساختہ ہنسی کو نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر روکا پھر بھی پورا چہرہ کڑی مسکراہٹ کی گرفت میں آ گیا۔

”بیٹھو، مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ اتنی نے صوفیہ پر اپنے ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”جی۔“ وہ بیٹھتے تو پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”تم نے سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا تھا۔ اور اب کافی وقت گزر گیا ہے۔ مجھے بتاؤ تم نے شادی سے متعلق کیا سوچا اور کیا فیصلہ کیا ہے؟“ اتنی نے بغیر کسی تہید کے اصل موضوع چھیڑا تو وہ فوری طور پر یہی کہہ سکے۔

”فیصلہ تو آپ کو کرنا ہے۔“

”میرا فیصلہ سنو گے؟“

”جی۔“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے تو وہ سوچ کر بولیں۔

”اگر تم اپنی گزشتہ غلطی پر نادم ہو اور اس کی تلافی بھی کرنا چاہتے ہو تو میں کہوں گی ربیعہ بہت اچھی لڑکی ہے۔“

”جی۔“ انہیں بے تحاشا حیرتوں نے آن گھیرا تھا۔ جس بات کو کہنے کے لیے وہ اتنے دنوں سے اپنے آپ کو تیار کر رہے تھے، وہ اتنی نے اتنی سہولت سے کہہ دی تھی، گویا ان کی خواہشوں تک ان کی رسائی ہوئی تھی، اتنی نے ایک نظر ان کے چہرے پر ڈالی پھر کہنے لگیں۔

”بعض لوگ اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتے ہیں کہ دل آپ ہی آپ ان کی طرف کھینچتا ہے۔ اور پھر وہ اتنے عزیز ہو جاتے ہیں کہ کہیں بھی رہیں، محبت میں کمی نہیں آتی کیونکہ ان کی ہر ادول پر نقش ہو چکی ہوتی ہے۔ ربیعہ کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔

”وہ جتنی ربیعہ اپنے اچھے کردار و عمل کے لیے نقوش چھوڑ گئی ہے جسے مٹانے کی سوچنا میرے نزدیک حماقت کے ساتھ ساتھ کم ظرفی بھی ہے۔ میں نے جب جب تمہاری شادی کے بارے میں سوچا مجھے اسی کا خیال آیا، اگر تم کہو تو۔“

اتنی خاموش ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگیں تو وہ سر جھکا گئے۔ گو کہ اتنی نے ان کے دل کی بات کہی تھی، پھر بھی وہ فوری طور پر کچھ نہ کہہ سکے۔

”کوئی زبردستی نہیں ہے بیٹا۔“ اتنی پتا نہیں کیا سمجھیں، کہنے لگیں۔ ”میں نے اپنا خیال ظاہر کر دیا ہے، تم اس سے اختلاف بھی کر سکتے ہو۔“

”نہیں۔“ وہ نفی میں سر ہلانے لگے۔

”کیا نہیں۔؟“

”میرا مطلب ہے مجھے آپ کی بات سے اختلاف نہیں ہے۔ اور ابھی آپ نے ٹھیک کہا، اپنی گزشتہ غلطی پر نادم ہوں۔ اور صرف تلافی کی خاطر نہیں اتنی، تلافی تو کسی بھی طرح ہو سکتی ہے بلکہ اس سے شادی میری خواہش ہے۔“ انہوں نے صاف گوئی سے اعتراف کیا تو اتنی کچھ دیر پہلے





”ہو گئیں آپ پرسکون؟“  
 ”ہاں۔ کیونکہ اب آن کا گزشتہ رویہ مجھے یاد نہیں آتا۔ کسی وقت خیال آئے بھی تو میرے اندر غم و غصہ نہیں بھرتا۔ اس کے برعکس میں بڑی سہولت سے آن دنوں کو ذہن سے جھٹک دیتی ہوں۔ اور مجھ! بہادری لڑنے میں نہیں معاف کر دینے میں ہے۔ میں نے معافی کا جو یقین ثاقب حسن کو دیا ہے، اس سے تو لگتا ہے، میں گرداب سے نکل آئی ہوں۔ شاید تم یقین نہ کرو لیکن میں تمہیں بتاؤں، اس روز ثاقب حسن کا خیال آنے پر جب عادت کے مطابق میں نے کہا ”میں نے تمہیں معاف کیا“ تو وہ جیسے مسکراتا ہوا میرے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ وہ کسی نادیدہ نقطے پر نظریں مرکوز کیے کہہ رہی تھی۔

”میں نے آپ کی بات پر یقین کر لیا۔ اور اب آپ یہ بتائیں کہ شہر وز بھائی کو معافی کس طرح ملے گی؟“ ہمارے مسکراہٹ و ہار ڈرنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔  
 ”کیا مطلب؟“ وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔  
 ”بھئی۔ شہر وز بھائی بھی اپنے گزشتہ رویے پر نادم ہیں اور۔“  
 ”بس۔“ وہ فوراً بول پڑی ”انہیں نادم ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آئندہ تم میرے سامنے ان کا نام مت لینا۔ ورنہ میں امان سے کہہ دوں گی کہ اگر شہر وز احمد کو اس گھر سے دوبارہ رشتہ جوڑنے کا اتنا ہی شوق ہے تو تم موجود ہو۔“  
 ”آپی۔“ ہمارے جیسے شک سا لگا۔ انتہائی تاسف سے اسے دیکھ گئی تو وہ دامت محسوس کرتے ہوئے بولی۔  
 ”آئی ایم سوری۔“

عجیب اتفاق تھا کہ کبھی وہ اُمی کے ساتھ صوفیہ کے لیے مہر و زکا پر و بزل لائی تھی تو صوفیہ نے اس پر دل کی مچھر اس نکالتے ہوئے ساتھ الزام بھی لگا یا تھا کہ اس نے اپنی ساس سے میرے بار میں بات کی ہوگی۔ اور اب وہ اس انداز سے سوچ رہی تھی اور اسے رہ رہ کر صوفیہ پر غصہ آ رہا تھا۔ جب کسی طرح وہ اپنے غصے کو نہیں دبا سکی تو آفس سے ہی اسے فون کر ڈالا۔ اب یہ اس کی قسمت کہ ہمیشہ کی طرح دوسری طرف سے ریسپورڈ آتے ہی وہی آواز سنائی دی۔  
 ”شہر وز احمد اس کیلنگ۔“ اس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے گھڑی کی طرف دیکھا۔ تین بج رہے تھے اس وقت۔ ان کی گھر میں موجودگی اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔  
 ”ہیلو کون؟“ وہ پوچھ رہے تھے۔ پہلے اس نے سوچا، فون بند کر دے لیکن پھر ارادہ مٹتوی کر دیا اور قدرے آواز بدل کر بولی۔

”صوفیہ ہیں؟“  
 ”کون ربیعہ؟“ بدلی ہوئی آواز کے باوجود وہ پہچان گئے تو وہ جھنجھلا کر بولی۔  
 ”آپ کو اس سے کیا، میں ربیعہ ہوں یا کوئی بھی۔ بس آپ صوفیہ کو بلا دیں۔“  
 وہ اس کی جھنجھلاہٹ پر غصے سے محفوظ ہوئے اور سوچ کر بولے۔  
 ”آپ کو تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔“

”کتنا انتظار؟“  
 ”بس اتنا کہ میں صوفیہ کے کمرے میں جا کر انہیں بلا لاؤں۔“  
 ”ٹھیک ہے، میں انتظار کر رہی ہوں۔“  
 ”کس کا؟“ وہ چھیڑنے کی غرض سے بولے۔ ”میرا مطلب ہے میری واپسی کا یا۔“  
 اس نے پوری بات سننے بغیر ہی سلسلہ منقطع کر دیا اور اندر ہی اندر کھولتے ہوئے میز پر

پیشانی ٹکائی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

”ہیلو۔“ اس نے ریسپورڈ کیا۔ دلی سے کہا۔  
 ”فون کیوں بند کر دیا تھا؟“ شہر وز احمد اپنے مخصوص لہجے میں پوچھ رہے تھے۔



شہر وز احمد کے رنگ بیک کرنے پر اسے واقعی حیرت ہوئی۔ کیونکہ اس کے خیال میں وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے، اس لیے فوری طور پر وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ پھر اندر ہی اندر جھنجھلائی ہوئی بھی تھی اس لیے قصداً کچھ دیر اور خاموش رہی، اس خیال سے کہ کہیں کوئی غلط بات منہ سے نہ نکل جائے۔  
 ”ہیلو ربیعہ۔“ اس کے خاموش رہنے پر وہ پکار کر کہنے لگے۔ ”میری بات کا جواب تو دیں؟“  
 ”کون سی بات کا؟“ وہ کسی حد تک اپنے آپ پر قابو پا کر نارمل لہجے میں پوچھنے لگی۔  
 ”گو یا آپ اعتراف کر رہی ہیں کہ میری بہت سی باتوں کا آپ کو جواب دینا ہے؟“  
 ”پتا نہیں کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ وہ اُلجھ کر بولی۔  
 ”طبیعی یہ بتائیے، صوفیہ سے کیا کام ہے؟“  
 ”مجھے آن سے جو کام ہے، ان ہی سے کہوں گی۔“  
 ”اچھی بات ہے پھر بلاؤ انہیں؟“  
 ”نہیں رہنے دیں۔“  
 ”کیوں؟“

کیوں کا جواب نہیں ہے میرے پاس؟۔ اور اب میں فون بند کر رہی ہوں۔ آپ برلے ہر باتی مجھے دوبارہ رنگ مت دیجیے گا۔“  
 اس کے ساتھ ہی اس نے ریسپورڈ کر ڈیل پر رکھ دیا۔ پھر کچھ دیر تک ٹیلی فون کو یوں دیکھتی رہی جیسے پھر پل بجنے لگے گی، لیکن ایسا نہیں ہوا، تب وہ طویل سانس لے کر اپنے کام میں مصروف ہوئی۔ پندرہ گئے ہی سارے دن گزر گئے اور وہ جو گزشتہ ہر بوجھ اور نلش سے نجات حاصل کر کے پرسکون ہونا چاہتی تھی، بری طرح ڈسٹرب ہو گئی تھی۔ اور یہ ساری ڈسٹربنس شہر وز احمد کے پروپول کی وجہ سے تھی، گو کہ اپنی طرف سے اس نے امان کو صاف منع کر دیا تھا لیکن ایک تو امان نے اس کا انکار شہر وز احمد کی اُمی تک نہیں پہنچایا تھا۔ دوسرے خود شہر وز احمد ہر دوسرے دن یا تو اسے آفس میں فون کر لیتے یا خود چلے آتے تھے۔ اور پھر ان کی شخصیت اتنی عام سی بھی نہیں تھی کہ مسلسل نظر انداز کی جاتی بلکہ ان کے بارے میں خود ربیعہ کا کہنا تھا کہ وہ شخص سب سے بڑا ساتھی ہے۔ اس کی آنکھوں میں فتح کر لینے والی ایسی قوت ہے کہ مقابل مفقود ہو کر بھی خوش رہتا ہے۔ اور وہ جہاں کھڑا ہو جائے، اس پاس کے ماحول کو بھی اپنے آپ پر رشک آنے لگتا ہے۔  
 اس کے امان سے کہا تھا، میں نے زندگی کے دور رخ دیکھے ہیں، ایک جتنا خوبصورت تھا دوسرا نا ہی بد صورت۔ پھر یہ بھی کہا تھا کہ ویسی خوبصورتیاں اب میرا مقدر نہیں ہو سکتیں۔ اگر اس نے بنا مقدر دیکھا ہوتا تو ایسی بات نہ کرتی کیونکہ اب وہی خوبصورتیاں اس کے راستوں کو سجانے لگی تھیں اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا یہ سب کیا ہے؟

وہ خوابوں کی دنیا میں جھٹک رہی ہے یا حقیقت میں اس کے ساتھ ایسا ہو رہا ہے؟  
 زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اسے اپنی طرف ہٹا رہی تھی۔ اور اگر جو وہ نادان ہوتی تو بے کی طرح آنکھیں بند کر کے ان راستوں پر چل پڑتی۔ لیکن اب وہ نادان نہیں تھی۔ گردشِ دوراں نے اسے بہت کچھ سکھایا اور سمجھا دیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ ہر خوبصورت نظر آنے والی شے درحقیقت بصورت نہیں ہوتی۔

اسی لیے شروع میں شہر و زاحمد کی آواز سنتے ہی وہ فون بند کر دیتی۔ اس کے بعد جھنجھلائے لگی تھی پھر کوئی سخت جملہ کہہ دیتی کہ شاید وہ یہ سلسلہ ترک کر دیں لیکن انہوں نے بھی جیسے طے کر رکھا تھا، اس کی کسی بات کا برا نہ منلتے۔ آفس آتے تو خاص طور سے اس کی ٹیبل کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہلکے سے کھانسنے کے آواز سے متوجہ کرتے یا اپنی آمد کی اطلاع دیتے تھے، وہ قصداً سر کو اس قدر جھکا لیتی جیسے کوئی بہت ضروری کام کر رہی ہو۔

لیکن بہت جلد اسے اندازہ ہو گیا کہ اس طرح وہ مزید ڈسٹرب ہو رہی ہے۔ وہ لاکھ ان کی آواز سنتے ہی فون بند کر دے لیکن اس کے بعد بہت دیر تک لاشعوری طور پر وہ بھی سوچتی رہتی ہے کہ پتا نہیں وہ کیا کہنا چاہتے تھے۔ پھر ان کی آمد پر سر جھکا لینا بھی اپنے آپ کو فریب دینا لگا کیونکہ پہلے وہ ان کے قدموں کو شمار کرتی ہے، پھر اس کا دھیان آپ ہی آپ اسفندیار کے کمرے کی طرف رہتا ہے، جہاں شہر و زاحمد داخل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ان کے نکلنے کا بھی انتظار کرتی ہے۔

یہ ساری صورت حال اسے بے حد پریشان کر رہی تھی۔ اور ایک طویل مدت بعد وہ ایک بار پھر فرار کا سوچنے لگی۔ پہلے اس نے سوچا یہ جاب ہی چھوڑ دے لیکن اب جاب اس کی ضرورت تھی اور دوبارہ اتنی اچھی جاب ملنا آسان نہ تھا۔ اس لیے ایک پہینے کی چھٹی لے کر گھر بیٹھ گئی۔

”بزدل۔“ شہر و زاحمد کو جب سے معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک پہینے کی چھٹی پر چلی گئی ہے تو وہ مسلسل اسے بزدل کہہ رہے تھے، یہاں تک کہ گھر آنے پر جب صوفیہ سے سامنا ہوا تو اسے دیکھتے ہی کہنے لگے۔  
”وہ بزدل گھر بیٹھ گئی ہے۔“

”کون؟“ فوری طور پر صوفیہ بالکل نہیں سمجھی۔  
”آپ کی بہن اور کون۔“ پچھلے ایک ہفتے سے مسلسل فون کر رہا ہوں، کئی بار آفس بھی گیا، نظر نہیں آئی، آج اسفندیار سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک پہینے کی چھٹی پر گئی ہوئی ہے۔  
”اچھا۔“ صوفیہ ہنسنے لگی۔ ”آپ جلتے تو ہیں، فرار حاصل کرنے میں وہ ماسٹر ہے۔“  
”لیکن اب زیادہ دیر فرار ممکن نہیں ہے۔“ وہ اس کی گزری ہوئی کوئی بات یاد کر کے ہلکے سے مسکرائے پھر کہنے لگے۔

”آخر وہ چاہتی کیا ہے؟“  
”پتا نہیں، صوفیہ کندھے اُجکا کر بولی۔ ”میں تو اس دن کے بعد سے دوبارہ گئی ہی نہیں ہوں۔“  
”لیکن اب آپ کو جانا پڑے گا۔“

”نہیں بھئی، میں جانتی ہوں اس کے اندر جتنا غبار بھرا ہوگا، وہ مجھ پر نکالے گی۔ اور یہ جواتے دنوں سے آپ اسے تنگ کر رہے ہیں، اس کا حساب بھی مجھ سے لے گی۔ اور معاف کیجیے گا شہر و زاحمد۔“  
مجھے آپ کی خاطر جان قربان کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“

”ارے۔“ وہ بے ساختہ ہنس پڑے۔ ”کیا وہ اتنی ہی خونخوار ہو چکی ہے۔“  
”بالکل۔“ اور میری مامیں تو اس کا خیال چھوڑ دیں۔“  
”ناممکن۔“ پھر اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولے۔ ”کل آپ کو ہر صورت میں میل میسج اس

”مک پہنچانا ہے۔“  
”بات سنیں بھائی۔“ صوفیہ پیچھے سے یکارتی رہ گئی لیکن وہ اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔  
صوفیہ کا خیال تھا اسے دیکھتے ہی ربیعہ شروع ہو جائے گی اور وہ ساری باتیں جو کہیں اس نے اس سے کہی تھیں، اب وہ کہے گی۔ لیکن اس کے برعکس اس کے ہونٹوں پر ایک جاہد خپ تھی۔ صوفیہ کو دیکھ کر وہ اس کے سامنے سے ہنسی بھی نہیں اور نہ ہی ہمیشہ کی طرح کسی گرم جوشی کا اظہار کیا۔ بس ایک

نظر اس پر ڈال کر جس طرح اہتجاج کے ساتھ مصروف تھی، اسی طرح مصروف رہی۔ اور اس صورت حال کا مقابلہ صوفیہ کو خاصا مشکل نظر آیا کیونکہ اگر وہ کہیں کر دل کی بھڑاس نکال لیتی تو پھر اس کی بات بھی سن سکتی تھی لیکن اب اس کی بے نیازی دیکھ کر صوفیہ کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ وہ اس سے کیسے بات کرے؟۔

”کچھ دیر تک وہیں اماں اور ہما کے پاس بیٹھی رہی، پھر جب اماں اٹھ کر کچن میں گئیں تو صوفیہ بھی بچہ تو ہما کی گود میں دے کر اماں کے پیچھے چلی آئی۔  
”اماں۔ پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟“ وہ چھوٹے ہی پوچھنے لگی۔  
”ربیعہ کے لیے؟“ اماں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔

”ہاں۔ ابھی جب میں آرہی تھی تو امتی نے خاص طور سے مجھے تاکید کی تھی کہ میں آپ سے معلوم کروں۔“  
”میں کیا کروں آگے وہ ربیعہ کچھ سننے کو تیار ہی نہیں ہے۔“

”کیا کہتی ہے؟“  
”کچھ نہیں، بس صاف انکار۔ زیادہ بات کروں تو کہتی ہے، گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی؟“ اماں فکرنری سے بولیں۔

”آپ خوا خواہ اس کی دھکیوں میں مت آئیے۔ آخر کہاں جائے گی، اتنی تو بزدل ہے۔ پتا نہیں نوکری کیسے کر رہی ہے؟“ پھر یہ بڑی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔  
”آپ نے ابامیاں سے بات کی؟“

”ہاں۔“  
”کیا کہا انہوں نے؟“  
”انہیں تو پہلے بھی شہر و زاحمد بہت پسند تھے اور اب بھی وہ کوئی اعتراض نہیں کر رہے لیکن ان کا کہنا ہے پہلے ربیعہ سے پوچھ لو۔ اور وہ بے کہ شہر و زاحمد کے لیے صاف انکار کر رہی ہے۔“

قدرے توقف کے بعد خود ہی کہنے لگیں۔  
”ویسے اس کا کہنا بھی ٹھیک ہے کہ جس گھر سے ایک بار نکل آئی ہے دوبارہ وہاں جانا۔“  
اماں نفی میں سر ہلاتے لگیں۔

”اماں۔ یہ کوئی انہونی بات تو نہیں ہے۔ آخر آپ کو کہیں نہ کہیں تو اس کی شادی کرنی ہی ہے اور میں سمجھتی ہوں، بجائے اس کے کہ نئے سرے سے رشتہ تلاش کیا جائے۔ اور پتا نہیں، کیسے لوگ ملیں، اس سے بہتر ہے شہر و زاحمد کے بارے میں سوچیں۔“

”میں نے خود یہی سوچا ہے لیکن کیا کروں، وہ کچھ سننے تب ناں۔“  
”نیں بات کروں اس سے؟“

”کر دیکھو۔“ اماں نے کہا تو وہ اسی وقت اٹھ کر اندر چلی آئی۔  
”ہما دونوں بچوں کی ریسنگ کر رہی تھی اور وہ بڑی دلچسپی سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ بار بار کہے جا رہی تھی۔“

”خیال کرو ہما، کہیں کوئی نیچے نہ گر جائے۔“  
”تم آج آفس نہیں گئیں؟“

”نہیں میں چھٹی پر ہوں۔“ اس نے سرری انداز میں جواب دیا۔ جب کہ پورا دھیان بچوں کی طرف تھا۔  
”اچھا کتنے دن کی چھٹی لی ہے؟“  
”ایک پہینے کی۔“

خیریت ہے۔ کوئی اور کام ہے یا یونہی؟

”بس یونہی۔“

”جلو اچھا ہے، کچھ دن آرام کرو۔“ پھر اچانک جیسے یاد آیا تو کہنے لگی۔ ”ارے ہاں! اگلے مہینے بچوں کی سالگرہ ہے ناں؟“

”مجھے یاد ہے۔“ وہ ہلکے سے مسکرا کر بولی۔

”ابک ساتھ سالگرہ منائیں گے۔“ میرا مطلب ہے ایک ہی جگہ۔“ صوفیہ نے کہا تو وہ یونہی اُس کی طرف دیکھنے لگی تب صوفیہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

”تم سب ہمارے گھر آنا، وہیں دونوں بچوں کی سالگرہ۔“

”نہیں چھوٹی آیا۔“ وہ پوری بات سننے بغیر بول پڑی۔ ”ہم ابھی ان کی سالگرہ اپنے گھر میں منائیں گے“ یہ صحیح ہے کہ ہم آپ کی طرح بہت زیادہ دھوم دھام نہیں کر سکیں گے لیکن جو ہماری حیثیت ہے، اس کے مطابق ضرور کریں گے۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو؟“ صوفیہ نے ٹوکا۔ میں تو اپنی خواہش بتا رہی تھی کہ سالگرہ والے دن دونوں بچے ساتھ ہوں۔ اور تم حیثیتوں کا فرق لے بیٹھیں۔ اگر ایسی بات ہے تو اس دن ہم سب یہیں آجائیں گے۔“ پھر سرگوشی میں بولی۔ ”شہر وز بھائی سمیت۔“

وہ ان سنی کر کے منہ دوسری طرف موڑنا چاہتی تھی کہ صوفیہ نے اس کی کریم ہاتھ ڈال دیا اور اُس کے کندھے پر ہٹھوڑی رکھتے ہوئے بولی۔

”تمہیں شہر وز بھائی کی آمد پر کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟“

”میں کیوں اعتراض کروں گی؟“ وہ بغیر کسی تاثر کے بولی۔

”تو سنو، اس وقت بھی اعتراض مت کرنا جب وہ دو گواہوں کے ساتھ آئیں۔“

”چھوٹی آیا۔“ وہ اپنی کمر سے اس کا ہاتھ نکال کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ہٹاکو بچوں کا خیال رکھنے کا کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ صوفیہ نے سوچا، جب بات شروع ہو گئی ہے تو ادھوری نہیں رہتی چلے آئی اور فوراً اٹھ کر اس کے پیچھے چلی آئی۔

”چھوٹی آیا۔“ وہ آتے اپنے پیچھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر کہنے لگی۔

”میں شہر وز احمد کے بارے میں کوئی بات نہیں سنوں گی۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ میں امان کو اپنا فیصلہ سنا چکی ہوں اور اگر انہوں نے آپ لوگوں تک میرا جواب نہیں پہنچایا تو مشن لیجیے۔ میں شہر وز احمد سے شادی نہیں کروں گی۔“

”امان کی زبانی تمہارا انکار سن چکی ہوں۔“ صوفیہ اطمینان سے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔

”اور اب تمہاری زبانی وجہ جاننا چاہتی ہوں۔“

”وجہ؟“ وہ تپنی سے ہنسی۔

”میں وجہ بتانے کی پابند نہیں ہوں۔ بس میرا دل نہیں مانتا۔“

”ہمیشہ دل کی ناجاتی ہو اور ہمیشہ پھینکتی ہو۔“

”اب نہیں پھینکتاؤں گی۔“ وہ یقین سے بولی۔ تو صوفیہ کچھ دیر تک اُس کی طرف دیکھتی رہی، پھر سمجھانے کی غرض سے بولی۔

”دیکھو ربیعہ، یہ تو نہیں ہے کہ تم شہر وز احمد کو نہیں جانتیں۔“

”بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“ وہ فوراً بول پڑی۔ اس کے لہجے میں طنز سمٹ آیا تھا۔ ”یہ وہی شخص ہے ناں جس نے ثاقب حسن کے کہنے پر ایک معاہدے کے تحت مجھ سے شادی کی، پھر اس

کے کہنے پر طلاق بھی دے دی اور اب آپ مجھے یہ بتائیں کہ اب اُس نے کس کے ساتھ معاہدہ کیا ہے اور اس کی کیا گاڑی ہے کہ کل کو وہ کسی کے کہنے پر مجھے چھوڑے گا نہیں۔“

”ربیعہ۔“ صوفیہ واقعی بہت حیران تھی۔

”میں غلط نہیں کہہ رہی۔ آپ ہی بتائیے میں کیسے شہر وز احمد کا اعتبار کر لوں؟“ اور یہ باتیں تو آپ کو بھی سوچنا چاہئیں، پھر آپ کیوں ان کی وکالت کرتی ہیں؟“

”اس لیے کہ میں جانتی ہوں، تمہارے بغیر ان کی زندگی ادھوری ہے۔“

”بس کریں چھوٹی آیا۔ کوئی کسی کے بغیر ادھورا نہیں ہوتا۔“

”لیکن وہ ادھورے ہیں۔ اور نہیں اس سے بڑھ کر اور کیا یقین چاہیے کہ تمہارے بعد انہوں نے پھر کسی کو دل میں جگہ نہیں دی۔ اور اس تمام عرصے میں تم جس طرح سائے کی طرح اُن کے ساتھ رہی ہو، یہ سب مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اب میں تمہیں کیا کیا بتاؤں۔ کبھی کبھی تو میں خود اُن سے اُچھے پڑتی تھی کہ جب کوئی ناتانہ نہیں رہا تو پھر کیوں انہیں تمہارا خیال ہے؟“ قدرے توقف کے بعد سوچ کر بولی۔

”اور یہ بچہ، ابھی ابھی۔ ہم سب نے نہیں شہر وز بھائی نے تمہاری گود میں ڈالا تھا۔ انہوں نے اس وقت تمہاری بات سن لی تھی، جب تم مجھ سے بچہ مانگ رہی تھیں۔ پھر انہوں نے مہر وز سے کہا کہ بچہ ربیعہ کو دے دو۔“

”چھوٹی آیا۔“ اُس کے ہونٹ بے آواز جنبش کے ساتھ نیم وا ہوئے اور وہ پوری کھلی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ تب صوفیہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگی۔

”تمہارا قصور نہیں ہے۔ حالات نے تمہیں منفی انداز سے سوچنا اور ہر ایک کو شبیہ کی نظر سے دیکھنا سکھا دیا ہے، پھر بھی میں تم سے کہوں گی کہ تم اگر کم شہر وز بھائی کے جذباتوں پر شبہ مت کرو، وہ کل بھی تمہارے ساتھ مخلص تھے اور آج بھی مخلص ہیں۔“

”اگر وہ اپنے خلوص کی یہ قیمت چاہتے ہیں کہ میں۔“

”نہیں میری بہن۔“ صوفیہ نے فوراً ٹوک دیا۔ ”خلوص کی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور وہ بدلے میں کچھ نہیں چاہتے۔ اُن کی تو بس یہ خواہش ہے کہ اُن کی بے آب و رنگ زندگی میں تمہارے نام، تمہارے وجود اور تمہاری محبت سے بہار آجائے۔“

”میرے وجود سے۔“ ارے چھوٹی آیا، میں تو خود۔“ اُس کی آواز بھڑکائی تو وہ خاموش ہو گئی۔ صوفیہ نے محبت سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دیا یا پھر کہنے لگی۔

”سنو، کبھی تم لوگوں نے مجھ سے کہا تھا کہ خوشیاں دروازے پر دستک دیں تو دروازے بند نہیں کر لینے چاہئیں۔ پھر اب تم کیوں دروازے بند کر رہی ہو؟“

”میں کیا کروں؟“ اُس نے گویا ہتھیار ڈال دیے۔

”صرف آخری بار اپنی زندگی کے فیصلے کا اختیار مجھے دے دو۔ یقین کرو میں تمہارے راستوں میں بہاروں کے قلعے اتار دوں گی۔“

”مجھے بہاریں راس نہیں آتیں۔“ وہ مایوسی سے بولی۔

”یہ محض تمہارا وہم ہے۔ اس طرح مت سوچو۔ بلکہ اب تم کچھ بھی مت سوچو۔ میری جھوٹی میں فقط ایک ذرا سی ہاں ڈال کر ہر فکر سے آزاد ہو جاؤ۔“

وہ شش و پنج میں پڑ گئی، کیا کرے، کیا نہ کرے۔ اور صوفیہ اس کی کیفیت محسوس کر کے کہنے لگی۔ ”جلو میں اصرار نہیں کرتی، پہلے تم خود اچھی طرح سوچ لو۔ لیکن مثبت انداز سے۔ میں پھر تم سے بات کروں گی۔“

”کیسی ہیں آپ ربیعہ؟“ لہجے میں نہ اختیار تھا، نہ بے اختیاری۔ قدرے جتانے والا انداز تھا جسے باور کر رہے ہوں کہ وہ ہرے مجمع میں بھی پکارنے کا حق رکھتے ہیں۔  
”ٹھیک ہوں۔“ وہ رکھائی سے کہہ کر اپنی ٹیبل پر آگئی۔ اور انٹرکام پراسفندیار کو اپنی آمد کے بارے میں بتانے لگی۔ انہوں نے کچھ دیر تک کراسے دیکھا پھر آفس سے نکلے چلے گئے۔  
شام میں جب وہ آفس سے لوٹے تو گھر میں بڑی آپا کو دیکھ کر اس نے پہلے خوشی کا اظہار کیا پھر نکلہ کر بیٹے لگی۔

”کمال ہے بڑی آپا، اتنے دنوں سے میں چھٹی پر تھی تو آپ آئی نہیں اور آج۔“  
”میں تم سے سخت ناراض ہوں۔ اور آج مجھے پتا تھا کہ تم گھر پر نہیں ہوگی، اس لیے اماں وغیرہ سے ملنے آگئی۔ بڑی آپا نے کہا تو وہ حیران رہ گئی۔

”آپ مجھ سے کیوں خفا ہیں؟“  
”تم نے سب کو پریشان جو کر رکھا ہے۔“

”میں نے؟“ اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُس نے اماں کو دیکھا۔  
”ہاں تم نے۔“ بڑی آپا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا پھر کہنے لگیں۔  
”کیا تمہیں ذرا احساس نہیں ہے کہ اماں اور اماں تمہارے لیے کتنے فکر مند ہیں؟ مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ صوفیہ کی ساس تمہیں بہو بنانا چاہتی ہیں لیکن تم۔“

”ہاں، میں منع کر رہی ہوں۔ مجھے منظور نہیں ہے۔“ وہ اُن کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی اور مزید کچھ کہے سے بغیر اندر چلی گئی۔ آسے برج بہت غصہ آگیا تھا کہ آخر سب لوگ شہر ز احمد کی طرف واپس کیوں کرتے گئے تھے۔ اُن کے گزشتہ روتے کو کیوں نہیں سوچتے۔ اور جب وہ خود سوچنے بیٹھی تو کسی خوبصورت لمحے نے چپکے سے دامن تھام لیا۔ اس کے بعد بے شمار لمحات تھے، وہ کس کس سے نظریں چرائی۔

وہ گھبرا کر کمرے سے نکل آئی۔ بڑی آپا جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ اُس نے پیچھے سے آکر اُن کی کمرے گرد اپنے بازوؤں کا حلقہ بنا دیا اور اُن کے کندھے پر پٹھوڑی ٹکا کر بولی۔  
”بڑی آپا، آپ مجھ سے ناراض ہو کر تو نہیں جارہیں؟“

”تمہیں میری ناراضگی کی پروا ہے؟“  
”کیوں نہیں، آپ ناراض ہو کر جائیں گی تو مجھے بہت دکھ ہوگا۔“  
”اچھا۔“ بڑی آپا نے خود کو اس کے بازوؤں کے حلقے میں سے نکالا اور پھر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولیں۔

”میں تم سے ناراض نہیں ہوں ربیعہ۔ بس تم میری ایک بات مان لو۔“  
”جی۔“ وہ مجسم سوالیہ نشان بن گئی۔  
”گزشتہ ساری باتیں بھلا دو۔“  
”آپ اسے آسان سمجھ رہی ہیں۔“

”نہیں، میں جانتی ہوں، یہ بہت مشکل ہے، پھر بھی تمہیں ایسا کرنا پڑے گا۔ اور اب جب کہ تم میں کافی تبدیلی آگئی ہے، میرا مطلب ہے تلخ تجربات سے تم بہت کچھ سمجھ اور سیکھ گئی ہو، تو میں گزشتہ حالات کو خود پر طاری یا حاوی نہیں رکھنا چاہیے۔ جب نئے انداز سے چلنا سیکھا ہے وہی راہوں پر چلنے کی امنگ بھی پیدا کرو۔“

”جی راہوں کی طرف آپ کا اشارہ ہے بڑی آپا، وہ نئی تو نہیں ہیں۔ وہی پرانے راستے وہی پرانے لوگ اور کوئی بعید نہیں کہ حالات بھی۔“

جس روز سے صوفیہ اسے سمجھا کر گئی تھی، اسی روز سے وہ اس برج پر سوچنے لگی تھی لیکن ہر بار اس کی سوچ کا اختتام اس بات پر ہوتا کہ لوگ کیا کہیں گے، خاص طور سے ثاقب حسن کے گھر والے۔ پھر اسے خود بھی بڑا عجیب سا لگتا تھا کہ وہ دوبارہ اس گھر میں داخل ہو۔ اس کے علاوہ اسے شہر و زاہد پر بھی کچھ زیادہ بھروسہ نہیں تھا اور یہ بے اعتباری اسے ثاقب حسن کے رویے نے دی تھی۔ جن نے غالباً اس کے حصول کو ہی مقصد جانا تھا۔ اور اگر شہر و زاہد بھی حاصل کرنے کے بعد اسی کی طرح رنگ بدل گئے تب۔؟۔ اس سے آگے وہ تصور بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

پھر اپنے طور پر اس نے فیصلہ کر لیا لیکن مسئلہ شہر و زاہد کا تھا جو بار بار اُس کے راستے میں آنے لگے تھے اور بعض اوقات اتنی بے باکی کا مظاہرہ کر جاتے کہ وہ حیران رہ جاتی۔ گو کہ ان کا سامنا ہونے پر وہ بہت ریزر ہو جاتی تھی، کبھی پیشانی پر شکنیں بھی ڈال لیتی۔ لیکن انہوں نے جیسے تہمت کر لیا تھا اسے رام کرنے کا۔ اس کی ناگواری محسوس کرنے کے باوجود معنی خیزی سے مسکراتے چلتے جس سے وہ مزید جھنجھلا جاتی۔

ان ہی کی وجہ سے وہ پہنچے بھر کی چھٹی لے کر گھر بیٹھی تھی تاکہ وہ اس کی طرف سے بالکل مایوس ہو جائیں۔ اور پتا نہیں وہ مایوس ہوئے تھے یا نہیں، البتہ وہ ضرور پریشان تھی۔ جیسے جیسے چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں اور دوبارہ آفس جانے کے دن قریب آ رہے تھے۔ اُسے ان کا سامنا کرنے کا خیال پریشان کر رہا تھا۔

اس وقت وہ سوچ رہی تھی، ناحق اتنے دن بونہی بے کار بیٹھ کر گزار دیے، اس دوران وہ کسی دوسری جگہ جاب تلاش کر سکتی تھی۔ اگر اس سے اچھی نہیں تو ایسی جاب تو مل ہی جاتی اور وہ بہت علموش سے ریزا نہ دے کر اپنا راستہ الگ کر لیتی۔ لیکن یہ خیال اسے پہلے نہیں آیا تھا اور اب جب کہ اس کی صرف تین چھٹیاں باقی تھیں تو اتنے کم وقت میں تو کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

”مجھے بتائیے، کیا مسئلہ ہے؟“ ہمارے آسے چونکا یا۔ میں اتنے دنوں سے دیکھ رہی ہوں۔ آپ کے سوچنے کا انداز بتاتا ہے کہ کسی مسئلے سے دوچار ہیں۔ مجھے بتائیے، کیا بات ہے؟“  
”کوئی خاص بات نہیں،“ اُس نے مسکرا کر ٹالنا چاہا۔  
”چلیے عام بات ہی بتا دیں۔“ ہمارے ہوئی تو وہ سرسری انداز میں بولی۔

”میں سوچ رہی ہوں، یہ جاب چھوڑ کر کہیں اور کوشش کروں۔“  
”کیوں؟“

”اصل میں جب سے شہر و زاہد کا ہمارے آفس میں آنا جانا ہوا ہے، تب سے میرا دل اچاٹ ہو گیا ہے۔“ وہ صاف گوئی سے بولی تو ہمارا حیران ہو کر کتنی دیر تک اُسے دیکھتی رہی۔

”اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟“ اُس نے ٹوکا۔  
”سوچ رہی ہوں جب شہر و زاہد بھائی کا اس گھر میں آنا جانا شروع ہوگا۔ تو کیا آپ کا یہاں سے بھی دل اچاٹ ہو جائے گا؟“ ہمارے کہا تو وہ ناگواری سے بولی۔  
”نہیں کس نے کہا کہ وہ یہاں آئیں گے؟“

”خائن طور سے تو کسی نے نہیں کہا لیکن سب کی باتوں سے تو ایسا ہی لگتا ہے۔“  
”اگلے دن سے اُس نے اخبار میں ضرورت ہے“ کے اشتہار دیکھنا شروع کر دیے۔ اور ابھی اسی مرحلے میں تھی کہ ادھر چھٹیاں ختم ہو گئیں۔

پورے ایک مہینے بعد آفس میں داخل ہو رہی تھی کہ پہلے ہی مرحلے پر شہر و زاہد سے سامنا ہو گیا، وہ جی ایم کے ساتھ کھڑے تھے۔ پہلی غیر ارادی نظر کے فوراً بعد انہوں نے چونک کر اسے دیکھا تو بس ایک پل کو دل زور سے دھڑکا، فوراً سنبھلی تھی کہ وہ کسی کا خیال کیے بغیر اس کے پاس چلے آئے۔

”السلامت سوچو۔“ بڑی آپاٹے ٹوک دیا۔ اس کے برعکس یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ان پرانے راستوں کو ان ہی پرانے لوگوں نے نئے انداز سے سمجھ لیا ہو۔ تم ایک بار اس انداز سے سوچ کر تو دیکھو۔“

وہ خاموش رہی، اب انہیں کیا بتانی کہ وہ ہر انداز سے سوچ چکی ہے، کبھی دل آمادہ ہوتا ہے اور کبھی صاف انکاری۔

اس روز صوفیہ نے اپنے اور ربیعہ کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو شہزاد احمد کے گوش گزار کر دی تھی جس سے انہیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ ان کی طرف سے نہ صرف کبیدہ خاطر بلکہ خاصی بے اعتبار سی بھی ہے اور اس کے بعد سے ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے اسے یقین دلائیں کہ وہ محض اپنی گزشتہ غلطی یا زیادتی کی تلافی کے طور پر نہیں بلکہ اپنی بے پایاں محبت کے ساتھ اسے ایسا سائبان دینا چاہتے ہیں جس پر وہ فخر کر سکے۔

اس روز کے بعد سے وہ مسلسل یہ کوشش کر رہے تھے کہ وہ کہیں اطمینان سے بیٹھ کر ان کی بات سن لے۔ آفس میں بار بار سامنا ہوا، کئی بار انہوں نے اسے اپنے ساتھ چلنے کی پیشکش کی۔ لیکن وہ سہولت سے منع کر گئی۔ اس کے انداز میں خفگی نہیں ہوتی تھی بلکہ یوں جیسے کسی معمولی جان پہچان رکھنے والے شخص نے اسے ساتھ چلنے کی پیشکش کی ہو۔ اور اس کا یہ انداز انہیں اس کے گزشتہ تمام رویوں کی نسبت عجیب سا لگا۔ کچھ تو بین کا احساس بھی ہوتا تھا، دل چاہتا تھا، تمام لوگوں کے درمیان اسے جھنجھوڑ دالیں۔ بشکل خود پر مضبوط کرتے رہے، کبھی کبھی اپنے آپ سے لڑنے لگتے لیکن کبھی بھی وہ خود کو اس سے الگ رکھ کر نہیں سوچ سکے۔

اس روز جب انہی نے انہیں بتایا کہ وہ آج پھر ربیعہ کے گھر گئی تھیں۔ اور یہ کہ ابھی انہوں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تو وہ بے حد جھنجھلائے۔ اسی وقت اس سے براہ راست بات کرنے کا سوچا، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ گزشتہ کئی روز سے وہ انہیں زیادہ بات کرنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھی۔ وہ کوئی بھی بات کرتے، مختصر اجواب دے کر فوراً دوسری طرف متوجہ ہو جاتی تھی۔ جیسی اسی وقت انہوں نے اس کے سامنے جلنے کے بجائے ٹیلی فون کا سہارا لیا۔ اور اس کی آواز سننے ہی مضبوط لہجے میں بولے۔

”آپ فون بند نہیں کریں گی۔“

”جی۔“ اس کا جی نہ اثبات میں تھا اور نہ سوالیہ۔ غالباً فوراً وہ سمجھ نہیں سکی تھی کہ پہلے ہی مرحلے پر وارننگ دینے والا کون ہے؟ اور جب سمجھی تو اسی قدر کہہ سکی۔

”فراہیے۔“

”ایک بات بتائیں ربیعہ، آپ کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کا اختیار صرف آپ کے والدین کو ہے یا۔“ وہ قصداً خاموش ہو گئے۔ اور وہ ان کا مطلب سمجھ کر بولی۔

”سوری۔ میں آپ کی بات کا جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھتی۔“

”لیکن میں ہر صورت جاننا چاہتا ہوں۔“

”کیوں؟“

”تاکہ مجھے معلوم ہو سکے کہ میرے پروپوزل کو آپ ریجیکٹ کر رہی ہیں یا آپ کے والدین۔؟“

”کیا واقعی آپ کے پروپوزل کو ریجیکٹ کر دیا گیا ہے۔“ وہ بلا ارادہ بہت جلدی پوچھ گئی تو وہ کچھ دیر اس کے لہجے پر غور کرنے کے بعد بولے۔

”جی ہاں، آپ ایسا ہی چاہتی ہیں؟“

”ہاں۔“

”کیوں؟“

”بس، میں مناسب نہیں سمجھتی۔“

”اچھا۔“ وہ ذرا سانس لے۔ یہ مناسب اور نامناسب کی تمیز کب سے ہو گئی آپ کو؟“

”سننا چاہتے ہیں؟“

”ضرور۔“

”اس روز سے شہزاد احمد جب جملہ عروسی میں آپ نے مجھے ایک نا محرم کا خط تھمایا تھا۔ اس کے بعد سے آج تک میں مناسب اور نامناسب کے بھنور میں چکر کھا رہی ہوں۔“

”پلیز ربیعہ، گزری کوئی بات مت دہرائیں۔ وہ عاجزی سے بولے تو وہ اپنے ہونٹ بھیچ کر کر دی گئی۔ پھر سوچ کر قدرے تاخیر سے بولی۔

”ایک بات مانیں گے؟“

”کیسے۔“

”آپ اپنا پروپوزل واپس لے لیں۔“ وہ اطمینان سے انہیں حیران کر گئی۔

”کیوں؟“

”کیوں کا جواب نہیں ہے میرے پاس۔“

”ٹھیک ہے، جب آپ کے پاس جواب ہو، تب کہیے گا۔“

”کیا مطلب؟“

”میں بغیر کسی وجہ کے آپ کی بات نہیں مان سکتا اور وجہ بھی ٹھوس ہونی چاہیے۔“ ان کے صحتی انداز پر وہ جھنجھلا اٹھی۔

”آخر آپ سمجھتے کیوں نہیں؟“

”کیا نہیں سمجھتا ہوں؟“

وہ خاموش ہو کر اپنے آپ سے الجھنے لگی اور وہ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد بولے۔

”آپ کچھ کہہ رہی تھیں۔“

”کچھ نہیں۔“ اس نے ساتھ ہی وہ سلسلہ منقطع کر گئی۔

انہوں نے ریسور کو یوں دیکھا جیسے شکوہ کر رہے ہوں، پھر کریڈل پر رکھ کر جیسے ہی پلٹے، صوفیہ کو کھڑے دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ وہ شوخ و معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔ ان کے متوجہ ہونے پر ہلکے سے کندھے اچکا کر بولی۔

”میں نے کچھ نہیں سنا۔“

”سن کر بھی کیا کہہ سکتی ہیں؟“ وہ کہتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ اس وقت کسی سے بات نہیں کرنا چاہتے تھے جب کہ صوفیہ پیچھے پیچھے چلی آئی۔

”کیا کہہ رہی تھی ربیعہ؟“

”یہ آپ اسی سے پوچھ لیجیے گا۔ وہ صوفیہ کے اشتیاق کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے آپ کو بہت عجلت میں ظاہر کر رہے تھے۔

”آپ کو بتانے میں کیا اعتراض ہے؟“

”اعتراض تو کوئی نہیں۔ بس اس وقت میں ذرا جلدی میں ہوں۔ اب ضروری کام سے جانا ہے۔“

”وہ ریک میں رکھی فائلوں میں جانے کیا تلاش کرتے ہوئے ہوئے۔“

”آپ کی واپسی کب تک ہوئی؟“

”کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ انہوں نے اپنے کام میں مصروف رہ کر کہا، پھر جانے کیا خیال آیا، اسے

دیکھ کر پوچھا: آپ کو کوئی کام ہے کیا؟  
 "کام تو نہیں البتہ آپ سے ایک بات کہنی تھی۔ چلیے پھر اطمینان سے۔" آخر میں وہ خود کلاہی کے انداز میں کہتے ہوئے جانے لگی کہ انہوں نے پکار لیا اور اس کے رکنے پر پہلے ہاتھ میں پٹری نائل رکھی، پھر آکر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"کیسے کیا بات ہے؟"

"میں نے ایک پلان بنایا ہے۔" صوفیہ کے رازدارانہ ہیچ اور انداز پر وہ چونکے اور پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو کر سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ کہنے لگی۔

"میں نے سوچا ہے کہ کچھ دنوں کے لیے اماں کے گھر چلی جاؤں اور ربیعہ سے یہ کہوں کہ جب تک وہ آپ سے شادی کے لیے ہامی نہیں بھرے گی، میرے لیے بھی اس گھر کے دروازے نہیں کھلیں گے یعنی میری واپسی اس صورت۔"

"شٹ اپ صوفیہ۔" وہ اُسے خاموش کروا کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہیں اس کی بات سمجھ ناگوار گزری تھی، بمشکل خود پر ضبط کر کے بولے۔

"محبت اور دھاندلی میں فرق ہوتا ہے صوفیہ، اگر دھاندلی ہی کرنا ہوتی تو بہت پہلے کر چکا ہوتا۔" پھر جاتے جاتے بولے۔

"خبردار، ایسی کوئی بات سوچنا بھی مت، جس سے اس کے ساتھ ساتھ میرے پندار کو بھی ٹھیس پہنچے۔"

صوفیہ نے بہت خاموشی سے انہیں کرے سے نکلتے دیکھا، اس کے بعد بھی وہ کتنی دیر تک وہیں کھڑی رہی تھی۔

ابتہاج کی سالگرہ میں بس دو دن تھے۔ کافی دن پہلے جب صوفیہ آئی تھی تو اس نے کہا تھا کہ وہ دو دن بچوں کی سالگرہ ایک ہی جگہ یعنی ایک ہی گھر میں کرے گی، اماں کے گھر یا اپنے گھر، اس کے بعد سے وہ نہ تو خود آئی تھی اور نہ ہی فون پر اپنے پروگرام کے بارے میں بتایا تھا، پھر بھی اس نے اپنے طور پر ساری تیاری تو مکمل کر لی تھی لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنی طرف سے کسی کو مدعو کرے یا نہیں، اس کے لیے یہ معلوم ہونا ضروری تھا کہ سالگرہ کہاں ہوگی؟

اس شام وہ اسی انجمن میں بیٹھی تھی کہ صوفیہ اور مہروز آ گئے، بہت جگمگت میں تھے، بس کھڑے کھڑے ہی صوفیہ نے بتایا کہ وہ سالگرہ کا اہتمام اپنے گھر پر کر رہی ہے۔ مہروز نے سب کو آنے کی تاکید کی اور خاص طور سے اس سے کہا کہ وہ ابتہاج کے ساتھ ضرور آئے، اس نے مرقم نام بلا دیا۔

"سچ آئی، آپ بھی چلیں گی؟" صوفیہ اور مہروز کے جانے کے بعد ہمارے بہت خوش ہو کر اس سے پوچھا تو اچانک وہ بے پناہ آزدگیوں میں گھر گئی۔ اس لیے نہیں کہ وہ وہاں جا نہیں سکتی تھی بلکہ اس لیے کہ سب جانتے تھے کہ وہ صوفیہ کے گھر نہیں جائے گی، اس کے باوجود ابتہاج کی پہلی خوشی اس کے بغیر منانے کا سوچ لیا تھا۔

اسے یاد تھا کہ وہ جب بچے کو لے کر آئی تھی تو کتنی خوش تھی اور اس نے سوچا تھا کہ اب بقیہ تمام عمر اسے ساری خوشیاں اسی بچے کے حوالے سے میں گی لیکن پہلی ہی خوشی پر اسے نظر انداز کر دیا گیا تھا وہ اندر ہی اندر کڑھتی رہی۔

اور سالگرہ والے دن جب سب صوفیہ کے گھر چلے گئے، ابتہاج کو لے کر یہاں تک کہ آبا میار بھی تو وہ بالکل اکیلی رہ گئی۔ اور آداس تو وہ تھی ہی، اپنی تہی دامن کا احساس بھی ہونے لگا تھا۔

اس طرح تو اس نے نہیں سوچا تھا اور اسے صوفیہ سے یہ امید ہرگز نہیں تھی کہ جب خوشی منانے کا وقت آئے گا تو وہ ابتہاج کو اپنے ساتھ لے جائے گی۔

کم از کم چھوٹی اپا کو میرا خیال ضرور کرنا چاہیے تھا۔ اس نے بے حد آزدہ ہو کر سوچا تو آنکھوں میں ڈھیر سا رانی جمع ہو گیا اور پھٹکنے کو تھا کہ کال بیل کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور جا کر دروازہ کھولا تو سامنے شہر و زاہد کو کھڑے دیکھ کر اس کے پورے وجود میں سرور ہی دوڑ گئی۔

"کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟" اس کی بھگی بھگی دیکھ کر ان کی مسکراہٹ معدوم ہو گئی اور لہجہ آپ ہی آپ سنجیدہ۔

وہ منع کرنا چاہتی تھی، ہونٹوں کو حرکت بھی دی لیکن آواز جلنے کہاں کھو گئی تھی۔ اندر ہی اندر اپنی بے بسی پر کڑھتی ہوئی ان کی طرف سے رخ موڑ گئی تو وہ دہلیز پار کر آئے اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔

"آئیے۔" وہ ایک دم جیسے ہوش میں آ گئی۔ لیکن اتنی سی دیر میں کتنی دیر ہو گئی تھی کہ وہ اس سے چند قدم آگے تھے، مجبوراً ان کے پیچھے چلنا پڑا۔ اور جب انہوں نے تخت کی طرف اشارہ کر کے اسے بیٹھنے کے لیے کہا تو اسے یوں لگا جیسے وہ ان کے گھر آئی ہو۔ خاصی دلچسپ صورتحال تھی یعنی مہمان میزبان کا لطف اٹھا رہا تھا۔

"کیا اب مجھے آپ سے چائے وغیرہ کا بھی پوچھنا پڑے گا؟" وہ اُسے تخت کے کنارے خاصے ٹکلف سے بیٹھتے ہوئے دیکھ کر مسکرا کر بولے۔ اور دیوار کے پاس سے کرسی کھینچ کر اس انداز سے بیٹھنے کہ وہ اگر یہاں سے اٹھنے کا ارادہ کرے بھی تو فوراً عمل نہ کر سکے۔

"آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔" وہ پکلیں اٹھائے بغیر انہیں دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں، یہ میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"ضرور جانتے ہوں گے لیکن۔"

"اس بحث کو چھوڑیں۔ اور اگر پوچھنا ہی ہے تو یہ پوچھیں کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟" انہوں نے ٹوک کر کہا تو وہ فوراً کچھ نہیں کہہ سکی پھر کچھ سوچ کر بولی۔

"میں آپ کی آمد کا مقصد جانتی ہوں۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ وقت کی بچت ہو گئی۔" وہ اطمینان سے بولے تو وہ اندر ہی اندر جھنجھلا کر رہ گئی۔

"پھر کیا خیال ہے آپ کا؟" انہوں نے اس کی جھنجھلاہٹ سے محفوظ ہو کر کہا۔

"کس بارے میں؟"

"ارے۔" ان کی مسکراہٹ ہلکی سی ہنسی کا روپ دھار گئی۔ ابھی تو آپ نے کہا ہے کہ آپ میری آمد کا مقصد جانتی ہیں۔"

"جی۔ اور میں اس سلسلے میں کوئی بات نہیں سننا چاہتی، وہ آہستہ آہستہ خود پر قابو پا رہی تھی۔"

"کہنے سننے کو تو اب کچھ رہا ہی نہیں ربیعہ بیگم۔ اب تو مجھے اور عمل کرنے کا وقت ہے۔ چاہے تو یہ کہ ہم بغیر کسی تاخیر کے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر اس شاہراہ پر قدم رکھ دیں جہاں ایک نئی زندگی ہمارا منتظر ہے۔"

میرے بارے میں کس انداز سے سوچتی رہیں اور میں آپ کے سامنے کوئی صفائی نہیں پیش کرنا چاہتا۔  
پھر بھی یہ ضرور چاہتا ہوں کہ جن باتوں نے آپ کو مجھ سے متفر کیا ہے، ان کی وضاحت کر دوں،  
مجھے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ وہ روشے روشے لہجے میں بولی۔

لیکن مجھے ضرورت ہے۔ وہ فوراً زور دے کر بولے۔ اس لیے کہ میں صرف تلافی کی غرض سے  
آپ کے پاس نہیں آیا بلکہ وہ محبت جو میری شریکوں میں گردش کر رہی ہے، وہ مجھے آپ تک لانی ہے  
اور یہ وہ محبت نہیں جو اپنی ہی آگ میں چپ چاپ تسلی رہے۔ اس کے برعکس یہ تمہارے دل تک  
رسائی چاہتی ہے۔

وہ بڑی خوبصورتی سے آپ سے تم پر اگر درمیان فاصلہ سمیٹتے ہوئے اپنی بے نام سی خواہشوں کا  
اعتراف کرنے لگے۔

”میں تمہیں چاہوں اور بدلے میں تم مجھے ٹوٹ کر چاہو۔

میں روٹھوں تو تمہاری جان پر بن آئے۔

اور۔

میں مسکرا کر دیکھوں تو ہر طرف تمہاری ہنسی کی جھنکار سنائی دے۔

اور ایسا تو جب ہی ممکن ہے رعبہ جب تمہیں میرا اور میری محبتوں کا اعتبار ہو۔

انہوں نے لمحہ بھر تک کراس کے وجود کو ستاؤں کے حصار میں دیکھا، پھر کہنے لگے۔

”شاید تم جانتی ہو، میرے دل کی نرم زمین پر تمہاری محبت کا بیج اُس روز گرا تھا جب تم برف سے  
گھر و بنا رہی تھیں، اس کے بعد پہلے تو یہ خود رو پودے کی طرح بڑھی، پھر میں نے خود اس کی آبیاری  
کی، یوں کہ تمہیں خیر نہ ہو۔ کیونکہ دریاں میں ثابت حسن موجود تھا۔ گوکہ مجھے تم پر شرعی اور قانونی حق  
حاصل ہو چکا تھا، تم میری منگوتھ تھیں، اگر میں چاہتا تو اسی وقت تمہیں اپنا پابند کر سکتا تھا اور ایسی صورت  
میں تو یہ اور بھی آسان تھا کہ تم بھی ایسا ہی چاہ رہی تھیں۔ اور بار بار میں نے سوچا کہ تمہیں بیوی کا مقام  
دے کر ہمیشہ کے لیے اپنے گھر میں رکھ لوں۔ لیکن اپنی سوچ کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔

اس لیے نہیں کہ میں کسی وعدے یا معاہدے کا پابند تھا، میرے لیے ان سب باتوں کی کوئی اہمیت  
نہیں تھی، میں نے صرف اس کے بعد کے حالات کو سوچ کر تمہاری طرف پیش رفت نہیں کی، اس لیے  
کہ مجھے محبت کی موت منظور نہ تھی اور نہ ہی میں سمجھتا تھا کہ اگر میں اس وقت اپنا حق استعمال کر  
لیتا تو اس وقت تمہارے سامنے نہ بیٹھا ہوتا۔ تم میری بات سمجھ رہی ہونا؟۔ انہوں نے براہ راست  
آس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا اور اس کے پلکیں جھپکالنے پر کہنے لگے۔

”میں شروع ہی سے حقیقت پسند رہا ہوں۔ اور تمہارے بارے میں جذباتی فیصلہ کرنے کے بجائے  
میں نے حقائق کو سامنے رکھ کر سوچا تھا اور حقائق بڑے تلخ تھے۔ تم سمجھ سکتی ہو محبت کی جذباتی فہم  
کتنی کم ہوتی ہے۔ سال دو سال یا اس سے کچھ زیادہ۔ اور اس دوران یا تو واقعی ایک دوسرے کی  
خامیاں نظر نہیں آتیں یا دانستہ نظر انداز کی جاتی ہیں۔

بہ حال اس کے بعد زندگی معمول پر آتی ہے اور اصل زندگی وہیں سے شروع ہوتی ہے۔ اور میں  
نے اصل زندگی ہی کا تصور کیا تھا تو جانشی بوس میں کیا تھا۔ ہر طرف بے اعتباری اور غیر یقینی۔ مجھے یوں  
لگا جیسے جذباتی دور سے نکل کر میں سطحی سی سوچ رکھنے والا بہت عام سادہ دین جاؤں گا یعنی تمہارے ہر  
انداز میں مجھے شائبہ حسن کی پرچھائیں نظر آئے گی۔

تم خاموش ہو تو کیوں؟۔

تمہارے ہونٹوں کی مسکراہٹ کس کی یاد کی مرہون منت ہے؟۔

تم تنہا کیوں بیٹھی ہو؟۔

اچانک تمہارا ہاتھ گرم کیتلی سے کیوں چھو گیا ہے؟۔

یعنی بات میں کیوں۔ اور اس کیوں کے ساتھ شائبہ حسن۔

وہ خاموش ہو گئے۔ جیب سے سگریٹ نکال کر سگایا اور دو تین گہرے کش لینے کے بعد بولے۔

”یہی ہے شمار باتیں سوچ کر میں تم سے دستبردار ہو گیا۔ میرے لیے یہ تصور ہی تکلیف دہ تھا کہ  
میرا جس میں تمہاری محبت کی جڑیں مضبوط ہو چکی ہیں، آئندہ چند سالوں میں فنا خشک و شبہات کا  
گھر بن کر رہ جائے۔ اور یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ میں تم سے ہر وقت شاکی رہتا اور تم مجھ سے  
مشغول۔ اور میں محال تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو الزام دیتے ہوئے الگ ہو جاتے یا پھر دوسری  
صورت سمجھوتے کی تھی یعنی جبراً ایک دوسرے کو برداشت کرنا۔

محبت مرحلے تو یہی دو صورتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ اور میرے لیے یہ دونوں صورتیں ناقابل قبول  
تھیں۔ جیسی یہ جاننے کے باوجود کہ میں اس نندھن کو قائم رکھنا چاہتی ہو، خود کو وعدے کے زنجیر  
میں پھنسا ہوا پابند شخص نظر کر کے راستے الگ کر لیے۔ قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

”ایسا کر کے میں خوش نہیں تھا۔ کبھی بھی خوش نہیں ہوا۔ اس کے باوجود یہ اطمینان تو رہا کہ ہم  
ایک دوسرے کی نظروں سے گرے نہیں۔ تم مجھ سے لاکھ متفرقی نہیں میرے کردار سے تشاکی  
نہیں ہو سکتی۔ اگر تمہیں یاد ہو تو ابھی کچھ دن پہلے تم نے صوفیہ سے کہا تھا کہ اس کی کیا گارنٹی ہے کہ  
اب میں تمہیں کسی کے کہنے پر چھوڑوں گا نہیں؟۔ تو اب تمہیں جان لینا چاہیے کہ پہلے بھی میں نے کسی کے  
کہنے پر تمہیں نہیں چھوڑا تھا۔ وہ فیصلہ میرا اپنا تھا۔ اور ابتدا میں، میں پچھتا یا بھی لیکن پھر تمہاری شادی  
اور اس کے بعد شائبہ حسن کا جو روپ سامنے آیا تو مجھے اپنا فیصلہ انتہائی مناسب لگا۔ جس کی بدولت  
میں نے خود کو شائبہ حسن بننے سے بچا لیا تھا۔

میں بڑا آدمی نہیں ہوں لیکن بڑا آدمی بننے کی خواہش تو ہر ایک کو ہوتی ہے۔ اور میں یقین سے  
کہہ سکتا ہوں کہ تم مجھے برا بھلا کہہ سکتی ہو، ملامت بھی کر سکتی ہو لیکن نظروں سے نہیں گرا سکتی، اس  
لئے کہ میں آج بھی اس مقام پر کھڑا ہوں، جس مقام پر تم نے میری ہمار ہی کی خواہش کی تھی۔ اور تم یہ  
یقین کر لو کہ میں اس مقام سے آگے تو جا سکتا ہوں، نیچے نہیں آ سکتا۔ اگر نیچے آنا ہوتا تو قدرت بہت  
پہلے مجھ سے جذباتی فیصلہ کروا چکی ہوتی۔ تم سن رہی ہوں ناں۔ میری طرف دیکھو۔ یہ میں ہوں شہر و احمد  
جس کے بارے میں تم نے صوفیہ سے کہا تھا کہ کبھی موقع ملے تو اس کا محاسبہ کر دیکھنا، بہت پارسا  
ہے ناں وہ؟۔

آس کے پہلو بدلتے پرے ساختہ مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر بولے۔

”اپنی پارسانی کا کیا ثبوت پیش کروں؟۔ دو سال تک تم میرے بیدار میں رہیں اور۔“ وہ قصداً  
خاموش ہو گئے لیکن نظریں آس پر سے نہیں ہٹائیں۔

”میرے خدا۔“ میں ایسی پہلی تو کبھی آس نے بھی نہیں پچائی تھی جس نے بڑے بڑے وعدے  
کیے تھے۔ اور وہ کہنے لگے۔

”اس کے علاوہ بھی میں ہر بات کی وضاحت کروں گا لیکن ابھی نہیں۔ ابھی تو میں صرف یہ دیکھنے  
آیا ہوں کہ تم اپنی کبھی بات پر قائم ہو یا نہیں؟۔ آس نے ایک لحظہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وضاحت  
کرتے ہوئے وہ بولے۔

”کیا تم نے ہر مقام پر یہ نہیں کہا کہ تم نہ تو کسی کو خفا کر سکتی ہو اور نہ خود کسی سے خفا ہو سکتی ہو اور  
اب میں دیکھ رہا ہوں رعبہ کہ تم خود تو روتی روتی ہو، مجھے بھی روتی ہو، گویا تم اپنی  
بات پر قائم نہیں رہیں۔ ہے ناں؟۔“

آس مسلسل خاموش دیکھ کر انہوں نے پوچھا تو وہ یہاں سے اٹھنے کا سوچنے لگی لیکن پیچھے دیوار

تھی اور سامنے وہ ۔ اور وہ اس کا ارادہ بھانپ کر بولے ۔

”بس کرو ربیعہ، کہاں تک مجھ سے بھاگنے کی فضول سی کوشش کرتی رہو گی جب کہ اب بھی طرح جانتی ہو کہ ہر راستے پر سب سے پہلے تمہارا سامنا مجھ سے ہو گا۔“

وہ اب بھی خاموش تھی اور پتا نہیں اس کی خاموشی میں کیا امرارتھا، وہ سمجھ نہیں سکے۔ کچھ دیر تک سوچتے رہے کہ اب کیا کہنا چاہیے لیکن اچانک احساس ہوا کہ مسلسل بول کر وہ اپنا وقار خود مچھو کر رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ انہیں بے حد عزیز تھی، ہر بل اسے رگ جاں سے قریب محسوس کیا کرتی اس کی خاطر جان دی جاسکتی تھی لیکن عزت نفس کو داؤ پر نہیں لگا سکتے تھے، پھر انا بھی آٹمے آٹمی تو ایک گہری نگاہ اس پر ڈال کر آٹھ کھڑے ہوئے۔

”میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں نے یہاں آکر غلطی کی لیکن یہ میری آخری کوشش تھی۔“ اپنے لیے کی شکستگی خود انہوں نے بھی محسوس کی اور فوراً پلٹ گئے لیکن دو قدم کے بعد ہی رُکے اور اس کی طرف پلٹے بغیر بولے ۔

”شاید تمہیں یاد ہو، جب میں آخری بار تمہیں اس گھر کے دروازے پر چھوڑنے آیا تھا تو تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ تم اپنے گھر والوں سے کیا کہو گی اور میں نے کہا تھا، سارا الزام میرے سر رکھ دینا۔“ اپنے پیچھے آٹھ محسوس کر کے وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئے، پھر کہنے لگے ۔

”اور ابھی یہاں آتے ہوئے میں سب سے کہہ آیا تھا کہ واپسی میں تم میرے ساتھ ہو گی، اب تم بتاؤ سب لوگ جو ہماری راہ تک رہے ہوں گے، میں تنہا ان کے سامنے جا کر کیا کہوں؟“

اور وہ قصداً خاموش نہیں تھی۔ بہت دیر سے بولنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن ان کی محبت جواب نہیں بلکہ بہت پہلے سے اس کے دل تک رسائی حاصل کر چکی تھی اور پھر بدلتے حالات سے مجبور ہو کر جسے اس نے اندر کہیں دفن بھی کر دیا تھا ۔ وہ اچانک یوں بیدار ہو کر اپنا آپ عیاں کرنے پر اصرار کر رہی تھی کہ اسے ڈرتھا جہاں ہونٹ کھلے پہلی بات اعتراف کی ہو گی، جبھی اتنی دیر سے وہ ہونٹ سے بیٹھی تھی اور اب جب کہ وہ اس کی طرف سے مایوس ہو کر جا رہے تھے تو اس نے ساری احتیاطوں کا دامن چھوڑ دیا۔ اور ان کی پشت پر نظریں جما کر بولی ۔

”آپ کو کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے شہر و زاحمد اس لیے کہ ۔ میں آپ کے ساتھ چل رہی ہوں۔“ انہوں نے فوراً پلٹ کر دیکھا ۔

وہ بدلے میں ٹوٹ کر چاہنے کا اعتراف اور عزم لیے کھڑی تھی ۔ اس کی آنکھوں میں چمکتے ستاروں پر عہد رفتہ کی پرچھائیں نہیں تھی، اس کے برعکس پلکوں سے ڈھلکتا قطرہ قطرہ آن کی محبت کو خزان پیش کر رہا تھا ۔

احساس طمانیت میں گھر کر انہوں نے گہری سانس لی اور بڑھ کر وہ سارے قطرے اپنی انگلیوں پر سمیٹ لیے ۔

اور کچھ دیر بعد وہ ان کے ساتھ، ان ہی پرانے راستوں پر چل رہی تھی جنہیں خاص طور پر اس کے لیے نئے انداز سے سجایا گیا تھا ۔

